نومبر 2013
دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
KitabPK.Com
دو سلسلے وار تحریریں
تم سے دور نہیں - جادوگر
اسلم راہی کی تاریخی کہانی
شاہ جہان
مُعاشرتی ناول
پسِ پردہ

KitabPK.Com

8 — باتیں آپ سے — مدیر

قارئین کے محبت نامے' گزشتہ شمارے پر تبصرہ' اپنی پسند..... چاہتیں' مدیر کے نام.....! آپ کی آراء' پسند.....ناپسند' مشورے

10 — شاہجہان — اسلم راہی

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف کے قلم سے

31 — شیاطین — احمد صغیر صدیقی

جیک کے کانوں میں وہ آوازیں برابر آ رہی تھیں جو ہسپتال کے معمولات میں تھیں۔ ان میں انٹرکام سگنلوں کی آوازیں بھی تھیں۔

52 — طلاق — ایم الیاس

حیرت نفرت.....دکھ اور غصے سے میرا بدن لرزنے لگا۔ یہ منحوس خبر اتنی اچانک تھی کہ اس نے نہ صرف مجھ پر بجلی گرادی بلکہ بدحواس بھی کر دیا تھا۔

80 — جادوگر — ایم اے راحت

ایک پریشان حال نوجوان کی داستان حیات جسے جنوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پراسرار واقعات سے بھری ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔

102 — عیاش مجسمہ — نوازش شاہین

اتفاق سے لڑکی کے ہاتھ میں ایک کٹار آ گئی۔ جدوجہد میں راجکمار زخمی ہو گیا۔ اس کی ایک انگلی کٹ کر وہیں بیوہ کی جھونپڑی میں رہ گئی۔

108 — نامعلوم مہم — ایس اے ہاشمی

کوشلیا کو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی حد تک راضی کر چکی تھی۔ اس کی اصل مرضی کا اندازہ تو اس کی زبان سے ہی ہو سکتا تھا۔

140 — بے وجود — دانش کمال

اس کا خیال تھا کہ صرف وہی ہے باقی کچھ بھی نہیں لیکن وہ بھول گیا تھا کہ جب کچھ بھی نہیں تو پھر وہ کیوں ہو۔ اسرار و تحیر میں لپٹی ایک منفرد داستان

149 — طلسم کمایہ — حسن علی خان

وقت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ ویسے بھی طوفان کی وجہ سے وقت تھم گیا تھا۔ طوفان ہی آپس کے تصادم اور ٹکراؤ کو روک رہا تھا۔

169 — اداکاری — سید عاطر شمیم

ایک اداکار کی کہانی اسے اپنی شریک حیات کی آزمائش مقصود تھی۔ اس فنکار کی کہانی جس کی بیوی وفا کے امتحان میں سرخرو ٹھہری

172 — عزت مآب — وقار بن سعید

اسے اپنی عزت نفس اور وقار بہت عزیز تھا وہ دوسروں کی نظروں میں حقیر ہونا نہیں چاہتا تھا اور اسے اپنا بھرم رکھنے کا ایک خوب صورت موقع مل ہی گیا۔

180 — جینے کا قرینہ — سید ذوالفقار حیدر

دو دوستوں کی کہانی وہ یکسانیت سے بیزار تھے اور تنوع چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے شب و روز کچھ مختلف طریقے سے گزریں۔

192 — ہم سے کوئی نہیں — غزالہ جلیل راؤ

میں قلم ہوں۔ کائنات کی ہر شے فانی ہے لیکن مالک کائنات نے مجھے عمر دراز عطا فرمائی ہے۔ مجھے اس کائنات کی خدمت سونپی گئی ہے۔

213 — ایک ہی بھول — سلطان جمیل نسیم

دکان ایسی چلی کہ سال بھر کے اندر ہی مجھے برابر والی دکان بھی لینا پڑی۔ ابھی نئی دکان لیے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک صبح —!

220 — ایک چینی کہاوت — اشرف نوشاہی

دادی اماں کی بہت سی عادتوں میں یہ عادت بھی مجھے عجیب لگتی تھی کہ وہ کبھی کسی ضرورت مند کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتی تھیں۔

226 — سرخ ہتھیلی — نوازش شاہین

کملا کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑ چکی تھی لیکن راجن کمار اول تو نشے میں تھا پھر اسے باپ کی تھانے داری کا زعم تھا۔

242 — محبت فاتح عالم — ہما صفدر

ان دنوں میں اور ارم اسکول کے آخری سال میں تھے' ہم پرچوں کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد ارم کے سسرال والوں کو پاکستان سے آنا تھا۔

262 — شاباشِ صباح — عائشہ اختر بٹ

کاش اس کے تمام پرچے اچھے ہو جائیں۔ وہ لڑکی جو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے درود شریف اور رب زدنی علما کا ورد کرتی تو اس کی تکلیف میں کمی ہو جاتی۔

266 — پس پردہ — عطیہ زاہرہ

ولاور نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی جو بالکل ساکت تھی۔ جسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ابھی تک برش دبا ہوا تھا۔

000 — کرنیں — ☆☆

مختلف صفحات پر چیدہ چیدہ تحریریں' اقوال' مسکراہٹیں' قارئین کے لیے بطور خاص' قارئین کی ارسال کردہ غزلیات' نظمیں وغیرہ

❖ نومبر 2013ء ❖ قیمت 40 روپے ❖ جلد 43 ❖ شمارہ 7

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار' کراچی

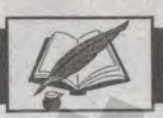

قارئین محترم ...... سلام مسنون!

قربانیوں کے مہینوں میں کس نے کیا کیا قربانی دی...... اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے‘ جس نے اپنی...... اپنے ارمانوں...... اپنے جذبوں...... اپنی خواہشوں کی قربانی دی ہے۔ ہم اور آپ بھی صرف اپنی کیفیات سے واقف ہیں...... دوسروں کی کیفیات سے اس لیے واقف نہیں ہو سکتے کہ ہم اپنی پریشانیوں کو ہی سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں...... دوسروں کی کیفیات کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے‘ جس نے اپنی ذات کو بالائے طاق رکھ دیا ہو...... ایسا کون ہے...... بہت سے ہیں...... ہم میں سے ہی ہیں...... وہ اپنی ذات کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور اُس ذات باری کے لیے...... اُس کی خوشنودی کے لیے اتنی خاموشی سے دوسروں کی مدد کرتے ہیں کہ اُن کے دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی...... اگر ایسا نہ ہو تو قیامت ہم سے زیادہ دور نہیں ہے...... وہ تو اسی انتظار میں ہے کہ ہم میں سے ’’جذبات‘‘ ختم ہو جائیں...... انانیت آ جائے...... زیادہ تر ایسا ہی ہے......اور جس دن یہ سب پر حاوی ہو گیا...... سمجھ لینا کہ قیامت آ گئی۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں‘ اپنی محفل کی جانب کہ جہاں آپ کے محبت نامے منتظر ہیں۔

♦......محمد سلیم بخاری‘ کوئٹہ سے لکھتے ہیں کہ اس شمارے میں سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

♦......کوٹری سندھ سے ذیشان حیدر لکھتے ہیں کہ موجودہ شمارے میں سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

♦......لاہور سے خرم سلطان لکھتے ہیں کہ اس ماہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

☆......خرم سلطان صاحب! آپ بھی مزیدار چٹکلے‘ لطائف اور اقتباسات ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ ہم انہیں ضرور شامل کریں گے۔

♦......خان پور سے کلیم احمد لکھتے ہیں کہ اس ماہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

♦......ملتان سے سید ارشاد حسین شاہ لکھتے ہیں کہ اس شمارے میں سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

♦......لاہور سے شوکت علی رقم طراز ہیں کہ اس شمارے میں سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

☆......جناب شوکت علی صاحب! آپ کا شکریہ۔ ہم سچی داستانوں پر مزید توجہ دیں گے۔ آپ کے مشورے کا شکریہ

♦......حیدر آباد سے محمد شفیق لکھتے ہیں کہ اس ماہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی ’’شاہجہان‘‘ ایم اے راحت کی ’’جادوگر‘‘ اور غزالہ جلیل راؤ کی ’’تم سے دور نہیں‘‘ کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ’’اور طرح کے لوگ‘‘ ایم الیاس کی ’’توازن جرم‘‘ سعدیہ لیاقت کی ’’لاحاصل‘‘ نازش شاہین کی ’’مندر کی تلاش‘‘ محمد سلیم اختر کی ’’خزاں کے بعد‘‘ ایس اے ہاشمی کی ’’گواہ‘‘ محمد صدیق طاہر کی ’’مہم‘‘ سید عاطر شمیم کی ’’بشرط استواری‘‘ آغا دلاور کی ’’فتنہ گر‘‘ حسن علی خان کی ’’دہرا چہرہ‘‘ ادب سے انتخاب میں نصرت علی کی ’’ایندھن‘‘ فاروق سولنگی کی ’’خون کے آنسو‘‘ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ’’قربتیں اور فاصلے‘‘ صائمہ کاردار کی ’’تازیانہ‘‘ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ’’سحر حیات‘‘ بہترین تھیں۔

☆......آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں۔ آپ کی محبت کا شکریہ۔

قارئین......! آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت   اللہ حافظ   مُدیر

KitabPK.Com

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے، بطور خاص

شاہجہاں

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں، اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

KitabPK.Com

گول کنڈا کے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ساتھ مغلوں کے سارے مسائل حل ہو گئے اور کوئی سرحدی تنازعہ باقی نہ رہا اب بیجاپور کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا دراصل بیجاپور پر سلطان محمد عادل شاہ کی حکومت تھی گو مغلوں کی حکومت کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے' لیکن عادل شاہ کی طرف سے مغلوں کو کوئی خراج ادا نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ خیر سگالی کے طور پر شاہ جہان نے سن سولہ سو اڑتالیس میں دوستی کی علامت کے طور پر بیجاپور کے حکمران عادل شاہ کو کوخان کی جگہ شاہ کے خطاب سے بھی نوازا۔

عادل شاہ ایک قابل حکمران تھا اس نے ایک طرف ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنایا تو دوسری طرف پرتگالیوں اور گول کنڈا کی حکومت سے تصادم کے بعد اپنا ایک علیحدہ اور منفرد مقام پیدا کرلیا ہے۔ ان کامیابیوں کے بعد عادل شاہ نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کچھ یوں اختیار کیا کہ وہ شاہ جہان کا ہم پلہ محسوس ہونے لگا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ بات شاہ جہان کو ناگوار گزری اس نے عادل شاہ کو انتباہ کیا کہ وہ اپنی حرکات سے باز رہے۔ ساتھ ہی شاہ جہان نے ایک خط میں نصیحت کی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے اطوار اختیار کرتے ہوئے شاہانہ شان شوکت ترک کردے۔ شاہ جہان کے اس انتباہ کے بعد بے جاپور کے شرفاء اور امرا نے عادل شاہ کو بھڑکایا کہ وہ بھی باقاعدہ دربار لگایا کرے اور لوگوں کو خطابات سے نوازا کرے انہوں نے عادل شاہ کو یہ بھی کہا کہ شاہ جہان نے اپنا مطالبہ ترک نہ کیا تو بے جاپور کے جنگ جو لشکری مغلوں کے ساتھ جنگ مول لینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

وقتی طور پر عادل شاہ ان کی باتوں میں آ گیا' لیکن جلد ہی اس نے مغلوں کے حملے کی صورت میں سنگین نتائج کے پیش نظر یہ فیصلہ ترک کردیا۔ اس نے شاہ جہان سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی نامہ بھجوادیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد چار نومبر سن سولہ سو چھپن کو عادل شاہ انتقال کرگیا۔ اس نے تیس سال تک نظام حکومت کو کامیابی سے نظم و نسق چلایا اس کے بعد اس کا لڑکا علی عادل شاہ ثانی اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

تخت نشین ہوتے ہی علی عادل شاہ ثانی کے بارے میں بے جاپور میں یہ افواہیں گشت کرنے لگیں کہ وہ سلطان عادل شاہ کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا لے پالک تھا اور اس کا تعلق ایک معمولی خاندان سے تھا۔ ادھر علی عادل شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی نہ صرف سازشوں کے جال پھیل گئے بلکہ بعض مشرقی علاقوں میں بغاوت کے آثار بھی پیدا ہو گئے۔

بے جاپور کے دربار میں اختلافات کے باعث بعض امراء نے اورنگ زیب کو اپنی پوری وفاداری کا یقین دلایا اور نگ زیب نے شاہ جہان کو ایک خط کے ذریعے ان تمام حالات سے آگاہ کیا۔ دراصل شاہ جہان بے جاپور کے معاملات میں مداخلت کر کے وہاں کے حالات درست کرنا چاہتا تھا اور شاہ جہان کو جب اورنگ زیب کا خط ملا تو اس نے جواب میں اورنگ زیب کو لکھ بھیجا کہ وہ جو شاہی حالات کو دیکھتے ہوئے مناسب کارروائی کرے۔

یہ اجازت ملنے پر اورنگ زیب نے بے جاپور کی مکمل تسخیر کا فیصلہ کرلیا اورنگ زیب نے اس مقصد کے لیے ایک لشکر مالوہ سے بھی منگوالیا اس دوران شاہ جہان نے اس کی مدد کے لیے میر جملہ کو بھی ایک لشکر دے کر روانہ کردیا تھا۔

شاہ جہان نے میر جملہ کو مورخین کے مطابق اس لیے بھیجا تھا کہ دکن کے معاملات کو اس سے بہتر اور کوئی شخص نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ میر جملہ اور اورنگ زیب مشترکہ لشکر کے ساتھ بے جاپور کی طرف روانہ ہوئے۔

اورنگ زیب اس کے بیٹے محمد بہار خان اور میر جملہ نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے ابدال نام کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس قلعہ کی فصیل کے ساتھ ساتھ پچپن گز گہری خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ قلعہ کے اندر بے شمار محلات باغات اور سرکاری عمارتیں موجود تھیں۔ قلعہ کی حفاظت کا بھی

خوب انتظام تھا اور اسلحہ کی وافر مقدار بھی موجود تھی۔ اس بنا پر بے جاپور کے حکمران ابدال نام کے اس قلعہ کو ناقابل تسخیر خیال کرتے تھے۔

ان دنوں ابدال نام کے کے قلعہ کا قلعہ دار ایک انتہائی تجربہ کار سالار تھا اس کا نام مرجان تھا۔ قلعے کی حفاظت کے لیے مرجان کے پاس ہزاروں گھڑ سوار' چار ہزار پیادہ اور بے شمار توپچی موجود تھے۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے ابدال پر حملہ ہونے سے پہلے ہی مختلف مقامات کا جائزہ لیا ابھی حملہ شروع بھی نہ ہوا تھا کہ قلعہ کے محافظوں نے پہل کرتے ہوئے قلعہ کے اندر سے گولہ باری کا آغاز کردیا۔

چنانچہ مغل لشکریوں نے گولوں کی بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے قلعہ کی فصیل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ انہوں نے جگہ جگہ خندقیں پر کر کے راستہ بنالیا پھر قلعہ کی فصیل توڑنے کے لیے کوشش شروع کردی گئی' خوفناک جنگ کے بعد مغل لشکر کو فتح حاصل ہوئی۔ قلعہ کا سالار مرجان شدید زخمی ہوا جو بعد ازاں زخموں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔ مغل لشکر نے قلعہ کے اندر داخل ہو کر فتح کا پرچم بلند کردیا۔

مرجان کے لڑکے قلعہ کی چابیاں لے کر اورنگ کے سامنے حاضر ہوئے اورنگ زیب ان کے ساتھ انتہائی تکریم و تعظیم کے ساتھ پیش آیا۔ اس طرح تقریباً ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد یہ قلعہ سر کرلیا گیا۔ اس مہم میں بارہ لاکھ روپے نقد اور بے شمار اسلحہ اور بارود ہاتھ آیا۔

ابدال نام کے قلعہ کو فتح کرنے کے بعد مغل لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے جبکہ مرجان کے مرنے اس کے بیٹے کی فرمانبرداری سے بے جاپور کے حکمرانوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے دوسری طرف ابدال نام کے قلعہ کو فتح کرتے ہی اورنگ نے قلعہ کے متعلق مزید انتظامات کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اس کے مخبروں نے اسے اطلاع دی کہ بے جاپور کا ایک بہت بڑا لشکر اورنگ پر حملہ کرنے کے لیے بڑی تیزی سے پیش قدمی کررہا ہے اور اس لشکر کا ایک مقدشہ الجیش اپنے لشکر سے چند میل آگے بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ قلعہ کے علاقوں کا رخ کیے ہوئے ہے۔

یہ خبر ملتے ہی فوراً کارروائی کا آغاز ہوا اورنگ زیب نے بہادر خان اپنے بیٹے محمد اور میر جملہ اور دیگر سالاروں کو ایک جگہ جمع کیا جو خبریں لشکر کے مخبر لے کر آئے تھے ان سے انہیں آگاہ کیا گیا۔ اس موقع پر صلاح مشورہ کرنے کے بعد وہ لشکر جو امیر جملہ اپنی کمانداری میں آگرہ سے لے کر آیا تھا وہ اس کی کمانداری ہی میں رہنے دیا گیا۔ دوسرا سالار لشکر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک حصہ اورنگ زیب نے اپنے پاس رکھا دوسرا حصہ بہادر خان اور اپنے بیٹے محمد کی کمانداری میں دیا گیا اور یہ فیصلہ کیا کہ بے جاپور والوں کا ہراول اور مقدشہ الجیش جو اپنے بڑے لشکر سے چند میل آگے بڑی تیزی سے ابدال نام کے قلعہ کا رخ کیا ہوا ہے اس کا بندوبست کیا جائے اور یہ کہ بہادر خان اور محمد اس کو روکیں گے اور ان دونوں کے پیچھے پیچھے پورے لشکر اور لشکر میں شامل عورتوں اور پڑاؤ کے ساتھ میر جملہ اور اورنگ زیب بھی پیش قدمی شروع کردیں گے۔

یہ فیصلہ ہونے کے بعد بہادر خان اور محمد دونوں اپنے حصے کا لشکر لے کر اس سمت بڑھے تھے جس سمت سے بقول مورخین بے جاپور والوں کا لشکر آرہا تھا۔

کھلے اور ویران میدانوں میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ بے جاپور کا لشکر آتے ہی جنگ کی ابتدا کرنے کے انداز میں تھا۔ اس سے بہادر خان نے بھی فائدہ اٹھانا چاہا۔ بہادر خان اور محمد نے پہلے ہی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا جونہی بے جاپور کا لشکر سامنے آیا پہلے بہادر خان حرکت میں آیا اور وہ بے جاپور کے لشکر پر سسکنے معدوم ہوتے لمحوں میں ذہن پر خونی دستک اپنے عذابوں خوف طاری کر کے قنا کے گھاٹ اتارتی آندھیوں کے خوفناک طمانچوں اور کالی راتوں میں زمین پر بکھرے اوراق کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دینے

والے خونی بگولوں کا روانی اور دھول دھول فضاؤں میں جذیوں کی داستانوں کو بکھیر دینے والے وحشت کے پرخفا دہشت کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

بہادر خان کے پیچھے محمد نے بھی اپنے کام کی ابتدا کی اور وہ بھی جذیوں اور خواہشوں میں اضطراب بھرتے بگولوں خیموں کی دھجیاں تک اڑا دینے والے وقت کے بدترین طوفانوں وقت کے دھندلکوں میں کرب کے مسلسل تلاطم، اضطراب، سسکتی قیامت اور جلتے عذابوں کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے بے جاپور کا لشکر بھی بہادر خان اور محمد کے لشکر پر ظلمتوں کی بکھری چادر میں جرم وعصیان کے حروف موت ومرگ کی رقصاں انگلیوں فنا کے گھاٹ اتارتی خوفناک قوت، شہرت کے تکبر عظمت کے گھمنڈ سے بجی برق تپاں کی قہر بائی اور غموں کی نہاں گہراؤں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

یوں گول کنڈا کی طرف سے آنے والی شاہراہ پر تلواروں کی دھاریں تیروں کی انیاں درد کے الفاظ تیزابی تلخیاں، خون اگلتے بگولے، دکھوں کے اندھے جھکڑ اور نامرادی کی اعناک کہانیاں رقم کرنے لگی تھیں۔ دلوں کی ساری آرزوئیں روحوں کی تمام امیدیں، عداوت کے ریتلے جھکڑوں میں دفن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ بدبختی کے گمبھیر طلسم کی چتا کو بھسم بھسم کرتے جلتے غمکدوں کا ایک نہ ختم ہونے والا رقص سا شروع ہو گیا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بے جاپور کے لشکر کا ہراول شکست اٹھا کر بھاگ گیا اتنی دیر تک بے جاپور کا پورا لشکر بھی آن پہنچا اور ان کے پہنچنے کے ساتھ ہی اورنگ زیب اور میر جملہ بھی اپنے پورے لشکر کو لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ دونوں لشکروں کے درمیان ہولناک رن پڑا اورنگ زیب نے پہلے پسپائی اختیار کرنے کا جنگی حربہ اختیار کیا اس کے بعد ایک دم اس نے پیش قدمی کی اور بقول مورخین اس نے ایک طرح سے بے جاپور کے لشکریوں کا محاصرہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اورنگ زیب کا لشکر کامیاب اور سودمند رہا اور بے جاپور کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

مورخین مزید لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب فاتحانہ انداز میں بے جاپور کے مرکزی شہر میں داخل ہوا جس کے بعد شاہ جہان کے نام کا باہمی تاریخی مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔

بے جاپور کو اس شکست کا شدید صدمہ تھا چنانچہ اس نے گل برگر برگا میں اپنے لشکروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا اپنے ایک سالار کو کئی ہزار گھڑسواروں کے ساتھ اورنگ زیب کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ یہ لشکر پہلے اردگرد کے علاقوں پر حملہ آور ہو کر اپنے لیے خورد ونوش اور مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ جمع کرنے میں مصروف رہا، اتنی دیر تک بے جاپور کے حکمرانوں نے ایک اور بہت بڑا لشکر اپنے دو سالاروں خان محمد اور افضل خان کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ چنانچہ ایک بار پھر بے جاپور کے لشکر کا ٹکراؤ اورنگ زیب کے لشکر سے ہوا اور مورخین لکھتے ہیں پہلا قلعہ جو اورنگ زیب نے فتح کیا تھا جس کا نام بیدر تھا اس قلعہ سے چالیس میل کے فاصلے پر کلیانی کے مقام پر ایک بار پھر دونوں لشکروں کا ٹکراؤ ہوا۔

مورخین لکھتے ہیں یہاں بھی اورنگ زیب کا لشکر نہایت جانفشانی کے ساتھ لڑا یہ جنگ بقول مورخین چھ گھنٹے تک جاری رہی جس کے نتیجے میں فتح اور کامیابی نے اورنگ زیب کے قدم چومے اور بے جاپور کا لشکر ایک بار پھر شکست اٹھا کر بھاگ گیا۔

مورخین لکھتے ہیں بیدر اور کلیانی کی شاندار فتح کے بعد اورنگ زیب کا لشکر بے جاپور کی طرف روانہ ہوا، دونوں طرف سے فوری طور پر جنگ بند کرنے کا حکم ملا۔ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاہ جہان نے یہ حکم دارالشکوہ کی سفارش پر دیا تھا، وہ کسی صورت میں یہ پسند نہیں کرتا تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ پورے ہندوستان کا شہنشاہ بننے میں کامیاب ہو جائے۔

اورنگ زیب بے جاپور کے مرکز کی سازشیں اس کے جال کامیاب ہوئے اور شاہ جہان سے کہہ

کہلوا کر وہ اس جنگ کو بند کروانے میں کامیاب ہو گیا تاہم دارالشکوہ نے اپنی سازشوں پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ بہانہ بنایا کہ موسم برسات کی آمد آمد کے باعث جنگ میں مشکلات پیدا ہوں گی لہٰذا جنگ بندی کر کے لشکر کو واپس بلایا جائے۔

اس کے نتیجے میں اپنے باپ کے حکم کا اتباع کرتے ہوئے اورنگ زیب پیچھے ہٹ گیا۔ سلطان نے تاوان جنگ کے طور پر ڈیڑھ کروڑ روپے ادا کرنا منظور کیا نیز بیدر، کلیانی اور پرندہ کے قلعے اس نے مغلوں کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ شاہ جہان نے ازراہ ترحم نصف تاوان جنگ بھی معاف کر دیا تھا۔

☆☆

ان حالات کے بعد مغل سلطنت میں ایک انقلاب اور تبدیلی رونما ہوئی وہ یہ کہ شاہ جہان بیمار ہو کر بستر علالت سے جالگا وہ قریباً ایک ہفتہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا اس دوران وہ جھروکا میں عوام کو درشن دینے کی رسم بھی ادا نہ کر سکا۔

چنانچہ چاروں طرف یہ افواہ عام ہو گئی کہ شاہ جہان نزع کے عالم میں ہے اور کچھ طرف یہ بھی افواہیں پھیل گئی تھیں کہ شاہ جہان وفات پا چکا ہے۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر شاہ جہان خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھا اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد آگرہ پہنچ جائے اس لیے کہ اس وقت وہ لاہور میں قیام کیے ہوئے تھا۔

شاہ جہان کے تینوں لڑکے اورنگ زیب، مراد بخش اور سلیمان شکوہ تینوں کو ہی دور دراز علاقوں میں ہونے کے باوجود بھی یہ خبریں پہنچ گئی تھیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ شاہ جہان کے تینوں لڑکوں کو بھی جو دور دراز علاقوں میں تھے اپنے اپنے مخبروں کے ذریعے باپ کی نازک حالت کی اطلاع ملی ان میں سے ہر ایک بخوبی جانتا تھا کہ دارالشکوہ تخت پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا تینوں نیانی تمام تر توجہ دارالحکومت پر مرکوز کر دی تھی۔ مراد بخش اس وقت گجرات کا والی تھا، دوسرا بیٹا سلطان شکوہ بنگال میں جبکہ اورنگ زیب دکن میں تھا۔ چنانچہ مورخین لکھتے ہیں کہ بے جاپور کی جنگ ختم ہوتے ہی تخت نشینی کی جنگ کا آغاز ہو گیا حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ ابھی تک مرہٹوں نے مغلوں کے خلاف سرگرمیانہ شروع نہ کی تھیں تاہم بے جاپور اور گول کنڈا کی فتح کے بعد مرہٹوں کے سربراہ شاہ جی کا لڑکا شیوا جی اسی سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا جن کی وجہ سے مغلوں کی قوت کو متزلزل کیا جا سکتا تھا دراصل شیوا جی نے بے جا پور اور گول کنڈا میں اورنگ زیب کی مصروفیت کے دوران ہی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اورنگ زیب اس طرف توجہ نہ دے سکے گا۔

اب جو شاہ جہان بیمار پڑ گیا اور اورنگ زیب کی توجہ آگرہ کی طرف مبذول ہو گئی تو شیوا جی کو پھر اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ شیوا جی کے باپ شاہ جی کو بے جاپور کی ملازمت میں بھیج دیا گیا ایک بار اس نے اس شرط پر مغلوں کی مدد کرنے کی پیشکش بھی کی کہ بے جاپور کا کچھ علاقہ الگ کر دیا جائے گا، لیکن اورنگ زیب نے یہ شرط قبول نہ کی تھی۔

جن دنوں اورنگ زیب بے جاپور میں مصروف تھا۔ شیوا جی نے مغل علاقوں کے شہر احمد نگر کے مغربی حصوں پر حملے شروع کر دیئے۔ کلیانی کی محاصرہ کے دوران اورنگ زیب کے ایک سالار نے شیوا جی کو شکست دی، لیکن موسم برسات کے باعث شیوا جی کے خلاف مہم جاری نہ رہ سکی۔ جب بے جاپور کے ساتھ امن قائم ہو گیا تو شیوا جی نے جب دیکھا کہ اب اورنگ زیب عالمگیر فارغ ہے تو وہ دبک گیا اور اورنگ زیب کی اس نے اطاعت قبول کرنا ہی اپنے لیے مناسب سمجھا، لیکن اب جب چاروں طرف شاہ جہان کی بیماری کی خبریں پھیلیں اور شیوا جی کو خبر ہوئی کہ اورنگ زیب نے اپنی ساری توجہ آگرہ کے علاقے پر مرکوز کر دی ہے تو مرہٹوں کا سردار شیوا جی ایک بار پھر پر پرزے نکالنے لگا تھا۔

مورخین ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید

KitabPK.Com

لکھتے ہیں کہ شاہ جہان کے سب سے بڑے لڑکے دارالشکوہ نے شاہ جہان پر ڈورے ڈال رکھے تھے لہٰذا اورنگ زیب نے بھی اپنی تمام تر توجہ دکن کی بجائے حکومت مغلیہ کے دارالحکومت پر مبذول کردی۔ شاہ جہان کو اپنی تمام اولاد میں دارالشکوہ سب سے زیادہ پیارا تھا اور اس پر اعتماد تھا۔

بقول مورخین اس نے دارالشکوہ کو وارث تخت بھی نامزد کردیا تھا اور نگ زیب نے بلاشبہ مغلیہ تخت کی بے حد خدمت کی تھی' لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے اس کی خدمات کا مناسب حصہ نہ ملا تھا۔ مورخین مزید لکھتے ہیں اس کے برعکس دارالشکوہ کی گورنری بہت اچھے علاقوں پر مشتمل تھی نیز اسے لاتعداد عہدوں اور خطابات سے نوازا گیا تھا اور نگ زیب اور دارالشکوہ کے درمیان اختلافات کی ایک بڑی وجہ مذہبی عقائد بھی تھے اورنگ زیب راسخ العقیدہ مسلمان تھا جبکہ دارالشکوہ تصوف کی طرف رجحان رکھتا تھا اور بعض ہندو عقائد میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ دارالشکوہ نے شاہ جہان کی شفقت و محبت کو کمزوری پر محمول کرتے ہوئے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اور پھر وہ دور دارالشکوہ کے لیے بڑا موافق اور مناسب تھا۔ شاہ جہان کے تمام مخلص مشیر انتقال کر چکے تھے اور دارالشکوہ کے لیے میدان خالی تھا تینوں بھائی مرکز سے دور تھے ایک بنگال' دوسرا گجرات اور تیسرا دکن میں تھا۔ ان حالات میں دارالشکوہ اپنی سازشوں سے کام لیتے ہوئے شاہ جہان سے جو چاہتا منوالیتا تھا۔

شاہ جہان کی بیماری کا سن کر سب سے پہلے جس نے ردعمل کا اظہار شروع کردیا وہ شاہ جہان کا بیٹا مراد بخش تھا اس وقت وہ گجرات کا والی تھا۔

چنانچہ اس نے اپنے وزیر علی نقی کو قتل کرنے کے بعد صورت پر حملہ کردیا اور فوراً بعد اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کرکے احمد آباد سورت اور کیمبے میں اپنے نام کے سکے جاری کردیے۔

دوسری طرف دوسرا بیٹا شاہ شجاع جو ایک قابل منتظم اور سالار تھا' بنگال میں اس نے اپنے پورے لشکر کو جو جمع کیا اور مغلوں کے دارالحکومت کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا۔ دارالشکوہ اس وقت تک خاموش تھا دربار میں بھی وراثت تخت کے بارے میں امراء اور وزراء اور سالاروں کے درمیان شدید اختلافات کے باعث سازشوں کا جال پھیل چکا تھا۔

ان حالات میں بے جا پور کے حکمرانوں نے جو معاہدے اورنگ زیب سے کچھ عرصہ پہلے کیے تھے انہوں نے ان سارے معاہدوں سے انحراف کرلیا۔

دوسری طرف دارالشکوہ یہ چاہتا تھا کہ پہلے اپنے چھوٹے بھائی مراد بخش کا خاتمہ کرے اس کے بعد شاہ شجاع کو ٹھکانے لگائے اور آخر میں اورنگ زیب سے نمٹے اسے سب سے زیادہ خطرہ اورنگ زیب سے ہی تھا۔ لہٰذا اس نے اورنگ زیب کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کے لیے کوشش شروع کردی تھی۔ اس کوشش کے لیے دارالشکوہ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ شاہ جہان کی علالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ جہان کے وزیر میر جملہ کو الگ کرکے پارندہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا اس دوران میں دارالشکوہ نے کوشش کی کہ برار کا علاقہ اورنگ زیب سے لے کر مراد بخش کو منتقل کرنے کی کوشش کی تاکہ ان دونوں کے درمیان پھوٹ پڑ جائے اور وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں اسی دوران شاہ جہان کی طبیعت قدرے سنبھلی تو اس کے حکم سے راجہ جے سنگھ کی ہمراہی میں ایک لشکر شاہ جہان نے اپنے بیٹے شاہ شجاع کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا اس لشکر میں بقول مورخین نائب کے طور پر دارالشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کو رکھا گیا تھا اس کے علاوہ دو اور بڑے بڑے لشکر جن میں سے ایک وگجرات کے حاکم مراد بخش کے علاقوں پر قبضہ کرنے اور تیسرے لشکر کو اورنگ زیب کی سرگرمیوں کو روکنے کی غرض سے بھی بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد دارالشکوہ نے سلطنت کے تمام انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شاہ جہان کی طرف سے تمام احکامات وہی جاری کرنے لگا تھا۔

فارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ ایک روز سنجیدہ سنجیدہ اور الجھا الجھا اپنی حویلی میں داخل ہوئے اس نے سیدھا اپنے دیوان خانے کا رخ کیا جہاں پہلے سے اس کی پتنی سرس وتی اور دونوں بیٹے ودیہ ناتھ اور قوی راج بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کررہے تھے' چپ چاپ آگے بڑھ کر جسونت سنگھ ان کے سامنے بیٹھ گیا کچھ دیر تک خاموشی رہی یہاں تک کہ گفتگو کا آغاز سرس وتی نے کیا اور جسونت سنگھ کو مخاطب کرکے وہ کہنے لگی۔

''کیا بات ہے کیا کوئی معاملہ آپ کے مزاج کے خلاف ہوگیا ہے۔

اس موقع پر جسونت سنگھ نے ایک لمبا سانس لیا پھر کہنے لگا۔ ''سرس وتی حالات بڑے دگرگوں اور ابتر صورت حال اختیار کرتے چلے جارہے ہیں۔ شاہ جہان کی بیماری نے چاروں طرف ایک آگ لگا دی ہے اورنگ زیب دکن میں ہے' مراد بخش بنگال میں' شاہ شجاع گجرات میں برسرعمل ہیں۔ مجھے شاہ جہان نے بلایا تھا اس نے پہلے چھوٹے لشکر تینوں بھائیوں کو روکنے کے لیے بھیجے ہیں' لیکن میں سمجھتا ہوں وہ لشکر کامیاب نہیں ہوں گے اس لیے بعد میں بڑے عساکر کو روانہ کیا جائے گا۔ سرس وتی ہم شاہ جہان کو نہیں چھوڑ سکتے اس لیے کہ اس سے ہمارا ایک نمک کا تعلق بھی ہے۔ دوسری طرف ہمارا داماد بہادر خان ہے جو ان دنوں اورنگ زیب کے ساتھ کام کررہا ہے۔ مرکز میں شاہ جہان اور دارالشکوہ ایک ہیں' میں نے شاہ جہان اور دارالشکوہ کے درمیان گفتگو سن کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ عنقریب شاہ جہان مجھے اور بنگال کے سابق والی قاسم خان کو ایک بڑا لشکر دے کر اورنگ زیب کے مقابلے پر بھیجے گا ایسی صورت میں میری بیٹی کا مستقبل بڑا تاریک ہوجائے گا' میں سمجھتا ہوں ہمارے ہنے پہ بہادر خان اورنگ زیب کا ساتھ نہیں چھوڑے گا تاہم راج کماری رتن مالا کو وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور میرے خیال میں رتن مالا کی محبت کی وجہ سے وہ اورنگ زیب سے اپنی وفاداری تبدیل کرسکتا ہے' لیکن ایسا ہونے سے پہلے رتن مالا کو بہادر خان کے پاس نہیں بلکہ ہمارے پاس ہونا چاہیے۔

اب میں نے جو منصوبہ بندی کی ہے اسے تم تینوں ماں بیٹے غور سے سنو' کل چند دستوں کے ساتھ قوی راج یہاں سے دکن کی طرف روانہ ہوگا سیدھا اپنی بہن رتن مالا کے پاس جائے گا بڑے شائستہ بڑے شستہ بڑے پیار اور بڑی محبت سے بہادر خان سے ملے گا اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوکر میرا سلام بھی پیش کرے گا اور بہادر خان سے یہ کہے گا کہ ہماری ماں سرس وتی سخت بیمار ہے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں اور مرنے سے پہلے وہ یہ چاہتی ہے کہ اپنی بیٹی کا منہ دیکھ لے لہٰذا بہادر خان مہربانی کرے اور رتن مالا کو اس کے ساتھ جانے دے مجھے یقین بلکہ قوی یقین ہے کہ ان حالات میں بہادر خان رتن مالا کو جانے کی اجازت دے دے گا۔ چنانچہ قوی راج رتن مالا کو لے کر یہاں آجائے گا۔ اس کے بعد ہم بہادر خان کی طرف پیغام بھجوائیں گے کہ وہ اورنگ زیب سے علیحدہ ہوکر شاہ جہان اور اس کے بیٹے دارالشکوہ کا ساتھ دے۔

اگر بہادر خان مان گیا تو اس کے بعد ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر وہ نہ مانا اس نے اپنی وفاداریوں کو اورنگ زیب کے ساتھ ہی قائم دائم رکھا پھر ہم رتن مالا کو استعمال کریں گے اس دوران سرس وتی تم رتن مالا کو پوری طرح سمجھاتی رہنا رتن مالا کے دل میں یہ بات بھی ڈالنی ہے اگر بہادر خان اورنگ زیب کا ساتھ دیتا ہے تو اورنگ زیب کے ساتھ وہ بھی مارا جائے گا اور یہ کہ شاہ جہان اور دارالشکوہ کسی بھی صورت اورنگ زیب کو معاف نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ اورنگ زیب کا ساتھ ترک کردے چنانچہ رتن مالا ایسا کرنے پر تیار ہوجائے گی اور اس کا پیغام بہادر خان کی طرف بھجوایا جائے گا اگر بہادر خان مان گیا تو بہت اچھا اور اگر وہ نہ مانا تو پھر تم رتن مالا کے دل میں یہ بھی بات ڈال دینا کہ اورنگ زیب شاہ جہان اور دارالشکوہ کے ہاتھوں کبھی نہیں

بچے گا اور اس کے ساتھ بہادر خان بھی مارا جائے گا۔ لہٰذا رتن مالا سے کہنا کہ بیوہ ہونے سے بہتر ہے کہ تم دھمکی آمیز رویہ اختیار کرو اور رتن مالا کی طرف سے بہادر خان کو یہ پیغام بھجوایا جائے گا کہ اگر وہ اورنگ زیب کا ساتھ نہیں چھوڑے گا تو پھر رتن مالا طلاق کا مطالبہ کردے گی۔ مجھے امید ہے کہ رتن مالا چونکہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بہادر خان کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی اس کی سلامتی کے لیے وہ ایسی دھمکی دینے پر رضامند ہوجائے گی اور جب ایسی دھمکی دے گی تو میرے خیال میں بہادر خان اورنگ زیب سے الگ ہونے کے لیے مان جائے گا نہیں مانے گا تو پھر طلاق کو ہونے دیں گے کیونکہ بہادر خان نے اورنگ زیب کے ساتھ مرنا ہی مرنا ہے ہم اپنی بیٹی کی شادی طلاق کے بعد کسی اور اس سے بھی بہتر جگہ کردیں گے پر یہ بات یعنی طلاق اور شادی کی باتیں رتن مالا کے ذہن میں فی الحال نہیں ڈالنی۔"

سرس وتی اور راجہ جسونت سنگھ کے دونوں بیٹے اس پر آمادہ ہوگئے تھے جسونت سنگھ کی اس منصوبہ بندی سے انہوں نے اتفاق کیا تھا لہٰذا دو روز بعد جسونت سنگھ کا بیٹا قوی راج مارواڑ کے کچھ ہندو معلم دستوں کے ساتھ رتن مالا کو لانے کے لیے دکن کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

رتن مالا ایک روز اپنے خیمے میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ بہادر خان اورنگ زیب کی طرف گیا ہوا تھا کہ اچانک خیمے کے دروازے پر رتن مالا کا بھائی قوی راج نمودار ہوا۔ قوی راج کو دیکھتے ہی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رتن مالا اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی اتنی دیر تک قوی راج خیمے میں داخل ہو اور جس نشست پر رتن مالا بیٹھی ہوئی تھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ رتن مالا بھی اس کے سامنے ہو بیٹھی۔ قوی راج کیونکہ کچھ سنجیدہ اور اداس تھا گو اداسی جعلی اور نقلی تھی اس کے باوجود رتن مالا پریشان اور فکرمند ہوگئی تھی اس کے بعد قوی راج کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"میرے بھائی میں دیکھتی ہوں تم کچھ پریشان ہو اور تمہارا اس طرح اکیلے میری طرف آنا میں سمجھتی ہوں کسی علت کے بغیر نہیں ہے۔"

اس پر قوی راج نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سر کو کھجایا اس کے بعد وہ رتن مالا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری بہن ماتا کی حالت سخت خراب ہے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے' اس بنا پر بتاجی نے مجھے آپ کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔ ماتا کی خواہش یہی ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتی ہوں اس بنا پر میری بہن میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔"

قوی راج کے یہ الفاظ سن کر رتن مالا پریشان اور فکرمند ہوگئی تھی کچھ دیر گہری سوچ ڈوبی رہی چہرے پر گہرے دکھ اور کرب کے آثار نمودار ہوئے تھے پھر دھیمے سے لہجے میں قوی راج کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"بھائی بہادر خان اورنگ زیب کی طرف گئے ہیں وہ آتے ہیں تو میں ان سے اس موضوع پر گفتگو کرتی ہوں۔"

رتن مالا کے ان الفاظ کے جواب میں قوی راج فوراً بول پڑا۔

"بھائی اور اورنگ زیب دونوں سے میری ملاقات ہوچکی ہے' میں اپنے ساتھ تمہاری حفاظت کے لیے مسلح دستے بھی لے کر آیا ہوں جونہی میں پڑاؤ میں داخل ہوا سب سے پہلے میری ملاقات بھائی اورنگ زیب سے ہوئی میں نے پورے حالات ان دونوں سے کہہ دیے ہیں۔ لہٰذا بھائی بہادر خان بھی سخت پریشان اور فکرمند ہوگئے ہیں اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہارے پاس وقت ضائع کیے بغیر روانہ ہوجاؤں اور جو میرے ساتھ دستے آئے ہیں ان کے قیام کا بھی بہترین اہتمام کردیا گیا ہے' میں چاہتا ہوں کہ کل صبح ہی صبح دونوں بہن بھائی یہاں سے آگرہ کی طرف کوچ کر جائیں۔"

رتن مالا نے اس پر اتفاق کیا تھا جواب میں کچھ

کہنا چاہتی تھی کہ اسی وقت خیمے میں بہادر خان داخل ہوا اور وہ آگے بڑھ کر قوی راج کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ پھر گفتگو کا آغاز اس نے کیا اور قوی راج اور رتن مالا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"مجھے بھی نہایت دکھ اور افسوس ہے کہ تم دونوں کی ماتا سخت بیمار ہے۔ قوی راج میں چاہتا تو یہ تھا کہ تم چند دن یہاں رہ کر آرام کرو' لیکن چونکہ ماتا کی زندگی کا سوال ہے اس لیے میں تمہاری تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ کل صبح ہی صبح تم رتن مالا کو لے کر آگرہ کی طرف کوچ کر جاؤ۔ میرے بھائی رتن کا خیال رکھنا اس سے پہلے میں ایک دفعہ مارکھل کے سلسلے میں دھوکہ کھا چکا ہوں تم چونکہ اپنے ساتھ مسلح دستے لے کر آئے ہو لہٰذا مجھے امید ہے کہ راستے میں کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔" بہادر خان جب خاموش ہوئے تب قوی راج نے کچھ سوچا پھر وہ بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور کہنے لگا۔

"بھائی کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ بھی میرے اور رتن کے ساتھ آگرہ چلیں۔"

قوی راج کے ان الفاظ پر اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہادر خان نے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر قوی راج کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"قوی راج میرے عزیز بھائی اگر حالات معمول کے مطابق ہوتے تو میں یقیناً رتن کو اپنے ساتھ آگرہ لے کر جاتا' لیکن حالات نہ درست ہیں نہ ہمارے حق میں ہیں اس بنا پر ان حالات میں تمہارے اور رتن کے ساتھ میں نہیں جاسکوں گا۔ آگرہ میں اقتدار کی کھچڑی پک رہی ہے یہ کھچڑی کسی کو کھانا نصیب ہوگی اس کا فیصلہ تو میرا رب ہی کرے گا' لیکن میں سمجھتا ہوں چاروں طرف سازشوں کے جال پھیلائے جارہے ہیں۔ فریب پر فریب اکٹھا کیا جارہا ہے اور سلطنت کے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ خانہ جنگی کا امکان بڑھ جائے گا۔

قوی راج آگرہ جاکر میری طرف سے ماتا کی صحت یابی کے متعلق پوچھنا میں ابا کی صحت کے لیے پریشان ضرور ہوں' لیکن حالات ایسے ہیں' میں جا نہیں سکتا۔ اگر حالات نے کروٹ لی کوئی انقلاب اور تبدیلی آئی تو میں تم دونوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں وقت ضائع کیے بغیر آگرہ پہنچوں گا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر خان رکا کچھ سوچا پھر وہ رتن مالا کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"رتن اپنا سامان ابھی سے سمیٹنا شروع کردو ساری نقدی تمہارے پاس ہے اور جس قدر نقدی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہو لے جاؤ وہاں جاکے ماتا کی دیکھ بھال کرنا میرے خیال میں تمہارے وہاں پہنچنے پر ماتا صحت یاب ہوجائے گی اگر ایسا ہوجائے تو ان کا خوب خیال رکھنا ان کی ہر بات ماننا ان کا احترام کرنا۔" رتن مالا نے مسکراتے ہوئے اثبات سے گردن ہلائی تھی اس کے بعد کھانا آگیا تینوں نے مل کر کھانا کھایا پھر اگلے روز صبح سویرے قوی راج رتن مالا کو لے کر اپنے محافظ دستوں کے ساتھ دکن سے آگرہ کی طرف کوچ کر گیا تھا۔

قوی راج کے ساتھ رتن مالا جب آگرہ پہنچی تو اس کی ماتا سرس وتی نے اپنے آپ کو ایک طرح سے لاغر اور بے چارہ ظاہر کرنا شروع کردیا تھا۔ جس وقت اسے اطلاع ملی کہ رتن مالا قوی راج کے ساتھ آرہی ہے تو وہ اپنی خواب گاہ میں بستر پر جالیٹی جسونت سنگھ بھی اس کے پاس جاکے بیٹھ گیا۔ رتن مالا کی آمد پر دوسرے بھائی ودیہ ماتھ نے دروازہ کھولا پھر وہ رتن مالا کو لے کر اس کمرہ میں داخل ہوا جہاں سرس وتی بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور جسونت سنگھ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سرسوتی کچھ دیر تک رتن مالا کو دیکھتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی بالکل ایسے اٹھی جیسے وہ برسوں کی بیمار اور کمزور ہوگئی ہو اس موقع پر جسونت سنگھ بولا اور کہنے لگا۔

"بیٹے میں سمجھتا ہوں تمہاری آمد کی وجہ سے تمہاری ماتا نے اپنی بیماری پر قابو پالیا ہے' چلنے

پھرنے کے قابل ہوگئی ہے کمزور ضرور ہے۔"

رتن مالا آگے بڑھ کر اپنی ماں سے گلے ملی پھر وہ واپس بیٹھ گئی اسی دن سے سرس وتی نے انہیں خطوط پر رتن مالا کو سمجھانا شروع کیا تھا جو خطوط یا جو منصوبہ بندی مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کی تھی۔ شاہ جہان ایک دل کش شخصیت کا مالک تھا اس کے پہلو میں ایک دردمند دل بھی تھا اس لیے وہ اکثر لوگوں کی خطائیں معاف کردیا کرتا تھا' انصاف پسند تھا' لیکن اولاد کے معاملے میں اس کا رویہ کچھ مختلف تھا۔ اولاد کے معاملے میں اس نے انصاف نہیں کیا ہر چھوٹی بڑی بات ہمیشہ اس نے دارالشکوہ کی ہی مانی وہ ایک وسیع سلطنت کا مالک تھا' لیکن اولاد کے معاملے میں وسیع القلبی نہیں تھی جہاں تک شاہ جہان کی سلطنت کا تعلق ہے تو شاہ جہان کی سلطنت سندھ سے سلیٹ تک اور افغانستان کے قلعہ لسبت سے دکن میں اوسا تک پھیلی ہوئی تھی جو بائیس صوبوں پر مشتمل تھی اس میں دہلی' اکبر آباد' لاہور' اجمیر' دولت آباد' الہ آباد' برار' مالدہ' خان دیش' احمد آباد' اودھ' بہار' ملتان' اڑیسہ' بکلانہ' ٹھٹھہ' قابل' بلخ' قندھار' بدخشاں اور کشمیر کے صوبے شامل تھے۔ ان بائیس صوبوں میں اسے تقریباً بائیس کروڑ روپے کی آمدن ہوتی تھی۔

شاہ جہان نے اپنی حکومت کا عام ڈھانچہ تقریباً وہی رکھا جو اکبر کے زمانے میں تھا تاہم اس میں کچھ ردوبدل کیا گیا جو حالات کے مطابق جاگیرداری اور منصب داری نظام پر مشتمل تھا' لیکن شاہ جہان نے اپنی طاقت بحال رکھنے کے لیے وسیع تعداد میں ذاتی فوج بھی رکھی۔

شاہ جہان نے ایک طاقتور حکمران ہونے کے باوجود رعایا کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک کیا۔ اتنی شفقت بہت کم حکمرانوں میں ملتی ہے اس کے امراء اور سالار اگر اپنے فرائض سے اغماض کرتے یا بدعنوانی سے کام لیتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں غرضیکہ اس نے رعایا کی سہولتوں اور آسائشوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ رعایا بھی اسے پسند کرتی تھی۔

مختلف قوموں کے لوگ شاہی ملازمت میں موجود تھے۔ ان کے پاس جاگیریں اور مراتب بھی تھے یہ لوگ مغل بادشاہوں کی عنایت ہی کے باعث اس سطح پر پہنچے تھے۔ شاہی ملازموں کو جاگیر اور انعام واکرام سے عام طور پر نوازا جاتا تھا انکی جاگیریں اور املاک ان کی زندگی تک ہی ان کا ساتھ دیتیں کیونکہ قانون کے تحت یہ ورثہ حکومت کے لیے وقف تھا۔

شاہ جہان کی ریاست کا اصل ذریعہ آمدن اراضی کا لگانا تھا۔

شاہ جہاں کی طرف سے افسروں کو کاشتکار طبقہ کی بہبود کا خیال رکھنے کا سخت حکم تھا اس کے باوجود بہت سے سرکاری افسر اپنے فرائض سے کوتاہی کرتے یا بدعنوان ہوتے ان کے ساتھ سختی سے نمٹا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نہ صرف تعمیرات' انصاف' سلطنت کے نظم ونسق معاملات انصاف بلکہ اس کے دور میں جو سکے ڈھالے جاتے تھے ان سے بھی اس کی اسلام سے محبت کا اظہار ہوتا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ فن تعمیر کے علاوہ شاہ جہان کے دور میں علم وادب کی بھرپور سرپرستی بھی کی گئی۔ فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ کاشان سے آئے ہوئے ایک درباری عالم نے نہایت آسان فارسی میں واقع نویس کا آغاز کیا تھا ایک اور شخص حاجی محمد جان نے بڑی عمدگی سے منظوم واقع نویس کی ابتدا بھی کی تھی۔

اس نے کشمیر کے بہت سے باغات اور شاہ جہان کی تعمیرات کے حالات منظوم کیے۔

پنجاب کے ایک برہمن چندر بھان نے جو دارالشکوہ کی ملازمت میں تھا فارسی کی شاعری اور نثر نویسی میں نام پیدا کیا۔ لکھنے والوں میں گوالیار کا ایک برہمن سندر داس نمایاں تھا۔ سندر داس کو مہاکوی کے خطاب سے نوازا گیا اس نے سنسکرٹ کے بھی بہت سے ترجمے کیے اس کی تحریروں میں فلسفیانہ رنگ نظر آتا تھا۔

کانپور کے ایک اور ہندو چنتامنی نے رامائن کو ازسرنو ترتیب دیا اس کی بھی سرکاری سرپرستی کی گئی ایک اور برہمن دیب دت جس کا تعلق متھی پور سے تھا مذہبی شاعری کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ علاوہ ازیں اس نے حکومت کی سرپرستی میں بہت سے ڈرامے بھی لکھے۔ بہت سے دیگر ہندوؤں نے بھی روحانی اقرار سے متعلق مضامین مرتب کیے۔ نیند ھیل کھنڈ کے ایک شخص پرامرناتھ نے متعدد ایسی نظمیں لکھیں جس میں ہندومت اور اسلام کے درمیان بعد کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کی معلومات میں ہندی کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ کا آزادانہ استعمال بھی ملتا تھا۔ احمد آباد کا ایک چولا ہا جو زیادہ تر راجپوتانہ میں رہا۔ اکثر روحانی منظومات لکھا کرتا تھا۔

اس طرح ایک اور شخص تکہ رام جس کا تعلق پونا سے تھا اور چھوٹی ذات کا ہندو تھا۔ اسی قسم کی نظموبات لکھتا تھا۔ اس کی مذہبی نظموبات کو قبول عام حاصل ہوا تھا لیکن براہمنوں نے اسے اس بنا پر موت کے گھاٹ اتار دیا کہ ایک چھوٹی ذات کے ہندو کی حیثیت سے اسے مذہبی تبلیغ کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔

شاہ جہان کے دور میں کچھ لوگوں نے دہلی کا حال لکھا اور ہندوؤں کی تاریخ کے مطابق اس کا بیان بھی کیا۔ دہلی کو وہ تیسری اقلیم گنتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے تھے کہ پہلا نام اس دہلی کا اندر پرست تھا۔ اندراکاس کے راجہ کا نام تھا جو ہندوؤں کے مذہب میں ایک مقرر کا راجہ ہے اور پرست دونوں ہاتھ بھر کر دھان کرنے کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے اعتقاد میں یہ بات کہ یہاں راجہ اندر سے کسی اگلے زمانہ دونوں۔ ہاتھ بھر کہ موتیوں کا دھان کیا تھا۔ جب سے یہ جگہ اندر پرست ہوگئی۔ مگر کثرت سماع سے پرست کا پت رہ گیا ازوفر لوگ اندر پٹ یا اندر بت کہنے لگے۔ چنانچہ اب تک پرانے قلعے کے پاس موضع اندر پت موجود ہے لیکن اس کی آبادی جہاں پہلے تھی وہاں سے ویران ہوگئی ہے اور وہاں کے زمیندار پرانے قلعہ میں بستے ہیں۔

اس بات پر بھی بڑا اختلاف ہے کہ اندر پت کو دہلی کب سے کہنے لگے۔ اس میں تین روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ دہلی ہندی کا ایک لفظ ہے جو ہندی کے لفظ ڈال سے نکلا ہے۔ ڈہلی ہندی میں نرم ذہن کو کہتے ہیں۔ جہاں پنج نہ گڑ سکے۔ دہلی کی زمین بہت نرم تھی۔ اس واسطے اس کو بھی ڈہلی کہنے لگے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ دہلو ایک زمیندار تھا۔ اس نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا۔ جب سے لوگ اسے دہلی کہنے لگے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ راجہ دلیپ نے اپنے نام پر ایک شہر آباد کیا جسے دہلی کہنے لگے اور عام لوگوں کی زبان پر دہلی بغیر کے جاری ہوگیا۔ اگلی کتابوں میں ڈہلی لکھا تھا۔ پت گئی اور دلی رہ گیا اور شاہ جہان کے دور میں جو سب سے بڑی بات رونما ہوئی۔ وہ اردو کا عروج تھا۔ اس کے دور میں جو زبان بولی جاتی تھی اسی وقت اسے اردو کہا جاتا تھا اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ اردو' فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی بازار کے ہیں۔ اردو سے مراد اردوئے شاہ جہان ہے۔

اگرچہ دہلی بہت قدیم شہر ہے۔ ہندوؤں کے تمام راجاؤں کا ہمیشہ سے دارالسلطنت رہا ہے لیکن سب اپنی اپنی بھاشائیں اور زبانیں بولتے تھے۔ ایک دوسرے کی زبان نہیں ملتی تھی۔ جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علمداری تھی تو مسلمان لوگ شہروں میں آئے تو اور بھی مشکل آن پڑی۔

نئے لوگوں کے آنے سے سودا سلف خریدنے اور بیچنے میں دقت آنے لگی۔ اول اول تو مسلمانوں کی عملداری میں اختلاف رہا۔ کبھی کسی کی بادشاہت رہی' کبھی کسی کی۔ کبھی غوری آئے ازور کبھی لودھی' کبھی پٹھان اور کبھی مغل اس وجہ سے زبان کا بدستور اختلاف چلتا گیا اور کوئی شخص اس کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑا۔

جبکہ اکبر بادشاہ کے دور میں ایک گوہر سلطنت کا قیام ہوا۔ سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے بیٹھے اور علم کا بھی چرچا ہوا لیکن اس زمانے میں فارسی زبان کی ایسی قدر تھی کہ لوگ کسی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے

تھے۔ جبکہ شہاب الدین شاہ جہان شہنشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا۔

دہلی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔ قلعہ بنایا اور شاہ جہاں آباد اس کا نام رکھا۔ اس وقت اس شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار رفتار جدا جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے لاچار ایک لفظ اپنی زبان کا اور دو لفظ اس کی زبان کے' تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے' سودا سلف لیتے اور یوں زندگی کا کام چلتا رہا۔

رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ ایک نئی زبان ہوگئی۔ چونکہ یہ زبان خاص شاہی بازاروں میں مجروح تھی۔ اس واسطے اس زبان کو اردو کہا جانے لگا اور بادشاہی امیر امراء اس کو ہی بولا کرتے تھے۔ گویا ہندوستان کے مسلمانوں کی پہلی زبان تھی۔

ہوتے ہوتے اس زبان ہی کا نام اردو زبان ہوگیا۔ اس وقت اس زبان نیا یک رونق حاصل کی جو دن بدن تراش خراش اس میں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جس زمانہ میں میر اور سودا نے اپنی خوش بیانی کا نقارہ بلند کیا تو یہ آواز ہر ایک کے کان میں پہنچنی شروع ہوئی۔ اس وقت یہ زبان بہت درست ہوگئی تھی اور عجیب رنگ ڈھنگ لائی تھی۔

اس کے بعد اس زبان میں فارسی' عربی اور سنسکرتی کے الفاظ مشتمل ہوئے اور پھر جب یہ آہستہ آہستہ سنورتی گئی تو سنسکرت کے الفاظ آہستہ آہستہ نکلتے گئے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ اس میں داخل ہوتے گئے اور جس کے نتیجے میں یہ زبان ایک بینا لاقوامی زبان بن کر نمودار ہوئی۔

مرکز کی طرف سے شاہ جہان نے اپنے تینوں بیٹوں سے نمٹنے کے لیے جو لشکر بھیجے تھے۔ ان تینوں لشکروں میں سے سب سے پہلے امیر کارا جے سنگھ ایک بڑے لشکر کے ساتھ شاہ جہان کے بیٹے شاہ شجاع کی طرف بڑا' جو اس وقت بنگال کا حاکم تھا۔ مگر اپنے لشکر کے ساتھ بنگال سے وہ پیش قدمی کر چکا تھا۔ دونوں کے لشکر جب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تو پہلے گفتگو کا آغاز شاہ شجاع نے امیر کے راجہ جے سنگھ پر انکشاف کیا کہ وہ شاہ جہان کو دارالشکوہ کی گرفت سے نکالنا چاہتا ہے از ور یہ کہ شاہ جہان کو دارالشکوہ سے خطرہ ہے۔ لہٰذا وہ اسے دارالسکوہ کے ہاتھوں لیس بچانے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے۔

راجہ جے سنگھ نے شاہ شجاع پر انکشاف کیا کہ شاہ جہان بقید حیات اور بخیریت ہے۔ نیز اس نے نہ صرف شاہ شجاع کو اس شرط پر معاف کر دینے کا پیغام بھی دیا کہ اگر وہ اپنا عہدہ دوبارہ سنبھالے تو بہار کا علاقہ بھی اسے دے دیا جائے گا لیکن شاہ شجاع اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس طرح ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے دونوں لشکر اپنی صفیں درست کرنے لگے تھے۔

امید کے راجہ جے سنگھ نے پیش قدمی کر کے پہل کی اور وہ شاہ شجاع کے لشکر پر ہر موڑ پر الجھنیں کھڑی کرتی آندھیوں کی بھیانک لہروں بھنور بھنور خون آلود بانہیں پھیلائے جوش حادثے بجز' ہر قدم پر ٹھوکروں کا طوفان برپا کرتے موجوں کے پیچ وتاب اور ہر لحہ' ہر ساعت میں اذیتوں کی طرح گھس جانے والے سیاہ بختی کے سایوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے شاہ شجاع بھی راجہ جے سنگھ کے لشکر پر نظر نظر میں سلگاہٹ پیدا کرتی غموں کی یلغار درد کے کالے جس میں الم نصیب سایوں' موت کی کراہوں اور بنجر پیاس میں سوگ کی اندھی آنچ اور زندان کی داستانیں الم کی طرح حلہ آور ہوا تھا۔ اس طرح امیر کے راجہ جے سنگھ اور شاہ جہاں کے بیٹے شاہ شجاع کے درمیان ہولناک دن پڑا تر ھا۔ دونوں طرف کے لشکری عزم راسخ' جرت محکم' عظیم اعتماد اور لازوال' مستحکم جذبوں کے ساتھ ایک دوسرے پر ضرب لگانے لگے تھے۔ تلخ لہجوں میں تکبیریں بلند ہو رہی تھیں اور جسموں کو تار تار کرتے نزع کے بے عکس ہیولے اور شعلہ اور خون ساماں

لہریں ہر طرف رقص کرنے لگی تھیں۔

شاہ شجاع کی بدقسمتی کہ اس ٹکراؤ میں اسے بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے بچے کھچے لشکر کے ساتھ وہ بنگال کی طرف بھاگ گیا تھا۔

دوسری طرف اورنگ زیب ابھی تک دکن میں قیام کیے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے پارکارے اور مخبر باقاعدہ آگرہ اور دکن کے درمیان چکر لگا رہے تھے۔ آجا رہے تھے اور مرکز کی ساری خبریں وہ اورنگ زیب تک پہنچا رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک مخبر بہادر خان کے خیمے میں داخل ہوا۔ بہادر خان نے اسے اپنے قریب بٹھایا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مخبر پہلے ہی بولا اور کہنے لگا۔

''امیر! میں جسونت سنگھ کا ایک پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور یہ پیغام ایک طرح سے آپ کی بیوی رتن مالا کی طرف سے ہے۔ اس لیے کہ جسونت سنگھ نے مجھے آگرہ میں اپنی حویلی میں بلایا' جس وقت یہ پیغام مجھے دیا گیا اس وقت جسونت سنگھ کی پتنی سرسوتی اس کے دونوں بیٹے اور آپ کی پتنی بھی وہاں موجود تھے۔ جسونت سنگھ نے مجھے پیغام جب دیا اس وقت آپ کی بیوی رتن مالا کی موجودگی جسونت سنگھ نے کہا کہ بہادر خان سے جا کے کہنا کہ یہ پیغام جسونت سنگھ کی طرف سے نہیں' بلکہ رتن مالا کی طرف سے ہے اور میں نے جب آپ کی بیوی سے یہ سوال کیا تو اس نے میرے سامنے کہا کہ وہاں یہ پیغام میری طرف سے ہے۔''

جب تک وہ مخبر بولتا رہا۔ تجسس بھرے انداز میں بہادر خان اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تب بہادر خان اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''پہلے یہ کہو کہ پیغام کیا ہے جو میرے سسرال والوں نے تجھے دے کہ بھیجا ہے۔'' اس پر وہ مخبر بولا اور کہنے لگا۔

''آپ کے نام پیغام یہ ہے کہ آپ محترم اورنگ زیب کا سنا تو چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ آگرہ میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ شہنشاہ شاہ جہان بیمار ہونے کے بعد تندرست ہو چکا ہے اور وہ ہر صورت میں اپنی بعد ہندوستان کی سلطنت کا بادشاہ اپنے بیٹے دارالشکوہ کو بنانے کا عزم کر چکا ہے۔ اس لیے کہ شاہ جہان اپنے بچوں میں دارالشکوہ اور بیٹی جہاں آراء کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے اور ان کی ہر بات مانتا ہے۔ لہٰذا دارالشکوہ اپنے باپ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمہ وقت اورنگ زیب کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے اور اس کام میں اس کی بہن جہاں آراء بھی اس کی مددگار اور معاون ہے۔''

رتن مالا کی طرف سے آنے والا پیغام سن کر بہادر خان نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ پھر اس مخبر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''جب تمہارا آگرہ جانا ہو تو جسونت سنگھ سے کہنا کہ میں اورنگ زیب کا ساتھ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ ہر صورت' ہر مرحلے' ہر تکلیف' ہر دکھ میں اورنگ زیب کے ساتھ ہوں۔ اب تم جا کر آرام کرو اور جب تم آگرہ پہنچو تو تفصیل کے ساتھ میرا یہ پیغام پہنچانا۔''

اس پر وہ مخبر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مسلح جوان بہادر خان کے خیمے پر نمودار ہوا۔ اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''امیر آپ کو محترم اورنگ زیب نے طلب کیا ہے۔''

بہادر خان فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اورنگ زیب کے خیمے کی طرف ہو لیا تھا۔ جب وہ اورنگ زیب کے خیمے کے دروازے پر آ گیا تو اندر اورنگ زیب اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر بہادر خان پر پڑی اس نے بہادر خان کو اندر بلایا۔ اپنے سامنے نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ بہادر خان جب بیٹھ گیا تب گفتگو کا آغاز اورنگ زیب نے کیا اور بہادر خان کو مخاطب کر کے وہ کہہ رہا تھا۔

''بہادر خان جسونت سنگھ اور تمہاری بیوی کی طرف سے جو خبریں لے کر قاصد آیا تھا۔ وہ پہلے مجھ

سے ملا اور جو تفصیل اس نے تم سے کہی وہی مجھے پہلے وہ کہہ چکا ہے۔

بہادر خان' تن کماری تمہاری بیوی' جسونت سنگھ تمہارا اسسر ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میرا بھائی دارالشکوہ اور میرا باپ شاہ جہان دونوں ہی جسونت سنگھ اور ایسی بہت سی قوتوں کو میرے مقابل لائیں گے۔ وہ ہر صورت مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ماضی میں ہر معاملے میں مجھے انہوں نے نظر انداز کیا۔ کبھی بدخشاں' کبھی ملتان' کبھی گجرات' کبھی دکن اور اس کے بعد پھر کبھی بدخشاں' کبھی قندھار کا والی بناتے رہے اور جہاں میری کامیابی اور کامرانی کے آغاز نمودار ہوتے تھے وہاں میں جانتا ہوں۔ دارالشکوہ کے کہنے پر فوراً تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

دراصل میرا باپ صرف دارالشکوہ کی باتوں پر اعتماد بھروسہ ہے ہی نہیں۔ میرے بھائی دارالشکوہ نے بھی میری بہن جہاں آرا کو اپنے شیشے میں اتار رکھا ہے اور وہ بھی اس کی ہم نوا بنی ہوئی ہے۔ ان دونوں بلکہ میرے باپ کا بھی بدعا یہی ہے کہ میں کہیں بھی جم کر کام نہ کر سکوں' کہیں سے بھی میری کامیابی میری ہنرمندی کے آثار ان کے کانوں تک نہ پہنچیں لیکن میرا بھروسہ' میرا یقین' میرا اعتماد اپنے اللہ پر ہے۔ اگر اس نے مجھے عزت دینی ہے تو وہ مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا اور اگر اس نے میرے مقدر میں عزت' وقار نہیں لکھا ہوا تو میں اسے اچک تو نہیں سکتا' لیکن میں اپنے مفاد کا دفاع ضرور کروں گا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا چکا ہوں اس کے مطابق میرے خلاف کچھ قوتیں حرکت میں آئیں گی۔ ان قوتوں میں تمہارا اسسر جسونت سنگھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر میں کبھی نہیں چاہوں گا تم جسونت سنگھ کا مقابلہ کرو۔ میں جانتا ہوں جس مخبر نے تمہیں یہ پیغام دیا ہوگا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو اس لیے کہ آگے خطرات ہی خطرات بکھرے ہوئے ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد اورنگ زیب رکا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔

"بہادر خان تمہارے اعمال میں زندگی کی بھرپور تڑپ اور انقلابی شعور ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تم بہترین جنگ اور چرب آزما ہو۔ مایوسی کی گھٹاؤں میں تم برق کے گھوڑوں خون آشام تلوار کی طرح حرکت میں آنے کا فن جانتے ہو۔ اپنے مخالفوں کی خواہشوں' آرزوؤں اور ارادوں کو سلب کر لینے کی ہمت رکھتے ہو۔ قسمت کی بساطوں کے سامنے اندھیرا طاری کر دینے والے جنگجو اور حرب آزما ہو۔" یہاں تک کہنے کے بعد اورنگ زیب رکا۔ پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"بہادر خان میں کبھی کسی بھی موقع پر تمہیں زبردستی اپنے ساتھ چپکا کے نہیں رکھوں گا۔ اگر حالات نے مجھے اکیلا بھی چھوڑ دیا تو بہادر خان میں ابلیس کے ان گماشتوں کی کمر توڑ کر رہوں گا۔ جو لوگ مجھے رنج و غم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ نفس کی بھوک قلب کی جوع رکھتے ہیں۔ ان کے خوابوں کے گھروندے میں مسمار کر کے رہوں گا۔ وہ قوتیں جو مجھ پر اداسی کی تھکن' اکیلے پن کا دکھ طاری کرنا چاہتے ہیں۔ گزرے کل کی ساری تلخیاں' شکستگی کے سارے خواب' عذابوں کے سارے قصے' سزاؤں کی ساری راستائیں' خطاؤں کی ساری کہانیاں میری جھولی میں ڈالنا چاہتے ہیں تو یہ سارے تحفے' یہ سارے انعامات پلٹ کر میں ان کی جھولی میں ڈال کر رہوں گا۔"

یہاں تک کہتے کہتے اورنگ زیب کو رک جانا پڑا۔ اس لیے کہ بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

"میرے محترم! آپ اسی طرح بولتے رہیں گے یا مجھے بھی کچھ کہنے اور مجھے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا کچھ موقع دیں گے۔"

اورنگ زیب خاموش ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا کہو' تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جواب میں بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

"میرے محترم! میرے عزیز' میرے انمول ساتھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا تعلق بے

ضمیر گروہ کے انسانوں سے نہیں ہے۔ میں ایسے لوگوں سے جو معاشرے کے اندھیرے کا شکار ہوتے ہیں نہ ہی میں تاریکی کے لبادے میں کوئی ابلیس درندہ انسان ہوں' نہ خناس کے وسوسے میرے دل کو پامال کر کے مجھ پر المناک گھٹن طاری کر سکتے ہیں۔ نہ کوئی میرے ارادوں کو ریزہ ریزہ میرے فیصلوں کو لخت لخت کر کے مجھے زوال و فنا کا شکار کر سکتا ہے۔ آپ کا ساتھ دیتے ہوئے اگر میرے سامنے کسی ساگر کی گہرائی' آگ کی لپیٹیں' کشمیر کی آغوش' خاردار وں کے تاکستان' وسوسیات اور بدگمانیوں کے کوہسار بھی آ جائیں تب بھی قسم اللہ پاک کی' میں کسی بھی صورت آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔"

یہاں تک کہتے کہتے بہادر خان کو رک جانا پڑا۔ اس لیے کہ بڑے فخر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اورنگ زیب کہنے لگا۔

"میں اورنگ زیب تیری سرفروشوں کی سی سرفرازی سے تیرے کاموں کی درشندگی' قوت و عظمت کی پرشکوہ علامت' عظمت و استقامت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میں پہلے ہی جانتا تھا تو آزادی و خودمختاری کے پرشکوہ' باوقار صداقتوں کا رازداں بن کر میرے ساتھ رہے گا۔"

اورنگ زیب کو ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ اس لیے کہ بہادر خان بولا اور کہنے لگا۔

"میرے محترم جہاں تک جسونت سنگھ اور رتن مالا کا تعلق ہے تو جسونت سنگھ میرا اسسر ہے۔ رتن مالا میری بیوی ضرور ہے۔ اگر دونوں باپ' بیٹی نے مجھے اور آپ کو میزان کے دو علیحدہ علیحدہ پلڑوں میں رکھ کر آزمانا چاہا' ہماری ہمت و جواں مردی کا اندازہ لگانا چاہا تو قسم خداوند قدوس کی میں انہیں بے وقعت مٹی اور بے کار غبار کی طرح اڑا کے رکھ دوں گا۔

ان کے ساتھ میرا تعلق اور کوئی واسطہ نہیں رہیں گے۔ اگر جسونت سنگھ اور رتن مالا اس طرح کے پیغام میری طرف بھجواتے رہے تو یقیناً وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔" بہادر خان مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اذان سنائی دی۔ اس طرح دونوں نماز کے لیے خیمہ سے نکل گئے تھے۔

☆☆

جسونت سنگھ اور اس کی پتنی سرسوتی' بہادر خان کے معاملہ میں بڑی تیزی اور بڑی سرعت سے کام لے رہے تھے۔ دراصل شاہ جہان اور دارالشکوہ نے جسونت سنگھ کے ذمے یہ کام لگوا دیا تھا کہ وہ پہلے مارواڑ جائے۔ مارواڑ میں جو ہندوؤں کا ایک جرار لشکر تھا اسے اپنے ساتھ لے اور اورنگ زیب کے مقابلہ کے لیے نکل کھڑا ہو' ساتھ ہی بنگال کے سابق حاکم قاسم کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا' تاکہ جسونت سنگھ کے ساتھ مل کر وہ اورنگ زیب کو شکست دے اور اسے مطیع اور فرماں بردار بنانے کی کوشش کرے۔ ان حالات میں جسونت سنگھ چاہتا تھا کہ مارواڑ کی طرف جانے وہاں سے اپنا لشکر لے کر دکن کو روانہ ہونے سے پہلے تیزی سے کام لیتے ہوئے بہادر خان کو اورنگ زیب سے علیحدہ کر لے۔ جسونت سنگھ ایسا کام دو وجوہات کی بنا پر کام کر رہا تھا۔

پہلی یہ کہ شاہ جہان نے اور دارالشکوہ نے اس کے ذمے یہ کام لگا دیا تھا کہ وہ اورنگ زیب اور بہادر خان سے ٹکرانے کے لیے کوچ کرے۔ ایسی صورت میں جسونت چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو دارالشکوہ اور شاہ جہاں کے احکامات کی تفصیل کرے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ اورنگ زیب کے مقابلے میں جانے سے پہلے وہ اورنگ زیب سے اگر بہادر خان کو علیحدگی کر دے تو پھر اورنگ زیب سے نمٹنا اس کے لیے آسان اور سہل ہو جائے گا لیکن یہ سارے جسونت سنگھ کے تخمینے تھے۔

بہرحال وہ سارے کام کو بڑی تیزی سے نمٹانا چاہتا تھا اورنگ زیب اور بہادر خان نے ابھی تک دکن میں ہی قیام کیا ہوا تھا کہ اورنگ زیب کہ وہ مخبر و طلایہ گرجوں جو دکن سے آگاہ کے درمیان بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے اورنگ زیب تک آگرہ کے تبدیل ہونے والے حالات سے اسے

آگاہ کررہے تھے۔ انہی مخبروں اور طلایہ گروں میں سے ایک اس وقت بہادر خان کے خیمے میں داخل ہوا۔ بہادر خان عصر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے خیمہ میں داخل ہوا تھا۔ بہادر خان نے اسے اپنے قریب بیٹھایا۔ پھر ہلکا سا تبسم اپنے چہرے پر بکھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"لگتا ہے تم میرے لیے پھر کوئی نئی خبر لے کر آئے ہو۔"

آنے والا طلایہ گر کسی قدر سنجیدگی اور اداسی میں بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"امیر! آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں خبر اچھی نہیں لے کر آیا۔"

بہادر خان مسکرایا اور کہنے لگا۔

"میرے عزیز! خبر اچھی ہو یا بری، میں ہر صورت میں اسے سننے کے لیے تیار ہوں۔ پوری تفصیل کے ساتھ بتاؤ، معاملہ کیا ہے۔ کچھ چیز چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔"

اس پر مخبر بولا اور کہنے لگا۔ "آپ کی طرف جسونت سنگھ اور اس کی بیٹی یعنی آپ کی بیوی رتن مالا نے پیغام بھیجا ہے کہ ان کی طرف اسے آپ کے لیے یہ پیغام ہے کہ اگر آپ اورنگ زیب سے علیحدہ نہ ہوئے تو پھر جسونت سنگھ اور اس کی بیٹی رتن مالا آپ سے طلاق، مطالبہ کردیں گے۔ یہ ان کا آخری فیصلہ ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ میری موجودگی میں آپ کی بیوی نے اس صورت میں طلاق کا مطالبہ کیا ہے کہ اگر اورنگ زیب سے علیحدہ نہ ہوئے تو آپ کے ساتھ کوئی رشتہ نہ رہے گا۔"

یہ الفاظ سن کر بہادر خان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔

"میرے عزیز! میں ایسے رشتے داروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جو کسی کے وقار کا دفاع کرتے ہوئے یک طرفہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے ہی۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے میں ایسے لفظوں کے اضطراب کا شکار نہیں ہونے والا، فریب اور نفرت کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں۔ تحریک کا باعث بنتے زباں کے تیروں سے خوف زدہ نہیں ہوتا، نہ ہی میں کسی کی خاطر خوابوں کی دھول لالہ رجوں کی محفلوں، ادھورے خوابوں کے پیچھے بھاگنے والا ہوں۔ شکست خوردہ غم کو نزدیک نہیں آنے دیتا، میں محترم اورنگ زیب کا ساتھ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر نہیں دے رہا اورنگ زیب سے میری ایک ارادتمندی اور عقیدت ہے۔ اس عقیدت کو کسی نے درد کے فاصلوں، نامرادیوں کی دھند کی الم نصیب سائے میں تبدیل کرنا چاہا تو پھر میں بہادر خان ایسے لوگوں کے نفس میں قضا کی امر پل نظر نظر میں سلگتے سائے دکھ کی کسک بھر کے رکھ دوں گا۔ ایسے لوگوں کا زندہ رہنا اور جینا حرام بنا کے رکھ دوں گا۔"

"میرے عزیز جو تو پیغام لے کر آیا ہے میرے لیے یہ بڑا افسوس ناک شکست کی طاری کرنے والا ہے، لیکن کوئی بات نہیں تو کل یہاں سے آگرہ کی طرف روانہ ہوجانا آج مغرب کی نماز کے بعد کھانا میرے ساتھ کھانا، میں تمہیں رتن مالا کے لیے طلاق لکھ کر دے دوں گا وہ طلاق نامہ تم جا کے رتن مالا کے باپ راجہ جسونت سنگھ کے حوالے کردینا جو بات میرے اورنگ زیب کی طرف جانے کے لیے رکاوٹ بنتی ہے اسے میں صاف کر کے رکھ دوں گا۔"

چنانچہ اس مخبر نے مغرب کی نماز کے بعد کھانا بہادر خان کے ساتھ کھایا اتنی دیر تک رتن مالا کے نام طلاق لکھ کر بہادر خان اس پر دستخط کر چکا تھا پھر وہ طلاق نامہ اس نے اس مخبر کے حوالے کردیا تھا۔ اگلے روز وہ مخبر دکن سے آگرہ کوچ کر گیا تھا اس ساری صورت حال سے بہادر خان نے اورنگ زیب کو آگاہ کردیا تھا۔

مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ ایک روز اپنی پتنی سرس وتی، بیٹی رتن مالا دونوں بیٹوں ودیہ ناتھ اور کوس راج کے ساتھ بیٹھا کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ وہ مخبر جو بہادر خان کی طرف گیا تھا دیوان خانہ کے دروازے

پر نمودار ہوا اسے دیکھتے ہی اس کی آمد پر سب خوشی اظہار کرنے لگے تھے۔ جسونت نے اسے اندر بلایا اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میرے عزیز بیٹے! جو پیغام ہم نے بہادر خان کی طرف بھجوایا تھا تو کیا جواب لایا ہے۔"

وہ مخبر فوراً حرکت میں آیا اپنے لباس کے اندر سے اس نے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا اور وہ کاغذ اس نے جسونت سنگھ کو تھماتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"جو پیغام آپ نے مجھے دے کر بہادر خان کی طرف بھجوایا تھا اس پیغام کا جواب اس کاغذ پر لکھا ہوا۔"

جسونت سنگھ نے وہ کاغذ لے کر پڑھا۔ اس کا رنگ پیلا ہوگیا تھا ہاتھ کانپنے لگے تھے اس پر ایک طرح سے کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی اپنے باپ کی یہ حالت دیکھتے ہوئے رتن مالا فوراً اس کی طرف لپکی اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا جوں ہی اس نے کاغذ پڑھا، ایک دم چکرائی اور فرش پر گر گئی تھی۔

یہ صورت حال کوس راج ودیہ ناتھ سرس وتی کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی اتنی دیر تک انہوں نے وہ کاغذ اٹھایا تینوں نے دیکھا وہ رتن بالا کا طلاق نامہ تھا سرس وتی جس نشست سے اٹھی تھی سر پکڑ کر اسی نشست ہو بیٹھی تھی ودیہ ناتھ بھاگا بھاگا باہر گیا ایک برتن میں پانی لے کر آیا پانی کے چھینٹے اس نے رتن مالا کے منہ پر دیے رتن مالا اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ دھاڑیں مار کر رو دی رہی سرس وتی اس کے قریب نشست پر ہو بیٹھی تھی، کچھ دیر ایسا ہی سماں رہا سرس وتی رتن مالا کو سنبھالتی رہی ڈھارس دیتی رہی رتن مالا کچھ دیر تک روتی رہی یہاں تک کہ سنبھلی اور اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اب مجھے کیا ڈھارس اور تسلی دیتی ہیں آپ اور پتا جی نے ایک منصوبہ بندی کے تحت میری زندگی خراب اور حرام کردی ہے آپ لوگوں نے مجھے یہاں بلا کر اس منصوبہ پر عمل کیا جو میرے لیے تباہی کا باعث بنی اگر آپ لوگ مجھے میرے شوہر کے پاس رہنے دیتے تو آپ کا کیا بگڑتا آپ لوگوں نے ان کی طرف پیغام بھیجنے شروع کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ طلاق نامہ بھیج دیا ہے اب گویا میرا میرے شوہر کے ساتھ کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہا اور یہ ایسا حادثہ ہے جو میرے ذہن میرے دل پر ایک کاری ضرب ہے یقیناً میرے لیے ناقابل برداشت ہوگی اور ضرور میری زندگی کا خاتمہ کر کے رہے گی۔"

اس موقع پر رتن مالا کی ماتا حرکت میں آئی اپنی جگہ سے اٹھی رتن مالا کے مزید قریب ہو بیٹھی رتن مالا کو اپنے ساتھ لپٹا کر اسے تسلی اور ڈھارس دینے لگی تھی۔

☆☆

راجہ جے سنگھ کے ہاتھوں شکست اٹھانے کے بعد جب دارالشکوہ کا بھائی شجاع واپس بنگال کی طرف بھاگ گیا تو دارالشکوہ بڑی خوشی اور متانیت کا اظہار کیا اس نے یہ اندازہ لگالیا کہ اگر وہ شاہ شجاع کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا ہے تو آنے والے دور میں وہ اورنگ زیب کے علاوہ اپنے بھائی مراد کو بھی مار بھگانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ دوسری طرف اورنگ زیب بھی بڑا محتاط تھا اس نے دو اقدام فوراً طور پر کیے پہلا یہ اس نے بے جاپور گول کنڈہ کے بارے میں اپنی پالیسی میں خاصی تبدیلی پیدا کرلی ان سے نہ صرف شفقت میز سلوک شروع کردیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ تخت نشیں ہوتے ہی انہیں انعام اکرام سے نوازے گا۔

دوسرا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ جنوبی ہند میں مرہٹوں کا سردار شیواہ جی بڑی طاقت وقوت پکڑ چکا تھا اور اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے لوٹ مار کا بازار گرم کرنا شروع کردیا تھا۔ ان حالات میں اورنگ زیب نہ بے جاپور اور گول کنڈہ سے بگاڑ چاہتا تھا نہ شیواہ جی کے خلاف صف آرا ہونا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ دور اس کے لیے بڑا نازک تھا۔ دارالشکوہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر چکا تھا چنانچہ شیواہ جی کے خلاف اورنگ

زیب نے یہ قدم اٹھایا کہ اس نے بے جا پور سے شیواہ جی کو ایک اعلیٰ عہدہ دینے کا سفارش کی اس کے ساتھ ہی دکن میں شیوہ جی کے لیے کچھ جاگر میں عنایت کی۔

چنانچہ شیوہ جی بے جاپور اور گول کنڈہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اورنگ زیب نے فروری 1658ء میں اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور برحان پور پہنچا وہاں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد اس نے اور بہادر خان نے اپنی عسکری حالت کو آخری شکل دی اس کے بعد انہوں نے آگرہ کی طرف بڑھنا شروع کیا تھا۔

جس وقت اورنگ زیب آگرہ کی طرف بڑھ رہا تھا اس وقت اس کا بھائی مراد بخش ایک خاصے بڑے لشکر کے ساتھ دیپال پور کے قریب پڑاؤ کئے ہ واتھا مراد بخش اپنے لیے بہتری اور سودمندی اس میں سمجھا کہ وہ اورنگ زیب کے ساتھ مل جائے وہ جانتا تھا اورنگ زیب کی بڑی طاقت اور قوت تھی اس کو یہ بھی خبر تھی کہ لوگ اورنگ زیب کو کسی حد تک پسند کرتے ہیں اس بنا پر وہ اپنا لشکر لے کر اورنگ زیب سے جاملا تھا۔

اورنگ زیب کا مقابلہ کرنے کے لیے دارالشکوہ نے دو لشکر تیار کیے اس نے راجہ جسونت سنگھ کو مارواڑ کی طرف بھیج دیا اس کے لیے یہ حکم جاری کیا وہ مارواڑ سے ہندوؤں کا ایک جرار لشکر لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھے آگرہ سے ایک لشکر اس نے بنگال کے سابق حاکم قاسم کی کمان داری دیتے ہوئے اورنگ زیب پر ضرب لگانے کے لیے روانہ کیا اس طرح راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان اپنے اپنے لشکر کے ساتھ دیپال پور سے چند میل دور ہی آپس میں مل گئے اور متحدہ لشکر کو لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھے تھے۔

اورنگ زیب کو جب خبر ہوئی کہ جسونت سنگھ اور قاسم خان ایک بہت بڑا لشکر لے کر اس پر ضرب لگانے کے لیے اس کی طرف بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ کوچ کر رہے ہیں اس نے تیز رفتار قاصد مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کی طرف بھجوائے اور اسے کہلوانے بھیجا کہ وہ راجپوتوں لشکر کو لے کر واپس ہو جائے کیونکہ اورنگ زیب اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے آگرہ جا رہا ہے۔

راجہ جسونت سنگھ کو اپنے طاقت اور قوت پر بڑا گھمنڈ اور بھروسہ تھا اس لیے اس کے پاس جو راجپوتوں کا لشکر تھا اسے وہ ناقابل تسخیر خیال کرتا تھا اور پھر ایسا ہی ایک لشکر لے کر قاسم خان بھی اس سے آملا تھا اس بنا پر دونوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ وہ بڑے آسانی کے ساتھ اورنگ زیب کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

چنانچہ جس وقت اورنگ زیب نے راجہ جسونت سنگھ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے لشکر کو لے کر ہٹ جائے اس لیے کہ وہ اپنے باپ کی طرف جانا چاہتا ہے تو راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اورنگ زیب سے ٹکرانے کے لیے اس نے اپنی پیش قدمی تیز کر دی تھی۔

آخر دونوں لشکروں نیا یک دوسرے کے سامنے پڑاؤ قائم کر لیا جس روز دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ کر گئے تھی اسی روز مغرب کی نماز کے بعد اورنگ زیب اور بہادر خان نے لشکر کے ایک حصے کو چوکس اور چوکنا کر دیا تھا تاکہ دھوکہ دہی سے کام لے کر راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان ان کے لشکر پر شب خون نہ ماریں پھر اورنگ زیب اور بہادر خان اپنے چند چھوٹے سالاروں کے ساتھ ایک خیمہ میں جمع ہو گئے اس موقع پر اورنگ زیب نے سب کا جائزہ لیا پھر وہ بہادر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بہادر خان دشمن ہمارے سامنے پڑاؤ کر گیا ہے جہاں تک میں نے راجہ جسونت سنگھ اور قاسم کان کے لشکر کا اندازہ لگایا ہے وہ ہمارے لشکر سے کسی بھی صورت دوگنا سے کم نہیں ہے۔“

یہاں تک کہتے کہتے تو اورنگ زیب کو روک

جانا پڑا اس دوران چھاتی تان ہوئے بہادر خان بول اٹھا۔

”امیر دشمن کا لشکر ہم سے دوگنا ہے تو کیا ہوا ہم اسے شکست بھی دوگناہ بہترین دیں گے۔ خداوند قدوس کو منظور ہوا تو فتح اور کامیابی اور فوج مند ہماری ہی جولی میں آئے گی۔“

بہادر خان کے ان الفاظ کے جواب میں چند لمحوں تک اورنگ زیب نے مسکراہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

”بہادر خان دارالشکوہ کے دونوں بڑے سالاروں کے ساتھ تمہارے تعلقات رہتے ہیں جسونت سنگھ تمہارا اسیر رہا ہے اور قاسم خان کو تم اپنا چچا قاسم خان تمہیں اپنا بھتیجا خیال کرتا رہا ہے۔“

اورنگ زیب کو ایک بار رک جانا پڑا اس لیے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بہادر خان بول اٹھا تھا۔

”آپ کا کہنا درست ہے، لیکن جہاں تک جسونت سنگھ کا تعلق ہے وہ کبھی میرا اسیر ضرور تھا لیکن اب اس کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہیں اگر اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ باقی بچا ہے تو وہ عداوت اور دشمن کا رشتہ ہے اور اسی دشمنی کو نبانے کے لیے وہ ہمارے مقابل آ گیا ہے۔

جہاں تک قاسم خان کا تعلق ہے اس سے میرا کوئی نصبی تعلق نہیں ہے اس کی مہربانی وہ مجھے اپنا بھتیجا کہتا رہا ہے، میں اسے اپنا چچا خیال کرتا رہا ہوں، لیکن جب ایک دوسرے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تو پھر اس طرح کا عارضی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ قاسم کان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے وہ دشمن ہے لشکر لے کر ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے آیا ہے لہٰذا ہم اس کا مقابلہ خوب کریں گے۔“

اس موقع پر اورنگ زیب نے ایک بار توصیفی انداز میں بہادر خان کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

”بہادر خان میں یہ معاملہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم ان دونوں میں سے کس کا سامنا کرنا پسند کرو گے۔“

انتخاب

میں نے پہاڑوں کو آتش فشاں کے روپ میں پھٹتے دیکھا، میں نے پھولوں کو بکھرتے، مرجھاتے دیکھا، میں نے ارمانوں کو کچلتے دیکھا، جس نے انسان کو انسان سے لڑتے دیکھا، جس نے دلوں کو ٹوٹتے اور تمناؤں کو مرتے دیکھا، میں نے ہنستے اور مسکراتے لوگوں کو دیکھا پھر میں نے روتے اور اُداس لوگوں کو دیکھا، پھر میں نے سوچا! دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ٹوٹی نہ ہو، بکھری نہ ہو، پھر قسمت سے کیا گلہ، زندگی سے کیا شکایت! میں نے اس بری دنیا کے بارے میں اپنے چھوٹے سے دل میں سوچا کہ ”زندگی کیا ہے۔ ٹوٹتے، بکھرتے اور ہر وقت مرمر کے جینے اور رونے کا نام یا آگے بڑھنے کا، کامیاب ہونے کا، ترقی پانے کا، ہنستے رہنے کا نام یہی تو ہے زندگی ہاں! یہی تو زندگی ہے۔

☆

☆میں نے اللہ تعالیٰ سے طاقت مانگی تاکہ کارنامے انجام دے سکوں۔ اس نے مجھے کمزوری عطا کی تاکہ فرمانبرداری سیکھ سکوں۔

☆میں نے دولت مانگی تاکہ خوشی میسر ہو۔ اس نے غربت دی تاکہ غریبوں کا دکھ درد سمجھ سکوں۔

☆میں نے سب چیزیں مانگیں تاکہ زندگی کا لطف اُٹھا سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا کی تاکہ سب چیزوں کو حاصل کر سکوں۔ جو چیزیں مانگیں وہ نہ ملیں لیکن وہ سب چیزیں مل گئیں جو ان سے بہتر ہیں۔ میں کتنا بڑا خوش نصیب ہوں۔

سست رفتار

بیوی (شوہر سے) ”اگر یہ کلاک چند منٹ پہلے گرتا تو اماں جان کا سر پھٹ جاتا!“

شوہر..... ”میں تو پہلے ہی کہتا تھا یہ کم بخت بہت سست ہے۔!“

جواب میں کچھ دیر تک گردن جھکائے بہادر خان سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔

"جسونت سنگھ کے تحت کام کرنے والے سارے ہندوؤں راجپوت ہیں اور یہ مرہٹوں کی طرح اپنے آپ کو ناقابل تسخیر خیال کرتے ہیں آج ہم نے یہ دیکھنا ہے یہ ہمارے سامنے کتنی دیر تک کتنی دنوں تک ناقابل تسخیر رہتے ہیں۔ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان یقیناً اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے اور دونوں علیحدہ علیحدہ لشکر لے کر آئے ہیں۔ مار وارڈ کا راجہ مارواڑ سے راجپوتوں کا لشکر لے کر آیا ہے۔ قاسم خان اپنے حصہ کا لشکر آگرہ سے لے کر آیا ہے لہٰذا دونوں علیحدہ علیحدہ رہتے ہوئے ہم پر ضرب لگائیں گے۔

جواب میں ہم بھی اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے میرے حوالے جسونت سنگھ کو کر دیں اس کے تحت لڑنے والے راجپوتوں پر میں آج انکشاف کروں گا کہ نہ وہ ناقابل تسخیر ہیں نہ ہی تیغ زنی کے فن میں وہ بے مثال بے عدیل ہیں۔ خداوند قدوس کو منظور ہوا تو راجہ جسونت سنگھ اور اس کے لشکر پر ایسی ضرب لگاؤں گا کہ ان راجپوتوں کے سامنے شکست قبول کر کے میدان جنگ سے بھاگنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔"

بہادر خان کی اس گفتگو سے اورنگ زیب اور دوسرے سارے سالار خوش ہو گئے تھے کچھ دیر تک بڑی رازداری کے ساتھ دشمن سے ٹکرانے اس کا حملہ روکنے جوابی کارروائی کرنے پر گفتگو ہوتی رہی اس کے بعد اورنگ زیب کے کہنے پر ایک چھوٹا سالار گیا اور اورنگ زیب کے بھائی مراد بخش کو بلا کر لے آیا۔

مراد بخش اورنگ زیب کے قریب آ کے بیٹھ گیا پھر اس سے پہلے اورنگ زیب کا خیمہ میں اورنگ زیب بہادر خان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل مراد بخش سے کہہ دی گئی ساتھ ہی مراد بخش کو مخاطب کر کے اورنگ زیب کہنے لگا۔

"مراد بخش جس قدر لشکر میرے اور بہادر خان کے پاس ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں تمہاری کمانداری میں جو لشکر ہے وہ تیسرا حصہ ہوگا' میں چاہتا ہوں تم جنگ کے شروع میں صف بندی میں حصہ نہ لو اپنے لشکر کو پیچھے رکھو پہلے میں اور بہادر خان راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خان سے ٹکرائے گے جب تم دیکھو کہ یہ ٹکراؤ خوب گرم ہو گیا ہے تو تم اپنے حصہ کے لشکر کے ساتھ ایک طرف سے نکل کر راجہ جسونت سنگھ کے ایک پہلو پر حملہ آور ہونا۔"

اس موقع پر بہادر خان حرکت میں آیا اور فوراً اورنگ زیب کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"امیر میرے ساتھ اتنی زیادتی نہ کریں میں صرف اپنے حصہ کے لشکر کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ آور ہو کر ان پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ناقابل تسخیر نہیں ہیں اور میں انہیں بدترین شکست دینے کی ہمت رکھتا ہوں میری آپ سے گزارش ہے چونکہ محترم مراد بخش لشکر کے پچھلے حصے سے اچانک نمودار ہو کر قاسم خان کے لشکر کے ایک پہلو پر حملہ آور ہو جائے اگر ایسا ہو تو قاسم خان اس وقت آپ سے ٹکرا رہا ہوگا اس کے لشکر میں اس طرح کھلبلی مچ جائے گی بدنظمی کا شکار ہو جائے گا تو پھر وہ پسپا ہو جائے گا اس کی پسپائی دیکھتے ہوئے راجپوت بھی بدنظمی کا شکار ہوں گے ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنے حملوں میں تیزی پیدا کروں گا اور ہر صورت میں راجپوتوں کو اپنے سامنے بھیڑ بکریوں کے گلہ کی طرح ہانک کر رکھ دوں گا۔"

اورنگ زیب اور مراد بخش دونوں نے اس سے اتفاق کیا پھر اورنگ زیب کے کہنے پر سب اٹھ کر اپنے خیموں کی طرف چلے گئے تھے۔

باقی واقعات کے لیے
آئندہ ماہ کا شمارہ
ملاحظہ کریں۔

معروف دہشت نگار آرمیک ایمن کا بہترین ناولٹ

شیاطین

احمد صغیر صدیقی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

بارش میں بھیگتے ہوئے اس نے عجلت سے پارکنگ لاٹ پار کی اور ماربری ہسپتال کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کی دائیں بغل تلے گہرے بھورے رنگ کے تھیلے میں ایک عفریت کی زندگی کی تاریخ دبی ہوئی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنے رین کوٹ کو جھاڑا اور چکنے سبز فرش پر پانی کی بوندیں گراتا ہوا وہ مرکزی اطلاعی میز پر بیٹھی ہوئی نرس کے پاس پہنچا۔ وہ مسز کرٹس کو پہچانتا تھا۔ اس نے نرس کو سلام کیا۔ نرس نے صبح بخیر کہتے ہوئے اس کا نیم ٹیگ نکالنے کے لیے دراز کھولی۔

"آج کا دن بھیگا ہوا ہے۔" نرس نے تبصرہ کیا اور اپنی ناک کی پھنگی پر ٹکی ٹھیک سے پیچھے سے وہ اسے رجسٹر پر دستخط کرتا دیکھتی رہی۔ پھر وہ بولی۔

جیک کے کانوں میں وہ آوازیں برابر آ رہی تھیں جو ہسپتال کے معمولات میں تھیں۔ ان میں انٹرکام سگنلوں کی آوازیں بھی تھیں۔ لوگوں کی کھسر پھسر اور لابی میں بیٹھنے والوں کی گفتگو بھی شامل تھیں نرسوں کی چاپیں مختلف اشیاء کی کھنکھناہٹیں لفٹ کی آوازیں۔ کسی ایمبولینس کی سائرن کی گونج ہسپتال کے مغربی دروازے پر ابھر رہی تھی۔

"موسم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آج کئی ڈاکٹر رقم کے حصول کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔"

اس نے کہا ہاں اور کاغذ پر ٹپک جانے والی ایک بوند کو جلدی سے صاف کرتے ہوئے اس نے اپنا نام لکھا۔ ڈاکٹر جیک شان...... پھر اس نے تاریخ اور وقت کا اندراج کیا...... اکتوبر سولہ۔ وقت دس بج کر ستاون منٹ۔ پھر اس نے منزل کے خانے میں آٹھ کا ہندسہ لکھا۔ فہرست کے دوسرے ناموں پر نگاہ ڈالی اور نوٹ کیا کہ اس میں سرکاری وکیل مسٹر فاسٹر کا نام موجود نہیں ہے۔ وہ ابھی ہسپتال نہیں پہنچا تھا۔ اس نے سوچا...... ادھر لابی میں رک کر انتظار کروں یا اکیلا ہی اوپر چلا جاؤں...... پھر اس نے طے کیا کہ وہ ادھر رک کر اس کا انتظار کرے گا۔ جلدی کی ضرورت نہ تھی۔ آج تو کیس لوڈ بہت ہوگا' مسز کرٹس نے کہا۔ اس کی آواز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ غالباً ہسپتال کا سارا عملہ واقف تھا اور مسز کرٹس تو اطلاع کی میز پر تھی۔ پچھلے چھ برسوں سے جیک جب سے یہاں آ رہا تھا اس نے اسے اسی جگہ پایا تھا۔ پھر اخباروں میں بھی اس کیس کی خبریں چھپ چکی تھیں۔ یہی حال ٹی وی اور ریڈیو کا تھا۔

"نہیں۔" جیک نے کہا۔ "کسی سے ملنا ہے۔"

"اچھا۔" نرس نے کہا وہ منتظر تھی کہ جیک کچھ اور بولے مگر بہ ظاہر اس نے کھڑکی سے باہر کی بارش دیکھنا شروع کر دیا۔ آسمان سرمئی تھا۔ بارش بھی سرمئی تھی اور اس جنگل کا رنگ بھی سرمئی ہو رہا تھا جس نے ہسپتال کو حلقے میں لے رکھا تھا۔ برمنگھم کا شہر یہاں سے کوئی چار میل دوری پر مغرب میں تھا۔ یہ خزاں کے بدترین دن تھے۔ فضا میں نمی کا تناسب بہت بڑھا ہوا تھا۔ ابھی صرف تین دن پہلے ہوائیں خاصی ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور ہسپتال کے ایئر کنڈیشن بند کر دیے گئے تھے۔ یہ ابھی تک بند تھے اور دیواروں کے اندر حبس اٹھ رہی تھی۔ یہ عمارت خاصی پرانی تھی اور سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی راہداریاں بھیگی بھیگی سی ہو رہی تھیں وہاں' مسز کرٹس نے بالآخر اپنی عینک ناک پر اوپر سرکاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر...... تمہیں یقیناً پریشانی ہو رہی ہے۔"

جیک نے جواب نہیں دیا۔ دراصل اسے خود اپنی پریشانی کا درست علم نہ تھا۔ اس نے نرس کو چھوڑا اور لابی میں چلا گیا۔ اس نے وہاں پڑا ایک اخبار اٹھایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا جو کھڑکی کے رخ پر پڑی تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار دیا اور انتظار کے لمحات گزارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ سرکاری وکیل کے بغیر اوپر کی آٹھویں منزل نہیں جانا چاہتا تھا۔

اخبار کے پہلے ہی صفحے پر اسے کلازن ہاؤس کی تصویر نظر آ گئی' خبر بھی تھی حیران کن تہرے قتل کی واردات میں کمسن لڑکا گرفتار...... جیک نے کھڑکی کے شیشے میں ٹکراتی بارش کی آوازوں کو سنتے ہوئے تصویر پر نظر ڈالی یہ ایک سفید رنگ کی پورچ والا نواحی علاقے کا مکان تھا۔ جو تین عدد زیتون کی اونچائی پر بنا ہوا تھا۔ اس کا صحن صاف ستھرا تھا اور ایک طرف ایک گیراج بھی تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ قصبے میں ایسے اور بھی مکانات تھے۔ البتہ یہ ایک ایسا مکان ضرور تھا جس میں دعوتیں اور ضیافتیں ہوتی تھیں جن کے کچن بڑے ہوتے ہیں جہاں آرام سے پیر پھیلا کر ٹی وی دیکھا جا سکتا ہے جہاں آس پاس کے لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔ اس میں سب کچھ عام سا تھا سوائے اس کے اس کی ہر کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

ویسے تو یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ لوگ چوروں سے حفاظت کے لیے سلاخیں لگواتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ کچھ مختلف تھا۔ یہ سلاخیں خاص قسم کی تھیں یہ کھڑکیوں کے باہر نہیں بلکہ اندر لگی تھیں۔ جیسے اندر کے کسی آدمی کو باہر جانے سے روکنا مقصود ہو۔ بس اس کے سوا یہ مکان نہ اچھا تھا نہ برا۔

اخبار کے اندرونی صفحات پر تفصیلات تھیں اور مقتولین کی تصاویر بھی تھیں۔ مسٹر اور مسز کلازن کی تصویر ان کی شادی کی تھی۔ ایک چوتھے گریڈ کی کمسن طالبہ کی تصویر تھی۔ اس میں مکان میں قتل کے

بعد کی اندرونی تصاویر نہیں تھی اور یہ اچھی بات تھی۔ یہ ایسی بری تھیں کہ چیر پھاڑ کے عادی ڈاکٹر جیک کو بھی لرزا سکتی تھیں۔

اس نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ تفصیلات جیک کے تھیلے میں تھیں۔ باقی باتیں جو جیک کو معلوم کرنا تھیں وہ اس لڑکے کے دماغ میں تھیں جو اس وقت ہسپتال کی آٹھویں منزل پر تھا۔

جیک کے کانوں میں وہ آوازیں برابر آ رہی تھیں جو ہسپتال کے معمولات میں تھیں۔ ان میں انٹرکام سگنلوں کی آوازیں بھی تھیں۔ لوگوں کی کھسر پھسر اور لابی میں بیٹھنے والوں کی گفتگو بھی شامل تھیں نرسوں کی چاپیں مختلف اشیاء کی کھنکھناہٹیں لفٹ کی آوازیں۔ کسی ایمبولینس کی سائرن کی گونج ہسپتال کے مغربی دروازے پر ابھر رہی تھی۔ ایک وہیل چیئر اس کے پاس سے گزری۔ نرس ایک حاملہ عورت کو لے جا رہی تھی۔ ہسپتال کا میٹرنٹی وارڈ دوسری منزل پر تھا۔ دو سفید پوش وردی والے ڈاکٹر کسی معمر مریض سے کھڑے باتیں کر رہے تھے پھر یہ سب لفٹ میں چلے گئے جیک مسکرایا۔ اس نے سوچا ایک ہسپتال بھی اپنی دنیا ہوتا ہے۔ المیے اور طربیے سب یہاں بھی ہوتے ہیں۔ آٹھویں منزل پر ذہنی مریض رکھے جاتے تھے۔ نچلے حصے میں مردہ خانہ بھی تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر تیرہ منٹ...... فاسٹر کو آنے میں خاصی دیر ہو چکی تھی یہ بات حیرت کی تھی وہ آدمی وقت کا پابند تھا۔

"ڈاکٹر جیک شون۔" آواز سن کر وہ چونکا۔ اس کے پاس ایک لمبے قد اور سرخ بالوں والی عورت کھڑی تھی اس کے کوٹ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بند چھتری تھی۔

"کیا۔" اس نے پوچھا۔

"میرا نام کے ڈوگلس ہے میں سرکاری وکیل مسٹر فاسٹر کے آفس سے آئی ہوں۔"

عورت نے کہا۔ "وہ آج نہیں آ سکیں گی۔"

"اچھا۔"

"ان کے پاس کچھ کام آ گیا ہے۔ ان کی جگہ میں آئی ہوں۔"

جیک نے سر ہلایا۔ دراصل باب فاسٹر نے کچھ سیاسی عزائم بھی تھے وہ اس کیس کے ساتھ جس میں وہ منتھی ہو گیا تھا اور جس کا ہر طرف چرچا تھا وہ کچھ خوش نہ تھا۔ شاید اسی لیے اس نے خود آنے کے بجائے اپنے معاونین میں سے ایک کو بھیج دیا تھا۔

"کوئی ہرج نہیں۔" اس نے کہا۔ "تم نے رجسٹر میں دستخط کر دیے۔"

"ہاں......" چلتے چلتے میں عورت نے کہا۔

لفٹ میں ان کے ساتھ ایک نوجوان جوڑا بھی تھا ایک دبلی سی سیاہ فام لڑکی بھی جو دوسری منزل پر اتر گیا۔ نرس جس وقت چوتھی منزل پر اتری تو جیک نے اپنی ساتھی سے کہا۔

"تم اس سے پہلے بھی ملی ہو۔"

"نہیں تم تو ملے ہو گی۔"

جیک نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ لفٹ اوپر جا رہی تھی اس کے پرانے گیئر بول رہے تھے۔ عورت کی زرد آنکھیں غیروں پر تھیں۔ "شاید فاسٹر اس کیس سے خوش تھیں۔" جیک نے کہا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولا۔

"ایسے کیسوں میں پروسی کیوٹرز کی خاصی پبلسٹی ہو جاتی ہے۔"

"ڈاکٹر شون یہ کوئی عام سا کیس نہیں ہے۔" عورت نے کہا۔ "خدا نہ کرے کہ ایسا کوئی کیس ہو۔"

لفٹ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ آٹھویں منزل آ چکی تھی۔ لفٹ کے دروازے کھلے وہ دونوں ماربری ہسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں ذہنی مریض کٹہروں میں درندوں کی طرح ٹہلتے تھے۔

☆☆

ہائے وڈ کی۔" نقرئی بالوں والی ایک عورت نے نیلا لباس اور ربر کے جوتے پہن رکھے تھے اور بالوں پر ایک بینڈ چڑھا رکھا تھا ان کی طرف لپکی اس کے چہرے پر بہت سی جھریاں تھیں اس نے لبوں پر

سرخ لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔

"تم مجھے دیکھنے آئے ہو نا۔"

"سوری مارگی..... آج میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں۔"

"ارے چھوڑو..... مجھے برج کے لیے ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔" مارگی نے ڈوگلس کو سخت نظروں سے دیکھا۔ "یہ کون ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہاری گرل فرینڈ ہے۔"

"نہیں سر یہ میری دوست ہیں۔" کسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کہا۔

"سر کے بال سرخ ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ جسم میں ہر جگہ کے بال سرخ ہوں گے۔" مارٹی نے ڈوگلس کو دیکھتے ہوئے طنز کیا ڈوگلس کے کان شرم سے سرخ ہو گئے۔

ایک کمزور سا معمر آدمی جس نے صاف ستھرا سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصا مقطع آدمی لگتا تھا۔ ان کی طرف بڑھا اس نے حلق سے کچھ غرغراہٹیں نکالیں۔ مارگی نے اسے جھڑکا۔ "بند کرو یہ حماقت ریٹرن۔"

راہداری متعدد لوگ آ جا رہے تھے کہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے عقب میں لفٹ کا دروازہ نیچے جا رہا تھا اس نے دیکھا اس فلور کی لفٹ میں کوئی بٹن نہیں تھا اسے کی کے ذریعے اوپر بلایا جاتا تھا۔

"اب تم بھی پھنس گئیں۔" مارگی نے اسے کہا۔

"ہم سب کی طرح۔"

"کیا کسی نے تمہیں بتایا کہ ہم سب پریڈ پر جا رہے ہیں۔" ایک بھاری آواز گونجی۔ "ذرا ڈاکٹر شون کو دم تو لینے دو۔" ایک سیاہ فام نرس جس کے کولھے خاصے بھاری تھے جیک اور کے کی طرف بڑھی۔ ریٹر نے اس کی سمت دیکھ کر منہ سے غرغراہٹ نکالی۔

"رونالی۔ ڈوکی مجھے آج دیکھنے آئے ہیں۔" مارگی نے نرس سے کہا۔

"نہیں وہ ہمارے وارڈ کو کسی کو نہیں دیکھیں گے۔" رونالی نے بتایا۔ اس سیاہ فام عورت کی آنکھیں کنجی تھیں۔ "ان کے پاس ایک دوسرا کام ہے۔"

"کون سا کام۔"

"شاید وہ کسی نئے پنچھی کو دیکھیں گے۔" ایک جوان آواز ابھری۔ یہ شخص راہداری کے کنارے پر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر لفٹ کی طرف دیکھا۔ "تم چپ رہو مسٹر چیمبر۔" رونالی نے اسے گھرکا۔

یہ شخص 30 یا 35 سال کا تھا۔ اس کے بدن پر ایک گہرے رنگ کی جیکٹ تھی۔ اس نے قمیض کی آستین چڑھا رکھی تھی۔ اس نے سگریٹ جلائی اور نرس کو گھورا۔

مسٹر چیمبر اچھی صورت کا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر گوشت کم تھا۔ "تمہیں ملاقاتیوں کا خیال کرنا چاہیے۔" نرس نے سرزنش کی۔

"کیا حال ہیں ڈیوی۔" جیک نے ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی۔ "کیا تمہارے سر کا درد بہتر ہے۔"

"اپنی سگریٹ بجھا دو مسٹر چیمبر۔" نرس نے آواز لگائی۔ ڈیوی نے سنی ان سنی کر دی تو نرس اس کی طرف بڑھی۔ "میں کہہ رہی ہوں سگریٹ بجا دو۔"

ڈیوی نے کش لے کر دھواں نتھنوں سے نکالا پھر اس نے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ کے نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"اب ٹھیک ہے۔" ڈیوی نے سگریٹ کو نگلتے ہوئے نرس سے پوچھا۔

نرس نے رکھائی سے اس کو دیکھا۔ "آپ پریشان نہ ہوں یہ دن بھر یہ تماشا کرتا رہتا ہے۔ یہ اسے پہلے ہی جھونکے سے بجھا دیتا ہے۔"

"یہ یہاں کے کر کیا رہا ہے۔"

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔" اس نے وہاں رکھے واٹر کولر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ایک مختصر سی عورت جس کے بال بیا کے گھونسلے کی طرح بنے ہوئے تھے اس کی طرف سائے کی طرح بڑھی۔ کے نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

وہ حال ہی میں کالج سے نکلی تھی ضروری تھا کہ وہ کچھ کارکردگی دکھاتی اسے نوکری میں ابھی دو ماہ ہوئے تھے۔ یہ کام اس کے لیے امتحان جیسا تھا اس سے قبل تین ہفتہ پہلے اسے جو کام ملا تھا اس میں اسے لاش کے بدن میں گولیوں سے بننے والے سوراخوں کو گننا پڑا تھا جو انہیں لوگان جھیل سے ملی تھی۔

"اچھا باقی..... یم یم۔" بیار جیسے گھونسلے بالوں والی عورت نے آواز نکالی کہ ڈوگلس کے حلق میں پانی پھنس گیا۔ وہ زور سے کھانسی۔

"ڈاکٹر کا تھروں پہلے ہی سے موجود ہیں۔" روزالینا نامی نرس نے سفید دروازے کی طرف اشارہ کیا جو ہائی وے کے آخر میں تھا۔ راستے کی دونوں طرف کی دیواریں اور چھت سفید تھیں۔ "وہ پندرہ منٹ سے وہاں ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا لڑکے کو آزاد کر دیا گیا ہے۔" جیک نے پوچھا۔

"میں نہیں سمجھتی تمہارے وکیل کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا' کیا یہ خاتون وکیل ہیں۔"

"ہاں۔"

"میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔ تم ڈاکٹر کا تھرون کو جانتے ہو۔ وہ اندر بیٹھے سوچ رہے ہیں۔"

"ہمیں دیر ہو چکی ہے۔ اندر چلو۔"

مارگی نے اس کی آستین تھام لی۔ "ڈوکی احتیاط سے اندر پہنچا۔ لڑکا بہت خطرناک ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہیں۔ وہ تمہیں مار دے گا۔"

"شکریہ۔" ڈاکٹر جیک نے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ویسے اس کا دماغ ہلنے لگا تھا۔ "نگرانی پر کون ہے۔" اس نے نرس سے پوچھا۔

"گل دروازے پر اور بوبی ڈیوٹی ڈیسک پر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کے کی طرف دیکھا۔ وہ اب اس مختصر سی عورت سے جان چھڑانا چاہتا تھا جسے سب یہاں بلی کہتے تھے۔ وہ بڑھا نرس روزالی اس کے ساتھ تھی۔ کے اس کے پیچھے تھی۔

"میں کہتی ہوں اندر نہ جاؤ۔" ڈیوی اچانک چیخی۔

"وہ پکا سور ہے۔"

"کیا کریں۔ یہ تو میرا پیشہ ہے۔" جیک نے کہا۔

"پیشے کو لات مارو۔ جان ہے تو جہان ہے۔"

جیک چپ رہا۔ وہ نرس کی ڈیسک کے پاس سے گزرا۔ جہاں مسز میری اور مسز اسٹی کی ڈیوٹی تھی۔ دروازہ نزدیک آ چکا تھا۔ اس کے تھیلے میں جو کاغذات اور تصویریں تھیں سب اس کے ذہن میں ابھر آئی تھیں مگر وہ ایک اعلا درجے کا سائکاٹرسٹ تھا۔ اسکے پاگل مجرموں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اسے ان کا تجربہ تھا۔ اسے طے کرنا تھا کہ مقدمے میں پیش ہونے کے لائق ہے اور کون نہیں اس کام میں اسے ناگواری بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ مگر..... یہ معاملہ خاصا مختلف تھا۔ تصویریں حالات وہ سفید مکان اس کی کھڑکیوں میں لگی سلاخیں سب کچھ مختلف تھا اور خاصا پریشان کن بھی۔

دروازے پر لگے بٹن کو اس نے دبایا۔ اندر گھنٹی بجی دروازے پر شیشے والے چوکھٹے سے اس نے گل کو آگے بڑھتے دیکھا۔

گل ایک لمبا چوڑا آدمی تھا۔ اس کے بال کروکٹ اسٹائل کے تھے۔ اس کی آنکھیں بھاری پپوٹوں والی تھیں۔ وہ چہرہ سے ایک بلڈ ہانڈ لگتا تھا۔ اس نے اندر سے جھانکا۔ جیک کو پہچان کر اس نے قفل میں کنجی گھمائی تالا ایسی آواز سے کھلا کہ کے اچھل پڑی۔ نرس نے اسے گھور کر دیکھا۔

دروازہ کھلا۔ "گل سے علیک سلیک ہوئی۔" اس نے کہا۔

"ڈاکٹر ہم تمہارے منتظر تھے۔" دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا گیا۔

"ڈاکٹر کا تھرون کانفرس ہال میں ہیں۔" گارڈ نے بتایا۔

"مس آپ کیسی ہیں۔" گل نے کے سے پوچھا۔

"فائن۔" کے نے عجلت سے کہا اور جیک کے پیچھے ہولی۔ گل ساتھ ہی تھا۔ وہ ایک راہداری میں چلے جس کا فرش چکنا اور سبز تھا۔ اس کے دونوں جانب مقفل دروازوں والے کمرے تھے اوپر ڈے لائٹ روشنیاں لگی تھیں راہداری کے آخر میں ایک اکیلی کھڑکی تھی جو جنگل کی سمت کھلتی تھی مگر اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

یہاں پر ایک میز کے پیچھے ایک جوان اور سیاہ فام شخص بیٹھا تھا جس نے گل کی طرح کی سفید وردی پہن رکھی تھی۔ وہ کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ اس نے کان میں اگر خون لگا رکھا تھا' شاید میوزک سن رہا تھا۔ جیک کو دیکھ کر وہ اٹھ پڑا یہ بوبی تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی سی تھیں اس نے ناک میں ایک سنہری کیل پہن رکھی تھی۔

"ہیلو ڈاکٹر۔" اس نے اخروٹی بالوں والی کے کی طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

"مارننگ بابی۔" جیک نے کہا۔ "کیا صورت ہے۔"

"گاڑی چل رہی ہے۔"

"ملاقات کی تیاری مکمل ہے۔"

"بالکل۔ ڈاکٹر کاتھرون اندر ہیں۔" اس نے اسی بند دروازے کی طرف اشارہ کیا جس پر کانفرنس روم کی تختی لگی تھی۔ "کیا کلازن کو باہر لایا جائے۔"

"ہاں۔" جیک نے کہا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلنے کا اشارہ دیا۔

اندر فرش پر گہرے کلر کا کارپٹ بچھا تھا۔ دیواروں پر پائن کی پینلنگ تھی۔ سلاخوں والی کھڑکیوں پر شیشے دھندلے تھے جن سے روشنی آ رہی تھی۔ چھت پر فلورسنٹ روشنی کا انتظام تھا۔ یہاں ایک اکیلی لمبی سی میز پڑی تھی جس کے ساتھ ایک طرف تین کرسیاں رکھی تھیں اور اس کے سرے پر بھی ایک کرسی موجود تھی۔ ان میں سے ایک پر ایک گنجے سر اور بھوری داڑھی والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے چشمہ پہن رکھا تھا۔ وہ اس وقت کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھ پڑا۔

"ہیلو..... میں سمجھا تھا مسٹر فاسٹر آئیں گے۔"

"یہ کے ڈوگلس ہیں اور یہ ڈاکٹر کاتھرول۔ سائکاٹری سروس کے ہیڈ۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" کے نے کہا۔ پھر اس نے اپنی چھتری ایک کونے میں رکھ دی۔ اس نے اپنا رین کوٹ بھی اتار کر دیوار کی کھونٹی سے ٹانگ دیا۔ اس نے نیچے ایک سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔

"ٹھیک ہے ہم آغاز کرتے ہیں۔" جیک نے میز کے سرے پر ٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے ایسا تھیلا سامنے رکھ لیا اور اسے کھولا۔ "میں نے کلازن کو بلایا ہے۔ وہ کوئی گڑبڑ تو نہیں کر رہا۔"

"نہیں۔" ڈاکٹر کاتھرون نے کہا۔ "جب سے اسے یہاں لایا گیا ہے وہ پرسکون ہے۔ بس حفاظت کے لیے ہم نے اسے باندھا ہوا ہے۔"

"باندھا ہوا ہے۔" کے نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... وہ اسٹریٹ جیکٹ میں ہے..... یہ یہاں کا معمول کا طریقہ ہے کہ مستقل مزاج۔"

"مگر آپ نے تو کہا ہے کہ وہ پرسکون ہے۔ پھر یہ جیکٹ....."

"مس کے۔" جیک نے اپنے تھیلے سے ایک فولڈر نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس معاملے کے بارے میں کتنا معلوم ہے۔ میرا خیال ہے فاسٹر نے تمہیں بتایا ہوگا اور تم نے اخبار وغیرہ بھی دیکھے ہوں گے۔ کیا تم نے پولیس کی لی ہوئی تصویریں دیکھی ہیں۔"

"نہیں..... مسٹر فاسٹر نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ایک فرسٹ ہینڈ رائے چاہتے ہیں۔"

جیک محی سے مسکرایا۔ "فضول بات ہے۔" اس نے کہا۔ "فاسٹر کو معلوم تھا کہ تم کو میں یہ تصاویر دکھاؤں گا۔ ٹھیک ہے میں دکھاتا ہوں۔" اس نے فولڈر کھولا اور کوئی آدھی درجن تصاویر نکال کر سامنے ڈال دیں۔

کے نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر رک گئی۔

وہ تصویر جو اوپر تھی اس میں ایک کمرے کا منظر تھا جس کا سارا فرنیچر ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔

دیوار پر بھورے دھبے تھے خون کے اسپرے جیسے کسی نے خون بھری انگلیوں سے دیوار پر کئی زبانوں میں 'ہیل شیطان' کے الفاظ لکھے تھے۔ یہیں دیوار پر زرد رنگ کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے جو شاید انسانی گوشت تھا۔

اس نے انگلی سے اوپر والی تصویر کھسکائی دوسری تصویر نے جسے اس کے دماغ میں سوراخ کر دیا۔ اس میں ٹوٹے کٹے اعضا کے ڈھیر تھے جس کمرے میں ادھر ادھر پھینکا گیا تھا۔ ایک کٹا ہوا پیر ایک کونے میں۔ ایک کچلا ہوا سر جس کا مغز پھیل گیا تھا۔ ایک طرف کچھ کٹی ہوئی انگلیاں تھیں۔ ایک جانب ایک پھٹا ہوا پیٹ پڑا تھا۔

"میرے خدا۔" کے نے سسکی لی۔

اور پھر کانفرنس روک کا دروازہ کھلا اور وہ لڑکا جس نے اپنی ماں' اپنے باپ اور اپنی دس سالہ بہن کو مار کے لوتھڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا۔

☆☆

کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ٹم کلازن میز کے دوسرے سرے پر پڑی کرسی کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں بائیں گل اور بوبی تھے۔

وہ اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے۔ لڑکے کا جسم اسٹریٹ جیکٹ میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گول شیشوں کا چشمہ تھا۔ اس نے شیشوں کے عقب سے اپنے ملاقاتیوں کو دیکھا اور مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں کوئی شیطنیت شامل نہ تھی۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔

"ہائے۔" اس نے کہا۔

"ہیلو ٹم۔" ڈاکٹر کاتھرون نے اسے مخاطب کیا۔

"ان سے ملو۔ یہ ڈاکٹر جیک شون ہیں اور یہ مس کے ڈوگلس میں یہ دونوں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"خوشی ہوئی۔" لڑکے نے کہا۔

کے ابھی تک ششدر سی تھی۔ تیسری تصویر تو اس سے دیکھی ہی نہیں گئی تھی۔ وہ لڑکے کو دیکھ کر الجھن میں پڑ گئی تھی اس نے کیس فائل پڑھ رکھی تھی۔ اس کا حلیہ پڑھ چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لڑکا سترہ سال کا ہے۔ وہ اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تصویر کھسکا دی اور ہاتھوں کو آپس میں پھنسا کر بیٹھ گئی۔ یہ ایک دوسرا امتحان تھا۔ اس نے سوچا فاسٹر جاننا چاہتا ہے کہ میں برف کی بنی ہوئی ہوں یا نہیں۔ لعنت ہو۔ تمہارے بال اچھے لگے مجھے لڑکے نے کہا۔ "ان کا اخروٹی رنگ بہت پیارا ہے۔"

"شکریہ۔" کسی طرح کے نے لفظ ادا کیا اور پہلو بدلا۔

لڑکے کی آنکھیں چمکیلی پرچھے جیسی تھیں۔ کے کو اس کی آنکھیں، شعلوں کی طرح لگیں۔ جو زرد رنگ والے چہرے پر جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بال ہلکے بھورے تھے اور چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے اس کے آنکھوں تلے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے جو ہاتھ تھکن سے بنے تھے یا جنون سے۔

جیک بھی لڑکے کا جائزہ لے رہا تھا ٹم اپنے عمر کے اعتبار سے جثے میں کم تھا۔ اس کی سر کی شکل قدرے بھونڈی سی تھی۔ یہ دونوں سمتوں سے کچھ پھولا ہوا سا تھا۔ اس کی گردن آڑی ہوئی سی تھی۔ لڑکے نے دونوں کو دیکھا یہ ایک گہری نظر تھی۔ بغیر پلک جھپکائے۔

"تم لوگ اسے ہمارے ساتھ چھوڑ دو۔" کاتھرون نے دونوں گارڈوں سے کہا۔

وہ باہر چلے گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔

"تم آج کیسا محسوس کر رہے ہو۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

"بالکل آزاد۔"

"میرا مطلب ہے جسمانی طور پر۔ کوئی درد وغیرہ۔"

"نہیں۔"

"اچھا....." اس نے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ تم یہاں کیوں لائے گئے ہو۔"

"ہاں۔"

"بتاؤ۔"

"نہیں..... میں سوالوں کے جواب دے دے کر تنگ آ گیا ہوں۔ اب میں سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

ٹم نے کہا۔ "پوچھوں۔"

ٹم نے کے کی طرف دیکھا۔ "میں ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ پہلے خاتون کے بارے میں..... محترمہ تم کون ہو۔" کے نے کاتھرون کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا جیک نے تصاویر سمیٹ لی تھیں۔ اس کے کان آوازوں پر تھے۔

"تمہیں ڈاکٹر کاتھرون بتا چکے ہیں میرا نام کے ڈوگلس ہے۔ میں سرکاری وکیل ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ٹم نے کہا۔ "مگر میں جاننا چاہتا ہوں تم کون ہو۔ شادہ شدہ ہو یا اکیلی یا مطلقہ۔ بچے ہیں یا نہیں مذہب کیا ہے۔ پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔"

"اچھا۔" کے نے کہا۔ "میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ بچے....." معاً وہ جھجکی یہ ایک احمقانہ بات تھی۔ کیا ضرورت تھی اسے یہ سب بتانے کی۔ لڑکا منتظر تھا۔ اس کی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

"میں کیتھولک ہوں۔" کے نے کہا۔ "مجھے سبز رنگ پسند ہے۔"

"کوئی بوائے فرینڈ بھی ہے۔"

"تم کو نہ جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ۔"

"سوالوں کے جواب دینا آسان نہیں۔" ٹم نے کہا۔ "دیکھا تم نے۔ مگر تم مجھ سے کچھ اسی وقت معلوم کر سکو گی جب تم مجھے جواب دو گی۔ میرا خیال ہے تم تنہا رہتی ہو۔ لوگوں کو ڈیٹ بھی دیتی ہو گی۔" کے بری طرح کھسیانے لگی۔

"ٹم تب..... ٹھیک کہا نا میں نے۔ اب بتاؤ تم اچھی کیتھولک ہو یا بری۔"

"ٹم۔" ڈاکٹر کاتھرون نے مداخلت کی۔ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ "تم صحیح نہیں چل رہے ہو۔ ہم سب جلدی میں ہیں اور اس معاملے کو طے کر دینا چاہتے ہیں۔"

"بتاؤ۔" تم نے کاتھرون کو نظر انداز کر دیا اور ڈاکٹر جیک سے مخاطب ہوا۔

"اب تم بتاؤ تمہاری کہانی کیا ہے۔"

جیک نے تصویروں میں سے ایک کو الگ کیا اس میں وہ دیوار تھی جس پر خون بھری انگلیوں سے تحریر لکھی گئی تھی۔

"میری شادی کو چودہ برس ہو چکے ہیں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میں ایک میتھوڈسٹ ہوں۔ میرا پسندیدہ رنگ نیلا ہے۔ میں ایک باسکٹ بال پلیئر ہوں۔ مجھے چینی کھانے پسند ہیں..... اور کچھ۔" ٹم تذبذب میں چلا گیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تم خدا کو مانتے ہو۔"

"ماننا..... اور تم۔"

"میں..... میں بھی ایک برتر ذات پر ایمان رکھتا ہوں۔ یہ بتاؤ خون کا ذائقہ تمہیں کیسا لگتا ہے۔" جیک نے کوشش کی کہ اپنے چہرے کو سپاٹ بنائے رکھے۔ وہ غیر جذباتی انداز میں بولا۔ "مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔"

"میری برتر ذات کو پسند ہے۔" ٹم نے کہا۔ اس کا بھاری سر گردن پر جھولا۔ "اور میں جاننا چاہتا ہوں مجھ سے سوالات کرنے والے کون ہیں۔ خیر..... چلو تم پوچھو۔"

"ٹم میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اکتوبر بارہ کی رات کو دس سے گیارہ بجے کے درمیان تمہاری ذہنی حالت کیسی تھی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس واقعے کی بات کر رہا ہوں۔"

ٹم چپ رہا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے دھندلے شیشے پر تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ "ہاں یہ وہ وقت تھا جب وہ وارد ہوئے تھے اور انہوں نے میرے گھر کو کچرا خانہ بنا دیا تھا۔"

"تم نے پولیس کے کیپٹن مارکوئس کو جو بیان دیا تھا اس میں کہا تھا وہ تمہارے والدین کے مکان میں آئے تھے اور انہوں نے....." رک کچھ جیک نے تھیلے سے اس کے بیان کی کاپی نکالی اور اسے پڑھتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "بربادی انہوں نے پھیلائی تھی میں انہیں روک نہیں سکا تھا۔ میں روک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ آئے انہوں نے بربادی پھیلائی اور ایک کام کر کے چلے گئے۔ میں نے پولیس کو فون کیا کیونکہ مجھے علم تھا میری چیخیں کسی نے تو سنی ہوں گی۔ یہ تھا تمہارا بیان ٹھیک۔"

"ہاں..... غالباً یہی تھا۔" ٹم مسلسل کھڑکی کے ایک خاص حصے کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"یہ کون تھے۔"

ٹم نے پہلو بدلا۔ کھڑکی پر بارش بوندیں بجیں۔ کے کو اپنے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی محسوس ہوئیں۔

"وہ میرے دوست تھے۔" تم نے کہا۔ "میرے بہترین دوست۔"

"خوب۔" جیک نے سوچا ایک بات تو کھلی اس نے پوچھا۔ "تم ان کے نام بتاؤ گے۔"

"ان کے نام۔" ٹم نے کہا۔ "تم ٹھیک سے سمجھ نہیں سکو گے۔ میرا مطلب ہے اس کے اصلی نام بولنے میں بہت پیچیدہ ہیں۔ البتہ میں نے ان کے نام اپنے طور سے رکھے ہیں۔ ہٹلر، مینڈک اور ماں۔ یہ تینوں میرے بہترین دوست ہیں۔"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔ کاتھرون نے اپنے نوٹ دیکھے جیک نے ایک سوال گڑھا۔ مگر کے نے اس سے قبل ہی پوچھ لیا۔

"یہ آئے کہاں سے تھے۔"

ٹم مسکرایا۔ جسے اسے اسی سوال کی امید تھی۔

"دوزخ سے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "یہ وہیں رہتے ہیں۔"

"اچھا تو ان میں ایک ہٹلر ہے۔" جیک نے کہا۔

"میں نے یہ نام خود رکھا ہے اس کا وہ ہٹلر نہیں ہے قدرے معمر بھی ہے آہ ایک بار مجھے ایک ایسی جگہ لے گیا تھا جہاں دیواریں تھیں اور خاردار تار تھے وہاں لاشوں کو بھٹی میں جھونکا جاتا تھا۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں..... وہ اک گائڈڈ ٹور تھا۔ اس مقام پر اگرچہ نازی فوجی تھے اور وہاں ایسی چمنیاں تھیں جس سے بھورا دھواں دکھتا تھا۔ یہاں ایک بوتھی اور ایسے لوگ تھے جو والکن بجا رہے تھے جبکہ دوسرے لوگ قبریں کھود رہے تھے۔ اسی لیے میں نے اسے ہٹلر کا نام دے دیا تھا۔

جیک نے ایک تصویر کو دیکھا جس میں دیوار پر سواستکا نشان بنا تھا۔ وہیں ننھی بچی کے بے سر اور بے پیر کی لاش پڑی تھی۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ جیک کو لگا اسے گرمی لگ رہی ہے۔ سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس تصدیق کے مطابق لڑکے کے پاس کوئی بھی دھاردار ہتھیار نہ تھا۔ آخر اس نے اپنے ماں باپ اور بہن کی لاشوں کو اس کا ٹا اور چیرا کس طرح تھا۔ اس نے خون بھری انگلیوں سے دیوار پر ہیل ٹیلر کے الفاظ لکھے تھے۔ انسانی ہاتھوں میں اتنے طاقت نہیں ہوتی لاشوں پر ناخن دار پنجوں کے نشانات تھے۔ دانت اس طرح ٹوٹے تھے جیسے ان پر ہتھوڑی چلائی گئی ہو۔ کان جسم سے جدا کر دیے گئے تھے۔

یہ وحشت کا ایک بے حد خوف ناک مظاہرہ تھا یہی نہیں بلکہ شیطان کے الفاظ انگریزی ہی میں نہیں بلکہ چھ زبانوں میں لکھے گئے تھے۔ جرمن، ڈینش، اٹالین، یونانی، فرنچ، اسپینی حتی کہ عربی بھی استعمال ہوئی تھی۔ جبکہ اسکول رپورٹ کے مطابق یہ لڑکا بہت معمولی ذہانت کا تھا۔ آخر اسے اتنی زبانوں کا علم کہاں سے ہوا۔

"تم نے یونانی کہاں سے سیکھی۔" جیک نے پوچھا۔

"یہ زبان مجھے نہیں آتی۔" لڑکے نے آنکھیں کھولیں۔
"یہ حرکت مینڈک کی تھی۔"
"مینڈک...... اچھا ذرا اس کے بارے میں بتاؤ۔"
"یہ...... خاصا بدصورت ہے۔ مینڈک چلایا۔ اسے اچھال بھرنے کا شوق ہے۔" ٹم بولتے بولتے آگے کو جھکا۔ کے تھوڑا سا ہٹ گئی 'مینڈک بہت اسمارٹ ہے۔ وہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ ساری دنیا میں اسے دنیا کی ہر زبان آتی ہے' جیک نے قلم نکالا اور پولیس والے بیان کے اوپر اس نے بڑے حروف میں ہٹلر اور مینڈک لکھا۔ اس کے آگے اس نے V لکھا۔ اس نے دیکھا لڑکا اسے دیکھ رہا ہے۔
"ٹم...... تم اپنے دوستوں سے کس طرح ملے تھے۔"
"میں نے انہیں بلایا تھا اور وہ آ گئے تھے۔"
"بلایا تھا' کس طرح۔"
"کتابوں کی مدد سے۔ جادو منتر سے۔" جیک نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔
ٹم کے کمرے کی تلاشی سے انہیں اس طرح کی کچھ کتابیں ملی تھیں جو شیطانی علوم سے متعلق تھیں۔ ٹم نے بتایا تھا اس نے یہ کتابیں فٹ پاتھ سے خریدی تھیں۔
"گویا یہ ہٹلر مینڈک وغیرہ شیاطین میں سے ہیں۔"
"ہاں...... کہاں جا سکتا ہے۔"
"تم نے انہیں پہلی بار کب بلایا تھا۔"
"کوئی دو سال پہلے ابتداء میں اسے بلانے میں خاصی دشواری ہوتی تھی۔ ہر ہر ہدایت پر ردعمل ضروری ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی سے عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ میں نے کوئی سو بار کوشش کی تھی تب 'ماں' آئی تھی۔"
"یہ کوئی عورت ہے۔"
"ہاں...... یہ بہت تجربہ کار ہے' ٹم نے کی طرف دیکھا۔ ماں کو سب معلوم ہے ماں نے مجھے سیکس کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔" اس نے کے کو کنکھیوں سے دیکھا اور بولا۔ "اس نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ عورت سے کس طرح لطف لیا جا سکتا ہے۔ عورت کو جب طلب ہوتی ہے تو وہ کیا کیا کرتی ہے۔ اس نے تو لڑکوں کو استعمال کرنے کے طریقے بھی مجھے بتائے ہیں یہ بتایا ہے کہ انہیں استعمال کر کے آزاد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔"
"کیا مطلب۔"
"جسموں سے آزادی۔ مار کر بوٹی بوٹی کرنا۔ وغیرہ۔" لڑکے نے پھر کے کی سمت دیکھا جس کا رنگ اڑ رہا تھا۔
"واہیے۔" جیک نے لکھا۔ "شیطان ازم دوزخ بہ شغف۔"
"تم نے ڈاکٹر کاتھرو سے کہا تھا تم آزاد محسوس کرتے ہو کیا مطلب تھا تمہارا۔"
"میرا ایک حصہ دوزخ میں ہے۔ اس رات تم سمجھ رہے ہو میں نے اپنی روح کا ایک حصہ نذر شیطان کر دیا تھا۔ یہ ایک ٹسٹ تھا۔ میں نے امتحان پاس کر لیا تھا۔ ایک امتحان ابھی باقی ہے۔"
"اچھا...... اور اس کے بعد تمہاری روح مکمل طور سے جہنمی ہو جائے گی۔"
"ہاں لوگوں کو جہنم کے بارے میں درست علم نہیں ہے۔ یہ ایک گھر جیسی ہے اور یہاں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے' البتہ محفوظ ضرور ہے۔ میں وہاں جا چکا ہوں اور شیطان سے مل چکا ہوں۔ وہ مجھے اپنی فٹ بال ٹیم میں جگہ دینے والا ہے۔ اس نے کہا ہے میں اسے ایک بڑا بھائی سمجھوں۔" اس نے پلکیں جھپکائیں۔ "یہاں تو محبت کرنا بہت مشکل ہے۔ دوزخ میں آسان ہے۔ کوئی روک نہیں۔"
اس نے ملتے ہوئے کہا۔ "شیطان بہت مہربان ہے۔ کہتا تھا جب کوئی نئی روح دنیا میں آتی ہے تو اسے بہت افسوس ہوتا ہے کیونکہ زندگی بہت دشوار چیز ہے۔" وہ زور زور سے ہلنے لگا۔
"ٹم" کاتھرو نے وحشت سے کہا۔ "ہلو مت۔"
"تم مجھے پنجرے میں نہیں بند کر سکتے۔" معاً ٹم زور سے چیخا۔ کے اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔
"نہیں مجھے قید نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے کہا...... ڈیڈی نے یہی چاہا تھا۔ وہ میری کتابیں جلانے والی تھے۔ وہ اپنی اسٹریٹ جیکٹ میں کسمسایا۔ کاتھرون اٹھ پڑا۔ اس نے بوبی اور گل کو آواز دی۔
"ٹھہرو۔" لڑکا چیخا۔
کاتھرون رک گیا۔ اس کی انگلی دروازے کی ناب پر تھی۔
"ٹھہرو۔" ٹم نے جدوجہد بند کر دی تھی۔ اس نے سر جھٹکا تو اس کا چشمہ کانوں سے نکل گیا اور سیدھا کے کی گود میں جا گرا۔ "میں اب ٹھیک ہوں۔" لڑکے نے کہا۔ "لیکن مجھے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ میری روح کا ایک حصہ جہنم میں پہنچ چکا ہے۔" وہ مسکرایا اور بولا۔ "اب میرے دوسرے امتحان کا وقت ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے یہاں آنے دیا تھا۔ تاکہ وہ بھی یہاں آ سکیں۔"
"کون۔" جیک نے پوچھا۔ اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔
"وہی میرے دوست ماں مینڈک اور ہٹلر...... لو وہ آ گئے ہیں۔"
"کہاں۔" کے نے گھبرا کے پوچھا۔
"میں دکھاتا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔ "مینڈک کہتا ہے۔ اسے بھی تمہارے سونے جیسے بال اچھے لگتے ہیں۔" لڑکے کی گردن کی رگیں پھولنے لگیں۔ "وہ انہیں چھونا چاہتا ہے۔"
کے چپ تھی۔ کاتھرون دروازے پر ساکت کھڑا تھا۔ جیک تم تھامے متذبذب سا بیٹھا ہوا تھا۔
معاً خون کا ایک گاڑھا قطرہ آہستگی سے ٹم کی بائیں آنکھ سے نکلا پھر پھسل کر اس کے رخسار پر آ گیا اور وہاں سے بہتا ہوا تھوڑی پر۔
پھر ٹم کی بائیں آنکھ کا دیدہ اپنے حلقے سے ابل پڑا...... "لو وہ آ گئے۔" اس نے سرگوشی کی اس کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔
"تیار ہو جاؤ۔"

☆☆

"ارے اسے تو ہیمرا ایجنگ ہو رہی ہے۔" جیک نے جلدی سے کہا۔ "ڈاکٹر فوراً ایمرجنسی کو فون کرو۔"
کاتھرون باہر کی طرف لپکا تاکہ بوبی کی میز سے فون کر سکے۔ ٹم کی صورت سے لگ رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ خون کی دو مزید لکیریں اس کی بائیں آنکھ سے نکل رہی تھیں جو حلقے پر کسی شدید دباؤ کا نتیجہ تھیں۔ لڑکے کے منہ سے کراہ نکلی اور اس کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ جیک نے اس کی جیکٹ کھولنی چاہی مگر بغل پر ہاتھ نہیں جم رہا تھا۔
کے کھڑی ہوئی تھی جیک نے اس سے کہا۔ "میری مدد کرو میں اس کی جیکٹ کھول سکوں۔" مگر وہ تذبذب میں تھی وہ خوف زدہ تھی۔ اسی وقت گل اندر آیا۔ اس نے لڑکی کو پکڑ لیا اس طرح جیک جیکٹ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ خون آنکھوں سے بہہ کر تھوڑی پر آ گیا تھا۔ لڑکے منہ کھولے بے آواز چیخ رہا تھا۔ اس کی زبان حلق سے باہر آ رہی تھیں۔ پھر ٹم کا جسم اتنے زور سے پھڑکنے لگا کہ گل جیسے آدمی کو بھی اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ جیک نے جیکٹ کا تسمہ کھینچا۔ اچانک ٹم کی بائیں آنکھ حلقے سے جدا ہو کر باہر نکلی اور خون اڑاتی کمرے میں آ اڑی۔ وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرائی اور کسی انڈے کی طرح پھٹی کے۔ کے تیورائی اور گرتے گرتے بچی۔
"سنبھالو اسے۔" جیک تھی۔ پہلے لڑکے کا چہرہ شیشے کی طرح چٹخا۔ اس کی پیشانی پھولی اور ایک بڑا سا گومڑ بن گئی لگتا تھا یہ سر بھی کسی وقت تربوز کی طرح پھٹنے لگا۔
کاتھرون اور بولا کمرے میں آ گئے۔ کاتھرون کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ بوبی نے جیکٹ کا آخری تسمہ

کھولنا شروع کیا۔

"ایمرجنسی والے آ رہے ہیں۔" ڈاکٹر کاتھرون نے کہا۔ "میرے خدا...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" جیک نے بے چارگی سے گردن ہلائی۔ لڑکے کی ضائع شدہ آنکھ کا حلقہ پچک کر اندر دھنس گیا تھا۔ اس کی دوسری آنکھ جیک پر مرتکز تھی۔

پھر لڑکے کی زبان منہ سے کوئی انچ بھر باہر آ گئی۔ اسی وقت گوشت پھٹنے کی آواز ابھری۔ نکلی ہوئی زبان سرمئی سی ہو گئی۔ اس پر شیشے کی کرچیوں جیسی نوکیں بننے لگیں۔

گل اور بوبی بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ ٹم کے چہرے اور سر کی شکلیں بدل رہی تھیں۔

"میرے خدا۔" بوبی ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ کوئی شے ٹم کا وزن کے ماتھے میں کملائی کانٹے دار زبان منہ سے باہر آ رہی تھی۔

پھر وہ لڑکے کی گردن کے رد گھس گئی۔ اس کی کنپٹیاں پچک رہی تھیں۔ معاً اس کے چہرے کا بایاں حصہ پٹاخے کی طرح پھٹا۔ ساتھ ہی اس کے کاشہ سر میں کئی سوراخ ہو گئے۔

اوپر کا ایک حصہ یوں اٹھنے لگا جیسے کسی چور دروازے کا ڈھکن کھلتا ہے۔

کے کے منہ سے ایک بھنچی بھنچی سی آواز نکلی۔

سراسیمہ جیک نے ٹم کے اس کے سیاہ حلقے میں جس میں کبھی آنکھ تھی کچھ حرکت سی نوٹ کی یہ حلقہ کچھ بڑا ہو رہا تھا۔ پھر اس میں سے ایک استخوانی سرمئی ہاتھ نکلتا دکھائی دیا۔ یہ یا تو کسی نومولود بچے کے ہاتھ برابر تھا۔ البتہ اس میں صرف تین ہی انگلیاں تھیں ان پر تیکھے ناخن اگے ہوئے تھے اور یہ پنجہ اس کلائی سے منسلک تھا جو چمڑے پر چڑھے تاروں جیسے مسلز سے بنا ہوا تھا۔

ادھر لڑکے کا منہ پھیلتا ہوا بڑا ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے ٹوٹنے کے نزدیک تھے۔ اسی منہ کی خلا سے پھر ایک خاردار کوبھے اور اس سے جڑی ایک دم نظر آئی جو کبھی ایک انسانی زبان تھی۔ ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کھال والی شے جس پر کانٹے اگے ہوئے تھے اور دو پسٹن جیسے پیر بھی اب ٹم کے کھلے منہ سے باہر آ رہے تھے۔ پھر وہ شے زور لگا کر باہر آ گئی اور اب ایک گنجا سا سر جو کسی آدمی کی مٹھی کے برابر تھا جس کا رنگ سڑے ہوئے گوشت جیسا تھا جیک کے روبرو تھا۔ پھر اس کا دوسرا ہاتھ بھی ظاہر ہوا۔ جیک نے دیکھا اس چہرے میں جڑی آنکھیں سرخ سرخ اور میں ترچھی بھی۔

گل کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح بدبدا رہا تھا۔ گنجے سر اس کی سمت گھوما اس کے موٹے ہونٹ مسکرائے اور دانت چاقو کی طرح چمکے پھر کوئی شے لڑکے کی کھوپڑی کے وسط میں لپکی، جیک کی سانس جیسے رک گئی۔ کے ڈوگلس کے حلق میں چیخ پھنس گئی۔ ایک مکڑی جیسی شے اپنے چھ پیروں اور سونڈوں کے ساتھ لڑکے کے کھلے ہوئے سر سے برآمد ہو رہی تھی۔ چار انچ قطر کا سر جو آہنی سے دھڑ کے ساتھ جڑا ہوا تھا جنید کانٹے جیسے بال اگے ہوئے تھے خود کو ابھارا۔ اس کا چہرہ ایک عورت کا تھا۔ باہر آتے ہی اس کے ہونٹ مسکرائے اس نے سپید آنکھوں سے جیک کو دیکھا۔ اس کے لبوں کے پیچھے آری جیسے دولا نبے دانت دکھائی دیے۔

کاتھرون کراہا وہ دیوار سے چمٹا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ باہر راہ داری میں بزر کی آواز ابھری ایمرجنسی والے آ گئے تھے۔ مگر وہاں دروازہ کھولنے والا کوئی نہ تھا۔

وہ جانور جس کے جسم پر نکیلے کانٹے تھے لڑکے کے منہ سے تقریباً باہر آ چکا تھا۔ اس کے جال دار پیر ٹم کے چہرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے سر کو گھمایا اس کی آنکھیں الو کی سی تھیں چہرہ ذرا بڑا اور جھریوں بھرا تھا۔ اس کا منہ سرخ کناروں والے پیالے کی طرح تھا۔ کسی جونک کے منہ کی طرح اس کی آنکھیں پٹ پٹا رہی تھیں۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔

ٹم کلازن کا سر اب کسی سوراخ دار غبارے کی

طرح لچک گیا تھا۔ وہ گنجے سر والی شے ہٹلر تھی۔ جیک نے اندازہ لگایا۔ اس کے سینے پر سفینے تھے اس کے نچلے دھڑ ے اس کے اعضائے تولید لٹک رہے تھے۔ اس شے کے پیر جولا ہی باہر آئے ٹم کے منہ سے ہوا نکلی جس میں خون اور بھیجے کی بو بھری ہوئی تھی۔

پھر لڑکے کا چہرہ پگھلنے لگا موم کی طرح وہ مکڑی جیسی عفریت 'ماں' تھی۔ جیک نے جان لیا تھا۔ یہ شے چلتی ہوئی لڑکے کے کاندھے پر جا رکی۔ اس وقت لڑکے کا چہرہ اندر دھنس چکا تھا۔ اب اس کے سر کی جگہ لوتھڑے تھے۔ اب ٹم کلازن کہیں نہیں رہا تھا۔

البتہ وہ تین عفریت ضرور سامنے تھے۔

ان تینوں نے مل کر اسے قابو کر رکھا تھا۔ جیک لڑکھڑایا اس کا جسم کے سے ٹکرایا۔ پہلے انہوں نے لڑکے کے والدین اور بہن کو ہلاک کیا تھا۔ پھر انہوں نے لڑکے اندر جگہ بنالی تھی اور اسے قابو میں کر لیا تھا۔ جیک کی عقل جواب دے رہی تھی اس کے کان کسی بزر کی آواز پر لگے تھے۔ ایمرجنسی کا عملہ دروازے کے ادھر آ چکا تھا۔ مگر جیک کو لگ رہا تھا وہ چل نہیں سکا۔ لڑکے نے کہا تھا میں نے انہیں بلایا تھا اور وہ آ گئے تھے۔ یہ میرے بہترین دوست ہیں اس وقت وہ تینوں یہاں موجود تھے یہ نہ تو فریب نظر تھے نہ کوئی واہمہ، اس وقت شیطانوں کے وجود پر بحث کا وقت نہ تھا۔ وہ عفریت جسے ٹم نے ہٹلر کا نام دیا تھا ایک دم سے اچھلا اور گل پر جا پڑا۔ اس نے گل کے چہرے پر اپنی تین عدد آہنی انگلیاں گاڑ دیں۔ گل کسی بکرے کی طرح چیخا۔ وہ منہ کے بل گر گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس عفریت نے اس کے چہرے کو کسی نقاب کی طرح ادھیڑ دیا۔ اس نے اپنے پیر گل کی گردن میں کسی قینچی کی طرح پھنسا دیے اور گل کی چہرے کی گوشت کو نگلنے لگا۔

بوبی ایک بلند چیخ کے ساتھ بھاگا۔ اس نے دروازے کو کھولا نہیں بلکہ توڑ ڈالا۔ قبضوں سے اکھاڑ دیا۔ جیک نے کے کا ہاتھ تھامے اور باہر کی طرف بھاگا۔ ماں نے اس کا پیچھا کیا۔ پھر ایک ہیولا اس کے سر کی سمت جھپٹا۔ اس نے جھکائی دی اور اپنے کو بچانے کے لیے دونوں ہاتھ سامنے اٹھا دیے۔ وہ مخلوق جسے ٹم نے مینڈک کا نام دیا تھا۔ اس کے شانے پر آ بیٹھا تھا۔ اس کی خاردار دم کہنیوں کے پاس سے اس کے لباس کو پھاڑ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور فراگ بنی مینڈک زقند بھرتا ہوا ڈاکٹر کاتھرون کے گنجے سر پہ جا ٹکا۔

"چھوڑ دے مجھے۔" کاتھرون چیخا۔ جیک دروازے پر رک گیا۔ مگر کاتھرون اب مدد سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ فراگ نے اپنا منہ کاتھرون کے سر پر رکھ دیا تھا۔ اس کا منہ اس کے حجم سے دگنا ہو گیا تھا۔ اس کی دم کاتھرون کی گردن میں رسی کی طرح لپٹ گئی تھی۔ کاتھرون آخری بار کراہا اور اس کا سر تربوز کی طرح پھٹا۔ فراگ اس کے خون کو اس طرح پی رہا تھا جیسے اس کا پسندیدہ مشروب رہا ہو۔ جیک نے کے کو کھینچا اور کمرے سے نکل گیا۔ ادھر بوبی مقفل دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معاً اس کا پیر پھسلا۔ دروازے کی دوسری طرف سے دستکیں جاری تھیں۔ شیشے سے جیک کو کئی چہرے نظر آ رہے تھے۔ بوبی لاک کی کنجی تلاش کر رہا تھا۔

نیچے ماں نامی مخلوق پھدکتی لپک رہی تھی۔

فراگ بھی کانفرنس روم سے نکل رہا تھا۔ اس کے منہ سے کاتھرون لوتھڑے چمٹے ہوئے تھے۔

"جلدی کھولو۔" جیک نے چیخ کر بوبی سے کہا۔

بوبی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسے کنجی نہیں مل رہی تھی۔ وہ تو گل کے پاس تھی اور وہ مر چکا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اسے ماں پندرہ فٹ کے فاصلے پر نظر آئی۔ اس کے عقب میں مینڈک تھا۔ ہٹلر بھی تھا۔ ایک دو فٹ کا انسانی ہیولا۔

"میرے خدا۔" بوبی کراہا۔

مگر کسی طرح ایک کنجی سے دروازہ کھل گیا لیکن اسے کھولنے کے ساتھ ہی فراگ نے اپنی انگلیاں اس کے شانے میں گھما دی تھیں۔ اس نے چیختے

ہوئے ہاتھ چلایا۔

جیک کو فراگ کی بدبو محسوس ہو رہی تھی۔ ادھر ایمرجنسی کے لوگ بھونچکیوں کی طرح انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک میز حائل تھی۔ روزالی نے دیکھ لیا تھا اور مسز اسٹیوارٹ نے بھی۔ دونوں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔

جیک نے فراگ پر دونوں ہاتھ ڈال دیے۔ اسے لگا جیسے اس نے انگارے پکڑ لیے ہوں۔ مگر اس نے بوبی کو اس سے آزاد کرا لیا کانٹوں سے جیک کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے۔ جیک نے پھر فراگ کو پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ اس مخلوق نے خود کو مکھی کی طرح اٹھا لیا۔ اس کا بدن دیوار سے ٹکرایا۔ نیچے گرتے ہی وہ دوبارہ اپنی شکل میں آ گیا۔

اس عرصے میں بوبی اور کے ڈوگلس دونوں دروازے سے نکل گئے۔ جیک بھی اچھل کر باہر نکلا اس نے دروازے کو دھڑوں سے بند کر دیا۔ اسی لمحے کوئی شے اس کے پیٹ سے ٹکرائی۔ یہ فراگ تھا مگر وہ دروازے سے ٹکرا کر ادھر ہی رہ گیا تھا۔ روزالی نے جلدی سے دروازہ مقفل کر دیا۔

بوبی بری طرح بھاگ رہا تھا وہ میز سے ٹکرایا پھر ڈیوی سے۔

"اے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔" ڈیوی نے کہا۔

بوبی لفٹ میں جا گھسا جو ایمرجنسی والوں کو اوپر لائی تھی۔ اس نے بٹن دبایا۔

"پٹیاں لاؤ۔" روزالی چیخی۔ اس نے جیک کے زخمی ہاتھ دیکھ لیے تھے۔

جیک کو درد کا احساس ہوا وہ کراہا۔

"ان خبیثوں نے کانٹھرون اور گل کو مار دیا ہے۔ یہ تین کسی اور لڑکے کے اندر نکلے ہیں۔ وہ لڑکا اب بغیر سر کی لاش بن چکا ہے۔"

"پھر بوبی بے ہوش ہو گیا۔"

روزالی نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔

"وہ..... وہ کیا چیز تھی۔" "مسز اسٹیورٹ ہکلائی اس نے فراگ کو دیکھ لیا تھا۔ جس کی آنکھیں الوؤں جیسی تھیں اور جس کا جسم مینڈک سے مشابہ تھا۔ اس کی نظر کے پر پڑی۔

"کے تم بھی زخمی ہو۔"

کے نے اپنا بازو دیکھا۔ اس جگہ فراگ کی دم اسے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں کانتھرون کی موت کا منظر ابھرا۔ نرس اسے لے کر راہداری میں چلی ایمرجنسی والے اس کی مرہم پٹی میں لگ گئے۔ اسی وقت دروازے سے کوئی چیز زور سے ٹکرائی۔ دروازہ بری طرح ہلا۔

اندر مارگی کی آواز ابھری..... ٹیلر کے اندر کون ہے۔

دروازے سے پھر ٹکر ماری گئی۔

"دروازے سے دور رہو۔" جیک چیخا۔

"روزالی سارے مریضوں کو یہاں سے ہٹاؤ۔ جلدی کرو۔"

دروازے پر تیسری ٹکر لگی اور اس کے شیشے چیخ گئے۔

"تمہیں کہا تھا نا۔" سگریٹ پینے والے ڈیوی نے کہا۔

"چپ رہو۔" روزالی نے اسے ڈانٹا معاً مسز میری چیخی۔ ٹکر پھر لگی تھی اور ٹوٹے شیشوں میں سے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ باہر آئے تھے۔ یہ ٹیلر تھا۔ جیک سراسیمگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مارٹی چیخی۔ ڈیوی بوکھلایا۔

پھر اس خبیث نے زقند لگائی اور دروازے سے نیچے کود گی۔ نیچے گر کر اس نے حریص نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

ادھر ماں نے بھی خلا سے سر نکالا تھا۔

"یہ ہم سب کو مار دیں گے۔" جیک نے سوچا۔ قوت نے اب منطق کی روپ دھار لیا تھا۔ یہ خوف بہت بڑھ گیا تھا۔ اب فلور پر موجود ہر شخص کی تقدیر میں اب موت لکھی ہوئی تھی۔ یہاں سے یہ خبیث وارڈ کے دوسرے مریضوں پر بھی حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اماں کا مکڑی جیسا بال دار جسم اوپر سے نکل کر

فرش پر کودا۔ دھپ کی آواز ابھری۔ پھر وہ بڑھ کر ہٹلر کی پاس جا رکی۔

اب دونوں ادھر کا جائزہ لے رہے تھے۔

☆☆

پھر کے نے حرکت کی۔ وہ راہداری میں پاگلوں کی طرح بھاگی۔ لفٹ جا چکی تھی۔ زینوں کا دروازہ مقفل تھا۔ پھر کا ریڈور ہی رہ گیا تھا۔ اس نے نرس کو اور پھر ایمرجنسی والوں کو پار کیا اور پھٹنے والی ٹیبل کے پاس پہنچی وہ آنے والی قیامت کو جیک کی طرح بھانپ چکی تھی۔

"نہیں۔" اس نے خود کلامی کی اور ٹیبل کو دھکا دیا۔ مسز کھڑکھڑائی اور چلی اس کا رخ ماں اور ٹیلر کی طرف تھا۔ مگر یہ دونوں ٹیبل کی رفتار سے زیادہ تیز تھے۔

ماں پھدک کر ایک طرف ہو گئی۔ ٹیلر اچھل کر دوسری طرف چلا گیا۔ ادھر اب فراگ خلا سے باہر آ رہا تھا۔ وہ کسی جیلی کی طرح تھا۔ میز طاقت کے ساتھ دروازی سے ٹکرائی۔

ہٹلر کی منہ سے ایک کھنکھناتی آواز نکلی۔

جیک نے روزالی سے کہا۔ "س" ب لوگ پیچھے ہٹ جائیں..... روزالی انہیں نیچے لے جاؤ۔"

روزالی نے مارٹی کو پکڑا اور راہ داری میں بھاگی دوسرے بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ ڈیوی بھی ان میں شامل تھی۔

فراگ سے اگلے پیر لٹک رہے تھے۔ مگر وہ خلا میں نہیں گیا تھا۔ ماں ذرا سی آگے بڑھی۔ ہٹلر اچک کر میز پر چڑھ گیا۔

جیک کو معلوم تھا۔ آٹھویں منزل پر کوئی ہتھیار نہیں نہ چاقو نہ ہتھوڑی گن کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس جگہ شاید سب سے کام کی چیز بس ٹوائلٹ پلنجر ہی تھا۔ بھلا اس سے وہ ٹم کے بہترین دوستوں کو کس طرح نقصان پہنچا سکتا تھا۔

فراگ خلا سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تاکہ وہ اپنے کولھے نکال سکے۔ ہاں محتاط انداز سے رینگ رہی تھی اور ٹیلر خطرناک ارادے سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"بچاؤ....." کوئی چیخا جیک نے دیکھا یہ مسز اسٹیوارڈ تھی جو میز پر رکھے فون میں چیخ رہی تھی۔ "ہم آٹھویں منزل پر ہیں۔"

ہٹلر کے پیر کھلے اور یہ شیطان کے اور جیک کی طرف اچھلا۔ یہ نیچے گرا اور دوسری چھلانگ بھری اور نرس کی ڈیسک پر پہنچ گیا۔ نرس اٹھی خون سی پر تھی اس نے نیچے کا ایک ہی وار سے اس کا تذکرہ ادھیڑ دیا۔ نرس گر کر تڑپنے لگی۔ ہٹلر تھا اس سے چمٹ گیا۔

"چھوڑ دے اسے۔ خبیث....." روزا چیخی وہ جھاڑو کے ساتھ اس کی سمت لپکی۔

"جیک..... بچنا۔" معاً کے چیخی۔ جیک مڑا۔ فرش پر ماں تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اس پر جوتے کی ٹھوکر رسید کی وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرائی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر لپکی۔

ایک کرسی اڑتی ہوئی آئی اور ماں کے اوپر گری۔ ماں کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ کرسی تلے اس کی ٹانگیں دب گئی تھیں۔ اس کی دو ٹانگوں سے نیلی رطوبت نکلنے لگی۔ "او ماردیا سالی کو۔" ڈیو نے نعرہ لگایا۔ "ڈاک بھاگو۔"

روزالی نے جھاڑو سے ٹیلر پر حملہ کر دیا۔ دونوں میں لمحہ بھر کشاکش رہی۔ جھاڑو چھوٹی تو ہٹلر نے روزالی کو دبانے کی تیاری کی۔

تبھی لفٹ کا دروازہ کھلا ایک ناٹے قد کا مضبوط آدمی جس نے گارڈ کی وردی پہن رکھی تھی یا تر!! اس کے پاس ریوالور تھا۔ ہٹلر پر نظر پڑتے ہی وہ سکتے میں چلا گیا۔ پھر گارڈ ہلا اور اسی لمحے ہٹلر نے اس پر چھلانگ لگائی۔ اس نے اپنے پنجے گارڈ کے سینے میں گاڑ دیے گارڈ منہ کے بل گر گیا۔

گارڈ کو ختم کرنے میں اس نے مشکل سے دس منٹ لیے تھے۔ ہٹلر مردہ گارڈ کے سینے پر بیٹھا تھا اس نے روزالی کی طرف دیکھا جو اس سے دور ہو گئی تھی۔ تبھی ڈیوی چلائی۔ "اے دوزخی۔" اس نے کرسی بلند

کی اور ہٹلر کا نشانہ لیا۔

"روزالی بھاگو۔ سب کو نیچے لے جاؤ۔" ڈیوی نے وہیں جمتے ہوئے آواز لگائی۔ اس نے شاید خود کشی کا ارادہ کرلیا تھا۔ "ڈاک تم بھی جاؤ۔" اس نے جیک سے کہا۔

پھر اس نے کرسی لہرائی۔ ماں کے دو پیر ٹوٹ چکے تھے۔ وہ آہستگی سے رینگ رہی تھی۔

ہٹلر نے چھلانگ لگائی۔ مگر وہ کرسی کے پیروں سے ٹکرایا۔

"میں اتنا آسان بھی نہیں ہوں۔" ڈیوی زور سے ہنسا۔ روزالی نے کجی سے زینوں کا دروازہ کھول لیا تھا۔ جلدی کرو ڈیوی چیخا۔

ماں جس کا منہ سفید تھا اور چہرہ عورت کا۔ فرش پر رینگ رہی تھی۔ فراگ ابھی تک دروازے میں پھنسا ہوا تھا۔

ہٹلر نے چھلانگ لگائی۔ ڈیوی نے کرسی چلائی کرسی ہٹلر کو نہ لگ سکی۔

روزالی مریضوں کو لے کر زینوں پر چل دی تھی۔

جیک نے چلا کر ڈیوی سے کہا۔ "ڈیو تم بھی آجاؤ۔" جواب میں ڈیوی ہنسا۔ "یار ڈاکٹر تم بھی خوب ہو۔"

اس نے کہا۔ "کیا تم چاہتے ہو۔ تینوں عفوبت سارے ہسپتال کو مذبح بنادیں۔"

کے نے جیک کو گھسیٹا۔ سب نیچے چلے گئے سوائے اس کے اور روزالی کے۔

"ہم پولیس کو بلائیں گے۔" کے نے کہا۔

جیک خود بھی جانا چاہتا تھا مگر وہ تذبذب میں تھا۔ اس کے سامنے ایک ذہنی مریض ڈیوی ان خبیثوں کے لیے دیوار بنا رکا ہوا تھا۔ وہ کیسے چلا جاتا۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑتا اسے معلوم تھا کسی بھی لمحے یہ ہٹلر دیوی کو نوچ سکتا تھا۔

"کے کو لے جا۔" جیک نے روزالی سے کہا۔ "اور دروازہ بند کرلو۔"

"نہیں۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

روزالی ہچکچائی۔ پھر اس نے کے کو کھینچا۔

"مس چلو۔" پھر وہ اس کے پیچھے زینوں کا دروازہ بند ہوگیا۔

☆☆

"ڈاکٹر..... کیا تم گھبرا گئے ہو۔" ڈیوی چیخا۔

ادھر ہٹلر اچھلا۔ ڈیوی نے کرسی گھمائی۔ جو اس خبیث کے کندھے سے لگی اور وہ دیوار تک چلا گیا۔ ماں ڈیوی کے پیروں کے پاس پہنچ چکی تھی۔ جیک نے دیکھا کہ فراگ کسی طرح خلا سے نکل آیا تھا۔ وہ ڈیوی کی طرف لپکا۔ ڈیوی نے کرسی لہرائی۔ "دیکھنا ڈیوی نے کرسی لہرائی۔ دیکھنا جیک نے ڈیوی کو ہشیار کیا۔ ہٹلر ڈیو پر لپکا تھا۔ ماں اس کے پیروں سے چمٹ گئی تھی۔ کمرے ڈیو نے اسے کرسی ماری مگر وہ بچ گئی۔ ہٹلر کا پنجہ ڈیو کو سینے کو چیر گیا۔ ڈیوی نے آخری بار جیک کو دیکھا اور زور سے کراہا۔

"پستول۔"

اسے ہٹلر کے کھاتے دار نے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔ تب جیک کو خیال آیا کہ پستول مردہ گارڈ کے جسم کے پاس پڑا ہوا ہے۔

کئی وسوسے اس کے ذہن میں ابھرے۔ پتا نہیں اس میں گولیاں ہیں یا نہیں۔ کیا وہ اسے چلا سکے گا۔ کچھ ہوا سے کام میں لانا ضروری ہے۔ وہ اس کے دن گنے جاچکے تھے۔

دم لہراتے ہوئے فراگ نے اس پر عقب سے حملہ کیا۔ اس کا سر پھسلا۔ پستول ابھی اس کے ہاتھ میں آیا ہی تھا کہ اسے اپنے منہ کے قریب ماں نامی مکڑی جیسی مخلوق نظر آئی۔ اس پر نوکدار دانت نکلے ہوئے تھے۔ وہ اس پر منہ مارنے ہی والی تھی۔ جیک نے ہاتھ کھینچا۔ پستول کی نال مکڑی کے جسم سے لگائی اور ٹریگر دبادیا۔

کیپٹن ہو اور صرف کلاک کی آواز آئی۔ ہٹلر اٹھ گیا تھا۔ فراگ پلٹا ماں مسکرائی۔ جیک نے جلدی

سے دوسری بار ٹریگر دبایا۔ معاً ایک زور کا دھماکا ہوا۔

بوم۔

ماں کے سر کا ایک حصہ اڑ گیا۔ سیال سفید مادہ ہوا میں اچھلا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹی۔ ہٹلر اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔

جیک نے ایک دو فائر کیا۔ ماں کا بدن چرخی کی طرح ناچنے لگا۔ فراگ اچھلا اور جیک کی گردن کے پاس گرا۔ جیک نے نال اس کے بدن سے بھڑائی اور ٹریگر دبایا۔ بوم..... اور فراگ کا بدن کھل گیا۔ اس سے بدبودار مادہ بہا۔ جیک نے ماں کا نشانہ لیا۔ مگر وہ اسپرنگ بن گئی تھی۔ اسے ہٹلر نظر آیا جو کمرے کی ایک دھاتی گرل کو کھینچنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ ہوا دان تھا جیک نے سوچا اگر خبیث اس سے گزر گیا تو..... اس نے ہٹلر پر فائر کیا۔

ادھر ہٹلر نے گرل اکھاڑ دی تھی۔ مگر جانے والی گولی نے اس کا ایک ہاتھ اڑا دیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس نے جیک کو دیکھا اس نظر میں بلا کی نفرت تھی۔ جیک کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ ہٹلر نے اپنا سر ہوا دان میں گھسایا۔

"نہیں۔" جیک چیخا۔ وہ اس خبیث کو دوسری طرف جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ مگر وہ نکل گیا تھا۔ وہ ڈیوی کی لاش کے پاس ہی پڑا تھا۔ سارا وارڈ مذبح بن گیا تھا۔ ادھر ہٹلر ابھی اسی ہسپتال میں تھا۔ وہ سوا دال کے پائپ سے نچلے فلور کی طرف جارہا تھا۔

ادھر ہسپتال کا میٹرنٹی وارڈ بھی تھا۔ لڑکے نے کہا تھا کہ شیطان بچوں کی آمد پسند نہیں کرتا۔

اسے اپنے بائیں کان کے پاس سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

زخمی ماں ادھر پہنچی ہوئی تھی۔ اس کے سر کا ایک حصہ غائب تھا وہ اب مزید خوف ناک لگ رہی تھی۔ جیک نے پستول کو نال سے پکڑا اور اس مکڑی کے اوپر قوت کے ساتھ دے مارا۔ مکڑی کی کھال آواز سے پھٹی۔ جیک نے دوبارا پستول اٹھا کر ضرب لگائی۔ اب مکڑی کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ تیسری ضرب پر پچک گئی۔

اب اس کا جسم کسی چیتھڑے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ جیک لفٹ تک گیا۔ اس کا دروازہ مسلسل کھل رہا تھا اور بند ہو رہا تھا کیونکہ گارڈ کے پیر لفٹ ہی میں تھے۔ اس نے جلدی سے گارڈ کی لاش کھسکائی۔ ہٹلر نچلے فلور پر پہنچ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے دوسری منزل کا بٹن دبایا۔ لفٹ چل دی۔

جیک سے کھڑا نہیں رہا جارہا تھا۔ اس کی قمیص کا پچھلا حصہ سرخ تھا۔ لفٹ لڑکھڑاتی چل رہی تھی پھر وہ رک گئی۔ جیک نے نمبر دیکھا یہ 5ویں منزل تھی دروازہ کھلا اور ایک سفید ہاتھوں والا ڈاکٹر اندر بڑھا۔ اس کی نگاہ جیک پر پڑی۔

وہ گھبرا گیا۔ "نکلو اس میں سے۔" جیک چیخا ڈاکٹر باہر نکل گیا۔ جس وقت لفٹ تیسری منزل پر پہنچی اس نے سوچا اس کے پاس تو کوئی ہتھیار نہیں وہ اس دوزخی ہٹلر کو کس طرح قابو کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ہٹلر میٹرنٹی وارڈ پہنچ چکا ہوگا اور تمہیں ہے تب سے بچوں کو دیکھ بھی چکا ہو۔

سیکنڈ فلور پر لفٹ بڑی۔ وہاں کوئی افراتفری نہیں تھی۔ نرسنگ روم میں موجود دونوں نرسوں نے جیک کو دیکھا اور حیران ہوگئیں۔ ایک کے ہاتھ میں کافی پیالہ چھلک گیا۔ جیک اس سے قبل میٹرنٹی وارڈ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

"تم دونوں بچوں کو کدھر رکھتی ہو۔" اس نے نرسوں سے پوچھا اور کہا۔ "سیکوریٹی طلب کرو اور کمک منگواؤ۔"

ایک نرس نے فون اٹھالیا۔

"دوستو میں جیک شان تھا۔ ڈاکٹر میں 8ویں منزل سے ادھر آیا ہوں۔ تم لوگ بچی کو یہاں بٹھاؤ۔ وجہ میں بعد میں بتاؤں گا۔"

"اوہ۔" نرس نے کسی کو پکارا۔ "جلدی آؤ۔"

جیک نے نرسوں کی آنکھوں میں شبہ دیکھ کر کہا۔

"میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔"

دائیں طرف ایک تیر کا نشان بنا تھا۔ میٹرنٹی

جیک ہال وے کی طرف چلا ایک نرس نے چیخ کر اسے روکنے کی کوشش کی وہ چپ رہا۔ خون کے قطرے فرش پر گراتا ہوا۔ کیس سگنل والی گھنٹی نے بجنا شروع کر دیا تھا۔ تحفظاتی کاروائی کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی۔

اس نے ایک موڑ کاٹا سامنے شیشے کا ایک پارٹیشن تھا۔ یہاں بچے لیٹے ہوئے تھے۔ لڑکیاں تھیلے کپڑے میں تھیں اور کمرے سفید کپڑوں میں یہاں پر متعدد رشتہ دار بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ کئی نرسیں اندر متحرک تھیں۔ ایک ملاقاتی نے جیک کو دیکھا عورتوں کے چہرے پر خوف ابھرنے لگا۔ جیک خون میں تر تھا۔ پھر کوئی شخص اس کے راستے میں مزاحم ہوا تو اس نے دھکا دیا۔ ”اسے یہاں سے باہر کرو۔“ اندر سے ایک نرس نے کہا۔

اچانک عقب سے دو ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

”پکڑے رہنا۔ گارڈ پہنچ رہے ہیں۔“

یہ لوتھر نامی چپراسی تھا جس نے جیک کو پکڑا تھا۔

”سنو۔“ جیک چیخا۔ مگر لوتھر نے اسے اٹھا لیا اور چل پڑا۔ جیک کی دیر نا خوشی سے گڑ کھا رہی تھیں۔ معاً اس نے ایک آواز سنی جو سامنے کی دیوار کے اوپر سے آئی تھی۔ یہ آواز ایک گرل اکھڑنے کی تھی۔ کسی نے دوسری طرف اسے دھکا دیا تھا۔

جیک نے خود کو چھڑانے کی سعی کی۔

ادھر گرل ایک آوازہ ساتھ اکھڑ گئی اور جیک نے دیکھا کہ سوراخ سے ایک چھوٹا سا ہاتھ نکلا ہے پھر ایک ہیولا ابھرا...... اور وہ نیچے کود پڑا۔

یہ ایک بازو والا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح ہو رہی تھیں۔

ٹیلر نے خوف زدہ تماشائیوں کو دیکھا۔ پھر اس نے جیک اور لوتھر کو دیکھا۔

لوتھر گھبرا گیا تھا۔ مگر اس نے جیک کو نہیں چھوڑا ہٹلر پلٹ کر شیشے سے ٹکرایا۔ مگر شیشہ ٹوٹا نہیں۔ عورت چیخی۔ اس کے ساتھ کے مرد کے اعصاب جواب دے گئی۔ شیشوں کے پیچھے ایک نرس نظر آئی وہ بچوں کو لیجانے آئی تھی۔

☆☆

ہٹلر نے پھر ٹکر ماری اور ایک کھڑکی ٹوٹ گئی۔ نرس اس کے لیے صرف منٹ بھر کا کھیل تھی۔ ”مجھے چھوڑو۔“ جیک چیخا اور لوتھر نے اسے چھوڑ دیا۔

ہٹلر نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ شیشہ کھسکا اور اس کا ایک ٹکڑا جیسے گرا۔ ہٹلر نے اس خلا میں خود کو ڈال دیا۔ یہ جگہ کم تھی۔ وہ پلٹا اور اس نے ایک بازو سے ٹکر مار کر خلا بڑا کر دیا۔

اس وقت چیخ پکار سے راہداری میں حشر اٹھا ہوا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔

جیک نے لپک کر عفریت کے پیر دبوچ لیے اور جھٹکا دے کر اسے خلا سے ادھر کھینچا دوسری طرف نرس نے خود کو جھکا کر بچوں کے لیے ڈھال بنا دیا۔

وہ عفریت ہٹلر، جیک کی گرفت میں کسی بندر کی طرح مچل رہا تھا۔ جیک نے اسے کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور چیخ گیا۔ اس کا کچھ بھیجا باہر آ گیا مگر اس نے خود کو سیدھا کیا وہ جیک کی سمت پلٹا۔ اس کے دانت کھلے موئے تھے۔ پھر اس کی یہ دانت جیک کی انگلیوں میں دھنس گئے۔ جیک درد سے چیخا۔ مگر اس نے خبیث کی ٹانگ پکڑ لی۔ اس نے ہاتھ کو جھٹکا اور عفریت فرش پر جا گرا۔

ہٹلر نے سنبھالا لیا اور کھڑکی کی طرف اچھلا۔ پھر وہ نرسری کی طرف اترنے لگا۔

جیک نے لوتھر کی طرف دیکھا۔ وہ سہما ہوا تھا۔ وہ نرس جو اندر تھی پہلی قطار سے بچوں کے لیے ڈھال بنی ہوئی تھی۔ ادھر وہ دوزخی شے شیشہ پار کر چکی تھی۔ زخمی ہونے کے باوجود ہٹلر نرسری میں کافی نقصان رکھتا تھا۔

جیک کو اپنی پشت پر کسی شے کے گرنے کا احساس ہوا وہ دروازے سے جا ٹکا تھا یہ گرنے والی شے ایک فائر ایک ٹنگوشر تھا۔ آگ بجھانے والا سلنڈر۔

ادھر ہٹلر نے اس نرس پر چھلانگ لگائی۔ اس نے نرس کی پشت پر کھرونچا مارا نرس کے کپڑے کھال سمیت ادھڑتے چلے گئے۔

جیک نے آگ بجھانے والے آلے کو نکال لیا اس کی انگلی اب اس کے بٹن پر تھی۔

”ہٹلر......“ جیک چیخا۔

درندے کا بگڑا ہوا سر جیک کی طرف گھوما۔ جیک نے بٹن دبایا۔ اس میں سے ٹھنڈا سفید جھاگ دھار کی طرح درندے کے منہ پر گرا۔ درندہ جیسے اندھا ہو گیا۔ وہ پلٹ کر گرا جیک نے اس پر دوسری دھار پھینکی۔

”اسے رکھ دو۔“ اس نے کسی کی آواز سنی۔ دو سکوریٹی گارڈ آ گئے تھے۔

”اسے رکھ دو۔“ اسے پھر حکم دیا گیا۔ مگر جیک نے سنی ان سنی کر دی۔ اس نے دیوار کے شیشے کو مزید توڑ دیا اور خود بھی اندر گھس گیا۔ اس نے آپریٹس سے ٹیلر کا نشانہ لیا اور اس پر کیمیکل کی دھار ماری۔ ہٹلر گر کر زمین پر تڑپنے لگا۔

”مر حرام زادے۔“ جیک دانت کچ کچا کے بولا۔ اس نے ہاتھ میں دبے سلنڈر سے اس مخلوق پر وار کیا۔ متعدد بار اس کے ہاتھ چلے۔ ہر وار کے ساتھ ہٹلر کے بدن سے کڑکڑاہٹیں اٹھتی تھیں۔ پھر جیک کو لگا اسے کوئی گھسیٹ رہا ہے۔ ہٹلر کا سر جس کی ایک آنکھ کسی جلتے کوئلے کی طرح سیاہ ہوئی تھی پچکا ہوا تھا۔ اس نے منہ کھولا دانت نکالے اور پھر اس کا پنجہ جیک کی پنڈلی میں دھنس گیا۔

جیک نے دوسرے پیر سے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کی۔ یہ زور دار ٹھوکر تھی۔ اس شے کا بھیجا کھل گیا۔

اس کے ساتھ ہی خود جیک بھی لہرایا اور زمین پر گر گیا۔

☆☆

جب وہ بھاگا تو وہ ایک پرائیویٹ روم میں تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ٹانکے تھے۔ اس کی انگشت شہادت آدھے کے قریب غائب تھی۔ اس کی پنڈلی پٹیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وقت کتنا گزر چکا ہے۔ اس کے منہ میں دواؤں کا ذائقہ تھا۔ اسے کھڑکی پر بارش برستی سنائی دے رہی تھی۔

دروازہ کھلا اور ایک برس اندر آئی۔

یہ ایک جوان چہرہ تھا۔ دروازہ بند ہونے سے قبل جیک نے باہر پولیس والے کی جھلک دیکھی۔ نرس اسے جاگتا پا کر رک گئی۔

”ہائے۔“ جیک نے بمشکل کہا۔ ”کیا وقت ہوا ہے۔“

”ساڑھے سات کیا حال ہے۔“

”زندہ ہوں۔“ اس نے کہا۔

نرس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”مریض جاگ گیا ہے۔“ شاہدہ پولیس والے کو بتا رہی تھی۔ اس نے جیک کا درجہ حرارت ناپا۔ جیک نے دیکھا کمرے میں کوئی قوت نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کوئی میری بیوی کو فون کر دے۔“

”تم لیفٹیننٹ سے بات کرو۔“

”بچے۔ وہ تو ٹھیک ہیں۔“

عورت نے جواب نہیں دیا۔

”مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھا بچوں کی طرف جائے گا۔“ وہ چپ ہو گیا پھر نرس اسے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی پاگل ہو۔ شاید اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

خون صاف کر لیا گیا تھا۔ لاشیں تھیلوں میں ڈول سی گئی تھیں۔ عینی شاہدہ کو ہدایت کر دی گئی تھی۔

”سوری۔“ وہ بڑبڑایا۔

نرس نے اس سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔

”قیمہ...... ہیمر۔“

اس نے اپنی پسند بتا دی تو وہ چلی گئی۔

وہ سوچنے لگا سات گھنٹے قبل وہ شیطانی مخلوق

سے نبرد آزمائی کر دیا تھا۔ تین عدد عفریتوں سے جو ایک لڑکے کے اندر سے وجود میں آئے تھے اور اب وہ بھنا قیمہ منگوا رہا تھا۔ یہ تھی زندگی۔ ذرا دیر بعد دروازہ پھر کھلا اس بار جیک کا علاقائی ایک گھنگھریالے بالوں والا آدمی تھا۔ جس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر تھی۔ اس کے نقش کھردرے سے تھے۔ یہ سرکاری آفیسر لگتا تھا۔ غالباً کوئی پولیس والا تھا۔

ڈاکٹر شون اور ملاقاتی نے پوچھا پھر کہا۔

"میرا نام لیفٹیننٹ بائڈ ہے۔ برمنگھم پولیس۔" بائڈ کرسی کھسکا کر پاس بیٹھ گیا۔

"خیر سوالات پوچھنے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ضرور۔" جیک نے تکیے کے سہارے اٹھنا چاہا تو اسے چکر آ گیا۔ "میں اپنی بیوی کو اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"اسے بتا دیا گیا ہے۔" آفیسر نے کہا۔ "ہم نے اسے سارا قصہ نہیں بتایا ہے۔" اس نے نوٹ بکس نکالی۔ "ہم نے مس کے ڈوگلس کا بیان لے لیا ہے۔ میٹرنٹی وارڈ اسٹاف کا بھی تم تو جانتے ہی ہو یہ واقعات بے حد ناقابل فہم سے ہیں۔"

جیک مسکرایا۔

"ہم سمجھتے ہیں تم نے اس ہسپتال کے بہت سے نومولود بچوں کی زندگیاں بچائی ہیں۔ البتہ میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں کہ وہ جو یہاں ظاہر ہوئی تھیں۔ کہاں سے آئی تھیں اور کیا تھیں۔ ہمیں تو سب باتیں کے سے معلوم ہوئی ہیں۔ یہ بیان بے حد خوف ناک اور ناقابل فہم ہے۔ اس میں کوئی معقولیت نہیں۔"

"نہیں۔" جیک نے کہا۔ "مس کے کیسی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اور روزائی۔"

"وہ ایک مضبوط عورت ہے یقیہ تو حواس ہی کھو بیٹھے ہیں۔" جیک کو تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔

لیفٹیننٹ بائڈ نے اس کی حالت محسوس کر لی۔ اس نے کہا۔ "میں بہت جلد چلا جاؤں گا۔ یہ بتاؤ جب روزانی تمہیں آٹھویں منزل پر چھوڑ کر نیچے چلدی جبھی تو وہاں کیا ہوا تھا۔"

جیک نے تفصیل بتایا بولنا مشکل تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کئی بار بولتے ہوئے اسے اونگھ آئی۔ بائڈ نوٹ لے رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ہٹلر کہاں جائے گا۔" جیک نے کہا۔ "اسے بچوں کی طرف ہی جانا تھا۔ یہ بات میں نے ٹم کی ایک بات سے جانی تھی۔ اسی لیے میں سیدھا میٹرنٹی وارڈ میں پہنچا تھا۔" بولتے ہوئے اسے چکر آیا اور وہ چپ ہو گیا۔

"ڈاکٹر شون اب ذرا ان لاشوں کے بارے میں بتاؤ وہ جو عفریت تھے۔" وہ چپ رہا تو لیفٹیننٹ نے کہا۔ "ہمیں صرف دو کی لاشیں ملی ہیں۔"

"اچھا۔" اس نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک سرسری سے اور دوسری وہ جو مکڑی تھی۔ ہم نے انہیں تھیلے میں ڈال کر ہٹا دیا ہے البتہ سوال یہ ہے کہ بہت بڑی لاش کہاں ہے۔"

"وہ فراگ تھا۔ میں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ اس کا بدن دو حصوں میں کھل گیا تھا۔ اسے میں نے مار ڈالا تھا۔"

"مگر ہمیں اس کی لاش نہیں ملی ہے۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"اسے وہاں ہونا چاہیے تھا۔" جیک نے نیم بے ہوشی میں کہا۔ اب اس کا سر ڈھلکا جا رہا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ خوف بھری سنسنی بھی اس کے جسم میں پھیل رہی تھی۔ اس کی نظروں نے کمرے کے دوسری طرف کسی شے کو محسوس کیا دروازے کے پاس ایک گرل تھی اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ فراگ ونٹ کے ذریعے آٹھویں منزل سے نکل گیا ہو مگر اب تو سات گھنٹے گزر چکے تھے اگر فراگ نرسری میں ہوتا تو کوئی کاروائی ضرور کرتا۔ پھر یہ کاروائی اس نے کیوں نہیں کی۔ "نالیاں....." اس نے کسی طرح کہا۔ "نالیوں میں۔"

"ہم نے سوچا تھا۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

"ڈکٹس کے اوپر ہم نے آدمی لگائے ہیں جو انہیں کھول کر دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ خاصا لمبا اور مشکل کام ہے۔ میرے خیال میں دو امکانات ہیں یا تو وہ مخلوق ہسپتال سے نکل گئی ہے۔ یا وہ ڈکٹس کے اندر ہی کہیں مر گئی ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ وہ مر گیا ہے لیکن جب تک اس کی لاش نہیں ملتی ہم تلاش جاری رکھیں گے۔ خواہ ہمیں سارے سسٹم کو ہی کیوں نہ اکھاڑنا پڑے۔"

جیک نے بولنا چاہا مگر آواز نہ نکل سکی ایک تیسرا امکان بھی تھا۔ فراگ ان سب سے اسمارٹ تھا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ تلاش میں ہو کمرے دیکھ رہا ہو۔ منزلیں کھنگال رہا ہو۔ گرل وغیرہ سے جھانک رہا ہو۔ اسے پانے کے لیے مارنے کے لیے۔

اسے جس نے اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یعنی مجھے یعنی جیک شون کو یہ امکان بھی تھا کہ وہ مر ہی گیا ہو۔ بے شک یہ امکان بھی تھا مگر۔

"میں دیکھ رہا ہوں تم بہت تھکے ہوئے ہو یہ تمہارے لیے بہت برا دن تھا۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "میں کل صبح کو آؤں گا۔"

جیک جواب نہیں دے سکا۔ اس نے کرسی کھسکنے کی آواز سنی اس کی نظریں گرل پر مرکوز تھیں۔

"اب تم سو جاؤ۔" اس نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی لیفٹیننٹ جا چکا ہے۔

جیک نے کوشش کی کہ وہ نہ سوئے۔ اس نے نیند کے خلاف جدوجہد کی۔

وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت لگے گا فراگ کو اسے ڈھونڈنے میں۔ مگر وہ اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ نہ جانے کب وہ اس کمرے کی گرل تک پہنچے گا۔ پھر وقت کے راستے اس میں داخل ہوگا۔

مگر فراگ تو مر چکا تھا۔

اسے بہر حال مر جانا چاہیے تھا۔

جیک کی جدوجہد کمزور ہو رہی تھی۔

نیند سے اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں اور پھر..... ونٹ کا منظر بھی اس کی آنکھوں سے دھندلاتا ہوا غائب ہو گیا۔

نیند میں ڈوبنے سے قبل اسے احساس ہوا کہ وہ نرس کمرے میں دوبارہ آئی ہے۔ کیونکہ جیک کی ناک سے بھنے ہوئے قیمے کی بو ٹکرائی تھی۔

انتخاب

دیا جلاؤ

ماضی کی سوگواری سے انسان کو اتنی گہری وابستگی نہیں ہونی چاہیے' انسان کو پیچھے نہیں آگے دیکھنا چاہیے..... اک دیا بجھ گیا تو اُسے کیوں مقدر بنایا جائے' آگے ہر قدم پر دیا جلایا جاسکتا ہے۔ جب منزل ڈھونڈنے کے اتنے مواقع موجود ہوں تو انسان اتنا احمق کیوں ہے کہ کولہو کے بیل کی طرح ساری زندگی بجھے ہوئے دیے کا طواف کرتا رہے۔

زبانِ من

جوش نے پاکستان میں ایک بہت بڑے وزیر کو اردو میں خط لکھا۔ لیکن اس کا جواب انہوں نے انگریزی میں ارسال فرمایا۔ جواب الجواب میں جوش نے انہیں لکھا۔ "جناب والا' میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا' لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔"

طلاق

ایم الیاس

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

حیرت نفرت..... دکھ اور غصے سے میرا بدن لرزنے لگا۔ یہ منحوس خبر اتنی اچانک تھی کہ اس نے نہ صرف مجھ پر بجلی گرادی بلکہ بد حواس بھی کر دیا تھا۔ میں بھونچکی سی ہوگئی۔ میں سکتے کی سی حالت چند لمحوں تک رہی۔ حوصلہ برقرار رکھنے کی ہر جدوجہد بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس شمارے کی ایک دل گداز کہانی

نجانے کیوں میں کچھ دنوں سے ایسا محسوس کر رہی تھی کہ میری اس حسین اور خوش گوار زندگی میں کوئی سونامی آنے والا ہے جو نہ صرف مجھے تہس نہس کر دے گا بلکہ میری زندگی اجاڑ دے گا۔ تباہی اور بربادی میرا مقدر بن جائے گا۔

تب میری زندگی میں ویرانی اور سناٹے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ویسے کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈستا رہے گا۔

اس طوفان کا پیش خیمہ دراصل عرشی کا رویہ تھا۔ میں نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان کی محبت اور گرم جوشی اور والہانہ محبت میں غیر محسوس انداز سے کمی آتی جا رہی ہے۔ میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر جھٹک دینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے شوہر عرشی کے اس رویے کی وجہ سوچی تو دور دور تک مجھے کوئی بات نظر نہیں آئی۔ شاید دفتر کی سیاست اور مصروفیت نے عرش کو پریشان کیا ہوا ہوگا..... لیکن میرے دل نے کہا کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے باوجود وہ دیر تک جاگتے..... مجھے سونے نہیں دیتے..... میں ان سے شوخی سے کہتی۔ ”میں کیا برسوں بچھڑنے کے بعد ملی ہوں۔ آپ میری بڑی پسلی ایک کر دیتے ہیں۔ جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا ہے۔ مجھ میں ہلنے کی سکت نہیں رہتی۔“

لیکن اب وہ کئی دنوں تک قریب نہیں آتے۔ کپڑے بدل کر دیوار کی طرف منہ کر کے سو جاتے..... میں نے عرشی سے اس کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

آخر وہ طوفان آ ہی گیا جس کا مجھے خدشہ تھا اور دل کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔

عرشی یوں تو دفتر میں مصروفیت کے باعث کوئی پندرہ بیس دنوں سے گھر نو دس بجے آ رہے تھے لیکن اس دوران وہ دن ڈوبنے کے بعد آئے تو ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی خاموش تھے۔ جیسے ان کے دل کو کسی بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔ جب کہ ان کے دفتر جاتے وقت ان میں ایسی کوئی بات میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ جانے کیوں ان کی خاموشی سے ایک ان جانا خوف محسوس ہونے لگا اور آج پھر انہوں نے نہ تو اپنی محبت کی گرم جوشی کا اظہار کیا اور نہ ہی اپنے بازوؤں میں محصور کیا اور میرے چہرے پر جھک کر دیر تک من مانیاں کرتے رہے۔ مجھے کسمسا کر ان سے کہنا پڑتا۔ توبہ ہے..... جب کہ ان کی شادی کے بعد صبح دفتر جاتے اور واپسی پر یہ معمول رہتا تھا۔

آج انہوں نے بڑی بے نیازی اور بے اعتنائی برتی تھی۔ میرے لیے یہ بڑی عجب خیز اور ناقابل فہم سی بات تھی۔

دوسرے لمحے میں نے یہ سوچ کر اس خوف کو دل کے نہاں خانے سے نکال پھینکا کہ کام کی زیادتی اور تھکن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہوگی۔ وہ روزانہ صبح نو بجے دفتر جاتے تھے لیکن آج سات بجے ہی نکل گئے تھے۔ جب وہ ہمیشہ زیادہ تھکے ہوئے ہوتے تھے تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان اس جملوں کا تبادلہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

میں تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی اور سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میک اپ کر رہی تھی۔ مجھے اپنی عزیز ترین اور دیرینہ سہیلی نشاط احمد کی شادی کی سال گرہ میں جانا تھا۔ میں آئینے میں عرشی کی حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بریف کیس تپائی پر رکھ کر میرے پاس آئیں گے۔ کیوں کہ اس وقت میں نیم بے حجابی کی اس حالت میں شعلۂ مجسم بنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ پھر وہ جذبات کی افراتفری میں بہنے سے باز نہیں آتے۔ پھر مجھے غسل خانہ میں گھسنا پڑتا تھا۔ میرے پاس آنا تو درکنار میری اس حالت کو دیکھنا تو درکنار ہیلو تک نہیں کہا۔ انہوں نے کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر پھیلا دیا۔ پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر براجمان ہوگئے۔ میرا یہ خیال خام ثابت ہوا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیں گے اور دبوچ کر ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر انہوں نے اخبار اٹھا کر کچھ دیر تک پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے اخبار تہہ کر کے تپائی پر رکھتے ہوئے بے حد سرد اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”فزا..... یہ تمہارا میک اپ کب ختم ہوگا۔“

ان کے اس لہجے نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے انہیں آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیس پچیس منٹ تو لگیں گے۔“

”ایسا کرو..... یہ میک اپ کچھ دیر کے لیے بند کرو۔ ادھر آ کر بیٹھو مجھے تم سے کچھ نہایت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ وہ روکھے لہجے میں بولے۔

”کیا یہ باتیں رات کو نہیں ہو سکتیں ڈیر!“ میں نے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جماتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔ وہاں

میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ نثار نے تمہیں بھی مدعو کیا ہوا ہے۔"

"نہیں....." نفی میں سر ہلاتے ہوئے قدرے تند لہجے میں بولے۔ "یہ باتیں پارٹی سے زیادہ اہم ہیں..... تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ مجھے اس قسم کی پارٹیاں پسند نہیں ہیں جن میں اداکاراؤں کی لڑکیاں عورتیں آتی ہیں اور عریانیت اور بے حجابی کی حالت میں آتی ہیں۔ اس لیے نہ ہی میں کبھی تمہارے ساتھ گیا ہوں۔ آج بھی تم اکیلی ہو آنا۔"

"خیریت تو ہے میری جان!" میں نے لپ اسٹک رکھ کر گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے جان! آج تم خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو۔ کیا دفتر میں کوئی بدمزگی ہوگئی ہے۔"

"خیریت نہیں ہے سمجھو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے تو ان کے لہجے سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ "آج میں تمہیں ایک نہایت اہم فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ فیصلہ مجھے پہلے سنا دینا چاہیے تھا۔"

"کیسا فیصلہ....." میں نے چونک کر اوپر سے نیچے تک حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس لمحے وہ کسی جج کی طرح لگ رہے تھے اور میں اپنے آپ کو ایک مجرم کی طرح محسوس کر رہی تھی جو کٹہرے میں کھڑا ہو۔

"یہ فیصلہ غیر متوقع ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "ایک دہلا دینے والا فیصلہ جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہ ہوگا۔"

"تم فیصلہ سنانے کے بجائے مجھے دہلا کیوں رہے ہو۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "جو فیصلہ بھی سنانا ہے وہ جلدی سے سنا دو۔"

"میں دہلا نہیں رہا ہوں بلکہ تمہیں ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں کہ تم اس فیصلے کو سن کر اپنے دل و دماغ پر قابو پا سکو۔"

"میں کوئی گیا نہیں ہوں جو فیصلہ سن کر صدمے سے بے ہوش ہو جاؤں۔" میں تنک کر بولی۔ "میں ہر قسم کا فیصلہ سننے کے لیے تیار ہوں۔ آخر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"تم ہوش تو نہیں کھو دو گی..... لیکن یہ فیصلہ تمہیں اندر سے نہیں نہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ چوں کہ تم ایک سمجھ دار اور تعلیم یافتہ اور حقیقت پسند عورت ہو لہٰذا تم اس فیصلے کو ٹھنڈے دل، صبر اور تحمل سے سننا۔ جذباتی نہیں ہونا، مجھے اسی فیصلے کو سنانے کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔"

"فیصلہ..... فیصلہ..... فیصلہ!" میں ہیجانی لہجے میں چیخی۔ "تم نے اس کی کیا تکرار لگا رکھی ہے۔ خدا کے لیے اب سنا بھی چکو۔"

"بات یہ ہے کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔" عرشی نے یہ بات آسانی سے اس طرح کہہ دی جیسے وہ کوئی دوسری گاڑی خرید رہے ہو۔

"کیا....." میں اسی طرح اچھل پڑی جیسے مجھے ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ میرا دماغ چکرانے لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایسا لگا جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ ہر چیز ڈولتی اور چکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اگر میں جلدی سے پلنگ کے سرہانے کا سہارا نہ لیتی تو گر پڑتی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عرشی یہ فیصلہ سنائیں گے۔ میں ان سے کئی دنوں سے کہہ رہی تھی کہ میری گاڑی بیچ کر مجھے نئی ہنڈا اکارڈ لے کر دے دیں۔ وہ ٹال مٹول اور حیلے بہانے کرتے رہے تھے۔ میں یہ سمجھی کہ شاید وہ نئی گاڑی خرید کر نہ دینے کا فیصلہ سنائیں گے لیکن وہ فیصلہ نہ تھا۔ یہ تو ایک زہریلا خنجر تھا جو میرے سینے میں درندگی سے اتار دیا گیا تھا۔

"دوسری شادی....." میری آواز گلے میں اٹکنے لگی اور کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اس کے زیر و بم سے سینہ بری طرح دھڑکنے لگا۔ چند ثانیوں کے بعد

سینہ دباتے ہوئے کہا۔

"عرشی.....! کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو..... کیا تم واقعی سنجیدہ ہو میری جان۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔" عرشی کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔ "میں سنجیدہ ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں اس قسم کے فضول مذاق نہیں کرتا۔"

"لیکن تم شادی....." میری آواز ویران کھوکھلی اور دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ میں آگے کچھ کہہ نہ سکی۔

"ہاں..... دوسری شادی....." عرشی میرے وجود پر جیسے ایک ایک دہکتا ہوا انگارہ رکھتے جا رہے تھے۔ "میں نے یہ فیصلہ بڑی مجبوری کی حالت میں کیا ہے۔ بہت ہی سوچ بچار سے..... یہ جذباتی نہیں بلکہ حقیقت پسند ہے۔ حقیقت بڑی تلخ اور کڑوی گولی ہوتی ہے۔ جسے نگلنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا ہے۔ زندگی میں بعض فیصلہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتے ہیں۔"

حیرت نفرت..... دکھ اور غصے سے میرا بدن لرزنے لگا۔ یہ منحوس خبر اتنی اچانک تھی کہ اس نے نہ صرف مجھ پر بجلی گرا دی بلکہ بدحواس بھی کر دیا تھا۔ میں بھونچکی سی ہو گئی۔ میں سکتے کی سی حالت چند لمحوں تک رہی۔ حوصلہ برقرار رکھنے کی ہر جدوجہد بے سود ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

تاہم میں نے چند لمحوں میں خود پر کسی نہ کسی حد تک قابو پا لیا۔ عرشی خاموشی سے میرا ردعمل دیکھ رہے تھے اور مجھے سنبھلنے کی مہلت دے رہے تھے۔ میں بے ترتیب سانسوں کے ساتھ بولی تو میری زبان کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

"تم دوسری شادی کر رہے ہو..... کس لیے....." میری رگوں میں لہو ابلنے لگا۔ میں شعلہ بار آنکھوں سے عرشی کو گھورنے لگی۔

"کیوں..... یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنے آپ سے پوچھو۔ اپنے دل کو ٹٹولو تو اس کا جواب تمہیں مل جائے گا۔" عرشی نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔ "تم انجان اور معصوم بننے کی کوشش مت کرو۔"

"تم مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہو۔" میں نے سرد تند لہجے میں کہا۔ "آخر میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو تم دوسری شادی کرنے پر مجبور ہو گئے ہو، بولو بتاؤ۔"

"اگر تم سننا چاہتی ہو تو سنو۔" عرشی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ "محض تمہاری وجہ سے دوسری شادی کی نوبت آئی ہے۔ ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ میں دوسری شادی کروں۔" عرشی نے رک کر سانس لی اور پھر کہا۔ "میں نے ازدواجی زندگی کے پانچ برسوں کا حساب کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس عرصے میں میں نے کیا چاہا..... تم نے مجھے کیا دیا.....! مجھے نہ تو میرے خواب ملے اور نہ وہ زندگی جو میرے لیے سب کچھ تھی جس کے خواب دیکھتا اور سوچتا تھا۔ کیا کرتا تھا۔"

"کہیں تم آج پی کر تو نہیں آ گئے ہو....." میں حیرت اور غصے سے بولی۔ "آج تم یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو۔"

"میں نے پہلے کب پی ہے جو میں آج پی کر آتا..... میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔ میرے حواس قابو میں ہیں میں دوسری شادی اس لیے کر رہا ہوں کہ تم بیوی بن سکیں نہ ہی میری تصوراتی عورت..... گھر میں ایک عورت کی ضرورت ہے۔ عورت ایک گھر ہوتی ہے..... کنبہ ہوتی ہے..... اب بھی وقت ہے اگر تم بیوی اور ایک گھریلو عورت ہو تو میں اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔"

"میں بیوی یا کوئی اور مخلوق ہوں۔" میں نے تنک کر جواب دیا۔ "ایسا لگتا ہے کہ آج کسی نے میرے خلاف تمہاری چابی بھر دی ہے۔"

"مجھے ایک ایسی بیوی چاہیے جو سیر و تفریحات اور پارٹیوں کی بجائے گھر کی چار دیواری میں رہے۔ اس کی زینت بنے۔ عورت کی عزت گھر سے..... گھر

کی عزت عورت سے ہوتی ہے۔" عرشی میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہہ رہے تھے۔ "وہ گھر اور شوہر کا خیال رکھے نہ کہ بلکہ گھر کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور پھر ایک ایسی عورت بن سکے جس کی مجھے ضرورت ہے..... یعنی وہ میرے بچوں کی ماں بن سکے..... مجھے اس گھر میں ایک مسافر کی طرح رہنا قطعی پسند نہیں ہے۔ تم نے اسے گھر نہیں ہوٹل بنا رکھا ہے۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ساری زندگی اسی طرح گزار دی جائے۔" عرشی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں سیر و تفریحات اور پارٹیوں سے دور نہیں رہ سکتی۔" میں زہر خند بولی۔ "کیا میں کوئی دیہاتی' جاہل' اجڈ اور گنوار عورت ہوں۔"

"دور کیوں نہیں رہ سکتی ہو..... آخر اس زندگی میں رکھا کیا ہے۔" عرشی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہ میری حسین زندگی اور میری بہت بڑی کمزوری ہے اور تم نے کیا یہ بات ان پانچ برسوں کے عرصے میں محسوس نہیں کی عرشی۔"

میں نے تڑ سے جواب دیا۔ "میں تمہاری بیوی ہوں۔ کوئی زرخرید نوکرانی نہیں ہوں۔ جس پر تم ہر قسم کا حکم چلاؤ۔ جبر و زیادتی سے اپنی ہر بات منواؤ۔ رہی بات ماں بننے کی..... کیا میں نے تم سے شادی کی پانچ ویں سال گرہ کے موقع پر کہا نہیں تھا کہ دو تین برس اور انتظار کرنا ہوگا مجھے بچے پسند نہیں ہیں اس لیے کہ نہ صرف حسن و شباب ڈھل جاتا ہے بلکہ عورت اپنی صحت اور جسمانی تشیب و فراز کی کشش کھو دیتی ہے۔ میں وقت سے پہلے بوڑھی' بے کشش اور بے عیب ہونا نہیں چاہتی۔ یوں بھی میرا حسن و شباب سدا بہار ہے۔ میری سہیلیاں اور میرے حلقے میں لڑکیاں عورتیں مجھے بہت سراہتی اور کہتی ہیں کہ روز بروز میری کم ہوتی جا رہی ہے اور میں سولہ برس کی دوشیزہ لگتی ہوں۔"

"میرے نزدیک ایسی زندگی جہنم سے کم نہیں ہے جسے عورت کسی اور نظر سے دیکھے..... تم بھول رہی ہو کہ عورت کی جوانی اور کشش چار دن کی چاندنی ہوتی ہے۔ پھر اندھیری رات..... عورت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب وہ ماں نہ بن جائے..... تمہاری اس سوچ اور خیالات اور احساسات کے باعث میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ مجھے اس خاندان کو چلانے کے لیے وارث چاہیے۔"

چشم زدن میں میری نظروں عرشی کی پرائیوٹ سیکریٹری شازیہ کا چہرہ اور سراپا گھوم گیا۔ وہ نہ صرف نہایت حسین تھی بلکہ بے پناہ پرکشش بھی۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے متعلق ایک دو مرتبہ سوچا بھی تھا کہ وہ اتنی حسین ہے اس کی منگنی..... شادی اب کس لیے نہیں ہوئی..... ! میرے دل کے کسی کونے میں شک کسی سانپ کی طرح کنڈل مار کر بیٹھ گیا۔ میں بہت ساری کمپنیوں کی لیڈی سیکریٹریز کے اپنے ایم ڈی او باس کے تعلقات کی کہانیاں سنی تھیں۔ ان میں مبالغہ نہیں تھا۔ بہت سارے ایم ڈی اور باس شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی پرائیویٹ سیکریٹری سے تعلقات رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی جو پرائیوٹ سیکریٹری وہ نوجوان' حسین' پرکشش اور پرشباب گداز بدن کی ہوتی تھیں۔ کوشش کی جاتی تھی کہ سیکسی ہو۔ ان کے باس جنسی طور پر ہراساں کر کے اور یہ پرائیوٹ سیکریٹری اپنے فائدے کے لیے ان کی لیول میں گر جاتی تھیں۔ باس کوئی فلیٹ کرایہ پر لے لیتے جہاں خفیہ ملاقاتیں اور وقت گزاری ہوتی تھی..... شادی شدہ جوان عورتیں بھی ہوتی تھیں لیکن ان کا پرکشش ہونا شرط ہوتا تھا اور پھر یہ عورتیں نہایت فیاضی سے مہربان ہوتی تھیں۔ اس لیے بھی بے خوف و خطر شادی شدہ ہوتی تھیں۔ میری ایک شادی شدہ سہیلی راشدہ کے شوہر ایم ڈی تھے۔ ان کی سیکریٹری شادی شدہ اور نوجوان تھی۔ اس کی شادی کو دو برس ہوئے تھے۔ راشدہ کسی کام سے اچانک ان کے دفتر گئی۔ جب وہ شوہر کے کمرے میں باہر ریڈ لائٹ دیکھ کر گھس گئی۔ دیکھا کہ سیکریٹری صاحب نہایت فیاضی سے مہربان ہو رہی ہیں۔ کمرا بیڈ روم بنا ہوا

ہے..... شازیہ نے منگنی کا یہ ظاہر کرنے کے لیے مشہور رکھا تھا کہ عرشی سے تعلقات کا شک نہ ہو۔ اتنی حسین اور سیکسی راشدہ کا دو برس تک شادی کا نہ ہونا مجھے شک میں مبتلا کرتا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ عرشی ایسے نہیں ہیں لیکن میرے ذہن میں یہ سوالات ڈنک بن کر لگ رہے تھے کہ اس کی شادی کیوں نہیں اور کس لیے نہیں ہوئی۔ آج اب اس وقت میری نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔

"تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ تم اپنی حسین اور نوجوان سیکریٹری مس شازیہ سراج پر مرمٹے ہو۔" میں نے سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں۔" آخر اس حرافہ نے تمہیں شیشے میں اتار ہی لیا..... میں کل ہی اس کمینی کے سیکسی جسم اور چہرے پر تیزاب پھینک دوں گی۔ اس کے چہرے کا جغرافیہ بگاڑ دوں گی۔ پھر دیکھتی ہوں تم اس سے کیسے شادی کرتے ہو۔"

"میں شازیہ سے شادی نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ آئندہ مہینے اس کی شادی اس کے کزن سے ہو رہی ہے جو دو برس کے بعد امریکہ سے آیا ہے اور وہ دونوں شادی کے بعد کناڈا چلے جائیں گے۔" عرشی بڑے پرسکون انداز سے بولے۔ "وہ عورت کوئی اور ہے اسے تمہارے فرشتے بھی نہیں جانتے ہیں وہ ایک انمول' نایاب اور قیمتی ہیرا ہے۔"

"تم اچھی طرح جان لو کہ میں کسی بھی عورت سے تمہیں دوسری شادی کرنے نہیں دوں گی۔" میں نے زور سے فرش پر پیر پٹخا۔ "کیوں کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم میری پہلی محبت ہو۔ میرا خواب ہو۔ مجھ سے دل بھر گیا تو تم نے کسی اور عورت کو دل دے دیا۔ اس کی محبت میں گرفتار ہو کر دوسری شادی کرنا چاہتے ہو..... یہ کمینگی نہیں بلکہ ذلالت بھی ہے۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا ہے..... عرشی..... ! عرشی..... میں اپنی محبت کا کسی قیمت پر خون ہونے نہیں دوں گی۔"

"مجھے دنیا کی کوئی طاقت دوسری شادی سے نہیں روک سکتی۔" عرشی مضبوط لہجے میں بولے۔

"اس حرافہ نے تمہیں اپنے بجلی بھرے بدن کے جادو اور نہایت فیاضی سے شاید مہربان ہو کر اور محبت کے جادو میں پاگل کر دیا ہے..... یقیناً اس نے تمہیں کچھ گھول کر پلا دیا ہے اور تم اس سے شادی کرنے پر تل گئے ہو۔" میں برافروختہ ہوگئی۔ "اس لیے ایک فلمی ہیرو کے انداز میں کہہ رہے ہو کہ میں اس شادی روک نہیں سکتی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عرشی نے سر ہلایا۔ "اگر میں اس قدر کم زور کردار کا مالک ہوتا تو کب کا غلاظت کے دل دل میں گر چکا ہوتا..... میرے لیے کبھی لڑکیوں عورتوں کی کوئی کمی نہیں رہی..... مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ تم میری بھی پہلی محبت ہو۔ میں نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد تمہارے سوا کسی عورت کو نہیں دیکھا۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔ تم تیسری بات مان لو ابھی اور اسی وقت یہ بات ختم ہو سکتی ہے۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا اور میری ہر صورت میں ہر بات کی اطاعت کرنا ہوگی۔ گھر کی چار دیواری بھی اس طرح رہنا ہوگا جس طرح میں چاہوں گا۔"

"کیا..... کیا تم میری آزادی سلب کرنا چاہتے ہو..... کیا تم نے مجھے ایک جاہل' اجڈ اور زرخرید کنیز سمجھ لیا ہے۔" میں نے حیرت سے عرش کی طرف دیکھا جو آج ایک دقیانوسی مرد کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ حیرت سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ عرشی کو یہ کیسا دورہ پڑ گیا ہے جو مجھ پر اس طرح کی پابندی عائد کرنا چاہتا ہے جو نچلے اور متوسط طبقے میں ایک کنواری لڑکی پر عائد کی جاتی ہے۔ شاید وہ بہک جائے اور بھٹک جائے۔

"میں تمہاری اس آزادی کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو بے حجابی اور جسمانی نمائش ہے بس تمہیں گھر سے دور بے زار اور نالاں کر دیا ہے۔ میں تمہیں صرف اور صرف ایک گھریلو عورت بنانا چاہتا ہوں۔ تم ایک رنگین تتلی بنی ہوئی ہو میں نہیں چاہتا کہ محفلوں کی زینت بنو..... ان محفلوں میں ایک عورت کی عزت

نہیں ہوتی اصل عزت اس گھر سے ہے۔ جس میں اس کا وقار اور مقام بھی ہے۔"

"اگر میں نے تمہاری ماں ماننے سے انکار کر دیا تو کیا کرو گے....." میں نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔

"مجھے طلاق دے دو گے..... اس لیے تمہارا راستہ صاف ہو جائے۔" یہ بات کہتے ہوئے میری نس نس میں سنسنی دوڑ گئی۔

"میں نے تمہیں طلاق دینے کی بات تو نہیں کی۔" عرشی نے جواب دیا۔ "نہ میں نے اس کے بارے میں بھولے سے بھی سوچا اور نہ میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔"

"کیا مطلب....." میں نے ششدر ہو کر ان کی شکل دیکھی مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "تم مجھے طلاق نہیں دو گے..... اور دوسری شادی بھی کرو گے....."

"تم ٹھیک سمجھیں....." عرشی نے سر ہلا دیا۔

"دوسری شادی کرنے کی صورت میں تم مجھے طلاق کیوں نہیں دو گے....." میں نے حیرت سے کہا۔ "تم دوسری شادی کی اجازت لینے کے لیے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔ دوسری شادی کرتے ہی دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال پھینک دو گے۔"

"مجھے دوسری شادی اس کے لیے نہ تو تمہاری محتاج ہے اور نہ تمہاری کسی اجازت کی ضرورت ہے۔" عرشی کہنے لگے۔ "نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں تمہیں اس لیے طلاق نہیں دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں کسی عورت میں کھونا نہیں چاہتا ہوں..... تمہارے ساتھ بھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ....." میں زہر خند مسکراہٹ سے بولی۔ "صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ تم بیک وقت دو حسین اور جوان عورتوں سے کھلونے کی طرح جی بہلانا چاہتے ہو۔ چوں کہ مجھ جیسی حسین عورت کا دل آسان اور جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس لیے تم مجھے کھونا نہیں چاہتے ہو..... کیوں۔ اصل بات یہی ہے نا..... مرد عورت کے معاملے میں کتنی دور کی سوچتا ہے۔ آج تمہارا اصل روپ میرے سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔"

"تم غلط انداز سے سوچ رہی ہو۔" عرشی بڑی سنجیدگی سے رک رک کر کہنے لگے۔ "تم اس تناظر میں مجھے دیکھو۔ میں کوئی عیاش آدمی نہیں ہوں اور نہ میں دوسری شادی کسی عورت کے حسن جسم اور شباب سے متاثر یا اس کی محبت میں گرفتار ہو کر کر رہا ہوں۔ اگر میں شادی محض عیاشی کے لیے کر رہا ہوتا تو تم سے بڑا احمق اور بے وقوف کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے اتنی دور جانے اور جھن جھٹ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنے دفتر کی کسی سیکریٹری یا کسی بھی حسین اور نوجوان لڑکی سے تعلقات قائم کر لیتا۔ میرے دفتر میں بہت ساری جوان لڑکیاں عورتیں خواب ناک زندگی گزارنے اپنا حسن اور جوانی کیش کرانے والی بھی ہیں۔ ان کی اتنی ضرورتیں اور خواب ہیں کہ اپنے آپ کو آلودہ کرتی رہتی ہیں۔ ان کا وجود ہر دفتر میں ہے۔ ان کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ کلیوں کے وجود سے اپنے آپ کو میلا کرتا رہتا اور تمہاری آنکھوں میں دھول جھونکتا رہتا..... تمہارے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگتی کہ میں کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ اب میرے پاس کیا نہیں ہے۔ کس چیز کی کمی ہے.....! کیا میرے لیے حسین لڑکیوں کا حصول کوئی مشکل کام ہے۔ اگر میں فطری طور پر ایک عیاش شخص ہوں تو غلط راستے پر چل پڑتا۔ میں تم سے کوئی غلط مطالبہ نہیں کر رہا ہوں جسے تم کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"نہیں..... میں اپنے آپ کی تقسیم نہیں کر سکتی۔" میں ترش روئی سے بولی۔ "میں ایک دن کے لیے کیا..... ایک لمحے کے لیے بھی یہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ جو مجھے سوکن بننے کا مشورہ دے رہے ہو میں اسے قبول کر لوں گی۔" میں بھڑک اٹھی۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" عرشی کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔ "تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو..... میری بات غور سے سنو..... میں تم دونوں کو الگ الگ رکھوں گا۔ تمہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسے دوں گا..... کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے تم پر ترجیح دوں گا۔ میں صرف اس کا ہو کر نہیں رہ جاؤں گا۔ مذہب نے دوسری شادی کے لیے جو مساویانہ شرائط رکھی ہیں اس پر دیانت داری سے عمل کروں گا۔ تم دونوں کو بھی کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے تو میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں تاکہ میری ناانصافی پر میرا گریبان پکڑ سکو۔"

"ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں....." میرا دماغ گھومنے لگا۔ میں اپنا غصہ دبا نہ سکی۔ "عرشی..... تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو تو بنا نہ سکو گے۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ غلط فہمی ہے۔ تم مجھے بے وقوف اور ناقص العقل سمجھتے ہو۔"

"ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں یہ بات میں بھی جانتا ہوں..... لیکن ایک شخص کی دو بیویاں ایک گھر میں رہ سکتی ہیں اور رہ بھی رہی ہیں۔ سینکڑوں گھر ایسی ہیں جہاں دو کیا تین تین بیویاں بھی ساتھ رہ رہی ہیں..... کیا دو بیویاں نہیں ہیں..... جوان بھی ہیں حسین ہیں..... ایک ہی کوٹھی میں رہ رہی ہیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی مثالی محبت دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ یہ آپس میں سوکنیں ہیں۔ یہ بات تم نے ہی تو مجھے متعدد بار بتائی تھی اور تم نے اس پر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا تھا کہ یہ کہی سنائی بات نہیں بلکہ میں نے تو دیکھا ہے۔ اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا..... لیکن میں تم دونوں کو ساتھ نہیں رکھ رہا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے ملو گی اور نہ ہی اس کی شکل دیکھو گی۔"

"میں اس صورت میں بھی تمہارے ساتھ گزار نہیں سکتی....." میں صدمے اور غصے سے بولی۔ "میرے لیے بڑا اذیت ناک ہوگا۔"

"تم جذباتی نہ بنو....." عرشی نے کہا۔ "فرزا! آخر اس میں کیا برائی ہے..... حرج ہی کیا ہے۔"

"اب تم میرا فیصلہ سنو عرشی....." میں نے پر ہیجان لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے دوسری شادی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یا پھر تم دوسری شادی چوری چھپے کر چکے ہو تو..... مجھے طلاق دے دو میں سوکن بن کر کسی قیمت پر رہنا نہیں چاہتی..... اس ذلت سے تو بہتر ہے کہ تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔ تم مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دے دو۔"

"طلاق....." عرشی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ چند لمحوں تک ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی جیسے میری بات ان کے دل کو صدمہ ہوا ہو۔ وہ تحیر زدہ لہجے میں کہنے لگے۔ "تم عورت ہو کر طلاق مانگ رہی ہو..... طلاق کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ عورت کے لیے ذلت، رسوائی اور شرم کی بات ہے۔ جانتی ہو جب کوئی اپنے شوہر سے طلاق مانگتی ہے تو عرش تک لرز اٹھتا ہے۔ خدا کو بھی یہ بات پسند نہیں ہے۔ خدارا..... زبان سے یہ لفظ نہ نکالو۔"

"عورت کو بھی طلاق اور خلع لینے کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے۔ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور مجھ پر ظلم بھی ہو رہا ہے اس لیے طلاق لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" میرے سینے میں سانس پھولنے لگی۔ پھر میں چیخ کر نفرت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ "تم مجھے اپنی چرب زبانی سے بہلانے اور سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں کوئی پندرہ سولہ برس کی لڑکی نہیں ہوں جو تمہاری باتوں کے فریب میں آ جاؤں گی..... آج میں نے تمہارا اصل چہرہ دیکھ لیا ہے۔ جو گھناؤنا اور مکروہ ہے۔ کیا میں اتنا بھی سمجھ نہیں سکتی اور جانتی نہیں ہوں کہ تم مجھے طلاق دینا کس لیے نہیں چاہتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ تم مجھے اپنی ملکیت اور زرخرید بیوی سمجھتے ہو۔ تم یہ نہیں چاہتے ہو میں کسی اور مرد کی ملکیت بن جاؤں اور وہ مجھے پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہو جائے۔"

"نہیں..... میری جان فرزا.....! نہیں یہ بات

نہیں۔'' عرشی پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ ''طلاق لینے کے بعد تم اس عزت اور مقام سے محروم ہو جاؤ گی جو تمہیں اس وقت نصیب ہے اور تمہیں اس بات کا بالکل بھی احساس نہیں ہو رہا ہے۔ طلاق یافتہ عورت معاشرے میں دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ طلاق ہونے سے بہتر ہے کہ تم سوکن بن کر رہو۔''

''اگر میں سوکن بن کر رہوں مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا.....! کیا معاشرے میں میری عزت دو چند ہو جائے گی۔'' میں نے استہزائی لہجے میں کہا۔

''اس طرح تم پر انگلیاں نہیں اٹھیں گی۔ کوئی تمہیں نفرت اور حقارت سے نہیں دیکھے گا۔''

''عورت طلاق لے لے تو دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے..... اور مرد دوسری شادی کرے تو اسے تحفہ مل جاتا ہے۔'' میں نے جذباتی انداز سے کہا۔

''خوب..... بہت خوب۔'' میں نے تالیاں بجائیں۔ ''یہ تم جیسے ہوس پرست اور مفاد پرست مردوں کی ذہنی اختراع جو ہمیشہ اپنے حق میں دور کی کوڑی لاتے ہیں اور عورتوں کی تذلیل و توہین کرتے ہیں لیکن میں اس بات کو نہیں مانتی..... تم خود غرض ہو۔ تم مجھے کھلونا بنا کر رکھنا چاہتے ہو تاکہ پانچوں انگلیاں گھی میں رہیں۔ رند کے رند رہے جنت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ میں نے طلاق لینے کا فیصلہ ہی نہیں بلکہ تہیہ بھی کر لیا ہے مجھے طلاق چاہیے۔ میں سوکن اور تمہاری غلام بن کر رہنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہوں۔''

''جذبات کی رو میں بہہ کر مت سوچو فزا!'' عرشی نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ ''تم ٹھنڈے دل سے ایک حقیقت پسند عورت کی طرح سوچو گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ تمہاری عزت اور ایک خوش گوار زندگی ایک مرد سے وابستہ رہنے ہی میں ہے اور زندگی کا سب سے خوب صورت وقت بھی یہی ہے۔ یہ وقت بھی بہت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ تم اٹھائیس برس کی ہو رہی ہو اور علیحدگی کی صورت میں تم دوبارہ اپنا گھر بسانا چاہ رہی ہو تو یہ اتنا آسان نہیں ہوگا جیسا کہ تم سمجھ رہی ہو۔ کیوں کہ ہزاروں حسین اور نوجوان لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی ہیں اور پھر ہمارے معاشرے میں ایک بیوہ اور مطلقہ عورت چاہے وہ کتنی ہی حسین اور جوان اور بے پناہ پرکشش ہی کیوں نہ ہو بہت کم لوگ شادی کے لیے تیار ہوتے ہیں اور شادی کے بعد اس عورت کو وہ عزت اور مقام نہیں ملتا جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ وہ شادی کر کے پچھتاتی ہے یا پھر احساس کمزوری اور محرومی اور کم تر ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے عورت کی اس دوسری شادی میں پہلی والی بات ہو ہی نہیں سکتی..... میں نہیں چاہتا کہ آنے والا دن عمر گزشتہ کی کوتاہی کا پچھتاوا بن جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لو۔ عجلت سے کام نہ لو۔''

''مجھے تمہاری لیکچر بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں پھنکاری میں تمہارے دوسری شادی کرنے کی صورت میں ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اگر تم نے مجھے طلاق نہیں دی تو پھر میں عدالت سے خلع لے لوں گی۔''

''میں تمہیں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔'' عرش ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اس وقت تم نہ صرف بے حد جذباتی ہو رہے ہو بلکہ تمہارا دماغ بھی ماؤف ہو رہا ہے بہتر ہے تم اپنے گھر والوں اور اپنی شادی شدہ سہیلیوں سے مشورہ کر لو شاید ان میں سے تمہیں کوئی یہ مشورہ دے اور رہنمائی کرے۔ میں شاکر کے ہاں جا رہا ہوں۔''

عرشی رکے نہیں۔ اپنا کوٹ اٹھا کر نکل گئے۔ میں بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے پلنگ پر کٹی پتنگ کی طرح گر گئی۔ پھر میں ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معلوم نہیں کتنی دیر زار و قطار روتی رہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ آنسو میری اس مخمل کا حل نہیں ہیں۔ عرشی مجھ پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اس کا سدباب کرنا پڑے گا۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ معلوم نہیں وہ کون تھی جس نے عاشی کو اپنا اسیر بنا لیا تھا۔

مجھے اپنی سہیلی شاہدہ کا خیال آیا۔ وہ اپنے شوہر کی پہلی بیوی تھی اور اس کے شوہر نے بھی دوسری شادی کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی دوسری بیوی کو الگ رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے مل کر مشورہ کرنا چاہیے۔ اس پارٹی میں اور بھی تو سہیلیاں آ رہی ہیں۔ ان کی رائے بھی تو معلوم کروں۔ دیکھوں وہ کیا کہتی ہیں۔

میں اٹھی اور پھر سے تیار ہونے لگی۔ آنسوؤں نے میرے میک اپ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ جلدی سے تیار ہونے کے بعد میں نے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے چہرے اور سراپا کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا کہ کہیں مجھ میں کوئی کمی پیدا تو نہیں ہو گئی ہے جس نے میری کشش، حسن اور سراپا کو متاثر کیا ہو۔ میں نے ہر طرح، ہر زاویے، رخ اور سکون اور آزادی سے جائزہ لیا۔ میں فلیٹ میں اکیلی تھی۔ کسی کے دخل اور مخل کا کوئی اندیشہ نہیں تھا..... میں ساڑی کسی بھی رنگ کی پہن لوں اس میں مجھے دیکھ کر لوگوں کو سولہ برس کی دوشیزہ کا دھوکا ہوتا تھا جس پر نوجوانی کا آغاز ہے اور وہ ٹوٹ کر برس رہی ہے۔ اٹھائیس برس کی عمر ہونے کے باوجود میری صحت ایسی تھی کہ لگتا تھا کہ روز بروز پھر سے جوان ہوتی جا رہی ہوں۔ آسمانی رنگ کی ساڑھی میں میرا چھریرا متناسب بدن خوب سج رہا تھا اور میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ میرے رسیلا اور شاداب بدن جو کسی کچے پھل کی طرح آخر وہ کون عورت ہے جس کا جادو عرش پر چل گیا ہے۔

جب میں پارٹی میں پہنچی تو وہاں رونق پورے شباب پر تھی۔ ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ ہر چہرہ دمکتا اور آنکھیں چمکتی ہوئی تھیں۔ میرا دل اندر سے مردہ ہو چکا تھا۔ اس لیے میرے دل کو کوئی خوشی نہ ہو سکی۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ مجھ پر کیا بجلی گری ہے اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ میں دل پر جبر کی سل رکھ کر ہنستی بولتی تقریب میں گرم جوشی سے حصہ لیتی رہی۔ کسی کو اس بات کا احساس ہوا کہ میں بہت غم زدہ ہوں اور دل اندر سے خون کے آنسو رو رہا ہے۔

پارٹی میں چوں کہ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی اس لیے میں نے شاہدہ، انیلا، عنبرین اور خالدہ کو ساتھ لیا اور کلفٹن آ گئی۔ ہم پارٹی سے جلد اٹھ گئی تھیں۔ شاہدہ کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ کیوں کہ میں انہیں اصرار کر کے پراسرار سے انداز سے لے آئی تھی۔ راستے میں شاہد کے دریافت کرنے پر میں نے ان سے کہا تھا کہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ میں اس مسئلے پر ان سے بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ کلفٹن پہنچا تو میرے دل میں ایک برچھی سی اتر گئی۔ کیوں کہ چاندنی رات تھی۔ چاندنی راتوں میں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد میں اور عرشی اکثر یہاں آتے رہتے تھے۔ چاندنی راتیں ہماری محبت کی امین تھیں۔ آج کی چاندنی رات تو کسی زہریلے خنجر کی طرح میرے دل میں اترنے لگی تھی لمحہ لمحہ میرے لیے نہ صرف اذیت ناک بلکہ سوہان روح بھی تھا۔ میرا سینہ اندر سے کٹ رہا تھا۔ اپنا لہو میں آپ پی رہی تھی۔

ریت کے ٹیلے پر بیٹھنے کے بعد میں نے عرشی کی دوسری شادی کے بارے میں پوچھا۔ ''تم لوگ کیا کہتی ہو۔''

ان پر جیسے گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ وہ جیسی کچھ سوچنے لگی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد شاہدہ نے اس حکومت کو توڑتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا مخلصانہ مشورہ مانو..... تو میں یہ کہوں گی کہ تم طلاق لینے کی حماقت کرنے اور پیروں پر کلہاڑی مارنے سے بہتر ہے کہ سوکن بن کر رہو۔ یہ تمہارے حق میں زیادہ مفید اور بہترین ہوگا۔''

''میں اس کمینی، حرافہ عورت کو اپنے سینے سے لگا لوں جو میرا گھر اجاڑ رہی ہے۔'' میں نے برہمی سے

کہا۔ ”وہ میری محبت اور ارمانوں کا خون کر رہی ہے۔ میری محبت اور میرا شوہر مجھ سے چھین رہی ہے۔“

”اگر تمہیں اپنا گھر اور اپنا شوہر اور محبت اتنی ہی عزیز ہے تو عرشی بھائی کی بات ان سے سمجھوتا کر لو۔ ان کی مرضی خواہش کے مطابق زندگی گزارو۔“

”میں عرشی کی جوتی بن کر رہوں یہ مجھے پسند نہیں ہے۔“ میں بھڑک اٹھی۔ ”میں اس شخص کی نوکرانی یا ملکیت نہیں ہوں‘ میں بھی برابر کے حقوق رکھتی ہوں۔ میں کوئی گرے پڑے گھر سے نہیں ہوں۔ میں اعلا تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ یہ مت بھولو۔“

”دنیا کس تیزی سے ترقی کر چکی ہے اور کرتی بھی جا رہی ہے اس کے باوجود مرد کی برابری نہیں کر سکی۔“ شاہدہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مرد کو ایک لحاظ سے جو برتری اور افضلیت ہے وہ عورت کو نہیں..... عورت کو حقوق مرد سے بھی زیادہ ہیں۔ پھر بھی وہ مرد کی محکوم ہے..... کیا تم نے اخبار میں مغرب اور یورپ کی خبریں نہیں پڑھیں..... وہاں کے مرد اپنی بیویوں کو مار پیٹتے ہیں تشدد اور ہراساں کرتے ہیں ایذائیں دیتے ہیں..... آٹے میں نمک کے برابر عورتیں حالات سے سمجھوتا کر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔“ اگر تم نے طلاق لے لی تو اپنی زندگی کی سب سے بھیانک ترین غلطی کرو گی۔“

”تم اس بڑھیا کھوسٹ کی باتوں میں نہیں آنا۔“ انیلا نے درمیان میں تیزی سے کہا۔ ”آج عورت اور وقت اور زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ عورت بہت آگے نکل چکی ہے میں اس بات کو مانتی ہوں۔“ شاہدہ بولی۔ ”لیکن اس نے پایا کیا۔ وہ کیا در بدر کی ٹھوکریں نہیں کھا رہی ہے..... اس کی ازدواجی انتہائی تلخ اور ناخوش گوار ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے ہاں طلاق اور خلع لینے کی شرح روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ماضی میں ایسی بات نہیں تھی۔ کل ہی میں نے سارا اخبار بھی پڑھا تھا کہ فیملی کورٹس میں سولہ ہزار مقدمات زیر سماعت ہیں عورت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے۔“

”یہ مرد..... مرد دوسری شادی کر کے دوسری بیوی کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور پہلی بیوی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔ ان کی محبت محض ایک ڈھکوسلہ اور فریب ہوتی ہے۔ یہ نارآستین ہوتے ہیں۔“ عنبرین بولی۔

”تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں اس سے اتفاق کرتی ہوں لیکن تم یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں۔“ میں نے بے بسی سے پوچھا۔

”تم عرشی کو شوٹ کیوں نہیں کر دیتی ہو۔“ عنبرین نے مشورہ دیا۔ ”نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔“

”شاباش ہے۔“ شاہدہ نے ملامت کے انداز میں کہا۔ ”تمہیں اس سے ایسی کیا عداوت اور دشمنی ہے کہ جو اس سے انتقام لینا چاہتی ہو۔ اس غریب کو نہ صرف بیوہ کر دینا چاہتی ہو بلکہ پھانسی کے تختے پر بھی۔“

”دوسری شادی عورت پر ایک عذاب ہے اس لیے امریکہ یورپ اور دیگر مذاہب میں اس کی اجازت نہیں ہے اور دوسری شادی کرنا جرم ہے۔“ عنبرین بولی۔

”وہ سوکن بن کر کبھی کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتی۔“

”امریکہ اور یورپ کی مثال مت دو اور موازنہ نہ کرو۔“ شاہدہ کہنے لگی۔ ”وہاں جنگل کا قانون ہے..... وہاں دوسری شادی جرم ہے لیکن داشتہ رکھنا‘ سیکریٹری یا اپنے دوست کی بیوی‘ گرل فرینڈ سے تعلقات رکھنا جرم نہیں ہے۔ وہاں حرام اور ناجائز بچوں کو بھی قانونی تحفظ مل جاتا ہے..... میری بھی تو سوکن ہے تم سب جانتی ہو وہ میرا اور میرے بچوں کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا دوسری بیوی اور اس کے بچوں کا..... وہ اپنے گھر میں خوش ہے اور میں اپنے گھر میں۔“

”اس لیے کہ تم لاکھوں میں ایک ہو اور ابھی نہ

تمہارا حسن ماند پڑا اور نہ جسم متاثر ہوا..... نشیب و فراز میں نوجوان لڑکیوں کی سی کشش اور دل کشی بھی قائم ہے۔“ خالدہ بولی۔ ”اس کے باوجود تمہارے شوہر نے دوسری شادی کیوں کی..... جب کہ تم حسین بھی تھیں اور تمہارے بچے بھی ہیں..... کیا عیاشی کے لیے..... تمہاری سوکن کو جانتی ہوں۔ وہ بڑی سیکسی بھی ہے۔“

”جب میری شادی کو دو برس کا عرصہ ہو گیا اور میں ماں نہیں بن سکی تو کئی ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔“ شاہدہ بتانے لگی۔ ”رپورٹوں سے ظاہر ہوا کہ میں بانجھ ہوں۔ میں ماں نہیں بن سکتی۔ انہوں نے مجھ سے دوسری شادی کے لیے اجازت مانگی تھی۔ میں نے اپنی خوشی اور مرضی سے اجازت دے دی۔ ان کی دوسری شادی کے بعد ہم دونوں اتفاق سے امید سے ہو گئیں۔ اللہ میاں کو میری نیکی بھا گئی تھی۔“

”سوکن بننے سے بہتر ہے کہ تم عرشی سے طلاق لے لو۔“ انیلا نے مشورہ دیا۔ ”تم شاہدہ کی باتوں میں نہ آؤ۔“

”طلاق لینے کے بعد فزا کیا کرے گی.....“ شاہدہ بولی۔ ”کیا اس عمر میں طلاق لینا مناسب اور زیب دیتا ہے۔“

”فزا..... عرشی سے طلاق لے کر دوسری شادی کر سکتی ہے۔“ انیلا کہنے لگی۔ ”اور پھر یہ حسین اور جوان بھی ہے۔“ پھر انیلا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”میری جان! تمہیں آج بھی کتنے مرد دیکھ کر سرد آہیں بھرتے ہیں اور تم قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں..... کسی بہانے قریب ہو کر تمہارا حسن پا لیتے ہیں..... قیصر ملک اپنی امریکی بیوی کو طلاق دینے کے بعد حسین ساتھی کی تلاش میں سرگرداں ہے‘ در بدر کی خاک چھان رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری طلاق کی خبر سنتے ہی وہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی ہے۔ ڈیفنس میں ہزار گز کا بنگلا ہے۔ نئے ماڈل کی ایک نہیں تین تین گاڑیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ماہ تین ماہ کے بعد امریکہ سے آتا ہے..... اور پھر یورپ چلا جاتا ہے..... نہ صرف وجیہہ ہے بلکہ امریکی فلموں کے ہیرو کی طرح دراز قد اور چاق و چوبند بھی ہے..... اور پھر خوب صورت بھی تو ہے۔“

”ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ عورت کی شادی ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ شاہدہ تیز لہجے میں بولی۔ ”تم سب فزا کو غلط مشورے دے کر اس کی زندگی غارت نہ کرو..... کیا تم نے دیکھا نہیں اور یہ بات علم میں نہیں ہے کہ کتنی لڑکیاں اس کی طلاق کی خبر سننے کے بعد اس گھر نے کے چکر میں دور تک چلی گئی ہیں۔ وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا ہے۔“

”کون کہتا ہے کہ مطلقہ عورت کی شادی نہیں ہو سکتی۔“ خالدہ کا پارہ چڑھ گیا۔ ”فزا کا کوئی بچہ نہیں ہے جو اس کی شادی میں رکاوٹ کا سبب بن سکے۔ ہماری سہیلیوں میں ریحانہ اور نگہت کی شادی نہیں ہوئی کیا۔ جب کہ دردانہ کی ایک نو برس کی لڑکی بھی تھی..... نگہت کے تو تین بچے تھے..... اصل بات یہ ہے کہ ایک عورت کا شادی کے لیے حسین اور جوان اور اس کا جسم پرکشش ہونا شرط ہے۔ ان تینوں کی مالک ہماری فزا ہے..... یہ کسی حسینہ عالم سے کم نہیں ہے۔“

”خالدہ سچ کہتی ہے۔“ عنبرین تائیدی لہجے میں بولی۔ ”تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔“

”ان دونوں کی شادیاں معاشقے کا نتیجہ تھیں۔ ریحانہ کا شوہر سرفراز ایک فرم میں کیشیئر تھا۔ ریحانہ کے خواب پورے کرنے سے قاصر رہا تھا۔ ریحانہ کا کزن رات امریکہ سے آیا تو ریحانہ پر لٹو ہو گیا۔ ریحانہ کی محبت رنگ لائی اور دونوں آلودہ اور ایک دوسرے کی کم زوری بن گئے۔ ریحانہ نے اپنے بدن کا جادو چلایا اس لیے کہ سرفراز کے مقابلے میں راشد ڈالر لے کر آیا تھا۔ اس لیے طلاق لے کر شادی کر لی..... اور نگہت کا بوڑھا ایم ڈی نگہت پر ریشہ خطمی ہو گیا۔ نگہت کی زندگی میں شادی سے قبل دو تین مرد آئے تھے۔ اسے تجربہ تھا کہ مردوں کو کیسے خوش کیا اور پھانسا جاتا ہے۔ ان دونوں کی شادی دو برس بھی نہ

چل سکی۔ ریحانہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ امریکہ گئی تو اسے طلاق ہوگئی۔ بچی خاوند کے پاس ہے۔ وہ ویٹرس بن گئی۔ اسے تنخواہ' بخشش کے علاوہ کالی راتوں سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ ہر ماہ ایک معقول رقم گھر بھیجتی ہے۔ نگہت کی سنو...... اس کے بوڑھے شوہر نے ایک مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ غلاظت کے دلدل میں دھنسا دیکھا۔ اس نے دونوں کو رنگے ہاتھوں دھر لیا۔ پھر اس نے نگہت کو طلاق دے دی۔ وہ نہ صرف بیس ہزار کی تن خواہ بلکہ بوڑھے مال دار شوہر سے بھی گئی۔ اب وہ تین ہزار کی ملازمت کر کے زندگی کاٹ رہی ہے۔ تم یہ سب کیوں چھپا رہی ہو۔''

''اس میں ریحانہ اور نگہت کی حماقتیں شامل تھیں۔ ورنہ انہیں طلاق نہ ہوتی۔ ادھر فزا نے عرشی سے طلاق لی ادھر اس سے شادی کرنے کے لیے دس امیدوار کھڑے ہوں گے۔ ایسی چاند سی دلہن چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو تم اپنے بھائی سے فزا کی شادی کر دو۔'' شاہدہ برجستہ بولی۔ ''تم ان کے لیے تین ماہ سے حسین لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہو نا...... نہ جانے کس کس سے کہتی پھر رہی ہو۔ تمہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔ فزا تو لاکھوں میں ایک ہے۔''

شاہدہ اور خالدہ میں تلخی پیدا ہوگئی...... شاہدہ نے اسے خوب کھری کھری سنائی کہ تمہاری محبت' تعریف اور جذبہ کہاں گیا...... کیوں نہیں اسے بھابھی بنا لیتی ہو...... اس لیے پیچھے ہٹ رہی ہو کہ فزا مطلقہ ہوگی۔ یہ کڑوا کسیلا گھونٹ دنیا والوں کو پلانا چاہتی ہو ذرا خود بھی تو پی کر دیکھو...... چوں کہ ماحول میں بدمزگی گھل رہی تھی اس لیے ان دونوں کو چپ کرا کے میں اٹھی۔ میں ان سب کو ڈراپ کر کے گھر پہنچی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہم سب وہاں کوئی تین گھنٹے تک بیٹھی رہی تھیں اور ایسی کوئی تدبیر سوچتی رہی تھیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے...... انیلا کی یہ تجویز بھی تھی کہ اس حرافہ کو تلاش کیا جائے جس نے میرے حسن مجسم کا سحر ماند کر دیا اور اسے اس طرح سے بہکایا جائے اور عرشی کی کردار کشی کی جائے اور اس سے کہا کہ جائے۔ عرشی نے دفتر کی کئی لڑکیوں اور عورتوں کو آلودہ کیا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ انہیں جنسی طور پر ہراساں کرنا اس کا فن اور کمال بھی ہے۔ انیلا کی ایک ساتھی لڑکی جو شوبزنس میں تھی۔ ماڈلنگ کرتی تھی۔ ماڈل گرلز اور کال گرلز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ عرشی کی دوسری ہونے والی بیوی سے مل کر کہہ سکتی تھی کہ میں عرشی کی داشتہ ہوں۔ شاہدہ کا کہنا تھا کہ اس عورت کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔ شرلاک ہومز ہوتا تو اس کے لیے بھی مشکل تھا۔ عرشی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

میری بھی یہ خواہش تھی کہ میں طلاق نہ لوں اور عرشی دوسری شادی کا ارادہ ترک کر دیں۔ یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ عرشی کی تمام شرائط بلا چوں و چرا تسلیم کر لوں۔ اپنی شکست مان کر اس شخص کے آگے جو میرا شوہر ہے ہتھیار ڈال دوں۔

لیکن یہ بات میرے لیے ناممکن تھی۔ اس میں میری انا اور عزت کا سوال تھا۔ یہ ذلت اور سبکی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جو میرے حلقے اور خاندان اور محلے میں ہوتی کہ...... فزا کو طلاق ہوگئی۔ اسے جو اپنے حسن پر غرور' بڑا زعم اور گھمنڈ تھا...... نازاں تھی وہ سب خاک میں مل گیا۔ اب وہ اس مکھی کی طرح ہے جسے دودھ میں سے نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔ اس لیے اس نے بہتر تھا کہ زہر کھا کر مر جاؤں۔ صرف ایک شاہدہ تھی جس نے مجھے سختی سے طلاق لینے سے منع کیا تھا۔ جب کہ تینوں سہیلیوں کا مشورہ یہ تھا کہ میں عرشی سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لوں۔ سوکن نہ بنوں۔ عرشی کے دباؤ میں نہ آؤں۔ آخر یہ مرد اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ طلاق لے کر عرشی کی عزت اور منہ پر ایسا جوتا مارو کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔

عرشی گہری نیند میں غرق تھی جیسے بے ہوشی کی حالت میں ہوں۔ ان کے چہرے پر بلا کا سکون اور

سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ کرب واذیت کی ایک لکیر تک بھی نہ تھی۔ کسی درد کی پرچھائیاں تک نظر نہ آ رہی تھیں۔ کیا میں جوانی کی آغوش میں ہوتی تھی اور وہ میرے چہرے پر جذباتی اندازہ والہانہ پن اور خود سپردگی سے جھک کر مجھے دیوانہ بناتے تھے کیا میں اس سے محروم ہو جاؤں گی۔ ان کے سکون اور طمانیت سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دوسری شادی کا رنگین اور سہانا خواب دیکھ رہے ہوں۔ ان کی دوسری بیوی حجلہ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی ہے۔ وہ اس سے پیار بھری باتیں کر رہے ہوں۔ عہد و بیان کیا جا رہا ہو۔ وہ اس سے جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ فزا کو تو میں نے تمہاری خدمت کے لیے ملازمہ بنا رکھا ہے۔ تاریک فضا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاند گہرے بادلوں کی آغوش میں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ساری کائنات رک گئی ہو۔ میرے دل کے کسی کونے میں نفرت کی شدید اور وحشیانہ لہر اٹھی۔ میرے جی میں تو آیا کہ کچن میں جا کر سبزی کاٹنے والی چھری اور پوری طاقت اور سفاکی سے ان کے سینے میں اتار دوں۔ پھر ان کے درد سے تڑپنے اور مرنے کا دل خراش منظر دیکھا اور ان کی نظروں کے سامنے کھڑی فاتحانہ قہقہے لگاؤں۔

کپڑے بدلتے وقت میرا خیال تھا کہ کسی آہٹ سے ان کی آنکھ کھل جائے گی۔ کمرے میں جو دودھیا رنگت کا زیرو پاور کا نائٹ بلب جو جل رہا تھا اس نے مجھے شعلہ مجسم بنا دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس ملگجی روشنی میں عورت خواب آفریں ہو جاتی ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس روشنی میں میرا بدن کسی شعلے کی طرح آنچ دے رہا تھا۔ میں نے ہلکی سی آہٹ بھی کی تھی کہ وہ بیدار ہو جائیں اور مجھے بے پردہ دیکھ کر بستر سے نکل کر مجھے دبوچ لیں اور بستر پر لے جائیں لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ میں شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر دراز ہونے کی بجائے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ دل زندگی سے اچاٹ اور پریشان تھا۔ میں سوچنے لگی' ماضی حال بن گیا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور پورے خاندان میں مجھ جیسی حسین لڑکی کوئی نہ تھی۔ گو میرے والدین متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے میری تعلیم و تربیت ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کی طرح کی تھی۔ کیوں کہ وہ نام و نمود اور نمائش پر مرتے تھے۔ پھر وہ میرا مستقبل انتہائی شان دار بنانا چاہتے تھے۔ میں انگلش میڈیم اسکول سے سینٹ جوزف کالج پہنچی۔ اس کالج میں اعلا گھرانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ میرے والدین کا خیال تھا کہ کالج زینہ ہے کسی اعلا گھرانے کی بہو بننے کا...... ان کی یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ انہوں نے بہت دور کی سوچی اور دور اندیشی سے کام لیا تھا۔ وہ وقت سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے تھے۔ میں نے اس زینے پر قدم رکھ دیا تھا۔ مجھے ایک ایک سیڑھی چڑھنا تھا۔ تب کہیں جا کر میں منزل پر پہنچ سکتی تھی۔ مجھے اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ میں اپنے سندر سپنوں اور راستے پر چل کر ہی پا سکتی ہوں۔ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں اور کسی شہزادی سے کم نہیں ہوں۔

کالج میں ایک سے ایک حسین لڑکی تھی موجود تھی۔ میرا شمار بھی ان لڑکیوں میں ہونے لگا۔ ان لڑکیوں پر فوقیت اس لیے تھی کہ میں جسمانی طور پر ان لڑکیوں سے کہیں پرکشش تھی۔ میری کشش اور نشیب و فراز اور گوری رنگت نے میری ہم جماعت لڑکیوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ میری نہ صرف گرویدہ ہوگئی بلکہ رشک کرتی تھیں اور اس کشش و تناسب اور جاذبیت کا راز دریافت کرتی تھیں تاکہ لڑکوں مردوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ اس کے حسن و جمال کو داد ملتی رہے۔ اس کے لیے وہ دنیا بھر کے جتن کرتی رہتی تھی اور جانے کن کن بیوٹی اور سلمنگ پارلرز کے خاک چھانتی رہتی تھیں۔ کیوں کہ ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی' لیکن یہ تو قدرت کا ایک انمول عطیہ تھا اس میں میرا کوئی دخل نہیں تھا۔

''فزا ڈارلنگ!'' میری ہم جماعت لڑکی کہتی

تھی۔ ”تم عالمی مقابلہ حسن میں حصہ لو تو میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ملکہ عالمی حسینہ منتخب کر لی جاؤ..... ہندوستان کی کئی لڑکیاں ملکہ حسن منتخب ہو کر شہرت اور دولت کما رہی ہیں اور فلموں میں ہیروئن بھی آ رہی ہیں..... زمین سے آسمان پر پہنچ کر ستاروں کی طرح جگ مگا رہی ہیں۔“

”لیکن میرے والدین اس کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”وہ کس لیے.....“

”اس لیے کہ لڑکی کو نیم برہنہ اور بے حجاب اور جسم کی نمائش کرنی پڑتی ہے۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے..... اس کے بغیر انتخاب ہونا مشکل ہوتا ہے۔ تمہارے جسمانی فگرز دنیا کو پاگل کر دیں گے اور پھر دولت اور شہرت ایسی نہیں مل جاتی ہے۔ تم دولت میں کھیلنے لگو گی۔“

میں کہتی..... ”میں نے سنا ہے کہ کئی بیویوں کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کام یابی ناممکن ہے۔“

پھر ایک لڑکی کہتی۔ ”اس میں حرج ہی کیا..... کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پہلی شرط ہوتی ہے..... اور پھر جو حسینہ عالم منتخب ہو جاتی ہے انہیں کراؤ اور ارب پتی کے ساتھ راتیں کالی کرنی پڑتی ہیں۔ کرتی ہیں۔ پھر وہ کروڑ پتی بن کر لوٹتی ہیں۔ جتنی ہندوستانی حسینہ عالم بن کر لوٹیں تو وہ کروڑ پتی تھیں۔ کاش! میرا فگر تمہارا جیسا ہوتا میں اس سے فائدہ اٹھاتی۔“

”کیا تمہارے گھر والے اس بات کی اجازت دے دیتے.....“

”کیوں نہیں..... کیوں کہ ہمارے والدین دقیانوسی خیالات کے نہیں ہیں۔ نہایت وسیع الخیال ہیں۔“

یہ بات ایک نہیں کئی لڑکیاں کہتی تھیں۔ وہ بہت بولڈ تھیں۔ ان کا رہن سہن اور لباس بھی ان کی طرح ہوتا تھا لیکن سب سے زیادہ حیرت کی یہ بات تھی کہ وہ شہرت پانے کے لیے غلاظت میں گرنے کو معیوب نہ سمجھتی تھیں۔

اس نے تو بہت پہلے ہی سے یہ بات میرے ذہن میں بٹھا دی تھی کہ مجھے کسی بڑی گھر کی بہو بننا ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو پسند کرتی رہوں۔ میری خود بھی یہی خواہش اور تمنا تھی۔ مجھے اخراجات کے لیے دل کھول کر رقم دی جاتی تھی تاکہ میرا سہیلیاں یہ نہ سمجھیں کہ میرا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ کسی سہیلی کے ہاں کوئی بھی تقریب ہوتی تو میں ہمیشہ نیا اور بے حد قیمتی جوڑا پہن کر جاتی تھی۔ کار اور کہیں بھی پرائیوٹ ٹیکسی میں آتی جاتی تھی جو رینٹ اے کار والوں سے طے کیا ہوا تھا۔ سہیلیوں کی سال گرہ کے موقع پر میں بھی ایسا قیمتی تحفہ دیتی تھی جو بڑے گھروں کی لڑکیاں دیتی تھیں۔ اس لیے میری بڑی عزت اور قدر کی جاتی تھی۔

میرے ابو ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے اس لیے میرے شاہانہ اخراجات برداشت کرتے تھے۔ انہوں نے میرے تاب ناک مستقبل کے لیے رشوت لینے لگے تھے۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کون سا ابو سرکاری دفتر اور محکمہ تھا جہاں کرپشن نہیں تھے۔ اوپر سے نیچے تک حمام میں سب ننگے تھے۔ انہوں نے گھر کی آرائش وزیبائش کے لیے ایسے لوازمات کیے تھے کہ ایک سرکاری ملازم اور متوسط طبقے کے فرد کے لیے بہت مشکل تھا۔ میرے اور ابو کے کمرے اور نشست گاہ ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ جب میرے ہاں ایسی کوئی تقریب جس میں ہم جماعت لڑکیوں کو مدعو کیا جاتا تو ایئر کنڈیشنرز آن کر دیے جاتے تھے۔

بی اے فائنل کا امتحان ختم ہوا تو تہمینہ نے اپنے گھر میں ایک شان دار پارٹی اپنی تمام سہیلیوں اور ہم جماعت لڑکیوں کو بھی دی تھی۔ اس کے ہاں اس روز پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس روز اس نے میرا تعارف اپنے گھر والوں سے کرایا تھا۔ عرشی اس کے سب سے بڑے بھائی تھے اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایم ڈی کے عہدے پر فائز تھے۔ عرشی بہت کو خوب صورت، وجیہ خوش پوشاک اور اسمارٹ تھے۔ ان کی

شخصیت میں ایسا سحر تھا کہ اس پہلی ملاقات نے مجھے ان کا اسیر بنا دیا وہ بھی میری ذات سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ میرے حسن کا جادو ان پر چل گیا تھا۔ ہم دونوں ملنے اور سیر و تفریح اور ڈنر پر جانے اور شاپنگ کرنے لگے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ جب ہم چاندنی راتوں میں ساحل سمندر پر آئے تو ٹہلتے ٹہلتے دور تک نکل کر ویرانے میں آ جاتے جہاں تنہائی اور ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ ہوتا تھا عرشی تھوڑی دیر تک من مانی کرتے لیکن کبھی وہ بہکے اور نازیبا حرکت کی تھی۔

میری اور سہیلیوں نے اپنے گھر والوں اور اپنے بھائیوں سے بھی ملایا تھا۔ وہ صاحب حیثیت اور ماڈرن لوگ تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے ان میں سے کسی سے محبت ہو سکی اور نہ پسند آئے۔ عرشی میرے لیے نہ صرف اور اتی بلکہ میرے دونوں کے لیے بھی آئیڈیل تھے۔ جب انہوں نے اپنا رشتہ بھیجا تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر ان سے میری شادی ہو گئی۔

ہنی مون منانے کے لیے وہ سوات لے گئے۔ وہاں سے مری..... مری کے مقابلے میں مجھے سوات بہت پسند آیا۔ پھر وادی کاغان ہی نہیں بلکہ جھیل سیف الملوک تک گئے تھے۔ وہاں سے واپس آنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ اس ہنی مون نے میرا خواب پورا کر دیا تھا۔ عرشی نے خوب تفریح کرائی اور دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ وہ سیر و تفریح اور ان کے ساتھ گزرے لمحات ناقابل فراموش تھے۔ جو یادگار بن گئے تھے۔ کون سا ایسا لمحہ گھڑی اور دن رات تھے جو ایک دوسرے کی معیت میں نہ گزرے ہوں۔ کیف و لذتوں سے آشنا نہ ہو ساری ایک طرح سے یہ سہانے خواب تھے۔

ہم ایک مہینے کے بعد وہاں سے لوٹے تھے۔ واپس آنے کے بعد عرشی نے ایک شان دار لگژری فلیٹ خرید لیا۔ میرے ذاتی استعمال کے لیے ایک نئی گاڑی خریدی۔ اس طرح پانچ برس کسی سپنے کی طرح بیت گئے لیکن آج یہ سپنا کسی مالا کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جو تقریبات میں میرے قریب ہوتے اور مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی لفٹ نہیں دی تھی اور ان سے اس انداز سے بات کر لیتی تھی۔ بعض اوقات ان کے بستر ے اور آنکھوں میں میلا پن دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ تنہائی اور موقع ملتے ہی مجھے دبوچ لیں گے اور من مانیاں اور دست درازی کریں گے۔ میں یہ بات محسوس کیے بغیر اس میں نہ صرف میرے پرشباب گداز بدن کی تصور ہے بلکہ میرے لباس کا جس میں میری بے حجابی جس میں میرے بدن کے نشیب و فراز کسی شراب کی طرح جھلکتا تھا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتے تھے جیسے انہوں نے کبھی عورت کو نہ دیکھا ہو۔ عرشی ایسی تقریبات میں اس لیے بھی نہیں آئے تھے لڑکیاں عورتیں اپنی جسمانی نمائش کرتی ہیں۔ وہ اس بات کو شرمناک بے ہودہ لعنت اور سمجھتے تھے۔ اس لیے میں نہایت بے جامی اور نئے فیشن کے ملبوسات میں ملبوس جاتی تھی۔ اس حالت میں دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ انہیں مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ عرشی میری لیے سب کچھ تھے۔ عرشی کے دوستوں کے حلقے میں بھی کتنے ایسے تھے جو میرے حسن کے مداح تھے۔ اس کا اظہار ان کی نگاہوں کی زبانی ہوتا تھا۔ میں دل میں خوش ہو جاتی تھی کہ میں مردوں کے دلوں پر حکومت کر رہی ہوں۔

اس سوسائٹی میں ایسے مردوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے شادی نہیں کی تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی بیویوں سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث اپنی ہم سفروں کو وہ ایک برس بعد طلاق دے چکے تھے۔ وہ دولت مند اور صاحب حیثیت بھی تھے..... اور ان کا سوسائٹی میں ایک مقام اور بلند مرتبہ بھی تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام سکتے تھے۔ میرے لیے سہارے کے لیے کوئی کمی نہ تھی۔ میرے

لیے یہی بہتر تھا کہ سوکن کو برداشت کرنے کی بجائے عرشی سے طلاق لے کر ان میں سے کسی ایک سے شادی کر کے گھر بسالوں۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے بڑا سکون اور طمانیت محسوس کی۔ میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو میرے دل کے کسی کونے میں دکھ اور پچھتاوے کا احساس نہیں تھا۔ میں جلد ہی نیند کی بانہوں میں سما گئی۔

میں صبح تیار ہو کر اس کے ہاں پہنچا۔ وہ اتنی جلدی مجھے اپنے ہاں دیکھ کر اس طرح چونکیں جیسے ان کا ماتھا ٹھنکا ہو اور پریشان ہو گئیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں صبح گیارہ بارہ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتی۔ امی نے یہ خبر سنی تو ان کا صدمے سے برا حال ہو گیا اور وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئیں۔ ابو کو اس قدر غصہ آیا کہ وہ اسی وقت عرشی کے دفتر جا کر ان کا گریبان اور انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جذباتی ہونے کے بجائے حل، تدبر اور تدبیر سے کام لیں تاکہ طلاق کی نوبت نہ آئے۔ دانش مندی اور دور اندیشی کا یہی تقاضہ بھی ہے۔

جب میں نے امی ابو سے مشورہ مانگا تو وہ کرخت لہجے میں بولے۔

"تم اس مردود سے طلاق لے لو..... اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

"تم پاگل پن کا مشورہ کیوں دے رہے ہو....." امی بھڑک کر بولیں۔ "کیا تمہیں بیٹی کے ماتھے پر داغ لگانا اچھا لگتا ہے۔ تم کیسے باپ ہو۔"

"جب عرشی دوسری شادی کرے گا تب اس کے نزدیک فزا کی کیا وقعت رہ جائے گی۔" ابو بگڑ کر بولے۔

اس موضوع پر امی اور ابو کے درمیان زبردست بحث و تکرار ہوئی۔ ابو نہیں چاہتے تھے کہ میں عرشی کے زیر اثر رہوں۔ ان کا خیال تھا کہ عرشی دوسری شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ ابو نے میرا حوصلہ بڑھایا اور دلاسا دیا کہ عرشی دوسری شادی کرنے رہا اور باز نہ آیا تو تم اس سے طلاق لے لو۔ تمہا دوسری شادی کوئی مسئلہ نہ ہوگی۔ میں تمہاری دو شادی عرشی سے بھی بڑے شخص سے کرادوں گا۔ تعلق بہت وسیع اور مال دار لوگوں تک ہے۔

امی..... ابو کے برعکس طلاق کے تصور سے بری طرح خوف زدہ اور لرزاں تھیں۔ ان کا کہ کہ شریف گھرانوں کی لڑکیوں پر طلاق ایک ایسا داغ ہے جو ساری زندگی میں کبھی نہیں مٹتا ہے عورت خود ہی اپنی نظروں ذلیل اور دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ شوہر مجازی خدا ہو جاتا ہے۔ عرشی چاہتے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔ تمہیں شوہر کا حکم بجا چاہیے۔ مرد کا درجہ عورت سے بلند ہوتا ہے۔ عور گھر کی زینت بننا چاہیے نہ کہ کسی محفل کی..... عورت بچے کی ماں بن جائے تو نہ اس کے حسن پر فرق پڑتا ہے نہ حسین زندگی پر..... آخر اس دنیا اور بھی حسین عورتیں ہیں جن کے بچے ہیں اور وہ خ گوار زندگی گزار رہی ہیں..... ایک ذرا سی بات کا گہرا اثر لینا نہیں چاہیے۔

میں اس کے ہاں سے واپس آئی تو عرشی طلاق لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میری امی ایک بزدل دقیانوسی عورت تھیں۔ اس کے برعکس ابو روشن خیا اور زمانے کے ساتھ چلنے والوں میں سے تھے۔ ہزار برس پہلے کی بات کر رہی تھیں۔ جب عور مردوں کی غلام تھی۔ آج عورت آزاد تھی اور مرد دوش بدوش چل رہی تھی۔ اب اسے گھر کی چار دیوا میں نہ تو قید کیا جا سکتا تھا اور نہ جانوروں کی طرح ہانکا جا سکتا تھا۔ اس کے اپنے حقوق اسے مل چکے تھے مل رہے تھے۔ غلامی کی زنجیر ٹوٹ چکی تھی۔

میں عرشی کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میرا مستقبل صرف محفوظ ہے بلکہ تابناک بھی ہے۔ مجھے دو شوہر ہم سے اچھا مل سکتا ہے..... آخر تم ہو کیا چیز ہو اپنے آپ پر اتنا اکڑتے ہو۔ عرشی نے میرا فیصلہ سنا وہ ایک لمحے کے لیے یہ سناٹے میں آ گئے۔ انہیں

کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے آخری لمحے تک مجھے سمجھایا کہ میں اتنی بڑی بدنامی کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈالوں۔ انہیں بڑا دکھ ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے محبت کا واسطہ دیا۔ میری منتیں کیں۔ میرے آگے ہاتھ جوڑے لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں دو دن کی مہلت اور لے لوں لیکن میں نے یہ بات بھی نہیں مانی۔ آخر کار میں ان سے طلاق لے کر رہی۔ انہوں نے پچاس ہزار حق مہر..... میرے تمام زیورات اور جہیز کا ایک ایک سامان نہ صرف واپس کر دیا تھا بلکہ میرے ابو نے شادی پر کیے گئے اخراجات کی رقم ڈیڑھ لاکھ مانگے تو وہ بھی بغیر کسی حیل و حجت کے فوراً دے دیے۔

جس وقت میں ان کے فلیٹ سے نکل کر جا رہی تھی میرا انداز فاتحانہ اور نظروں میں ان کے لیے تمسخر تھا۔ میں نے اپنی دانست میں انہیں زبردست شکست دی تھی لیکن عرشی کی کیفیت مجھ سے یکسر مختلف تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ میری حالت اس سپاہی کی سی تھی جس نے بہت بڑی محاذ فتح کیا ہو۔ میری خوشی بے پایاں تھی۔ گھر پہنچنے تک میں جیسے آسمان کی وسعتوں میں پیدا نہ کر رہی تھی۔ عرشی کی اداس چہرہ اور آنکھوں کی یاسیت تصور میں بار بار ابھر رہی تھی۔ ان کا دل گرفتہ لہجہ..... جیسے وہ دنیا کا دکھی اور مظلوم شخص ہو۔ پھر میں نے اپنے تصور سے ان کا چہرہ جھٹک دیا۔

امی نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔ ان کے چہرے پر حقارت اور آنکھوں میں نفرت دیکھ کر حیران ہوئی کہ میری ماں کو خوش ہونے کی بجائے نفرت اور حقارت سے پیش آنا کتنے دکھ اور تعجب کی بات تھی۔ میں نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔

اس روز رات کو یک لخت مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بدترین حماقت کی ہے۔ میں نے طلاق لے کر ایک ایسی مفلسی کی ہے جس کا خمیازہ مجھے ساری زندگی بھگتنا پڑے گا۔ عرشی جیسا محبت کرنے والا شوہر اور رفیق سفر ساری زندگی نہیں مل سکے گا۔ اب مجھے عرشی کی قدر ہو رہی تھی۔ وہ ایک نایاب انمول اور سب سے قیمتی ہیرا تھے۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں رات کے آخری پہر تک زار و قطار روتی اور ان کے والہانہ پن، وارفتگی اور بے صبری باتوں اور لمحات کو یاد کرتی رہی تھی اور پھر میں اپنے دل کو سمجھاتی بھی رہی کہ میں نے جو فیصلہ کیا وہ غلط نہیں ہے..... پھر میں اپنے دل سے پوچھتی کہ..... آخر مجھے پچھتاوا کیوں اور کس لیے ہو رہا ہے۔ کیا رونے دھونے سے تقدیر بدل سکتی ہے۔

دوسرے دن صبح خالدہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی۔ اس کے شوہر کو عرشی نے ٹیلی فون پر مجھے طلاق دینے کی اطلاع دی تھی۔

جب میں خالدہ سے گلے مل کر رونے لگی تو اس نے مجھے دلاسا دیا کہ اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"فزا..... تم رنجیدہ نہ ہو اور جذباتی نہ بنو۔ حوصلے سے کام لو..... جلد ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی تمہارے لیے رشتے آنے شروع ہو جائیں گے۔ لائن لگ جائے گی۔ تمہارے لیے انتخاب کرنا دشوار ہو جائے گا۔ میری نظر میں تمہارے لیے دو تین بڑے بڑے اچھے رشتے ہیں۔ عدت گزر جانے دو پھر میں ان سے بات کرتی ہوں۔ عرشی تو ان کے پیروں کی دھول ہی نہیں ہے۔ تمہاری چٹ منگنی اور پٹ بیاہ میں تمہاری شادی کرائے بغیر دم نہیں لوں گی۔"

"میں عرشی سے پہلے اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں اور اسے یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرے پروانے اور قدر دان کتنے ہیں۔" میں بولی۔

"ایسا ہی ہوگا میری جان!" خالدہ کہنے لگی۔ "عرشی کو ساری زندگی تم جیسی لڑکی نہیں ملے گی۔ اس احمق نے اس انمول ہیرے کی کوئی قدر نہیں کی..... اب ساری زندگی پچھتائے گا اور سر پکڑ کر روئے گا۔"

دو برس پلک جھپکتے گزر گئے۔ ان دو برسوں میں میرے لیے دو رشتے بھی نہیں آئے۔ میں نے

جن جن کے سہانے خواب دیکھے تھے انہوں نے میرے گھر کا رخ تک نہیں کیا۔ ایک ٹیلی فون بھی نہیں آیا۔ میری وہ سہیلیاں جو میرا دم بھرتی تھیں اور میری دوستی پر نازاں تھیں اور میرے بغیر کوئی تقریب نہیں کرتیں اور سیر و تفریح پر تک نہیں جاتی تھیں۔ مجھ سے ملنے سے کترانے لگیں اور مجھے ہر قسم کی تقریبات میں مدعو کرنا چھوڑ دیا۔ جب میں انہیں گھر پر ٹیلی فون کرتی تو جواب ملتا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

صرف ایک شاہدہ تھی جو دس پندرہ دن میں ایک بار ٹیلی فون کر کے میری دل جوئی کرتی یا مجھ سے ملنے آتی تو کہتی کہ..... اپنی اس کوتاہی کی اللہ سے معافی مانگو..... تم نے اپنے نیک سیرت اور محبت کرنے والے شوہر سے طلاق لے کر عرش کو ہلا دیا۔

خالدہ ان دو برسوں میں صرف دو مرتبہ مجھ سے ملنے کے لیے میرے گھر آئی تھی۔ وہ میرے لیے ایک سلائی کی فیکٹری کے رنڈوے مالک کا رشتہ لے کر آئی تھی جس کے تین بچے تھے اور گھر میں مجھ سے سولہ اٹھارہ برس بڑا تھا۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ دوسرا رشتہ ایک کمپنی کے ایم ڈی کا تھا جس کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ اس کی دونوں بیویوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ خالدہ کا کہنا تھا کہ ایم ڈی میرے نام بنگلہ لکھنے تیار ہے۔ میرا انکار کرنا خالدہ کو اتنا برا لگا کہ اس نے قطع تعلق کر لیا۔

اس عرصے میں عرشی کے ان دوست احباب نے جن سے میری دوستی اور بے تکلفی تھی اور جو ایک طرح سے میرے پرستاروں میں سے تھے اور میرے قریب ہونے کے آرزو مند تھے اور میرے حسن و جمال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دیتے تھے اور سراہتے تھے، مل کر وہ ایک تقریبات میں مدعو کیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں سمجھ گئی کہ ان میں میرے حصول کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان میں سے کسی کا ایک کا ہاتھ تھام لوں اور اپنا گھر بسالوں اور انہوں نے ایک فائیو اسٹارز ہوٹل میں ڈنر پر بلایا تھا۔ جب میں نے ان سے کھل باتیں کی تو وہ اور فری ہو گئے تھے۔ ان ملاقاتوں جو جذبہ کارفرما تھا وہ بھی بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی انہوں نے مجھے رستے کا مال سمجھ لیا تھا اور مجھے غرضی کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میں ان کے لیے دسترخوان تھا جو سیر ہونا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ اگر ان کی نیت صاف ہوتی تو وہ مجھ سے شادی کی بات کرتے اور کے رشتے تو میں ان میں سے کسی کو پسند کر لیتی۔

اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ سوسائٹی میں مجھے جو مقام اور عزت اور پذیرائی حاصل تھی میرے حسن و شباب، دل کشی اور ہیجان خیز سراپا اور رعنائیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ میرے اپنے شوہر کی وجہ سے تھا صرف عرشی نے ہی نہیں بلکہ امی نے بھی سچ کہا تھا کہ..... مطلقہ عورت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب میں ایک خالی برتن کی طرح تھی۔ اپنی نظروں میں ذلیل اور حقیر ہو چکی تھی۔ محلے کی عورتیں اور پڑوسنیں مجھے دیکھتی تھیں تو ان کی نظروں میں ہوتا تھا۔ محلے میں میرے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں اور میرے متعلق ان کی بڑی شرمناک رائے ہوتی تھی کہ میں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے ورنہ شوہر طلاق کیوں دیتا۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ ان کی زبانوں پر پہرے بٹھا نہیں سکتی تھی۔

میرا غرور اور پندار حسن خاک میں مل چکا تھا۔ میں اب بھی حسین، جوان اور غیر معمولی پرکشش نہ تھا۔ میں نے اپنے جسم کو ڈھلنے اور خطوط کو متاثر ہونے نہیں دینا تھا۔ پھر بھی میرے لیے رشتے نہیں آ رہے تھے۔ رشتے طے کرانے والیاں میری لیے جو رشتے لائی تھیں وہ نہ صرف بے جوڑ بلکہ نچلے طبقے کے مردوں کے ہوتے تھے۔ ان سے شادی کرنے کے بجائے گھر میں بیٹھے رہنا بہتر سمجھتی تھی۔

شاید وہ دوسری دو ایک سہیلیوں کے ہاں میری اور درخت رہتی تھی۔ شاہدہ نے مجھے بتایا تھا کہ عرش نے مجھے طلاق دینے کے تین مہینے بعد فریدہ نام کی

ایک لڑکی سے شادی کر لی، فریدہ لڑکیوں کے کسی کالج میں لیکچرر تھی۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ اپنی سیکریٹری سے شادی کریں گے۔ شادی کے ڈیڑھ برس کے بعد وہ ایک بچے کے باپ بھی بن گئے تھے۔ دو برس کے عرصے کے بعد جو ایک لمبا تھا شاہدہ نے مجھے اپنی نند کی شادی میں مدعو کیا تھا۔ میں ایک سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔ شاہدہ مجھے بلا کر ایک کونے میں لے گئی۔ اس نے مجھے ایک سمت اشارہ کیا۔ ایک میز پر ایک عورت گود میں بچے کو لیے بیٹھی تھی۔

"فزا..... تم اس عورت کو جانتی ہو..... کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ عورت کون ہے۔" شاہدہ نے پوچھا۔

میں نے اس عورت کو غور سے دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ "میں اسے نہیں جانتی..... میں اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

"یہ عرشی بھائی کی دوسری بیوی ہے۔" شاہدہ نے جواب دیا۔

"عرشی کی بیوی....." میں نے اس عورت کو چونک کر بڑے غور سے دیکھا۔ وہ ایک جوان عورت تھی۔ بلا کی حسین نہ تھی لیکن اس میں دل موہ لینے والی جاذبیت تھی۔ اس کا سانولا رنگ ایسا پرکشش تھا کہ گوری رنگت کی عورت کا حسن ماند پڑ جائے۔ اس کے نقش و نگار میں دل میں اتر جانے والا تیکھا پن تھا۔ بڑی بڑی جھیل جیسی کالی کالی آنکھیں جس میں سارا جہاں ڈوب سکتا تھا۔ وہ بڑی سادگی سے آئی تھی۔ اس کے لباس سے بے حجابی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ میک اپ سے مبرا بھی تھی۔ اس کی گود میں ایک خوب صورت سا پیارا پیارا، ہنستا کھیلتا، گول مٹول سا بچہ تھا جسے دیکھ کر مجھے بے اختیار پیار آیا تھا۔

شاہدہ کسی کام سے چلی گئی لیکن میں کتنی ہی دیر تک ساکت و جامد سی کھڑی فریدہ اور اس کے بچے کو دیکھتی رہی۔ بچہ اپنے باپ پر گیا تھا۔ میں عرشی کی بات مان لیتی میری گود میں بھی ایسا ہی خوب صورت بچہ کھیلتا اور ہمکتا ہوا ہوتا۔ میری زندگی میں یہ ویرانی اور خزاں نہ ہوتی عورت کا اصل حسن اس کے ماں بننے میں ہے۔ یہ فریدہ کتنی خوش ہے.....! کتنی مسرور ہے..... بچے کو بار بار چوم کر اس پر کیسی سرشاری سی طاری ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں مامتا کی کیسی شمع فروزاں ہے۔

میں پھر چونکی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عرشی سے میرا سامنا ہو۔ میں رکی نہیں گھر چلی آئی گھر آئی تو میرے سینے میں خلش کا خنجر پیوست ہو گیا تھا۔ میں اپنا کمرا بند کر کے تکیے میں منہ دیے گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

عرشی بہت خوش تھے۔ آخر کیوں نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنی منزل پا لی تھی۔ مگر میری منزل کہاں تھی۔ میں خوش نہ تھی۔ ایک اور پچھتاوا جو مجھے کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈستا رہتا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آتا تھا کہ آخر میرے رشتے کیوں نہیں آ رہے ہیں اور میری شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی۔ میں کسی اچھے خاندان کے شخص سے شادی کر کے عرشی کو بتانا چاہتی تھی کہ مجھے تم سے اچھا شوہر ملا ہے اور وہ میرے ہر حکم کا تابع ہے۔ میں نے آدھر مشورہ کر رکھا تھا میرے لیے اونچے اونچے گھروں کے رشتے آ رہے ہیں امریکا کناڈا اور جرمنی سے..... کویت کا ایک شخص مجھ سے شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔ وہ میری خاطر اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دینے کے لیے بھی تیار ہے لیکن میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں ایک آزاد اور بے فکری کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے شادی اور مردوں کے نام سے نفرت ہو چکی ہے۔

ابو کو بھی اپنی غلطی کا احساس اور پچھتاوا سا تھا۔ اس کی تلافی اور کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے طور پر میری شادی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور انہوں نے دن رات شادی کے دفتروں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے رشتے طے کرانے والیوں سے کہہ رکھا تھا کہ بہت اچھا رشتہ ہوا تو وہ پچیس تیس ہزار روپے تک دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے خیال میں وقت تیزی سے گزر رہا تھا جس کا

اثر مجھ پر اور عمر پر پڑ رہا تھا دو ایک رشتے آئے تھے لیکن میں نے اپنے قابل اور معیار کا نہیں جانا۔ کیوں کہ یہ رشتے متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے اپنے گھرانوں سے رشتے اس لیے نہیں آ رہے تھے کہ میرا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ میرے ابو منہ مانگا جہیز' جوڑے کے لیے دو لاکھ کی رقم اور گاڑی نہیں دے سکتے تھے۔

ایک تو میں نے کلب آنا جانا بند کر دیا تھا اور پھر ہائی سوسائٹی میں میرا اٹھنا بیٹھنا برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لیے میں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اس طرح دو برس کا عرصہ اور گزر گیا۔ میرے ابو میرے لیے بہت زیادہ پریشان رہنے لگے۔ میری شادی کی فکر میں روز بہ روز گھلنے لگے..... اور امی مجھ سے کہتی تھیں کہ تم نے دیکھ لیا نا اپنے ناز و غرور کا انجام.....! تم اپنے بات کی نہ مانتیں اور عرشی جیسے نیک شوہر سے طلاق نہ لیتیں آج یہ دن دیکھنا نہیں پڑتے..... آج کیا تم اپنی نظروں اور دنیا والوں کی نگاہوں میں دو کوڑی سے بھی بدتر ہو کر رہ گئی ہو.....! نہ صرف تم بلکہ تمہارا باپ بھی کرب و اذیت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ یہ پچھتاوا میری زندگی کا روگ بن گیا ہے۔ اس روگ کا علاج بمشکل ہوتا ہے۔

میرے ابو کے بچپن کے ایک دوست شاعر اسلم فریدی کی کوششوں سے میرا رشتہ جمیل سے طے ہو گیا۔

مجھے یہ رشتہ ذرہ برابر بھی پسند نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ جمیل ایک پرائیوٹ کمپنی میں کیشیئر تھا۔ اس کی تنخواہ آٹھ ہزار روپے ماہوار تھی۔ وہ اپنی ماں اور دو جوان بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی عمر چھتیس یا اڑتیس برس کے درمیان تھی۔ خوب صورت اور وجیہہ تھا۔ اس کے دراز قد نے اسے جاذب نظر اور آج کی لڑکیوں عورتوں کا تصوراتی بنا دیا تھا۔ صحت مند تھا اور توانا جسم اور بازو فولادی تھے۔ بے حد پرکشش دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دوسری بیوی کا دو برس قبل کسی بیماری میں انتقال ہو چکا تھا۔ شادی آٹھ برس میں بھی وہ ماں نہ بن سکی تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک موٹر سائیکل تھی۔ فیڈرل بی ایریا کے جس مکان میں وہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ رہتا تھا وہ ایک سو تیس گز پر بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک سو بیس گز کے مکان تھے لیکن جو کارنر تھے وہ دس پندرہ گز زیادہ ہوتے تھے۔ مکان اس کے نام تھا۔ اس کی والدہ اور بہنیں اسکول ٹیچر تھیں۔ وہ سرکاری اسکولوں میں پڑھاتی تھیں۔ پہلے تو میں نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی والدہ اور بہنیں اسکول ٹیچر تھیں۔ وہ سرکاری اسکولوں میں پڑھاتی تھیں۔ پہلے تو میں نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس خیال سے کہ جمیل کی قلیل تن خواہ سے کیا ہوگا۔ وہ تو شاید پانچ روپے میں جیب خرچ نہ دے سکے۔ جب کہ عرشی ماہانہ بیس ہزار روپے دیتے تھے۔ شاپنگ کے لیے بیس ہزار روپے وہ الگ ہوتی تھی۔ میں میک اپ اور لباس پر ماہانہ دس ہزار روپے خرچ کرتی تھی۔

پھر ایک خیال اور آیا کہ جمیل کی ماں اور بہنیں بھی تو کما رہی ہیں۔ لہٰذا جیب خرچ کے لیے اس سے معقول رقم لے سکتی ہوں لیکن اس کی تنخواہ میں خواب ناک زندگی گزاری نہیں جا سکتی اور ہر ساس نندوں کا بھی جتن بہت ہے۔

یہ رشتہ مجھے ابو کے سمجھانے بجھانے پر قبول کرنا پڑا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے مرنے کے بعد تم زندگی کیسے گزارو گی۔ مگر میں نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ ابو مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہیں اور مجھ سے بے زار ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے وجود پر میں جیسے پھوڑا بن گئی ہوں جو درد دیتا جا رہا ہے..... اس نے بھی مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ ایک عورت بن کر سوچو ماڈل گرل بن کر نہیں..... کہاں گیا وہ تمہارا حسن و شباب جس پر تمہیں بڑا گھمنڈ تھا' اس لیے کہ تم مطلقہ بھی..... یہ کیسا بدنما داغ ہے۔

کوئی تین مہینے کے بعد جمیل سے میری شادی ہو گئی۔ جمیل اور اس کے گھر والوں سے کوئی بات چھپائی نہیں گئی تھی۔ انہیں صاف طور پر بتا دیا گیا تھا

میں مطلقہ ہوں۔ مجھے طلاق اس لیے ہو گئی تھی کہ شادی کے پانچ برسوں میں میری کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ میرے سابقہ شوہر نے مجھے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی۔

میری دوسری شادی کی پہلی سہاگ رات تھی جو میرے خواب کے برعکس تھی۔

میں اپنے آپ کو دلہن نہیں مردہ سمجھ رہی تھی۔ ایک مردے کو سجا کر جیسے اس کا نام دلہن رکھ دیا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں کوئی امنگ تھی اور نہ ہی کوئی آرزو تھی اور نہ ہی کسی ان جانے خیال سے کوئی خوشی دل کو ہو رہی تھی۔ نہ ہی جسم پر میٹھی سنسنی تھی جب کہ میری پہلی شادی کی پہلی سہاگ رات کو ہوئی تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھنے کا کوئی اشتیاق تھا اور نہ تجسس..... میں نے شادی سے قبل اس کی تصویر دیکھنے کی خواہش کی تھی نہ ہی کسی ان جانے تصور سے کوئی دھڑکن پیدا ہو رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جیل جلد از جلد کمرے میں آئے اور میں رسم دنیا سے گزر کر سو جاؤں۔ میرے دل میں جو جذبے اور احساسات تھے وہ برف کی طرح سرد پڑے ہوئے تھے۔ میں تو مٹی کا تودہ بنی بیٹھی تھی۔

رات کے دو بجے جیل حجلہ عروسی میں داخل ہوا۔ میری پہلی اور دوسری شادی میں بڑا فرق تھا۔ میری پہلی شادی ایک فائیو اسٹار ز ہوٹل میں ہوئی تھی اور ولیمہ بھی اس ہوٹل میں ہوا تھا۔ میرا حجلہ عروسی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ کمرا بھی بہت بڑا اور آراستہ و پیراستہ تھا۔ دوسری شادی کی تقریب ہال میں ہوئی تھی۔ جمیل کے گھر کا یہ کمرا زیادہ بڑا نہ تھا لیکن قدرے کشادہ تھا۔ میرے جہیز کے سامان سے بھر گیا تھا۔ کمرے میں گرمی تھی۔ چھت کا پنکھا ناکافی لگا تو میری چھوٹی نند افشاں نے ٹیبل فین آن کر دیا تھا۔ میں گھونگھٹ نکالے روایتی دلہن کی طرح نہیں بیٹھی تھی۔ یوں میں آج کل دلہنوں میں شرم و حیا اور حجاب کہاں ہوتا ہے۔ وہ اسٹیج پر نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد اس طرح بے تکلفی سے خوش گپیاں کرتی رہتی ہیں جیسے کئی دنوں کی دلہن ہوں اور نشاط انگیز راتوں کا فسانہ سنا رہی اور سن رہی ہوں۔

جمیل کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ پلنگ پر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور مجھے دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے میری نگاہیں اس سے ملیں تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے حسن سے متاثر ہو رہا ہے اور دزدیدہ نظروں کی گرفت میں میرا چہرہ لیے آنکھوں میں جذب کر رہا ہے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مخملی ڈبیا نکالی۔ اس میں سے ایک سونے کی خوب صورت انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ کی مخروطی انگلی میں پہناتے ہوئے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ واقعی اتنی حسین ہیں کہ چودھویں کا چاند میں شرما جائے۔''

ایک تو میں پہلے ہی کیا کم حسین تھی۔ پھر بیوٹی پارلر کے سولہ سنگھار نے میرے حسن کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ میں نے اس کے اس تعریفی جملے پر شرما کر سر جھکایا اور نہ کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''فزا.....! میں آپ کو اپنے گھر والوں اور اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری ماں..... میرے لیے اللہ کے بعد سب سے عزیز اور مقدس ہستی ہے۔ میں انہیں بہت چاہتا ہوں اور اس کا اندازہ آپ کو رفتہ رفتہ ہو جائے گا..... ماں کی عزت میری عزت ہے۔ اس طرح میں اپنی دونوں بہنوں کو بھی خوب چاہتا ہوں۔ آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہوگی کہ میری ماں اور بہنیں ملازمت کرتی ہیں۔ میں ان کی کمائی میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا۔ تینوں کی آمدنی بہنوں کی شادی کے لیے جمع کی جا رہی ہے۔ میری تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہے..... اس میں نہ صرف گھر چلاتا ہوں بلکہ پس انداز بھی کرتا ہوں۔ میری ماں..... بہنوں کی خدمت اور ان کی عزت کرنا آپ کا فرض ہے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف اور شکایت کا موقع نہ دینا۔ اس میں.....''

وہ لمبا چوڑا لیکچر دیئے جا رہا تھا اور میں کسی

بہری اور گونگی کی طرح اس کی باتیں سن رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے اپنی بیوی نہیں بلکہ نوکرانی بنا کر لایا ہے۔ اس نے میری حیثیت جتلا دی تھی تاکہ میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہوں۔ اگر میں مطلقہ نہ ہوتی شاید وہ اس قسم کی باتیں نہ کرتا۔ وہ مجھے..... اس کی ماں اور بہنیں مجھے دبا کر رکھنا چاہتی ہیں۔

میں نے بھی اپنے دل میں سوچ لیا کہ اسے اپنے حسن کا اسیر بنا کر اپنے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچاؤں گی۔ میں اس کے گھر والوں کی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں سے اپنی خدمت کراؤں گی۔ میرے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھی۔ کیوں کہ شعلہ مجسم تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کیا خوابوں میں مجھ جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی ہوگی۔

جمیل نے دس برس تک اپنی پہلی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کے بچے ضائع ہوتے رہے تھے۔ اس لیے وہ ماں نہ بن سکی تھی۔ آخری بچے نے ہی اس کی جان لے لی۔ اسے بچوں کی بڑی تمنا ہے۔ دو چار اور بچوں کی خواہش رکھتا ہے۔ اللہ لڑکے دے یا چاروں لڑکیاں وہ اس قانع اور خوش رہے گا۔ اس لیے کہ اس میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ دو برس کے بعد میں اس کی زندگی میں آئی تھی جب اس کے وجود میں سوتے ہوئے مرد کو جگا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک سرد لاش کی طرح حوالے کر دیا تھا لیکن اس کی وارفتگی اور والہانہ پن نے میرے سرد جذبات میں آگ لگا دی اور محبت کی گرم جوشی پیدا کر دی۔ باوجود نفرت اور سرد مہری کے باوجود میں خود سپردگی سے پیش آئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس لیے کہ پانچ برسوں کے بعد ایک بھرپور اور جوان مرد میری زندگی میں آیا تھا۔ میں آگ سے اپنا دامن کیسے بچاتی! آخری پہر تک طوفان آتے رہے اور میں تہس نہس اور تاخت و تاراج ہوتی رہی۔ میری نفرت اور حقارت تنکے بن کر اڑ گئی۔ میں نے جو سوچا میں اس پر عمل نہ کر سکی۔ سب کچھ دھرا رہ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو ان پر نچھاور کیا کیا' ان کی ذات کا جزو بن گئی۔

تیسرے روز ولیمہ تھا۔ اس نے ولیمے کی تقریب گھر پر کی تھی۔ گھر میں شامیانہ لگایا گیا تھا۔ دن ڈوبنے کے بعد گھر میں اس کے رشتہ داری اور مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ جس کمرے میں مجھے تیار کیا جا رہا تھا وہ لڑکیوں عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بظاہر انجان سی بنی سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن ان کی سرگوشیوں میں کی جانے والی باتوں کو میں برابر سن رہی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں دلہن لاکھوں میں ایک ہے۔ چودھویں کا چاند ہے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ دلہن اتنی حسین ہوگی..... لیکن جتنی حسین ہے اتنی ہی مغرور بھی لگ رہی ہے۔ بدمزاج بھی معلوم ہوتی ہے۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ اتنی خوب صورت بیوی کو پہلے شوہر نے طلاق دے دی..... ایسی حسین لڑکیاں قسمت سے ہی ملتی ہیں۔"

"شاید شوہر بدصورت ہوگا..... یہ چوں کہ بہت حسین ہے اس لیے نباہ نہ کر سکی ہوگی۔ شوہر نے طلاق نہیں دی ہوگی بلکہ ان محترمہ نے خود ہی طلاق یا خلع لے لیا ہوگا۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان محترمہ کے چال چلن اچھے نہ ہوں۔"

"آپا.....! میرے میاں کہہ رہے تھے کہ اس کے پہلے شوہر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی ماہانہ تن خواہ دو لاکھ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"کیا یہ حسینہ عالم اپنے میاں کے آٹھ دس ہزار روپے میں گزارہ کر لے گی..... مجھے تو یہ گاڑی زیادہ دنوں تک چلتی نظر نہیں آتی ہے۔ چار دنوں بعد یہ اپنے میاں کو نہ چھوڑ دے۔"

"تین چار ہزار روپے تو اس کے میک اپ اور لباس پر اڑ جائیں گے..... ماں بہنوں کی کمائی پر جمیل کو گزارہ کرنا ہوگا لیکن جمیل بھائی کی ماں اور بہنیں

اپنی کمائی کیوں دینے لگیں۔"

"بہن.....! اگر یہ میاں کو اپنا غلام نہ بنا لے اور ساس نندوں کو گھر سے نہ نکال دے میرا نام بدل دینا۔"

"جمیل بھائی نے اتنی حسین عورت سے شادی کر کے اچھا نہیں کیا اور نہ ماں بہنوں کو ایسی حسین عورت ڈھونڈ کر لانا تھی۔ کیوں کہ یہ مجھے کوئی بلا دکھائی دیتی ہے۔"

"ویسے میں ایک بات کہوں بھابھی..... جمیل بھائی قسمت کے بڑے تیز ہیں۔ بہت خوش قسمت واقع ہوئے ہیں..... انہیں اتنی حسین اور کم عمر عورت مل جائے گی ہم نے سوچا تک نہیں تھا۔"

"یہ اس لیے مل گئی کہ مطلقہ ہے۔ مطلقہ عورت تو دوکوڑی کی ہوتی ہے۔"

یہ طنز اور نفرت کے زہریلے تیر تھے جو میرا سینہ چھلنی کیے دے رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے فقرے نہیں سنے تھے اور نہ ہی کسی نے مجھے اس طرح سے نشانہ بنایا تھا۔ مگر میں ان تیروں کی چبھن کو بڑے صبر و ضبط' تحمل اور اذیت اور خاموشی کے ساتھ سہہ رہی تھی اور میری رگوں میں خون آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ میں اس وقت بے بس اور مجبور سی تھی۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ ان لڑکیوں عورتوں کے منہ نوچ لوں اور ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ کیا مجال کبھی نے میری ایسی توہین کی ہو..... مجھے ذلت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ لڑکیاں عورتیں میرے حسن کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ مگر یہاں اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تو میں نے افشاں سے بڑی بہن راحت کو بلا کر کہا کہ مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔ مہمانوں کی وجہ سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔

کوئی بیس بائیس دنوں تک میری ساس اور نندوں نے مجھے کوئی کام کرنے نہیں دیا اور نہ ہی میں نے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔ میری بڑی پذیرائی ہو رہی تھی۔ میری دونوں نندیں ہر وقت میرے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں۔ میری ساس ذرا رکھ رکھاؤ کی تھیں۔ کیوں کہ وہ کسی اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ اڑوس پڑوس اور محلے کی عورتیں لڑکیاں آتی تھیں تو میری بڑی تعریف کر کے جاتی تھیں۔ میں جو جہیز لائی تھی وہ شان دار' قیمتی اور اتنا تھا کہ وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے..... اور پھر میرے حسن و جمال نے بھی انہیں بے حد متاثر کیا اور مرعوب کر دیا تھا۔

جمیل بھی میری چاہت میں پاگل ہو رہا تھا۔ میں اس بات سے بہت ہی خوش اور مسرور تھی کہ میرے جہیز اور حسن کا جادو ان پر چل چکا ہے۔ لہٰذا وہ نوکروں کی طرح میری خدمت کرتے رہیں گے اور میں ان سے نوکرانیوں کی طرح کام لیتی رہوں گی۔

جمیل نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ اس لیے رات ہم دونوں دیر تک جاگتے رہتے تھے اور صبح گیارہ بجے کمرے سے نکلتے نہیں تھے۔ میری ساس اور نندیں اسکول چلی جاتی تھیں۔ اس لیے ٹوکنے اور آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرح سے ہم گھر میں ہی' ہنی مون منا رہے تھے۔ میں نہا کر اور تیار ہو کر کھانے کی میز پر آتی تو میز پر کھانا چنا ہوتا تھا۔ ناشتا اور لنچ ایک ہی ہوتا تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر کے بعد پھر ہم دونوں کمرے میں گھس جاتے اور شام کو نکلتے..... کہیں کسی کے ہاں دعوت میں جانا ہوتا تو پھر نہا کر تیار ہوتی۔ جمیل کسی کام سے چلا جاتا تو میں اپنے کمرے میں لیٹی رسالے پڑھتی رہتی یا پھر ٹی وی پر کوئی غیر ملکی چینل دیکھتی۔ پھر ڈی وی ڈی بھی تھا ہیجان خیز قسم کی ممنوعہ فلموں کی سی ڈیز دروازہ بند کر کے دیکھتی۔ یہ جمیل نے لا کر دی ہوئی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے ساس کو زہر لگتی

تھی۔ میں اندر ہی اندر اس بات سے سرشار تھی کہ جمیل میری مٹھی میں آ گئی ہے۔ میرے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ میرے حسن اور جہیز کی وجہ سے اس گھر پر میرا راج قائم ہو گیا ہے۔

جمیل کی چھٹیاں ختم ہونے سے وہ ایک روز پہلے میری ساس نے مجھ سے کہا۔

"فزا بیٹی..... اکل تم کھیر پکا کر باورچی خانہ اور گھر سنبھالو گی۔ یہ تمہارا گھر ہے اب اسے تمہیں سنبھالنا ہے۔"

میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جمیل کے گھر جا کر باورچی خانہ سنبھالنا ہوگا۔ میری امی نے میرے ابو کی وجہ سے کچھ نہیں سکھایا تھا۔ عرشی کی بڑی خواہش تھی کہ میں اپنے ہاتھوں چائے اور کھانا بنا کر کھلاؤں..... مگر پانچ برسوں کے اس لمبے عرصے میں پانچ مرتبہ مما چائے بنا کر پلا نہ سکی۔ کھانا تو دور کی بات تھی۔

رات جب جمیل نے مجھے اپنے بازوؤں میں کر لیا تب میں نے اپنے ہونٹوں سے اس کا چہرہ لال کر دیا اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں امور خانہ داری میں بالکل صفر ہوں۔ میں نے اس کی اصل وجہ بھی بتا دی۔ لہٰذا باورچی خانہ کے لیے کسی نوکرانی کا بندوبست کر لیا جائے۔ وہ صفائی ستھرائی کا کام بھی کر لے گی۔ شام کو نوکرانی کی ضرورت بھی نہیں ہوا کرے گی۔ کیونکہ تمہاری ماں اور بہنیں بھی آ جاتی ہیں، میرا خیال تھا کہ جمیل میری بات مان لے گا اور میری مشکل دور ہو جائے گی۔ جمیل نے میری بات سن کر کہا۔

"فزا جانی! آج تک کسی نوکرانی نے ہمارے گھر میں کوئی کام نہیں کیا..... جو گھر میں عورت ہو اس گھر میں نوکرانی کی کیا ضرورت..... میری ماں اور بہنیں تمہیں ہر کام سکھا دیں گی..... کھانا پکانا اور گھریلو صفائی کچھ ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ میری مرحومہ بیوی سارے کام خود ہی کرتی تھی۔ میری ماں اور بہنوں کو کوئی سا بھی کام کرنے نہیں دیتی تھی۔ اس بات نے سب کا دل جیت لیا تھا۔"

میں نے عرشی سے اس لیے تو طلاق لی تھی کہ میں گھر بار سنبھالنا اور بچے پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر وہی بات سامنے آ گئی تھی۔ میری ماں نے رخصتی سے ایک دن پہلے مجھ سے صاف صاف اور تلخ لہجے میں کہا تھا کہ اب تم ایسی کوئی حماقت مت کرنا جو تمہارا گھر برباد کر دے۔ تمہیں اب اس گھر میں زندگی گزارنا ہے۔ وہ جیسا بھی ہے تمہارا اپنا گھر ہے۔ اگر تم نے پھر اپنے گلے میں بدنامی کا طوق ڈالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

میں نے ان کی ان ناصحانہ باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جمیل میرا غلام ہو گیا ہے۔ کیوں کہ میرے اشاروں پر چلے گا..... میں انگریزی فلموں کی سی ڈیز ڈی وی ڈی پر دیکھ کر اس پر ایسی فیاضی سے مہربان ہو جاتی تھی کہ وہ میرا دیوانہ بنتا جا رہا تھا۔ بلکہ دیوانہ بن گیا تھا۔ مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے اسے زن مرید سمجھ لیا تھا۔ وہ کوئی چوبیس پچیس برس کا جوان لڑکا نہیں تھا۔ جو میرے حسن و شباب اور کشش کے خزانوں کا اسیر بن کر میری ہر بات بلا چوں و چرا مان لیتا وہ ایک سلجھا ہوا سنجیدہ مرد تھا۔ اس کی زندگی میں مجھ سے پہلے بھی ایک جوان عورت آ چکی تھی۔ وہ بھی خوب صورت تھی۔ میں نے اس کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اس طرح کے مرد کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے اس کا حکم ماننا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تاہم میں نے سوچ لیا تھا کہ جمیل کو اپنا ایسا احتیاج اور غلام بناؤں گی کہ وہ ایک روز اپنی ماں اور بہنوں کو گھر سے نکال دے گا پھر میں ٹھاٹ سے رہوں گی۔

مجھے باورچی خانے میں نہیں بلکہ ایک جہنم میں جھونک دیا تھا۔ باورچی خانہ میرے لیے کسی جہنم سے کم نہیں تھا۔ مجھے رفتہ رفتہ اس عذاب کا عادی ہونا پڑا۔ میں نے ذرا بھی دل چسپی نہیں لی۔ اس لیے میں باوجود کوشش کے اچھا کھانا پکانا سیکھ نہ سکی۔ اس

کے باوجود کوئی کیڑے نہیں نکالتا تھا۔ ساس اور نندیں کہتی تھیں کہ کوئی بات نہیں دراصل میں یہ چاہتی تھی کہ یہ لوگ بیزار ہو کر مجھے اس عذاب سے نجات دلا دیں لیکن ایسے کوئی آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

سارے گھر میں جھاڑو دینا اور پونچھا لگانا میری شان کے خلاف تھا۔ ساس کے لاکھ کہنے پر بھی میں نے یہ کام نہیں کیا۔ انہوں نے جمیل سے میری شکایت کرنے کے بجائے مجھے کتنی مرتبہ سمجھایا کہ عورت گھر کی عزت ہوتی ہے۔ وہ شوہر کی عزت اور کام کاج سے اپنا مقام حاصل کرتی ہے۔ سگھڑ اور سلیقہ مند عورت بن کر نام پیدا کیا جاتا ہے۔ دیر تک سو کر اٹھنا..... شوہر کو ناشتا بنا کر نہیں دینا۔ کھانا پکانے کے بجائے ہوٹل سے منگوا لینا..... سارا دن اخبار رسالے اور ٹی وی پر فلمیں دیکھنا ایک اچھی عورت کو زیب نہیں دیتا..... اور پھر گھر میں دو جوان کنواری نندیں ہیں۔ کمرا بند کر کے شوہر کے ساتھ گھنٹوں رہنا بڑی معیوب سی بات ہے۔ کم از کم اپنی نندوں اور شوہر کا خیال کر لیا کرو۔

میں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کی باتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ ان کی کسی بات کی پروا نہیں کی۔ گھر سنبھالتی میری جوتی..... میں دیر تک سو کر اٹھتی ناشتہ میری نندیں تیار کرتی تھیں۔ یہ چاروں صبح نو بجے تک چلے جاتے تھے۔ میں گیارہ بجے تک مزے سے سوتی رہتی۔ بستر سے نکل کر نہاتی اور تیار ہوتی۔ کپڑے بدلتی اور اپنا آئینے میں بڑی آزادی اور ہر زاویے سے اپنے بجلی بھرے بدن کا تنقیدی نظروں سے کپڑے بدلتے وقت ضرور جائزہ لیتیں۔ اس لیے بھی کہ اس میں ایک عجیب اور سنسنی خیز خود لذتی محسوس ہوتی تھی۔ پھر میک اپ کرتی تو بدن پر لوشنز لگاتی تو وہ مہک اٹھتا تھا۔ ناشتا میز پر ہوتا تھا۔ ناشتا کر کے اخبار پڑھتی۔ پھر ٹی وی کے وہ چینل یا سی ڈیز لگا کر وہ فلمیں دیکھتی جو ساس اور نندوں کی موجودگی میں دیکھی نہیں جا سکتی۔ نندیں صرف نندیں تھیں۔ وہ سہیلیاں اور بہنیں نہ بن سکی تھیں۔

دو بجے ساس اور نندیں ایک ایک کر کے آ جاتی تھیں۔ باورچی خانہ اور گھر کی حالت دیکھ کر منہ بن جاتا تھا۔ پھر میں اپنے کمرے میں بند کر اپنی پسند کی فلمیں دیکھتی۔ جمیل نے ماں اور جوان بہنوں کی وجہ سے کیبل نہیں لیا تھا۔ کیبل صرف میرے کمرے میں تھا۔ جمیل شام کو دفتر سے گھر آتا تو کمرے سے نکلتی۔ میں شام کے وقت باورچی خانے میں جمیل کو دکھانے کے لیے قدم رکھتی۔ میں جانتی تھی کہ میرے جہیز کی وجہ سے ساس اور نندوں کا منہ بند ہے۔ وہ میرے خلاف زہر نہیں اگل سکتیں۔ پھر میں راتوں کو جمیل کے کان بھرنے لگی تھی۔ وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر پیار بھرے لہجے میں کہتا۔ چھوڑو ان باتوں کو..... محبت بھری باتیں کرو۔

پھر چھ مہینے کا عرصہ بڑی تیزی سے بیت گیا۔ میری ساس اور نندوں پر جو سحر چھایا ہوا تھا وہ ماند پڑتا گیا۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ پھر میں ان کے طنز و طعنوں کا نشانہ بننے لگی تھی۔ پہلے تو اشاروں کنایوں میں کہا جاتا تھا۔ اب کھل کر کہا جانے لگا کہ تم ایک مطلقہ عورت ہو۔ ہم تمہارے حال پر ترس کھا کر بیاہ کے لائے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے پہلے شوہر نے تمہارے ساتھ ناانصافی اور ظلم و ستم کیا تھا لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ اس شریف آدمی نے تمہیں طلاق کیوں دی۔ تمہارے ماں باپ کو چاہیے تھا کہ تمہاری شادی کرنے کے بجائے ایکٹریس یا ماڈل گرل بنا دیتے۔ شوبزنس کا گندا تالاب میں تمہیں مچھلی کی طرح چھوڑ دیتے اگر تم یہاں سیدھی طرح نہیں رہیں تو تمہارے ساتھ وہی ہوگا جو پہلے ہو چکا ہے۔ تمہاری بہتری اور عزت اس میں ہے کہ راہ راست پر آ جاؤ۔

پھر ایک روز ساس اور نندوں سے میری زبردست لڑائی ہو گئی۔ اتفاق سے اس روز جمیل دفتر سے جلد گھر آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جمیل میری کھل

کر طرف داری کرے گا۔ جب اس نے مجھے اپنی ماں سے زبان درازی کرتے تو اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے طیش میں آ کر پیر سے جوتے نکال کر میرے دو تین لگا دیے۔ اگر میری ساس بیچ میں نہ آتیں تو تو وہ شاید جوتے سے میری ایسی درگت بناتا کہ میں بے ہوش ہو جاتی۔ میں اپنی اس ذلت اور توہین پر آپے سے باہر ہوگئی۔

پھر میں ہزیانی لہجے میں چیخ کر بولی۔

"کتے..... تمہارے پاس کیا تھا..... میرے باپ نے اتنا سارا جہیز دیا اور پھول سی بیٹی اٹھا کر دے دی..... تم اس کی یہ عزت کر رہے ہو..... تو اسے جوتے سے مار رہے ہو.....! شرم نہیں آتی ایک عورت پر مردانگی دکھا رہے ہو۔"

جمیل نے میری باتیں سنیں تو اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور ان میں خون اتر آیا۔ اگر میری ساس اور نندیں درمیان میں نہ ہوتیں تو وہ میرا گلا دبا دیتا۔ اس نے ماں اور بہنوں کو درمیان سے ہٹانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چٹان بن گئی تھیں۔ ساس نے اس سے کہا۔

"جمیل.....! دیکھو وہ عورت ذات ہے۔ تم اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"

جمیل چوں کہ اپنی ماں کی بات بہت مانتا تھا اور ان کا احترام کیا کرتا تھا اس لیے رک گیا۔ پھر اس نے مجھ سے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے باپ نے جو یہ سب کچھ دیا ہے وہ اس لیے کہ تمہاری ذات پر لگے ہوئے دھبے کو دھویا جائے۔ ہمیں نہیں چاہیے یہ چیز..... اسے لے جاؤ..... اس گھر میں رہنا ہے تو ایک بیوی اور عورت بن کر رہو..... نہیں تو پھر فیصلہ کرنے تیار رہو..... ابھی اور اس وقت اپنے گھر جا کر والدین کو بھیج دینا۔"

میں اس وقت سنسناتے ہوئے تیر کی مانند اپنے کمرے سے نکلی اور اپنے گھر پہنچا۔ ابو گھر پر موجود تھے۔ امی اور ابو نے میری شکل دیکھی تو ان کے اوسان خطا ہوگئے۔ امی نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا بیٹی فرا.....! خیریت تو ہے نا۔"

میں نے انہیں رو رو کر سارا واقعہ سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ امی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جب میں انہیں اپنی رام کہانی سنا چکی تو ابو نے سپاٹ اور ہر قسم کے عارضی جذبات کے لہجے میں پوچھا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو..... صاف صاف بتا دو۔"

!" میں نے نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "میں اب اس گھر میں ایک لمحے کے لیے نہیں رہ سکتی۔"

"تم نے پہلے طلاق کا انجام دیکھ لیا۔ پھر بھی تم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔" ابو نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں وہاں رہ کر ساس نندوں کے لیے گنتی رہوں اور شوہر سے جوتے کھاتی رہوں۔" میں نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"یہ تمہارے لیے دنیا کی ذلت سے کہیں بہتر ہے۔" امی نے تڑخ کر کہا۔

"یہ ہے آپ کی اپنی بیٹی سے محبت....." میں نے برہمی سے کہا۔ "آپ لوگوں نے مجھ پر کبھی بھولے سے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ناز و نعم سے پالا۔ اس مردود خبیث اور کمینے نے مجھے جوتے مارے تو کوئی بات نہ ہوئی....."

"ہم نے تمہیں ناز و نعم میں پال کر جو غلطی کی اس کا خیال صرف تم ہی نہیں ہم بھی بھگت رہے ہیں۔" امی نے گہری سانس لی جو دکھ بھری تھی۔

"آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں....." میں نے تنک کر پوچھا۔

"تم جس طرح آئی ہو اس طرح واپس جاؤ۔" امی نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ "اپنے شوہر، ساس اور نندوں سے اپنی بدتمیزی، سرکشی اور گستاخی کی معافی مانگو..... اس بات کی کوشش کرو کہ آئندہ اس کی نوبت نہ آئے۔"

"کیا....." حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "اگر اس ذلیل شخص نے پھر جوتے مارے تو کھالوں۔ اف تک نہ کروں۔"

"ہاں....." امی کہنے لگیں۔ "اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم سدھر جاؤ گی۔ ذلت اور رسوائی سے بچ جاؤ گی..... پھر تم صحیح معنوں میں ایک اچھی عورت اور بیوی بن جاؤ گی۔"

"نہیں..... اب مجھ سے نہیں ہوگا۔" میں غصے سے فرش پر پیر پٹخ کر چیخی۔ "مجھے اس خبیث سے طلاق چاہیے۔ میں اس کے ساتھ ایک دن کیا ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی..... میں کسی نیت پر واپس نہیں جاؤں گی۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے۔"

"تو پھر تم بھی ہمارا فیصلہ سن لو۔" ابو سرد و سفاک لہجے میں کہنے لگے۔ "اگر تم طلاق لینا بہتر سمجھتی ہو تو شوق سے لے سکتی ہو..... ہم روکیں گے نہیں..... مگر طلاق لینے کے بعد اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے اور ہم کبھی تمہاری صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ تم اچھی طرح سوچ لو۔"

"ابو.....! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔" میں دکھ سے بولی تو میری آواز بھرا گئی۔ "کیا آپ دونوں بھی مجھے جوتے نہیں مار رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹی! میں کہہ رہا ہوں۔ تمہارا باپ ہوں۔" ابو افسردگی سے بولے۔ "جب بیٹی طلاق لیتی ہے تو صرف بیٹی ہی کی نہیں بلکہ ماں باپ کی بھی بے عزتی ہوتی ہے۔ توہین اور رسوائی اور ذلالت..... پورا خاندان لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ایک کے طلاق لینے سے خاندان کی معصوم اور بے قصور لڑکیوں پر بھی اس کا برا اثر پڑتا تھا۔ تم دوسری مرتبہ طلاق لے کر تم پھر ہم سب کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتی ہو۔ ہم سر اٹھا کر پہلے ہی چلنے کے قابل نہیں رہے..... اب تو کسی کو اپنا منہ بھی دکھا نہیں سکیں گے۔"

کوئی دو گھنٹے کے بعد امی ابو مجھے لے کر سسرال پہنچے بہنوں نے میری طرف سے معافی مانگی۔ میں نے بھی اپنے شوہر اور نندوں سے معافی مانگی۔ میری ساس نے مجھے گلے سے لگایا۔ نندوں نے بھی مجھے خوب پیار کیا۔ میرے شوہر نے مجھے سب کے سامنے معاف کر دیا۔ اس معافی نے سب کے دل صاف کر دیے۔ دلوں میں کوئی کدورت نہ رہی۔

امی اور ابو رات کے کھانے کے بعد میں اپنی ساس اور نندوں کے پاس بیٹھی دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ رات بارہ بجے خواب گاہ میں داخل ہوئی جمیل میں اس نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے بازو پھیلا دیے۔ "آجاؤ۔"

"میں نہیں آتی....." میں نے پیار بھری خفگی سے کہا۔

"کیوں....." وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے دبوچنے اور بستر پر لے جانے آیا تھا۔

"اس لیے کہ تم نے مجھے جوتے کیوں مارے۔"

"اگر میں تمہیں جوتے نہیں مارتا تو تمہاری شکل ٹھکانے نہیں آتی۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "دیکھو اس جوتے نے ہم دونوں کے درمیان کتنی محبت پیدا کر دی۔" مجھے گود میں اٹھا کر بڑے جذباتی انداز سے میرے چہرے پر جھک گیا۔

جمیل نے غلط نہیں کہا تھا..... واقعی اس جوتے نے میرا دماغ درست کر دیا تھا۔ آج اس واقعے کو سات برس بیت چکے ہیں۔ میری دونوں نندوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ دو دو بچوں کی مائیں ہیں۔ میری ساس حیات ہیں۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں..... اگر روز جمیل مجھے جوتے سے نہ مارتے تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ میرے وجود اور شخصیت کی تکمیل نہ ہوتی۔

جاگو مگر

دسویں قسط

ایم اے راحت

دِل والوں کی دِلّی..... مُغلوں کی یَادگاروں اور وَلیوں دَرویشوں کی آغوش میں سانس لینے والی دِلّی میں پیش آنے والے ایک پریشان حال نوجوان کی داستانِ حیات جسے جِنوں سے واسطہ پڑگیا تھا۔ سطر سطر تجسس اور پراسرار واقعات سے سجی ہوئی دلچسپ سلسلے وار داستان۔

اس جہان میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ جن پر عقل حیران رہ جاتی ہے اور یقین ہی نہیں آتا کہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے.....؟ ایسے ہی واقعات سے بھرپور یہ داستان بھی آپ کو اپنے حصار میں جکڑ لے گی۔ عمران ڈائجسٹ کا نیا اور حیرت انگیز سلسلہ

عمران ڈائجسٹ کا سنسنی خیز، پرتجسس اور نیا سلسلہ

میں نے متحیرانہ انداز میں یہ جدید سسٹم دیکھا۔ اس نے کافی کا ایک گلاس مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"پی لو۔ اس میں کوئی نشہ آور چیز شامل نہیں ہے۔" وہ مجھ پر طنز کر رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کافی اس کے ہاتھ سے لے لی اور پھر نیچے اتر کر تعجب سے گاڑی کے اس حصے کو دیکھنے لگا۔

"کیا یہ کافی اسی میں تیار ہوتی ہے۔"

"نہیں تیار کر کے اس میں بھری جاتی ہے لیکن ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

بلاشبہ انتہائی نفیس کافی تھی۔ میں نے ایک اور گلاس بھرا اور اسے خالی کرنے کے بعد نیلسن کے طریقے پر اسے دور پھینک دیا۔ اطراف کا منظر دھند میں بھی حسین نظر آ رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پہاڑوں کا ایک بلند سلسلہ تھا' جس کی چوٹیاں دھند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ داہنی سمت کھیت نظر آ رہے تھے۔ جن میں بھوسے کی بڑی بڑی گانٹھیں ترتیب سے پڑی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگے پروں والا ہیٹ پہنے ایک کسان گانٹھوں کو اٹھا اٹھا کر لکڑی کے بنے ہوئے گودام میں لے جا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں پانی کی بالٹی لیے بھورے رنگ کے ایک گھوڑے کو نہلانے میں مصروف تھا۔ میں نے نیلسن سے پوچھا۔

"گرافن ابھی کتنی دور ہے۔"

"ابھی کافی دور ہے اور راستہ بھی کافی پرخطر ہے۔" اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا..... میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

"اس کے باوجود تم اطمینان سے کھڑی یہاں کافی پی رہی ہو۔"

"تو پھر! کیا پرخطر راستوں پر موت سے خوفزدہ ہونا ضروری ہے اور اگر ہے بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی ایک ایڈونچر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

میرا دل ہول کر رہ گیا کہ یہ ایڈونچر پسند لڑکی کہیں کوئی لمبا ہی ایڈونچر نہ کر ڈالے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اس کا اظہار ممکن نہیں تھا۔ نیلسن واقعی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے باندھنے لگی اور اس کے بعد گاڑی کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ یا تو وہ مجھے زچ کر رہی تھی یا پھر میرے خوف سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ خوف کا اظہار کر کے میں اسے خوش ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔ چنانچہ میں خود بھی دوسری طرف سے گھوم کر بونٹ کے دوسرے حصے پر بیٹھ گیا۔

نیلسن کی نگاہیں دھند میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ کافی پرے ایک وادی میں سوئٹزرلینڈ کے دیہی وضع کے مکانات بکھرے پڑے تھے۔ یہ مکانات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ نیلسن کہنے لگی۔

"پرانے زمانے میں ان گھروں کے رہنے والے وادی کے پار اپنے ساتھیوں کو ایک خاص طریقے سے پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ لکڑے کے بنے ہوئے کئی کئی فٹ لمبے قرنے زور سے پھونکے جاتے تھے اور پوری وادی میں ان کی بھیانک آواز گونجتی تھی۔ وادیوں میں رہنے والے ان قرنوں کی آوازوں کے زیر و بم سے پیغام پڑھ لیا کرتے تھے۔ برف باری اور شدید طوفانوں کے دوران جب پیغام رسانی کے دوسرے وسائل ختم ہو جاتے تھے تو وادی کے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے اسی طریقے سے کام لیا کرتے تھے اور اسے یوڈلنگ کہا جاتا تھا۔"

"فنٹاسٹک! کیا زندگی ہو گی ان لوگوں کی۔ کیوں نہ ہم یہ رات یہیں بسر کریں ڈیئر نیلسن۔" میں نے ایک خاص خیال کے تحت کہا۔

وہ چند لمحے میری صورت دیکھتی رہی اور پھر جلدی سے بونٹ سے نیچے اتر گئی۔

"نہیں ہمیں گرافن تک پہنچنا ہی ہو گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی اس ترکیب کی

کامیابی پر خود کو سراہا تھا۔ شاید میں اس لڑکی کی فطرت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے اس کے اندر یہ انحراف نہیں تھا۔ بلکہ وہ مجھ سے مکمل تعاون کر رہی تھی لیکن اب اس کے انداز میں ایک ہلکی سی جھنجھلاہٹ پائی جاتی تھی' اور جو کچھ میں کہہ رہا تھا اس سے بعض اوقات وہ انحراف بھی کر لیتی تھی۔ اس کی وجہ میں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ یہ پچھلی رات اس کی خاندانی کاک ٹیل قبول نہ کرنے کا شاخسانہ تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر اچھل کر بیٹھ گئی اور میں اس انداز میں سیٹ کی طرف بڑھا' جیسے بحالت مجبوری آگے کا سفر کرنا چاہتا ہوں لیکن میری دلی خواہش تھی کہ جلد از جلد اس کہر آلود راستے کو طے کر کے کسی بہتر جگہ قیام کیا جائے تاکہ راستے کے خطرات سے نہ نمٹنا پڑے۔

جس سڑک پر ہم جا رہے تھے' اس کے گرد پہاڑوں پر بے پناہ دھند تھی۔ کسی جگہ دھند صاف ہوتی تو قصبوں کے دیدہ زیب کلیاؤں کے سرخ گنبد نظر آ جاتے۔ بلندی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دھند میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ہم خود بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ونڈ اسکرین کے سامنے دھند کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور مجبوراً نیلسن کو کار کی روشنیاں آن کرنی پڑیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کار کی رفتار بھی سست کر دی تھی۔ موسم کی شدت دیکھ کر میرے اعصاب کشیدہ ہوتے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں گرافن تک پہنچتے پہنچتے کیا صورت حال پیش آئے۔

پھر کار نے ایک موڑ کاٹا تو دوسری جانب سڑک کے بیچ میں خطرے کے سرخ نشان کا تختہ لگا ہوا نظر آیا۔ تختے کے ساتھ ساتھ دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور نیلسن نے کار ان کے قریب لے جا کر روک دی۔

"سوری میڈم! آپ آگے نہیں جا سکتیں۔ برف ایک تو دہ پھسلنے کی وجہ سے سڑک بالکل بند ہے۔ آپ واپس چلی جائیں۔" ان میں سے ایک نے کھڑکی کے قریب آ کر کہا۔

نیلسن نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا اور کہنے لگی۔

"میں گاڑی نکال لے جاؤں گی۔ رات ہو چکی ہے۔ واپسی بھی ہمارے لیے خطرناک ہو گی۔"

"براہ کرم! ضد نہ کیجئے۔ آگے بڑھنا بالکل ممنوع قرار دیا جا چکا ہے اور ہم اس سے پہلے بھی اس طرف آنے والے لوگوں کو واپس بھیج چکے ہیں۔"

"تعجب ہے۔ راستے میں ہمیں کوئی بھی واپس جاتا ہوا نظر نہیں آیا۔"

"تاہم آگے بڑھنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔"

"اوہ ٹھیک ہے۔ کیوں ڈیئر شامی! اگر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے تو پھر زیادہ پیچھے ہٹنا بھی ہمارے لیے مناسب نہیں ہو گا۔"

"کیا مطلب۔" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آؤ..... مطلب بعد میں سمجھاؤں گی۔" نیلس بولی اور پھر اس نے کافی تیز رفتاری سے کار کو ریورس کیا اور پھر ایسی جگہ آ کر جہاں سے وہ ٹرن لے سکتی تھی' کار واپس موڑ دی۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ میں ابھی اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر پایا تھا کہ دفعتہً اس نے کار سڑک کے دائیں سمت نشیب میں اتار دی اور میرے منہ سے ایک ہلکی سے آواز نکل گئی۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا' جیسے اسٹیئرنگ اس کے کنٹرول سے باہر ہو گیا ہو لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ کار نشیب میں اتر کر ایک کھلی جگہ پر رک گئی اور نیلس نے اس کا سوئچ آف کر دیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا اور وہ سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ پھر میں نے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں' چاروں طرف دھند ہی دھند تھی۔ تھوڑے فاصلے کی چیزیں بھی اب صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"یہ..... یہ کیا ہوا نیلس۔"

"جو ہونا چاہیے تھا....." وہ سرد لہجے میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں۔" دفعتہً میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی۔

"کیا نہیں سمجھے۔"

"تم..... تم کیا چاہتی ہو..... کیا چاہتی ہو آخر....."

"ارے..... ارے تمہارے لہجے سے تو خوف جھانک رہا ہے۔ ڈر رہے ہو اس ماحول سے۔" دفعتہً نیلس کے لہجے میں ایک شوخی سے پیدا ہوگئی۔

"نہیں..... لیکن کار یہاں اتارنے کا کیا مطلب ہے۔"

"میرے خیال میں قیام کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔ کل دن کی روشنی میں جب راستہ صاف ہوجائے گا تو ہم گرائن چلیں گے۔ تمہیں کون سی واپس جانے کی جلدی ہے۔"

"لیکن یہ بھیانک جگہ....."

"اوہ..... کوئی جگہ بھیانک نہیں ہوتی۔ یہ تو ایڈونچر ہے۔ کیا لطیف آئے گا یہاں رات گزار کر..... لیکن تم فکر مت کرو۔ اس کھلی چھت کی کار میں تمہیں یہ رات بسر نہیں کرنی پڑے گی۔ میں ہر طرح کے انتظامات رکھتی ہوں۔"

وہ چھلانگ لگا کر کار سے نیچے اتر گئی اور پھر اس کے عقبی حصے میں پہنچ کر اس نے ایک بٹن دبایا۔ کار کے پچھلے حصے کا ڈھکن کسی وہیل مچھلی کے منہ کی مانند کھل گیا تھا۔ اس نے اس میں سے ایک بڑا سا بنڈل نکالا اور اس کے بند کھولنے لگی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی لیکن جب نیلس نے اس بنڈل کو پوری طرح کھول کر زمین پر پھیلایا تو میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں' یہ ایک باقاعدہ بڑا خیمہ تھا۔ جو انتہائی جدید ساخت کا تھا۔ چند ہی لمحوں میں نیلس نے اسے کھڑا کر کے وہاں ایک باقاعدہ کمرہ سا بنادیا۔ خیمے کی طنابیں اس نے ایک مخصوص قسم کے راڈ میں پھنسا کر زمین میں گاڑی تھیں۔ کیونس یا نائیلون ملی ہوئی کسی چیز کا یہ خیمہ بظاہر کافی مضبوط نظر آتا تھا۔ نیلس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ دوبارہ ڈگی کی طرف متوجہ ہوگئی اور اس بار اس نے ایک اور بنڈل نکال لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پمپ بھی جو سائیکلوں میں ہوا بھرنے کے کام آتا تھا۔ بنڈل کا نپل کھول کر اس نے پمپ سے ہوا بھرنی شروع کردی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبا چوڑا گدا تیار ہوگیا۔ اس گدے کو خیمے کے اندر بچھانے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور ایک بار پھر ڈگی کی جانب بڑھ گئی۔ اب اس نے ایک بڑا سا کمبل نکال لیا تھا۔

"ایک پوری رہائش گاہ' تم نے کافی کا تھرماس دیکھ لیا ہے۔ اس تھرماس میں تقریباً ایک گیلن کافی ہے اور میرا خیال ہے' یہ ہمارے لیے بہت ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء بھی موجود ہیں۔ یہ گرم کمبل ہمیں سردی کا احساس بھی نہیں ہونے دے گا۔ اب کیا' کیا جائے..... زندگی کے یہ لوازمات تو ضروری ہوتے ہیں اور ان خیال رکھنا چاہیے۔ ویسے ڈیئر شامی! ایڈونچر پسند بنو..... اسی میں مزہ ہے۔ زندگی ایئر کمرے میں بہترین بستروں پر بھی گزرتی ہے لیکن اگر کبھی ایسے ہولناک ویرانوں میں بھی بستر کرنی پڑ جائے تو ان سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔"

میں خاموش ہی رہا تھا۔ وہ اطمینان سے ریڑھ کے گدے پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی اور مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کسی خیال کے تحت باہر نکل کر گاڑی کو لاک کیا۔ اگنیشن سے چابی نکال لائی اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا لیمپ بھی جو غالباً بیٹری سے چلتا تھا۔ تاریکی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ مدھم لیمپ خیمے کے اندر کی فضا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر باہر نکل کر ڈگی میں سے ایک پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ڈنر۔"

"خدا کی پناہ نیلس..... ! یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں ان ساری چیزوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔"

"یہ بات تمہارے علم میں آچکی ہے کہ میں

ایڈونچر پسند ہوں اور زندگی میں ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی ہوں۔ پتا نہیں کیسے انسان ہو تم شامی! حقیقت یہ ہے کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ یکسانیت تو انسان کو چند سال سے زیادہ زندہ بھی نہ رہنے دے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اب بہت زیادہ بیزاری کا مظاہرہ بھی حماقت تھی۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ واپسی کا سفر اس وقت ممکن نہیں تھا اور پھر واپس جا کر کون سا تیر مارنا تھا۔ نیلس کے ساتھ ہی کوٹھی میں رہنا تھا۔ مسٹر اور مسز ڈینس تو کنارہ کش ہوگئے تھے۔ عجیب سی بات تھی۔ بہر طور وہ لوگ میرے احسان مند تھے اور انہوں نے اس احسان کے صلے میں مجھے آزادی ملی تھی۔

چنانچہ اب اصولاً مجھے بھی ان پر بار نہیں بننا چاہیے تھا۔ مہمان نوازی اور احسان کے بارے میں یہ سوچتے ہوئے مجھے خود بھی اس مضحکہ خیز لگا تھا۔ بھلا میں اپنے لیے کیا کرسکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضا میں چکراتا رہتا۔

نیلس کھانے پینے کا سامان اور کافی کے گلاس لے آئی۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تکلف نہیں ڈیئر! بہت ہلکا پھلکا سا کھانا ہے۔ تمہیں پسند آئے گا۔" انتہائی نفیس پیکنڈ چیزیں جو مختلف چیزوں سے بنے ہوئے تھے اور کافی یہی ہمارا کھانا تھا لیکن اس سے زیادہ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سردی بدن میں اترتی جارہی تھی اور اب اندر ہی اندر کچھ کپکپاہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کافی حلق میں انڈیلنے کے بعد کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔ نیلس نے پچھلے حصے کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور اس سے تکیے برآمد ہوگئے۔ اس کے بعد اس نے کافی کے گلاس خیمے کے دروازے سے باہر پھینکے۔ دروازے کی زپ بند کی اور اطمینان سے گدے پر آکر لیٹ گئی۔

"سردی واقعی ضرورت سے کچھ زیادہ ہوتی جارہی ہے۔"

"ہاں! مجھے تو حیرت ہے کہ تم سردی سے اتنی زیادہ متاثر نظر نہیں آرہی ہو' جتنا میں ہوں۔"

"نہیں یہ بات نہیں..... سردی تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن میں کسی بھی چیز کو مسلط کرنے کی عادی نہیں ہوں۔"

"تب تم عورت نہیں ہوں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو....." نیلس نے برا ماننے والے انداز میں کہا۔

"عورت کے تصور کے ساتھ نزاکتوں اور لطافتوں کا تصور بھی ابھرتا ہے' جو تم میں موجود نہیں ہے۔"

"بدصورت ہوں میں۔" اس نے سوال کیا۔

"نہیں..... نہیں! شکل و صورت تو تمہاری بہت اچھی ہے لیکن تمہاری طبیعت میں مردانہ پن زیادہ جھلکتا ہے۔"

وہ چند لمحات مجھے دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار ہنس پڑی۔

"نہیں..... یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ اب ایسی بھی بات نہیں....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی اور اس کے بعد اس نے کمبل کا ایک سرا بے تکلفی سے اپنے اوپر کھینچ لیا۔ ظاہر ہے کہ کمبل تھا کوئی قالین نہیں تھا' جو لمبا چوڑا ہوتا۔ میں اس کی فطرت پر غور کرنے لگا۔ نیلس بے تکلف لڑکی تھی۔ ان تمام اخلاقی فضولیات سے دور جو خواتین کے نام سے منسوب ہوتی ہیں۔ پھر ویسے بھی اس کا تعلق ایک ایسی جگہ سے تھا جہاں کی سوچ ذرا مختلف تھی لیکن میں اپنی سوچ کو کس طرح بدل سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں' ذہن کو ایک عجیب سا احساس ہورہا تھا۔

پھر سردی کی شدت سے ہر طرح کا احساس دل سے نکال دیا۔ انتہائی خنکی پیدا ہوگئی تھی فضا میں یہ اندازہ نہیں تھا کہ سردی آن کی آن میں اس طرح آسمان سے اتر کر زمین پر پھیل جائے گی۔ بلاشبہ جب ہم برن سے نکلے تھے تو موسم سرد تھا اور تھوڑا سا

فاصلہ طے کرنے کے بعد دھند اور کہر نے آلیا تھا لیکن اس میں اتنی سردی تو نہیں تھی۔ اب تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف برف ہو اور ہم اس کے درمیان ہوں۔ بدن کے اندر ایک عجیب سی اینٹھن پیدا ہوگئی اور ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہونے لگا۔ کمبل کو میں نے اپنی ایک سائیڈ سے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دوسری سائیڈ البتہ میرے بس میں نہیں تھی۔

دفعتہً نیلس نے میری طرف دیکھا اور میری پیشانی پر الٹا ہاتھ رکھ کر بولی۔

"کیا بات ہے۔ شاید تم بہت زیادہ سردی محسوس کر رہے ہو۔"

"ہاں..... ایسی ہی بات ہے۔" میرے حلق سے بمشکل تمام نکلا۔

نیلس کہنیاں ٹکا کر بیٹھ گئی اور پھر کمبل پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر وہ خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ اس بار جب خیمے کا دروازہ کھلا تو یوں محسوس ہوا جیسے برف کا برادہ اڑ کر میرے بدن سے چپک گیا ہو۔ میں نے جلدی سے کمبل میں منہ ڈھک لیا تھا۔ پتہ نہیں' اب وہ کیا کرنے گئی تھی لیکن چند لمحات کے بعد واپس آ گئی۔ میری اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ کمبل سے منہ نکال کر دیکھتا۔ ویسے اس نے دروازے کی زپ بند کر دی تھی۔ پھر اس نے میری پیشانی کو تھپتھپایا۔

"اٹھو شامی! اٹھو۔"

"کک..... کیا بات ہے۔" میں نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لو یہ پی لو۔ تمہاری سردی بہت کم ہو جائے گی۔"

"کک..... کیا چیز ہے۔" میں نے کہا۔

"منہ تو کھولو۔ ہٹاؤ یہ کمبل چہرے سے۔ یہ کیا حرکتیں کر رہے ہو۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے سے انداز میں کہا اور میں نے ڈرتے ڈرتے کمبل' چہرے سے ہٹا لیا۔ نیلس کا ہاتھ میرے چہرے کے قریب تھا۔ اس نے جلدی سے کوئی چیز میرے ہونٹوں سے لگا دی..... غیر اختیاری طور پر بھی میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ ایک کڑوی' بدذائقہ اور عجیب سی شے میرے حلق سے نیچے اتر گئی۔ سینے میں ایک ہلکی سی لکیر بنتی چلی گئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور ابکائیاں سی لینے لگا۔

"اریارے..... کیا حماقت ہے۔ خود کو سنبھالو....." نیلس نے کہا اور خود بھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس سے چسکیاں لینے لگی۔ میں نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ یہ اس کا خاندانی نسخہ تھا..... وہی نسخہ جو اس نے مجھے پہلے بھی پلانے کی کوشش کی تھی۔

"شششی..... شراب۔"

"حماقت کی باتیں کرو گے تو خیمے کا دروازہ کھول کر باہر نکال دوں گی۔ پتا نہیں کس قسم کے آدمی ہو۔ لو..... یہ ایک اور بھی پیو اور محسوس کرو کہ اب اندر کی کیفیت کیا ہے۔"

میں نے اپنے آپ پر غور کیا تو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ بلاشبہ ایک ہی گلاس میں اندر کی سردی تو نکل گئی تھی اور اب وہ کیفیت نہیں تھی جو چند ہی لمحات قبل میں نے محسوس کی تھی۔ اس نے دوبارہ میرے گلاس میں وہ رنگین چیز انڈیل دی جو کئی رنگوں سے مل کر بنی تھی اور گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"نیلس پلیز۔"

"کوئی چیز اگر دوا کے طور پر استعمال کی جائے تو وہ اتنی بری بھی نہیں ہوتی۔ آخر ڈاکٹر تمہیں دوائیاں دیتا ہے۔ پتا نہیں کس ٹائپ کے آدمی ہو۔ میں نے تو ایسا کوئی مرد اس سے پہلے نہیں دیکھا۔"

"اوہ..... اب تم مجھے طعنے دے رہی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا اور گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"آہستہ آہستہ چسکیاں لے لے کر پیو۔ لطف آ جائے گا۔" اس نے کہا۔ میں ابھی تک اس بدذائقہ چیز کو اپنے منہ میں محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے مجھے جو فائدہ پہنچایا تھا' وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں

تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی ایک چھوٹی سی چسکی لی۔ دوسری تیسری..... اور چوتھی اور اس کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ذائقہ ختم ہو گیا ہو۔ بلکہ اب ایک عجیب سی خوشبو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ یہ دوسرا گلاس بھی خالی ہوا تو اس نے تیسرا گلاس بھر دیا۔

"نقصان تو نہیں دے گی۔" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ایک گلاس اور پی لو۔ اس کے بعد مجھے بتانا کہ اس نے تمہیں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔" نیلس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اسی دوران وہ اپنے لیے بھی تیسرا گلاس بھر چکی تھی۔ ہر چند کہ یہ گلاس بہت چھوٹے چھوٹے تھے لیکن بہرطور امیرے لیے کافی تھے۔ تیسرا گلاس پینے کے بعد میں نے اپنا گلاس رکھ دیا۔

دفعتہً ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا' جیسے فضا میں گرمی پھیلتی جا رہی تھی۔ میرے اندر کی سردی نکل گئی تھی۔ باہر کی فضا بھی نارمل سی محسوس ہونے لگی لیکن رفتہ رفتہ حدت کچھ اور بڑھی اور میری کنپٹیوں سے ہلکی ہلکی آنچ نکلنے لگی۔ آنکھوں میں بھی عجیب سی چبھن پیدا ہو گئی تھی..... ذہن کچھ بھٹکنے سا لگا تھا۔ میں نے ہمرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیلس! کیا ایک گلاس اور مل سکتا ہے۔"

نیلس ہنس پڑی۔

"ہاں کیوں نہیں لیکن میرا خاندانی نسخہ یہ بھی ہے کہ چوتھے کے بعد پانچویں گلاس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے بعد انسان اوندھا ہی ہو سکتا ہے۔"

اس نے مجھے چوتھا گلاس بھی دے دیا اور یہ گلاس معدے میں اتارنے کے بعد دنیا ہی تبدیل ہو گئی۔ مجھے اپنے چاروں طرف روشنیاں سی جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مدھم مدھم رنگین روشنیاں..... جو میرے چاروں طرف ٹمٹما رہی تھیں۔ کبھی جلتیں اور کبھی بجھ جاتیں۔ فضاؤں میں ایک عجیب سی سرمستی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چندھیائی ہوئی نگاہوں سے ان روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ آسمان سے براہ راست رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ میں فضا میں تیر رہا تھا۔ ستارے میرے بالکل قریب تھے..... مجھے دیکھ کر ہنس رہے تھے..... پھر ان ستاروں نے اپنے بازو پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا..... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پانی کی..... گہرائیوں میں اترتا جا رہا ہوں۔ بہت ہی لطافت بکھری ہوئی تھی چاروں طرف اور میں ستاروں کے درمیان کھیلتا رہا..... پھر تھکن سے چور ہو گیا اور وہیں کسی ستارے کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی تھی۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہو گئی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے اطراف میں دیکھا۔ نیلے رنگ کی چھولداری کی چھت نظر آ رہی تھی اور میں اس کے اندر تھا۔ زپ بند تھی اور میرے بالکل قریب نیلس موجود تھی لیکن وہ جس حالت میں تھی' اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اپنے آپ پر بھی غور کیا..... اور میرے حواس چند لمحات کے لیے معطل ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے تو جی چاہا کہ اٹھ کر باہر بھاگ جاؤں لیکن پھر سردی کے تصور نے باز رکھا۔ باہر نکلنے کا مطلب ہے کہ براہ راست نمونیا..... میں پریشانی کے عالم میں نیلس کو دیکھتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں..... ہونٹوں پر ایک گہری سی مسکراہٹ..... نقوش میں ایک عجیب سی کیفیت..... نجانے کیوں میری نگاہ اس پر جمی رہ گئی اور گزارے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے میرے ذہن سے گزرنے لگے اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کمینی کہیں کی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور کمبل سے باہر نکل آیا۔ نیلس جب جاگی تو میں چھولداری کے باہر کھڑا تھا اور ان حسین نظاروں کو دیکھ رہا تھا' جو اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔ طبیعت پر ایک عجیب سی شگفتگی اور ایک عجیب سی نفرت طاری تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی اور میں نے شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہیلو شامی! کہو..... اب تو سردی کا احساس

نہیں ہے۔"

"کیا کہوں تم سے نیلس! کیا کیوں۔"

"اوہ ڈیئر! کچھ مت کہو۔ بس! کچھ بھی مت کہو..... پلیز! کچھ مت کہو....." اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ پھر چونک کر بولی۔

"کافی پی تم نے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر آؤ! ایک ایک کپ کافی پئیں۔"

میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کافی اس وقت بھی بالکل گرم اور تازہ تھی۔ یہ حیرت انگیز چیز نیلس نے اپنی گاڑی میں لگا رکھی تھی۔ کافی کے دو دو کپ پینے کے بعد ہم تازہ دم ہو گئے۔ نیلس کہنے لگی۔

"بس! ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے اور وہ ہے پانی..... جس سے ہم غسل کر سکیں۔"

"غسل....." میں نے پھریری لیتے ہوئے کہا اور نیلس ہنس پڑی۔

"ہاں! یہاں غسل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا خیال ہے' چلیں۔"

"ظاہر ہے' ہم یہاں قیام کے لیے تو نہیں آئے تھے۔ ویسے تمہاری دوست ایلی تمہارے نہ پہنچنے سے پریشان نہیں ہوگی۔ یا پھر راستہ بند ہونے کی اطلاع اسے مل گئی ہوگی۔" میں نے سوالیہ انداز میں کہا اور نیلس کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"میری دوست ایلی۔" اس نے شوخ انداز میں کہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

"کیوں..... کیا مطلب ہے اس بات کا۔"

"اس نام کی کوئی لڑکی میں نے کبھی دوست نہیں بنائی اور گرافن..... گرافن سے زیادہ واہیات علاقہ سوئٹزرلینڈ میں اور کوئی نہیں ہے۔ ایک بھدا اور بدنما قصبہ جہاں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں تعجب سے نیلس کو دیکھنے لگا' کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس نے چھولداری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اب اس سامان کو سمیٹیں۔"

میں نے خیمہ اتارنے میں اس کی مدد کی تھی۔ بہت ہی عجیب و غریب خیمہ تھا۔ لپیٹنے کے بعد ایک چھوٹے سے بنڈل کی شکل میں رہ جاتا تھا۔ ویسے کافی کشادہ تھا۔ گدے کی ہوا نکالی گئی۔ تمام سامان ڈگی میں منتقل کر دیا گیا۔ پھر کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"تو کیا تم گرافن نہیں چلو گی۔"

"نہیں بھئی! ہمیں گرافن سے کیا دلچسپی ہے۔ وہاں واقعی دیکھنے کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تو پھر..... تو پھر....." میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"بس! تمہیں اس کاک ٹیل کے چند گلاس پلانا چاہتی تھی۔ تم وہاں قبول کر لیتے تو یہ رات اس سردی میں نہ گزارنا پڑتی۔" نیلس نے کہا اور کار اسٹارٹ کر کے ریورس کر دی۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور جب میری سمجھ میں آئی تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ آہستہ سے چیخ کر ہنس پڑی تھی۔

کار نے سڑک کی ڈھلان عبور کی تو میں نے خود ہی گھبرا کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ کیونکہ رفتار بہت تیز تھی لیکن اس کا رخ واقعی گرافن کی جانب نہیں تھا۔ بلکہ وہ واپس شہر کی جانب جا رہی تھی۔

"تم..... تم کمینی لڑکی! تم واقعی بے حد کمینی ہو۔"

"شکریہ ڈیئر! دراصل میں ایڈونچر پسند ہوں اور میری زندگی ایسے ہی گزر رہی ہے۔" اس نے کہا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اسپورٹس کار کی رفتار یکدم بڑھ گئی اور میں نے خود کو سنبھالنے کے لیے جلدی سے سائیڈوں میں لگی ہوئی بیلٹ اپنے پیٹ پر باندھ لی۔ نیلس کی حرکت مجھے عجیب و غریب لگی تھی لیکن نہ جانے کیوں گزری ہوئی رات اب بری نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

برن کے اسی خوبصورت علاقے میں اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو کر نیلس نے مجھے خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ باتھ روم میں جا کر گرم پانی کے شاور کے نیچے جا بیٹھا۔ غسل کر کے باہر نکلا تو نیلس میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بھی غسل کر کے آ گئی تھی۔

"میں نے ملازم سے ناشتا لانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے لیکن ناشتے کے بغیر کیسے کام چلے گا..... کیا خیال ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

"ویسے مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری خاندانی شراب پسند آئی ہوگی۔"

"نیلس! بس' کیا کہوں تم سے۔"

"کمال کے انسان ہو۔ پتا نہیں کیا ٹائپ ہے تمہارا..... میں تو واقعی تمہیں سمجھ نہیں سکی۔"

"بہتر ہے' نہ سمجھو۔"

"آؤ! ناشتے کے کمرے میں چل کر باتیں کریں گے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میں اس کے ساتھ ناشتے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ عمدہ قسم کا ناشتا میز پر سجا دیا گیا تھا۔ میں نے مسز ڈینس پال کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"ملازم کو فون ملا تھا۔ انکل مارسیلز جا رہے ہیں اور یقیناً وہاں بھی انہیں دو چار روز لگ جائیں گے۔ البتہ آنٹی کل تک اسپتال سے واپس آ جائیں گی۔ تاہم آنٹی بہت اچھی طبیعت کی مالک ہیں۔ ہمارے مشاغل میں وہ کبھی دخل نہیں دیں گی۔"

"ہوں..... لیکن میں سوچ رہا ہوں نیلس! کہ اب مجھے یہاں کب تک تمہارا مہمان رہنا چاہیے۔"

"کیوں..... اکتا گئے۔ ابھی تو سوئٹزرلینڈ بہت وسیع ہے۔"

"یقیناً ہے لیکن تم نے مجھے فطرتاً عجیب کہا ہے اور یہ بھی میری عجیب فطرت کا ایک پہلو ہے کہ میں اس سے زیادہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔"

"لیکن احمق آدمی! اس کی وجہ تو بتاؤ۔"

"بس بھئی! ایک چھوٹا سا کام کر دیا تھا تمہارے انکل کے لیے اور وہ بھی اتفاقی طور پر۔ میں نے کم از کم تم لوگوں سے جھوٹ نہیں بولا۔ جان بوجھ کر میں نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا تو پھر اب اس کا اور کتنا معاوضہ وصول کروں۔"

"نہیں ڈیئر! ہر چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا اور یہ تو تمہاری اچھی فطرت کی دلیل ہے کہ تم اتنے بڑے کام کو چھوٹا سا سمجھتے ہو۔ آنٹی اور انکل ان کے چنگل میں جا پھنسے تھے۔ یوسف عارض زخمی ہو کر ناکارہ ہو گیا تھا اور پھر باقی جو کچھ ہونا تھا اگر اس انداز میں ہو جاتا تو انکل کا کیریئر خطرے میں پڑ جاتا۔ تم نے نہ صرف انہیں اس مصیبت سے نکال لیا' بلکہ کسی بدنامی کا شکار بھی نا ہونے دیا اور اس کے بعد تم اس کام کو چھوٹا سا کہتے ہو..... چلو! ہم اسے مان لیں تو کیا ایک دوست کی حیثیت سے تم کچھ عرصے ہمارے ساتھ قیام نہیں کر سکتے۔ یا پھر میری پلائی ہوئی کاک ٹیل سے خوفزدہ ہو گئے ہو۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی خود میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا اور نہ جانے کیوں اب نیلس مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ یوں تو میری زندگی کی کتاب آپ کے سامنے ہے۔ ایک طویل سفر میں نے کینس کے ساتھ تنہا طے کیا تھا۔ اس کے بعد زینو کا بھی میری زندگی میں آئی تھی لیکن یہ کاک ٹیل پینے کے بعد میرے ذہن میں کچھ نئے احساسات جاگ اٹھے تھے۔

میری خواہش تھی کہ اب میں تھوڑی دیر آرام کروں۔ طبیعت پر ایک ہلکا سا سرور اس وقت بھی طاری تھا لیکن نیلس نچلا بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھی۔ لنچ کے بعد ہی اس نے مجھ سے تقاضا کر دیا تھا کہ باہر گھومنے پھرنے کے لیے..... تیاریاں کر لی جائیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ برن کا موسم اتنا ہی حسین تھا اور نیلس کی اسپورٹس کار مختلف علاقوں میں چکراتی پھر

رہی تھی۔

رات کا کھانا دریا کے کنارے اسی ہوٹل میں کھایا گیا اور جب کافی رات ہوگئی تو نیلس نے واپسی کا اعلان کردیا۔ فضا میں اس وقت کافی دھند تھی' کوٹھی پہنچ کر نیلس نے مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں پہنچ کر لباس وغیرہ تبدیل کرنے لگا۔ ذہن میں بہت سے خیالات تھے۔ سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن اب سوچ کی اس یلغار سے بچنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں کچھ سوچنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

میں اپنی مسہری پر دراز ہوگیا اور نجانے کیا کیا خیالات میرے سینے میں مچلنے لگے۔ بدن کو ایک نئی کیفیت کا احساس ہورہا تھا..... دفعتہً دروازے پر دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا..... مسرت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی..... دروازہ کھولا تو نیلس کھڑی تھی اور وہی خوبصورت سی نازک سی ٹرالی اس کے سامنے تھی' جس پر چند شیشیاں اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ نیلس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے ٹرالی اندر داخل کردی اور آہستہ سے بولی۔

"میرا خاندانی نسخہ۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پچھلی رات اس خاندانی نسخے کی کرامات دیکھ چکا تھا اور اس سے برے اثرات مرتب نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ ایک طرح سے مجھے ذہنی سکون ملا تھا۔ چنانچہ میں نے آج بھی اس کا یہ خاندانی نسخہ قبول کرلیا اور آج یہ نسخ اور بدذائقہ کاک ٹیل مجھے پچھلی رات کی مانند بری نہیں محسوس ہوئی تھی۔

دوسری صبح جاگا تو کاک ٹیل کے اثرات ذہن پر موجود تھے اور اس کی خرافات میرے قریب..... میں نے جھنجھوڑ کر نیلس کو جگایا تو وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی..... پھر اس نے مجھے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم مجھے قتل کرائے بغیر نہیں چھوڑو گی۔ اگر مسٹر ڈینس یہاں آ جائیں اور انہیں ان ساری باتوں کا علم ہوجائے تو۔"

"تو کیا۔" وہ تعجب سے بولی اور میں گہری سانس لے کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

اس کا کہنا درست تھا۔ یہاں سب کچھ جائز تھا۔ کوئی کسی کے معاملات میں مداخلت کا حق نہیں رکھتا تھا..... ہر شخص کو اپنے طور پر جینے کی آزادی تھی۔

نیلس کمرے سے باہر نکل گئی اور میں غسل خانے کے اندر چلا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ باہر کچھ آوازیں سنائی دیں اور نیلس چونک کر کھڑی ہوگئی۔

"اوہ..... آنٹی واپس آ گئی ہیں۔"

میں سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر مسز ڈینس پال اندر آ گئیں۔ سفید اسکرٹ میں وہ پہلے سے زیادہ خوشگوار نظر آ رہی تھیں۔ رسمی سلام دعا کے بعد وہ اپنے لیئے بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"نیلس مجھے بھی ناشتا دو۔ میں سوچ کر چلی تھی کہ کہیں لیٹ نہ ہوگئی ہوں۔"

"ضرور آنٹی! ویسے آپ کی صحت پہلے سے بہت بہتر نظر آ رہی ہے۔"

"ہاں! میں فٹ ہو کر آئی ہوں۔" مسز ڈینس پال نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ ناشتے میں مصروف ہوگئیں۔ ناشتے کے دوران وہ مجھ سے بھی گفتگو کرتی جارہی تھیں۔

"تم سناؤ مسٹر شامی! ہم دونوں کی غیر موجودگی میں تم بور تو نہیں ہوئے۔ کیوں نیلس! مسٹر شامی کو تم نے برن کی سیر کرائی۔"

"ہاں آنٹی! میں نے کوشش تو کی ہے انہیں خوش رکھنے کی۔ اب پتا نہیں' اس میں کامیاب ہوئی ہوں یا نہیں۔" نیلس نے بدستور شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور میں بوکھلا گیا۔ اس کا اندازہ معنی تھا۔

بہرطور! میں ناشتے کے دوران ان کے ساتھ

ہی رہا اور پھر ہم تینوں باہر نکل آئے۔ مسز ڈینس پال نے نیلس سے کہا کہ انہیں اس سے کچھ گفتگو کرنی ہے۔ چنانچہ وہ شامی کوس کے کمرے میں چھوڑ کر ان کے پاس آ جائے۔ نیلس ان کی ہدایت کے مطابق مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی تھی۔ واپس پلٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"کاک ٹیل کے لیے تم بالکل فکرمند مت ہونا شامی! اس کی بہت بڑی مقدار میرے پاس موجود ہے۔ او کے۔"

وہ واپس چلی گئی۔ مجھے اب اس تفریح سے کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ ذہن پر وہ بیزاری طاری نہیں تھی جو میری فطرت کا خاصا بن چکی تھی۔ اب ذرا فرحت کا احساس ہورہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سوچا کہ بہرطور! یہاں اقدار کا کوئی تعین نہیں تھا اور یہ لوگ میرے احسان کا صلہ کچھ طویل عرصے تک ادا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کیوں نہ یہاں اس وقت تک قیام کروں۔ جب تک یہ لوگ خود ہی مجھ سے اجازت نہ مانگ لیں۔ مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آ گئی تھی لیکن دنیاداری یہی چیز ہے۔ لوگ اسی انداز میں جینے کے عادی ہیں اور اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ ان تمام آداب سے ناواقفیت ہی آج تک میرے لیے جھٹکنے کا باعث رہی ہو۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ نیلس کسی کام میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس لیے واپس نہیں آئی تھی۔ تقریباً پونے بارہ بجے مسز ڈینس پال میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر آ گئیں۔ میں سمجھا تھا کہ نیلس ہوگی یا پھر کوئی ملازم..... مسز ڈینس کو دیکھ کر تعظیم کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو..... بیٹھو..... پلیز شامی! میں دیکھنے آئی تھی کہ تم کیا کررہے ہو۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ساڑھے بارہ بجے مسٹر ڈینس آنے والے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل مارسیلز سے فون آیا تھا ان کا۔"

"گڈ....." میں نے خوامخواہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ مسٹر ڈینس کی واپسی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مسز ڈینس دیر تک مجھ سے گفتگو کرتی رہیں۔ دوران گفتگو ہی میں نے نیلس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نیلس ایرپورٹ گئی ہوئی ہے۔ مسٹر ڈینس کو لے آئے گی۔

"میں نے اسے خود ہی منع کردیا تھا کہ تمہیں ساتھ نہ لے جائے۔"

"ٹھیک کیا آنٹی۔"

"ویسے نیلس تمہیں پسند آئی ہوگی۔ وہ بہت ہی خوش مزاج لڑکی ہے۔"

"یقیناً اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے باہر ہارن کی آواز سنائی دی تو مسز ڈینس میرے ساتھ دروازے کی جانب اپنے شوہر کے استقبال کے لیے چل پڑیں۔ میں بھی ساتھ تھا۔ نیلس کی سپورٹس کار پورٹیکو میں رکی ہوئی تھی۔ مسٹر ڈینس پال کے ساتھ گولڈن کلر کے خوب صورت پھولوں والے اسکرٹ میں ملبوس ایک حسین سی لڑکی بھی نیچے اتری تھی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بچوں کے سے اسٹائل میں ربن لگا ہوا تھا اور اس کی چال میں بڑی اٹھلاہٹ تھی۔ جیسے ہی وہ چند قدم آگے بڑھی' دفعتہً میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... یہ صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ ہرچند کہ اس سے ملاقات بہت مختصر رہی تھی لیکن بہرطور! میری نگاہ اسے پہچان سکتی تھی ایک لمحے میں میرے ذہن کی کیفیت خراب ہوگئی۔

مسٹر ڈینس پال مسکراتے ہوئے میرے قریب پہنچے تھے۔ انہوں نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ! میں تمہیں بہت خوش و خرم دیکھ رہا ہوں شامی..... اس کا مطلب ہے کہ میری غیر موجودگی میں تمہارا بہترین خیال رکھا گیا ہے۔"

میں اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ مسٹر ڈینس پال کی بات کا جواب بھی نہیں دے سکا اور جس بات کا مجھے

خدشہ تھا' وہی ہوا۔ مسٹر ڈینس پال نے لڑکی سے میرا تعارف بھی نہیں کرایا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑی۔ چند لمحات اسی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچ گئی۔

"اوہ..... مائی گاڈ..... اوہ' مائی گاڈ..... تم یہاں..... تم یہاں....."

نیلس چونک کر لڑکی کو دیکھنے لگی تھی۔ مسٹر ڈینس بھی چونک پڑے تھے۔ مسٹر ڈینس نے متعجب انداز میں لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم انہیں پہچانتی ہو ایلن۔"

ایلن کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی ابھر آئی تھی۔ اس نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں انکل ڈینس..... کیوں نہیں۔ آہ..... آپ نہیں جانتے کہ آپ کے سامنے کیا چیز کھڑی ہے۔ قدیم دور کا فرعون..... جسے مصر سے لایا گیا تھا اور جس کے تابوت کی حفاظت میں نے کی تھی۔ آپ نہیں جانتے انکل! میں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا' اگر اس کے بارے میں دنیا کو معلوم ہو جائے تو دنیا مجھے کیا حیثیت دے۔ ان سے پوچھو انکل! ان سے پوچھو! یہ صرف میری خواہش پر زندہ ہوئے تھے۔ ورنہ یہ صدیوں سے مردہ تھے اور ایک تابوت میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں انہیں پہچان سکتی ہوں انکل! یہ فرعون ہے۔ قدیم مصر کا فرعون..... جس نے ہزار ہا سال ایک تابوت کے اندر بسر کیے ہیں۔ آہ! تم..... تم یہاں مل جاؤ گے' میں نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن تم فرار کیوں ہو گئے تھے۔ تم مجھے دھوکہ دے کر فرار کیوں ہو گئے تھے۔ میں نے تمہاری خدمت کی تھی۔ بولو! تم چلے کیوں آئے تھے۔"

حالت تو میری کافی خراب ہو گئی تھی لیکن ان لوگوں کے سامنے خود کو سنبھالنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے نیلس' مسز ڈینس اور مسٹر ڈینس پال کو دیکھا۔ میرے چہرے کے نقوش دیکھ کر مسٹر ڈینس کو کچھ احساس ہوا اور وہ جلدی سے ایلن کے قریب پہنچ گئے۔

"اوہ بے بی! آؤ' اندر چلو۔ اگر یہ تمہیں مل گئے ہیں تو یہ تمہاری خوش بختی ہے۔ دنیا کے سامنے تم اپنے اس کارنامے کا اظہار بعد میں بھی کر سکتی ہو۔ ابھی کچھ نہیں کیا۔"

"انہیں گرفتار کر لیجئے انکل! پاپا کا کہنا ہے کہ یہ بہت عجیب و غریب شخصیت ہے اور پاپا اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر تحقیق کی دنیا میں اس شخص کی مدد حاصل ہو جائے تو وہ قدیم فراعنہ کی سرزمین کا ایک ایک راز کھول کر رکھ دیں گے اور انہیں ساری دنیا میں ایک عظیم محقق کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے گا۔ آپ نہیں جانتے انکل! کہ پاپا ان کے لیے کتنا پریشان ہیں۔ میں نے ان کی بے لوث مدد کی تھی۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ میرے کہنے پر زندہ ہو جائیں گے۔ میں نے ان سے درخواست کی تو یہ زندہ ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں بہت ساری چیزیں لا کر دیں' لیکن یہ مجھے دھوکہ دے کر فرار ہو گئے تھے۔ میرے علم میں بھی نہیں تھا کہ یہ یہاں موجود ہیں۔ پاپا آئیں گے تو آپ انہیں ان کے سامنے پیش کیجئے گا۔ دیکھیے! پاپا کتنا خوش ہوں گے۔"

"ہاں! یقیناً..... یقیناً..... آؤ! اندر چلو۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہیں اور ہم انہیں کہیں جانے نہیں دیں گے۔" مسٹر ڈینس پال نے کہا۔

نیلس عجیب سی نگاہوں سے لڑکی کو دیکھ رہی تھی اور کبھی کبھار اس کی نگاہیں میرے چہرے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں لیکن اب میں اداکاری کرنے لگا تھا۔ میرے چہرے پر ایسے ہی تاثرات پیدا ہو گئے تھے' جیسے لڑکی کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہو اور میں اس کے الفاظ پر حیران ہوں۔

اندر داخل ہونے کے بعد مسٹر ڈینس پال نے نیلس سے کہا۔

"بے بی! ایلن کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے اپنا گھر دکھاؤ کچھ دن یہ ہماری مہمان رہے گی۔ میں اس کا مختصر تعارف تم سے کرا چکا ہوں لیکن تفصیل بعد

میں بتاؤں گا۔ جاؤ بے بی! نیلس تمہاری دوست ہے۔"

"لل..... لیکن..... میں..... میں ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں' کیا آپ ہم دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہائی مہیا کر دیں گے۔"

"ابھی نہیں..... ابھی مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے ان سے۔ تم جاؤ۔ یہ تھوڑی دیر کے بعد تم سے ملاقات کریں گے اور ویسے بھی اب لنچ کا وقت ہونے والا ہے۔ نیلس تمہیں تیار کرا دے گی۔ ملازمین تمہارا سامان اندر پہنچا دیں گے۔ جاؤ بے بی! پلیز....." مسٹر ڈینس نے کہا اور نیلس' ایلن کا ہاتھ پکڑ کر آگے لے گئی۔

ایلن' ڈاکٹر جین کی بیٹی تھی اور جین وہی شخص تھا جس نے مجھے ایک تہہ خانے میں رکھا تھا۔ اگر ایلن کی مدد مجھے حاصل نہ ہو جاتی تو اس وقت ڈاکٹر جین کے تہہ خانے سے فرار ہونا آسان کام نہیں تھا۔ اس معصوم لڑکی نے مجھے لباس مہیا کیا تھا اور اس کے بعد میرے نکلنے کے راستے فراہم کیے تھے۔ ورنہ پتہ نہیں' ابتدائی صورتحال کیا ہوتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ مجھے ایک نگاہ میں ہی پہچان گئی تھی۔ ویسے میں نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور ظاہر ہے' یہ بہت زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

مسٹر ڈینس آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

"یہ بلاشبہ ایک بڑے محقق کی بیٹی ہے۔ سر زمین ایران پر رہنے والا ڈاکٹر جین اپنی ذات میں منفرد انسان ہے۔ قدیم ادوار پر اس کی تحقیقات ایک مستند حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نے یونان' بابل اور مصر کے بارے میں بہت انوکھے انکشافات کیے ہیں۔ بڑی پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ میرا دوست ہے حالانکہ زیادہ قدیم نہیں لیکن فطرتاً بہت اچھا انسان ہے۔ ایلن ذہنی خلل کا شکار ہے۔ ڈاکٹر جین کا خیال ہے کہ اس کا یہاں علاج کرایا جائے اور اس غرض سے مارسیلز میں اس نے اسے میرے حوالے کر دیا ہے۔ کچھ عرصے ایسے وہاں کام تھا اور اس کے بعد وہ بھی یہاں پہنچ جائے گا۔ پھر ہم ایلن کو کسی اعلیٰ قسم کے اسپتال میں داخل کر کے اس کا ذہنی معائنہ کرائیں گے۔ درحقیقت! اس کی ذہنی سطح' عام سطح سے ہلکی ہے۔ تم اس کی باتوں کا خیال مت کرنا۔ ظاہر ہے' ایک محقق کی بیٹی ہے پتہ نہیں' ذہن میں کیا سما گیا۔"

"اوہ! میں تو حیران ہی ہو گیا تھا مسٹر ڈینس! اس نے مجھے قدیم فرعون بنا دیا حالانکہ..... حالانکہ۔"

مسٹر ڈینس پال آہستہ سے ہنس پڑے تھے۔ پھر وہ افسوس بھرے انداز میں بولے۔

"کتنی پیاری بچی ہے لیکن ذہنی طور پر پسماندگی کا شکار۔ ہم لوگ کوشش کریں گے کہ یہاں اس کا بہتر علاج ہو سکے اور ہاں! اگر وہ تمہیں فرعون ہی کہنے پر مصر ہو تو پلیز برداشت کر لینا۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔" میں نے گردن ہلا دی۔

مسٹر ڈینس اپنی بیگم کو لے کر اپنے کمرے کی جانب چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ آج ہی سوچا تھا کہ نیلس کے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا اور زندگی پرسکون ہو جائے گی لیکن سکون..... تمام پروگرام غارت ہو گئے۔ بھلا اب کیا ہو سکتا ہے۔ مسٹر ڈینس پال نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر جین بھی یہاں پہنچنے والا ہے۔ لڑکی کو تو دماغی مریض قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر جین کو دماغی مریض قرار دینا آسان کام نہیں ہو گا۔ وہ کمبخت فوراً ہی کہے گا کہ میں فرعون ہوں اور کسی بھی قیمت پر میری بات تسلیم نہیں کرے گا۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر جین ایسے معاملات میں مجرمانہ کارروائی پر بھی اتر آتا ہے۔ پہلے بھی اس نے یہی کوشش کی تھی اور اب..... اب تو یہاں میرا کوئی ایسا دوست بھی نہیں تھا جو کسی طرح میری مدد کر سکتا۔ بے چارے مسٹر ڈینس اس سلسلے میں کیا کر سکتے تھے۔

بہت پریشان ہو گیا تھا میں۔ اس پریشانی کے عالم میں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کہ ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں چلنے کو کہا۔ یہ ہدایت اسے مسز ڈینس سے موصول ہوئی تھی۔ میں ایلن کا سامنا

کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ دل میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال تو کچھ وقت گزارا جائے۔ بعد میں کوئی فیصلہ کیا جائے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ایلن، نیلسن کے ساتھ موجود تھی۔ نیلس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ غالباً اسے بھی یہ بات بادی گئی تھی کہ ایلن ذہنی مریضہ ہے۔ مسٹر اور مسز ڈینس موجود تھے۔ خوش دلی سے میرا استقبال کیا گیا۔ مسٹر ڈینس کہنے لگے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اپنی اس مصروفیت نے مجھے شرمندہ بھی کیا ہے۔ اصولاً تو مجھے خود تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن بہرطور شامی! مجبوریاں بھی بعض اوقات پتا نہیں کیا کیا کرا لیتی ہیں۔ اب یوسف عارض کو دیکھو زخمی ہونے کے باوجود اسے چھٹی نہیں مل سکی اور وہ ایک کام سے مغربی جرمنی گیا ہوا ہے۔"

میں نے رسمی انداز میں مسٹر ڈینس سے کہا کہ ان کی غیر موجودگی میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

ایلن کہنے لگی۔

"لیکن انکل! یہ آپ کے پاس کیسے پہنچے۔ کیا تابوت سے ان کٹنے کے بعد یہ سیدھے آپ کے پاس آ گئے تھے۔ انکل! آپ نے ان سے قدیم مصر کے بارے میں گفتگو کی۔"

"نہیں بے بی! اب ڈاکٹر جین آ جائیں گے تو ہم ان سے مصر کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔"

"یہ کام میں کروں گی اور پاپا پر انکشاف کروں گی کہ جو کام وہ نہیں کر سکے تھے، میں نے کر ڈالا۔ کیوں مسٹر! کیا کہنا ہے آپ کا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں مس ایلن!" میں نے شانے ہلا کر جواب دیا اور نیلس کی ہلکی سی ہنسی گونج اٹھی۔

مسٹر ڈینس نے سرزنش کرنے والے انداز میں نیلس کو دیکھا تھا، لیکن ایلن نے نیلس کی ہنسی کی جانب توجہ ہی نہیں دی تھی۔ کھانے کے بعد ایلن کہنے لگی۔

"کیا آپ مجھے کچھ وقت دے سکیں گے مسٹر۔"

میں نے امداد طلب نگاہوں سے نیلس کی طرف دیکھا تو نیلس جلدی سے بولی۔

"ہاں..... ہاں! کیوں نہیں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آپ انہیں اپنے کمرے میں لے جائیے ایلن!" وہ شرارت آمیز انداز میں بولی اور میں گہری سانس لے کر اسے گھورنے لگا۔ نیلس نے رخ تبدیل کر لیا تھا۔

"آیئے! آپ میرے کمرے میں آیئے۔ میرا کمرہ بہت خوب صورت ہے۔"

میں ایلن کے ساتھ چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ایلن مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"آپ یقین کیجئے! آپ کے اس طرح چلے آنے کے بعد میں کس قدر مضطرب رہی تھی۔ کتنی پریشان ہوگئی تھی میں۔ میں نے تو پاپا کو یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کو میں آزاد کیا تھا۔ پاپا کو شاید خود ہی پتا چل گیا۔ وہ کئی دن مجھ سے ناراض رہے تھے۔ ایک طرف تو آپ کا معاملہ تھا۔ آپ کے چلے آنے سے مجھے جو دکھ ہوا تھا، میں اس کا شکار تھی اور دوسری طرف پاپا بھی مجھ سے ناراض ہوگئے تھے۔ مجھے واقعی یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور اب آپ کو بھی نہیں۔"

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وہاں سے نکلنے کے بعد آخر آپ کہاں چلے گئے تھے اور ان لوگوں کے ہاتھ کیسے لگ گئے۔ کیا ہماری کوٹھی سے باہر نکلتے ہی یہ لوگ آپ کو مل گئے تھے۔"

"ہاں، شاید....." میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لیکن یہ آپ کو یہاں کیوں لے آئے۔ ان لوگوں کا تو قدیم مصر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں آپ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ویسے میں محسوس

کر رہی ہوں کہ آپ یہاں بہت خوش ہیں لیکن پاپا آ جائیں تو ہم آپ کو واپس لے چلیں گے۔ پاپا آپ کو کسی قیمت پر یہاں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ آپ کے بہت قدردان ہیں۔"

"شاید۔" میں نے جواب دیا اور دروازے پر پھر ہلکی سی ہنسی گونجی۔ نیلس یقیناً ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے دروازے کی طرف رخ کر کے کہا۔

"باہر کیوں کھڑی ہو نیلس۔ اندر آ جاؤ۔"

اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

"درحقیقت میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں اس وقت مسٹر شامی کو کاک ٹیل کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"شرارت نہیں نیلس! پلیز بیٹھ جاؤ۔"

"لیکن میں تنہائی میں آپ سے گفتگو کرتے رہنا چاہتی ہوں۔ مس نیلس، پلیز! کیا آپ ہمیں تنہائی نہیں دیں گی۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ مسٹر فرعون اگر چاہیں تو تمہارہ سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ کیوں نہ ہم اپنی اس گفتگو کو رات تک کے لیے ملتوی کر دیں مس ایلن۔"

"ہاں، ہاں! بالکل..... رات کو کاک ٹیل پینے کے بعد گفتگو کرنے میں بہت لطف آئے گا مس ایلن! آپ ہمارے ساتھ شریک ہونا پسند کریں گی۔"

"مگر میں تنہائی میں۔"

"دیکھا جائے گا..... دیکھا جائے گا۔" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ نیلس کے قہقہے نے میرا تعاقب کیا تھا۔

بہرطور! مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ صورت حال اس شکل میں سنبھل گئی ہے کہ ایلن کی ذہنی صحت پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے، ہی ایسی کوئی بات ہو لیکن کم از کم میرے مسئلے میں وہ بے چاری صحیح دماغ رکھتی تھی اور کوئی بات غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر ایک بار پھر مجھ پر وحشت سوار ہوگئی۔ کیا کروں۔ کیا کرنا چاہیے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اب اس خوب صورت زندگی کو خیر باد کہہ دوں۔ یہاں بھی میرا گزارہ ممکن نہیں تھا۔ یہاں ہی کیا، اگر ڈاکٹر جین، برن آ گیا تو اسے یقیناً اس بات کی اطلاع مل جائے گی کہ میں یہاں موجود ہوں۔ ایلن کی بات کو تو خیر اس کے دماغ کی خرابی سمجھ لیا گیا تھا لیکن ڈاکٹر جین تو پاگل نہیں ہوگا۔ جب ایلن اس سے فرعون کا تذکرہ کرے گی تو وہ ایلن سے زیادہ پاگل ہو جائے گا اور اس کے بعد بھلا وہ میری گردن کہاں چھوڑنے والا تھا۔ مسٹر ڈینس یقیناً اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے انہیں اپنی تمام کہانی سنانی ہوگی اور میں خوامخواہ ایک بار پھر منظر عام پر آ جاؤں گا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اس لیے بیٹے شامی! بہتر یہی ہے کہ یہاں سے بھی رفو چکر ہو جاؤ اور اس کے بعد یہ سوچو کہ اب کیا کرو گے.....!

اس عمارت میں رہنا میرے لیے قطعی ممکن نہیں ہے۔ کہیں اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔ کسی ایسی جگہ منہ چھپا کر بیٹھ جانا پڑے گا، جہاں نیلس یا اور کوئی مجھے تلاش نہ کر سکے۔ دل خون خون ہو رہا تھا۔ نیلس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات یاد آ رہے تھے۔ بلاشبہ اس لڑکی نے وہ کر دکھایا تھا، جو میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ شاید..... شاید میں اس حد تک بھی آگے نہ بڑھ سکتا..... بہت سے منصوبے میرے ذہن میں آتے رہے اور اسی چکر میں شام ہوگئی۔

ڈنر پر میرا سامنا ایک بار پھر ان لوگوں سے ہوا۔ نیلس آج دن میں میرے پاس بالکل نہیں آئی تھی۔ وہ ایلن سے کافی ملی جلی نظر آتی تھی۔ پتا نہیں کس ٹائپ کی لڑکی تھی۔ میں نے بھی اس پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ ڈنر کے بعد کافی دیر تک چہل قدمی ہوتی رہی۔ ایلن نے پھر وہی تذکرے چھیڑ دیئے تھے۔ بھلا وہ بے چاری اس بات کو کیسے نظر انداز کر سکتی تھی کہ اس کا باپ مجھے سرزمین مصر سے لایا تھا اور میں قدیم فرعون تھا۔ یہ بات ڈاکٹر جین نے اسے بتائی

ہوگی اور اس کے بعد ڈاکٹر جین کی کارروائیاں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہوں گی لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ خلل دماغ کا دم چھلا لگا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مسٹر ڈینس پال بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔

بہر طور! اس کے بعد گلوخلاصی ہوگئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید آج نیلس میرے کمرے کا رخ نہ کرے لیکن نیلس کے بارے میں شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ بہت تیز و طرار لڑکی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل اچھل پڑا۔ دروازہ کھولا تو نیلس معمول کے مطابق کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ آج میں خود بھی اس کے لیے مضطرب ہو رہا تھا پتا نہیں کیسے کیسے خیالات تھے میرے دل میں۔

رات کو تقریباً دو بجے نیلس واپس چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد میں اپنا بوریا بستر باندھنے لگا۔ فیصلہ یہی کیا تھا کہ رات کی تاریکیوں میں یہاں سے نکل جاؤں۔ سامان بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں کئی چیزیں ایسی تھیں جو آئندہ کے لیے بہت ضروری تھیں۔ ورنہ شاید ویسے ہی بھاگ چکا ہوتا۔ دو بچے چوروں کی طرح اپنا سامان لے کر کسی کی کوٹھی سے نکلنا خطرناک بھی ہوسکتا تھا لیکن بہر طور! یہ اس سے زیادہ خطرناک نہیں تھا کہ ڈاکٹر جین یہاں پہنچ جائے۔ چنانچہ میں نے یہ خطرہ مول لے لیا۔

اس دوران چونکہ نیلس کے ساتھ کئی بار کوٹھی سے نکل کر مختلف علاقوں میں جا چکا تھا۔ اس لیے بعض جگہیں میرے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔ البتہ چلنے پھرنے والوں کی نگاہوں سے بچنا تھا۔ سڑکیں بے شک سنسان پڑی ہوئی تھیں لیکن کہیں بھی مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔

بمشکل تمام یہ لمبا سفر طے کر کے ایک سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ مارک گاسے تھی۔ سڑک مارک گاسے برن کے اچھے علاقوں میں شمار ہوتی تھی۔ یہاں عمدہ درجے کے ہوٹل وغیرہ بھی تھے۔ چنانچہ میں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ رات کی سروس سے میں نے ایک کمرہ طلب کیا اور مجھے عارضی طور پر فوراً ہی کمرہ حاصل ہوگیا۔ کسی نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ہوٹل بہت اعلیٰ نہیں تھا لیکن بہر طور! کم مناسب تھا۔ کم از کم بقیہ رات گزارنے کے لیے ایک قیام گاہ مل گئی تھی۔ سونے کا تصور بھی ذہن میں نہیں ابھرا۔ میں اپنی عجیب و غریب قسمت کو کوس رہا تھا اور اس وقت میرے اوپر شدید جھنجلاہٹ سوار تھی۔ بہر طور! اس جھنجلاہٹ کو دور کرنے کے لیے بہتر یہی تھا کہ غسل خانے میں جا گھسوں اور بلاشبہ تقریباً ایک گھنٹے تک میں اپنے اوپر پانی بہاتا رہا تھا۔ ہلکا گرم پانی بڑی فرحت دے رہا تھا لیکن ذہن وسوسوں سے آزاد نہیں تھا۔ البتہ نہانے کے بعد سوچنے کی قوتوں میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ کوئی بھی ہوٹل میرے لیے مخدوش ہوسکتا ہے۔ کیونکہ مجھے ہوٹلوں ہی میں تلاش کیا جائے گا۔ نیلس وغیرہ پر میرے اس انوکھے فرار سے نہ جانے کیا گزرے گی۔ ویسے وہ خود بھی مجھ سے کافی مانوس ہوگئی تھی اور میرے اس طرح غائب ہو جانے سے اسے یقیناً دلی دکھ ہوگا لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ پتا نہیں، کتنے لوگوں کو میری وجہ سے دکھ ہوا تھا اور میں کتنے لوگوں سے دکھی تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں جو اپنے چہرے کے خدوخال تبدیل کرانے کے لیے کوشاں ہوں، اس سلسلے میں مجھے کیسے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ کم از کم برن میں میرے لیے یہ کام مشکل ہوگا۔ کیونکہ چالاک نیلس سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ کہیں نہ کہیں ضرور پکڑا جاؤں گا اور اس کے بعد اگر ڈاکٹر جین نے ان لوگوں کو یہی حقیقت بتائی کہ ایلن کا کہنا غلط نہیں ہے اور ایسی ایک شخصیت جین کے پاس سے فرار ہوگئی ہے تو یہ لوگ دلچسپی کی غرض سے مجھے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ کیوں نہ یہاں سے نکل جاؤں..... برن چھوڑ دوں..... سوئٹزرلینڈ کے کسی چھوٹے سے قصبے یا کسی دیہات میں پناہ لے لوں..... لیکن وہاں کیا جھک ماروں گا۔

دوسری صبح میں نے ایک بار پھر غسل کر کے ناشتا کیا اور رات کی تھکن ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ ذہن سلگ رہا تھا لیکن بہر طور! اپنے آپ کو پرسکون رکھنا بھی ضروری تھا۔ میں نے ہوٹل کے نچلے حصے میں پہنچنے کے بعد اندر ہی بنے ہوئے کاؤنٹر سے اخبارات اور قرب و جوار کے نقشے خریدے اور اپنے کمرے میں آ گھسا۔ اخبار میں کوئی ایسی خبر نہیں تھی جو میرے لیے قابل توجہ ہوتی۔ پھر میں نے نقشے پھیلا لیے اور اس کے بعد دل میں یہ طے کیا کہ برن سے فرینکفرٹ چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں کوئی شناسا تو نہیں ہوگا۔ مجھے اس سفر میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آ سکتی تھی۔

چنانچہ ذہن میں اس سوال کو پوری طرح ترتیب دے کر میں باہر نکل آیا اور اس کے بعد تیاریاں کرنے میں مجھے بہت زیادہ مشکل نہیں ہوئی متعلقہ اداروں سے سارا کام منٹوں میں ہوگیا تھا۔ میں نے برن سے فرائی برگ تک کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ فرائی برگ کے بارے میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، ان سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ جرمنی کے خوب صورت ترین علاقے بلیک فارسٹ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کچھ وقت بلیک فارسٹ کے کسی چھوٹے سے قصبے میں گزاروں گا اور پھر وہاں سے فرینکفرٹ نکل جاؤں گا۔

گاڑی سوئٹزرلینڈ کی سرحد عبور کر کے اب جرمنی اور فرانس کی سرحد پر جا رہی تھی۔ یہاں گاڑی کی پٹڑی کئی میل تک دونوں ملکوں کی سرحد کا کام دیتی ہے۔ میں نے گاڑی کے کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کو دیکھا۔ زیادہ تر جرمن باشندے تھے۔ اکا دکا ہی دوسرے ملکوں کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک گوشے میں ذرا مختلف قسم کا ایک جوڑا نظر آیا، جوان یہ بین الاقوامی آوارہ گرد تھے۔ جو لباس اور زندگی کے دوسرے لوازمات سے بے پرواہ صرف اپنی دھن میں مگن رہتے تھے۔ جرمن طالب علموں کا ایک گروہ ان کی طرف متوجہ تھا لیکن وہ ان کی باتوں پر توجہ نہیں دے رہے تھے۔

نجانے میرے ذہن میں کیا خیال آیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔ لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور خفیف سے انداز میں مسکرا دی۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور وہ بھی اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے پیلے دانت جو کہ بہت بھدے بھی تھے نکال دیے اور پھر شستہ انگریزی میں بولا۔

"انگریزی بول سکتے ہو۔"

"ہاں..... کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم جرمن ہو....."

"میں ایشیائی ہوں۔" میں نے کہا۔

"انڈین۔"

"نہیں..... پاکستانی۔"

"اوہ پاکستانی..... پاکستانی....." نوجوان نے مسکراتے ہوئے اپنی ساتھی لڑکی کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی اور وہ بھی مسکرا دی۔

"ہاں..... پاکستانی۔ کیا آپ لوگ پاکستان گئے ہیں۔"

"نہیں..... صرف کھٹمنڈو تک جا سکے ہیں ہم لوگ۔ ارادہ تھا کہ وہاں سے پشاور جائیں گے لیکن نہیں جا سکے۔"

"اس وقت کہاں جا رہے ہو۔" میں نے سوال کیا اور نوجوان اپنی ساتھی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے ہنس پڑا۔ اس کے ہنسنے کا انداز نہایت بھونڈا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے تمام دانت باہر جھانکنے لگے تھے اور یہ غلیظ دانت، دل میں کراہیت پیدا کرتے تھے۔ لڑکی نے کہا۔

"کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہم لوگ۔ ویسے شاید ٹروتھ چلے جائیں۔ ٹروتھ، فرائی برگ سے بارہ میل کے فاصلے پر بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ زندگی

سے بھرپور..... جرمن علاقوں کا حسین ترین قصبہ۔"

"گڈ..... فرائی برگ سے ٹروتھ جانے کے لیے کیا ٹرین تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ یا وہ راستے میں ہی پڑتا ہے۔"

"نہیں۔ فرائی برگ اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے۔ وہاں سے تم ٹرام کے ذریعے قصبے میں پہنچ سکتے ہو۔"

"تو پھر کیوں نا میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی چلوں۔ ویسے مجھے تمہارا نام نہیں معلوم ہو سکا۔"

"میرا نام ٹونی ہے اور یہ ہیلن ہیں۔ بڑے مختصر سے نام ہیں ہمارے جو کوئی بھی یاد کر سکتا ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم دونوں سے مل کر۔ میں بھی سیاح ہوں۔ میرا مطلب ہے ٹورسٹ..... ٹورسٹ۔"

"گڈ! ہم آپ کو کس نام سے پکاریں مسٹر۔"

"شامی۔" میں نے جواب دیا اور وہ دونوں منہ ٹیڑھا کر کے میرا نام دہرانے لگے لیکن صحیح تلفظ ادا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاہم کسی انسان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ میں ان سے باتیں کرتا رہا۔ ان کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ وہ دونوں آپس میں رشتے دار تھے۔ شادی وغیرہ کا..... تصور ان لوگوں کے ہاں مضحکہ خیز ہی سمجھا جاتا تھا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ فرائی برگ اسٹیشن پر اتر گیا اور پھر ان لوگوں کے مشورے کے مطابق ٹرام پر سوار ہو کر اس قصبے میں پہنچ گیا۔

ٹروتھ بلاشبہ خوب صورت جگہ تھی۔ بے حد پرسکون..... عمارت کے گرد باغیچے نظر آ رہے تھے اور ان کی سجاوٹ میں نفاست تھی۔ آبادی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس پر لوہے کے سلاخوں کے پل بنے ہوئے تھے۔ پلوں کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح کے قریب پن چکیاں چل رہی تھیں۔ قصبے کی آبادی جہاں پر ختم ہو جاتی تھی، وہاں سے جو کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ کھیتوں کے دوسری جانب بلیک فارسٹ تھا۔ ٹونی اور ہیلن کو میں نے قصبے میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ بلاوجہ کسی کے پیچھے لگے رہنا اچھی بات نہیں ہے۔

میں ایک تنگ پگڈنڈی پر چل پڑا۔ رخ جنگل کی جانب تھا۔ جو کے پودے کا سنہری رنگ، جنگل کے سیاہ پس منظر سے اور بھرپور ہو گیا تھا۔ آسمان بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں جنگل کے کنارے پہنچا تو بارش شروع ہو گئی اور میں نے بھاگ کر ایک اونچے درخت کے نیچے پناہ لی۔ مجھ سے کچھ فاصلے دو افراد اور بھی ایک درخت کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھے۔ مرد خوب صورت سوٹ میں ملبوس تھا اور شاید اس کے ساتھ کوئی عورت تھی۔ دونوں ہی دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگے۔ چہرے مہرے سے اچھے خاصے پروقار معلوم ہوتے تھے۔ میں ایسے ہی شناسائی کے طور پر ان کے قریب پہنچ گیا اور انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ہیلو بلیک بوائے!" عورت بولی۔

"ہیلو۔" میں نے اس کے الفاظ کا برا منائے بغیر کہا۔

"بارش اچانک ہی شروع ہو گئی ہے۔ ہمیں اس کی امید نہیں تھی۔"

"ہاں! آپ لوگ شاید پہلے سے یہاں موجود تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں! بلیک فارسٹ دیکھنے آئے تھے۔ یہاں آ کر اندازہ ہوا کہ اسے کالا جنگل کیوں کہا جاتا ہے۔ درختوں سے روشنی نیچے آتی ہی نہیں کہ جنگل روشن ہو۔ اس مناسبت سے اس کا نام بلیک فارسٹ بالکل درست ہے۔" مرد نے کہا۔

"یقیناً! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔"

"تم ٹورسٹ ہو۔" اس نے سوال کیا۔

"ہاں! اور ٹروتھ دیکھنے کے لیے فرائی برگ سے یہاں آیا ہوں۔"

"ٹروتھ بلاشبہ حسین ہے لیکن یہاں رہنا آسان نہیں ہے۔ قیام کے لیے اپنی گاڑی کے علاوہ اور کوئی جگہ موزوں ہی نظر نہیں آئی۔ چنانچہ یہاں

کے قیام کو ہم نے مختصر کر دیا۔"

"بدقسمتی سے میرے پاس تو گاڑی بھی نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پروقار شخص کے چہرے پر ہمدردی کے آثار پھیل گئے۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر تم چاہو تو عارضی طور پر ہمارے ساتھ پناہ لے سکتے ہو۔ میرے پاس بڑی گاڑی ہے۔"

میں نے شکر گزار نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔ مرد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا نام راک ہڈسن ہے اور یہ میری بیوی ایلورا۔ میں ایک سرکاری محکمے میں کام کرتا ہوں اور ایلورا اپنا الگ کام کرتی ہے۔"

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام شامی ہے اور پاکستانی ہوں۔"

"اوہ..... اوہ! واقعی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے تقریباً چھ سال پاکستان میں گزارے ہیں اور تھوڑی بہت تمہاری زبان بھی جانتا ہوں لیکن بہت تھوڑی سی۔ صرف چند الفاظ....." راک ہڈسن نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور ایلورا نے بھی ہاتھ ملا دیا تھا۔

"بارش تو ابھی دیر تک نہ رکے گی۔ کیا خیال ہے، گاڑی تک چلیں۔ ہم لوگوں کو امید نہیں تھی کہ اچانک ہی بارش شروع ہو جائے گی۔ ورنہ شاید گاڑی ہی میں یہاں تک آتے۔"

"صبر طور! ان درختوں کے نیچے سے نکلنے کے بعد تو بھیگنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا اور اس کے بعد ہم تینوں درختوں کے نیچے سے نکل آئے۔ راک ہڈسن کی گاڑی کافی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔ بہت کشادہ اور لمبے سفر کی گاڑی تھی۔ جس کا پچھلا حصہ بہت وسیع تھا اور اگر یہ دونوں تنہا ہی ہیں تو یقیناً مجھے بھی ان کے ساتھ جگہ مل سکے گی۔

میں گاڑی کے قریب پہنچا تو راک ہڈسن نے پہلے عقبی دروازہ کھولا۔ جرمن مہمان نوازی کا یہ پہلا مظاہرہ مجھے پسند آیا تھا۔ اس کے بعد راک ہڈسن نے اپنی بیوی ایلورا کو بھی پیچھے ہی کھسیڑ دیا اور خود اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔ اتنے ہی فاصلے پر دوڑتے ہوئے ہمارے لباس بھیگ گئے تھے لیکن یہاں ان حالات میں لباس تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا اور پھر میرا سامان تو پیک تھا۔

راک ہڈسن نے اخلاقاً کہا۔

"اگر تم لباس تبدیل کرنا چاہو تو ہم دونوں نیچے اتر جائیں۔"

"یہی پیشکش میں آپ کو کرنے والا تھا مسٹر ہڈسن۔"

"نہیں۔ ہم لوگ ایڈونچر پسند ہیں اور پھر یہ لباس تھوڑی ہی دیر کے بعد خود بخود سوکھ جائیں گے۔ اچنبھا ہم انہیں بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

ایلورا پچھلے ہی حصے میں بے تکلفی سے سائیڈ میں لگی ہوئی ایک برتھ کھول کر لیٹ گئی۔ راک ہڈسن میرے سامنے چہرہ کیے مجھ سے باتیں کرتا رہا اور دوران گفتگو اس نے بتایا کہ ایلورا نے اپنا ایک چھوٹا سا کلینک کھول رکھا ہے۔ جہاں وہ پلاسٹک سرجری کا کام کرتی ہے۔ یہ انکشاف میرے لیے جتنا حیرت انگیز اور سنسنی خیز ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں راک ہڈسن کے الفاظ بھول گیا تھا۔ بس! تعجب سے یہ سوچے جا رہا تھا کہ کیا اس جوڑے کا مل جانا میرے لیے ایک نیک فال نہیں ہے۔ اپنے چہرے کے خدوخال تبدیل کرانے کا ارادہ تو میں نجانے کب سے رکھتا تھا لیکن اس کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا میرے پاس۔ معلومات بھی حاصل نہیں تھیں اس بارے میں۔ اچانک ہی ان لوگوں کا مل جانا میرے مقصد کی تکمیل کر سکتا تھا۔ چنانچہ اب میری پوری توجہ ان لوگوں کی جانب ہو گئی اور میں نے اپنی گفتگو میں مٹھاس اور اپنائیت۔ بالآخر وہ دونوں مجھ سے متاثر ہو ہی گئے۔ رات کا کھانا بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی کھایا اور اس کے بعد گفتگو کے دوران میں

نے ان سے یہی کہا کہ میں صرف جرمن علاقے کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔

"دراصل سال کے اس ماہ ہم لوگ تقریباً پندرہ دن کی چھٹیاں ایسے ہی لمبی ڈرائیونگ کر کے گزارتے ہیں اور ہر بار ایک نئی جگہ دیکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ٹروتھ کے بارے میں بہت دن سے ہمارے ذہن میں پروگرام تھا۔ چنانچہ ہم اس طرف آنکلے۔ ویسے تم اگر چاہو تو برلن تک ہمارے ساتھ جاسکتے ہو۔ فرینکفرٹ وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہم برلن تک جائیں گے۔"

میں نے ایک بار پھر گردن ہلادی تھی۔ ایلورا کہنے لگی۔

"اس کے علاوہ برلن کے سفر میں بھی تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔ مسٹر شامی۔"

ایلورا کا تلفظ بہت بہتر تھا۔ جبکہ اس کی نسبت راک ہڈسن میرا نام لیتے ہوئے تھوڑا سا اٹکتا تھا۔ بہرحال! ان لوگوں سے خوب دوستی ہوگئی اور یہ بات میرے لیے زیادہ فرحت بخش تھی کہ ایلورا پلاسٹک سرجری جانتی ہے۔ اگر میں ان لوگوں کی پوری توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو شاید یہی میری مشکل کا حل بن جائیں۔

دوسری صبح ہم ٹروتھ سے باہر نکل آئے۔ فرائی برگ پہنچے اور وہاں سے فرینکفرٹ جانے والی عظیم شاہراہ آٹوبہان پر چل پڑے۔ ایلورا مجھے راستے کے بارے میں بتاتی جارہی تھی۔ ہائیڈل برگ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ دریائے نیکر کے دیدہ زیب پل پر سے گزرے تو وہاں نیچے پانی میں شفق کی سرخی اتری ہوئی تھی۔ دریا کے کنارے کافی رش تھا تھا۔ ہائیڈل برگ کا شہر دریائے نیکر کے کنارے ہی واقع ہے اور کافی خوب صورت شہر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سے نکلے تو ایلورا نے بتایا کہ اب فرینکفرٹ کا راستہ آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔

راک ہڈسن کہنے لگا۔

"شامی! اگر تم فرینکفرٹ کو ایک نگاہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہم ایک رات یہاں قیام کر سکتے ہیں۔"

"میری وجہ سے آپ لوگوں کو کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"سنا ہے کہ تم لوگ بے کار الفاظ کا استع... بہت زیادہ کرتے ہو۔ بہرطور! ہم اسے پسند نہ... کرتے جب میں نے ایک بار تم سے کہہ دیا کہ ... تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے خوش آمدید ... ہوں تو اس کے بعد یہ ساری باتیں ختم ہوجاتی ہیں ... مغربی جرمنی کے ساتھ ساتھ تم مشرقی جرمنی بھی د... لوگے۔ جبکہ عام حالات میں شاید تمہارے لیے یہ... آسان نہ ہوتا۔"

"اوہ ہاں! بے شک لیکن کیا مغربی جرمنی ... سرحد عبور کرنے میں کوئی مشکل تو درپیش نہیں ہوگی۔"

"اگر تمہارے کاغذات درست ہیں تو تمہیں ... برلن کے لیے عارضی ویزہ مل سکتا ہے۔"

"تب میں دوسری جنگ عظیم کا یہ عظیم شہر ضرور دیکھنا پسند کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"برلن ہر سال پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوجاتا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہم فرینکفرٹ پہنچ گئے۔ ... بہت زیادہ باقی نہیں تھا۔ گاڑی ہی میں راک ہڈسن نے مجھے تھوڑی سی سیر کرائی۔ قیصر اسٹریٹ دکھائی ... اس کے بعد ہم دریائے مائین کے کنارے یوتھ ہوسٹل کے قریب فروکش ہوگئے۔ یوتھ ہوسٹل ... جس کا شمار دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔

شام جھک آئی تھی۔ سامنے دریائے مائین کے ... مٹیالے پانی میں سامان بردار کشتیاں اور سٹیمر چل رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر سیاہ کائی زدہ کلیسا ... کھڑا تھا جو اس شہر کا علامتی نشان ہے۔ ہڈسن سے ... زیادہ ایلورا مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی۔

بہت رات گئے تک ہم فرینکفرٹ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور پھر معمول کے مطابق گاڑی ہی میں سو گئے۔ گاڑی کی اگلی سیٹیں آرام دہ بستر کی حیثیت سے کھل جاتی تھیں۔ عقبی سائیڈ میں بھی سائیڈ برتھیں لگی ہوئی تھیں۔ گویا ابھی ایک آدمی کی مزید گنجائش تھی۔ کافی رات گئے ہم لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسری صبح آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ ہڈسن اور ایلورا مجھ سے پہلے ہی جاگ گئے تھے اور کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نیچے اترا تو انہوں نے دریائے مائین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پہلے میں منہ ہاتھ دھولوں۔ اس کے بعد مجھے کافی دی جائے گی۔ کافی کا ایک ایک کپ پینے کے بعد ہم لوگوں نے سفر کی تیاری کی۔ مسٹر راک ہڈسن کہنے لگے کہ علی الصبح سفر شروع کردیا گیا تو آرام سے برلن پہنچ جائیں گے۔ ناشتے کے لیے انہوں نے کہا تھا کہ گاڑی ہی میں کیا جائے گا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

چنانچہ ہم چوڑی سڑک آٹوبہان پر نوے میل فی گھنٹے کی رفتار سے برلن کی طرف روانہ ہوگئے۔ بے حد نفیس سڑک تھی۔ لہٰذا یہ سفر جاری رہا اور پھر شام سے کچھ پہلے ہم مشرقی جرمنی کی سرحد پر پہنچ گئے۔ سرحدی محافظوں نے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور ہمیں ہدایت کی کہ کار یہیں کھڑی کر کے کسٹم ہاؤس سے مشرقی جرمنی عبور کرنے کے لیے ویزہ لگوالیں۔

کسٹم ہاؤس میں پہنچے تو ویزہ افسر میز کے پیچھے بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا۔ اس نے پاسپورٹ پر موجود تصویریں دیکھ کر ہماری شناخت کی اور پھر چند فارم پر کروا کر ویزے کی مہر لگادی۔ اس کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

مغربی اور مشرقی جرمنی کے درمیان ایک قلعہ نما سرحد پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی عمارتیں بے حد ہیبت ناک تھیں۔ ہر سو گز کے فاصلے پر حفاظتی مینار نظر آرہے تھے جن پر مشین گنوں سے مسلح محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ ان میناروں کے نیچے سڑک پر لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے تھے جہاں کاغذات بار بار چیک کیے جاتے تھے۔ کئی جگہوں پر سڑک کے کنارے سیمنٹ اور لوہے کے ستون ڈھلوان رخ پر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ اگر کوئی کار وغیرہ کسٹم ہاؤس اور آہنی پھاٹکوں پر رکے بغیر تیز رفتاری سے سرحد عبور کرنا چاہے تو ان ستونوں کی مدد سے ان کو روکا جاسکے۔

ہم برلن کے نواح میں پہنچے تو خاصی رات ہوچکی تھی۔ شہر کے وسط میں پہنچ کر راک ہڈسن نے کار کا رخ ایک خوب صورت علاقے کی جانب کردیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گیا۔ گاڑی عمارت کے باہر ہی ایک مخصوص جگہ کھڑی کردی گئی اور راک ہڈسن نے مسکراتے ہوئے پرتپاک انداز میں کہا۔

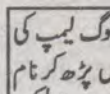

یہ داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ
ملاحظہ کریں۔

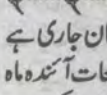

کل اور آج

☆ کل لوگ لیمپ کی روشنی میں پڑھ کر نام روشن کرتے تھے لیکن آج بلب میں پڑھ کر لندن اور امریکا میں برتن صاف کرتے ہیں۔

☆ کل لوگ نمک اور مرچ سے روٹی کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے لیکن آج مرغ بریانی کھانے کے بعد کہتے ہیں "یار مزہ نہیں آیا۔"

☆ کل شوہر بیوی کے سر کا تاج ہوتا تھا لیکن آج شوہر بیوی کا محتاج ہوتا ہے۔

☆ کل شوہر کو دفتر سے آتے ہی کھانا تیار ملتا تھا لیکن آج شوہر کو دفتر سے آتے ہی کھانا تیار کرنا پڑتا ہے۔

☆ کل پردہ عورت کی زینت تھا مگر آج پردہ کھڑکی اور دروازے کی زینت ہے۔

☆ کل کھڑے ہو کر کھانا بدتمیزی سمجھا جاتا تھا لیکن آج کھڑے ہو کر کھانا فیشن سمجھا جاتا ہے۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

کہا جاتا ہے ایک رات راجکمار ایک غریب بیوہ کے گھر میں گھس گیا۔ بیوہ کی ایک ہی جوان اور خوب صورت بیٹی تھی۔ اس نے اسے اپنی بیٹی کو بچانا چاہا تو راجکمار نے اس کو قتل کردیا۔ لڑکی نے اپنی عزت بچانے کے لیے جدوجہد کی۔ اتفاق سے لڑکی کے ہاتھ میں ایک کٹار آگئی۔ جدوجہد میں راجکمار زخمی ہوگیا۔ اس کی ایک انگلی کٹ کر وہیں بیوہ کی جھونپڑی میں رہ گئی۔

عیاش مجسمہ

نوازش شاہین

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

میں نے ہندوستان کے تمام پہاڑی علاقے دیکھے ہیں۔ نینی تال، کشمیر، اوٹ کمنڈ یہ تین جگہیں میرے نقطہ نظر سے ہندوستان کے خوب صورت ترین ہل اسٹیشن ہیں لیکن جب میں نے چمبل کی وادی میں قدم رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے ابھی تک میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

اونچے نیچے پہاڑ چاندی کے دھاروں کی طرح چمکتے ہوئے آبشار پہاریوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے سرسبز میدان غرض کہ ہر منظر کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح لگتا تھا۔

میں اپنے دوست بلبیر سنگھ کا شکر گزار تھا کہ اس نے ہنی مون گزارنے کے لیے مجھے ایسے پرفضا اور خوب صورت مقام پر آنے کا مشورہ دیا بلکہ اس نے خود ہی ایک ڈاک بنگلہ میں ہماری رہائش کا بندوبست بھی کردیا تھا۔

ڈاک بنگلہ ایک چھوٹے سے گاؤں نگری سے کوئی آدھا میل دور الگ تھلگ بنا ہوا تھا وہاں سے ایک پتلی سی پگڈنڈی گاؤں کی طرف جاتی تھی اور ایک راستہ دائیں جانب سیدھا چلا گیا تھا۔ اسی راستہ پر کوئی ایک میل چل کر ایک مندر تھا جو راجہ سری نواس کا مندر کہلاتا تھا۔ مندر قدیم راجپوت فن معماری کا بہترین نمونہ تھا۔ مندر کے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ اس میدان میں سنگ مرمر سے تراشے ہوئے تیرہ انسانی مجسمے کھڑے تھے۔ یہ مجسمے چار چار کی تین لائنوں میں کھڑے تھے۔

تیرھواں مجسمہ ان تینوں لائنوں کے آگے اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ ان سب کا سردار ہو اور واقعی وہ ان کا سردار تھا۔ اسی کا نام راجہ سری نواس تھا جن کے نام پر وہ مندر بنا ہوا تھا۔ راجہ کے علاوہ باقی بارہ کے بارہ مجسمے سپاہی تھے۔ تلواریں ان کے پہلوؤں میں لٹکی ہوتی تھیں اور سب کے چہروں سے خوفناکی برستی تھی۔

پہلے دن جب میں اور آشا ڈاک بنگلہ میں اپنا سامان رکھ کر گھومنے نکلے تھے تو سب سے پہلے اسی مندر میں گئے تھے تاکہ بھگوان کی مورتی کے چرن چھو کر آشیرواد لیں۔ ہم دونوں کو حیرت تھی کہ مندر کے سامنے یہ مجسمے رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آشا کا خیال تھا کہ راجہ نے شاید مندر بنوانے کے بعد اپنے مجسمے بنوا کر رکھ دیے ہوں گے تاکہ جب تک مندر قائم رہے، لوگ اس کو بھی یاد رکھیں۔

''یاد تو اس کے نام سے ہی رکھ سکتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''مندر کا نام ہی راجہ سری نواس کا مندر ہے۔''

''ہوسکتا ہے اس راجہ میں اپنی نمائش کا جذبہ زیادہ ہو اور نام کے ساتھ اپنی نمائش بھی کرنا چاہتا ہو۔''

جس وقت ہم یہ باتیں کررہے تھے ایک پانڈے ادھر سے گزرا ہم نے پانڈے کو روک کر کہا۔

''مہاراج کیا یہ مجسمہ راجہ کا ہے جس نے مندر بنوایا تھا۔''

''نہیں شری مان جی۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ ''مندر کا نام راجہ سری نواس کا مندر ضرور ہے مگر مندر ان مہاشے نے نہیں بنوایا تھا۔''

''پھر مندر کس نے بنوایا تھا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اور اگر مندر کسی دوسرے شخص نے بنوایا تھا تو اس مندر کا نام راجہ سری نواس کا مندر کیوں پڑا۔''

''مندر دراصل راجہ سری نواس کے پتا نے بنوایا تھا۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ ''مہاراج ادھیراج اس زمانے میں ریاست کا راجہ تھا۔ شری نواس راجکمار تھے۔ راجکمار سری نواس کو صرف دو چیزوں کا شوق تھا۔ ایک شکار کا دوسرا عورتوں کا۔ ان کے پتا جتنے نیک انسان تھا۔ راجکمار سری نواس اسی قدر ظالم اور عیاش تھا، وہ راتوں کو اپنی پرجا کے کسی بھی گھر میں گھس جاتا تھا اور نوجوان عورتوں کی عزت لوٹ لیتا تھا۔ اگر کوئی دربار میں اس کی شکایت لے کر آتا تھا تو اگلے دن راجکمار کے سپاہی اس کے سارے خاندان کو قتل کردیتے تھے لیکن! ظلم کی ناؤ سدا نہیں چلتی ایک روز ضرور ڈوبتی ہے، کہا جاتا ہے ایک رات راجکمار ایک غریب بیوہ کے گھر میں گھس گیا۔ بیوہ کی ایک ہی جوان اور خوب صورت بیٹی تھی۔ اس نے اسے اپنی بیٹی کو بچانا چاہا تو راجکمار نے اس کو قتل کردیا۔ لڑکی نے اپنی عزت بچانے کے لیے جدوجہد کی۔ اتفاق سے لڑکی کے ہاتھ میں ایک کٹار آگئی۔

جدوجہد میں راجکمار زخمی ہوگیا۔ اس کی ایک انگلی کٹ کر وہیں بیوہ کی جھونپڑی میں رہ گئی۔ راجکمار نے غصہ میں لڑکی کو اپنے جانتے میں قتل کردیا اور چلا گیا لیکن لڑکی صبح تک زندہ رہی اور کسی طرح گھسٹتی گھسٹتی راجہ کے دربار تک پہنچی۔ مرنے سے پہلے اس نے بھرے دربار میں راجکمار سری نواس کے ظلم کی کہانی سنائی اور ثبوت کے طور راجکمار کی کٹی ہوئی انگلی پیش کی۔

سارا دربار سناٹے میں رہ گیا۔ راجہ اپنی پرجا کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور انصاف کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ لڑکی نے اپنی فریاد سنا کر دم توڑ دیا۔ ثبوت میں راجکمار کی انگلی موجود تھی۔ راجہ نے راجکمار کو دربار میں بلوایا۔

راجکمار کے داہنے ہاتھ کی انگلی غائب تھی۔

راجہ نے راجکمار اور اس کے ساتھی سپاہیوں کی گردنیں اڑا دینے کا فیصلہ سنا دیا۔

درباریوں نے اگرچہ بہت منت سماجت کی لیکن راجہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے اور ان کے حکم سے راجکمار اور ان کے ساتھیوں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔

راجہ نے اگرچہ انصاف کیا تھا لیکن بہرحال وہ ان کا بیٹا تھا۔ بیٹے کی موت کا انہیں اس قدر دکھ ہوا کہ انہوں نے راج پاٹ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کردیا اور بیٹے کی یاد میں یہ مندر بنوایا۔ اس کے سامنے یادگار کے طور پر اپنے بیٹے اور سپاہیوں کے مجسمے بنوا کر لگوائے اور مندر کو راجہ سری نواس کے مندر کے نام سے مشہور کردیا تاکہ رہتی دنیا تک اس کا نام رہ سکے' اس کے بعد ساری زندگی انہوں نے اسی مندر میں بھگوان کی بھگتی کرنے میں گزاری۔ اسی لیے یہ مندر آج تک راجہ سری نواس کے نام سے مشہور ہے۔''

''کیا یہ کہانی سچ ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے' کیا اس علاقہ کی تاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے۔''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سال میں ایک اماوس کی رات کو قرب وجوار کے سارے گاؤں والے شام سے ہی اپنے دروازے اندر سے بند کرکے بیٹھ جاتے ہیں کیوں کہ مشہور ہے اس رات یہ مجسمے زندہ ہوکر گاؤں میں گھومتے ہیں اور جو انسان نظر آجاتا ہے۔ اسے قتل کردیتے ہیں کہتے ہیں یہ وہی رات ہوتی ہے جس رات راجہ نے اس غریب بیوہ کی لڑکی کی عزت لوٹی تھی۔''

''مجسمے زندہ ہوجاتے ہیں۔'' میں نے پانڈے کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں شری مان۔''

''کیا تم نے بھی انہیں کبھی چلتے پھرتے دیکھا ہے۔''

''چلتے پھرتے نہیں دیکھا لیکن ایک بار اسی اماوس کی رات کو میں نے مندر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا تو اس میدان میں یہ مجسمے نہیں تھے۔ وہ گاؤں میں گھومنے چلے گئے تھے۔''

یہ کہہ کر پانڈے مندر کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاید ہمارے چہروں سے اندازہ لگالیا تھا کہ ہمیں اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

میں اور آشا ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اندر سے نکل کر آگے گھومنے چلے گئے۔ مندر سے کوئی آدھا میل دور ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی' پہاڑی ندی کسی شوخ چنچل بچے کی طرح اچھلتی کودتی شور مچاتی بارہ مہینے بہتی رہتی تھی۔

پہلے دن آشا اور میں اس ندی کے کنارے ایک پتھر پر بہت دیر تک بیٹھے رہے اور قدرت کے حسن میں کھوئے رہے۔ مناظر نے ہم دونوں پر جیسے جادو سا کردیا تھا۔

آخر شام ہونے لگی تو ہم دونوں اٹھ کر واپس ڈاک بنگلہ کی طرف چل دیے۔

یہاں میں کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے ذرا سا اپنا تعارف کرادوں۔

میرا نام سوشیل کمار ہے۔ دہلی میں میرا چھوٹا اسٹیشنری کا کاروبار ہے۔ آشا کالج میں میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں اسی زمانے سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ آخر ہمارا پریم بیاہ کے بندھنوں میں بندھ گیا اور ہم اپنے دوست بلبیر کے مشورہ پر ہنی مون منانے جمبل وادی کے اس گاؤں میں آگئے تھے۔ بلبیر ٹورسٹ سینٹر میں ایک افسر تھا اس لیے اسے سارے ملک کے خوب صورت مقامات کا پتا تھا اور اس جگہ کو دیکھ کر ہم دونوں بھی بلبیر کے ذوق کے قائل ہوگئے تھے۔

آشا میری محبوبہ جو اب میری بیوی تھی۔ کالج کی سب سے زیادہ خوب صورت لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ مجھے اس کے حسن میں ہمیشہ ایک طرح کی پراسراریت محسوس ہوتی تھی جیسے وہ اس دنیا کی باشندہ نہ ہو' کسی دوسری دنیا سے آئی ہو۔ اس کی آنکھیں بھنوروں کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ مجھے دوسروں کا تو پتہ نہیں لیکن جب وہ میری طرف دیکھتی تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میری رگوں میں کوئی چیز سرسراتی چلی گئی ہو۔ اس کا رنگ گورا تھا اور ہونٹ قدرتی طور پر سرخ رہتے تھے۔ شادی سے پہلے جب ہم دونوں مل بیٹھتے تو میں زیادہ وقت صرف اس کے چہرے کو دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ میری نظروں کی تاب نہ لاکر شرما جاتی اور پوچھتی۔

''تم مجھے اس طرح کیوں دیکھتے ہو۔''

میں اسے کوئی جواب نہ دے پاتا کیونکہ مجھے خود معلوم نہ ہوتا تھا میں کتنی دیر سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھ پر جادو سا ہوجاتا تھا اور میں اس کو دیکھتا رہ جاتا تھا۔

میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا کیونکہ میں نے اسے حاصل کرلیا تھا۔ اب آشا جنم جنم بھر کے لیے میری تھی۔ اس سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں۔ ہنی مون کے زمانے میں ہم دونوں کے جذبات کا کیا عالم ہوگا۔

اس رات ہم بہت دیر تک اس مندر اور راجہ سری نواس کا ذکر کرتے رہے بلکہ ایک طرح سے پانڈے کی اس بات کا مذاق اڑاتے رہے کہ سال میں ایک اماوس کی رات کو وہ پتھر کے مجسمے گاؤں میں گھومنے چلے جاتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ ہم پیار کی لذتوں میں گم ساری دنیا کو بھول گئے۔ دن بھر ہم آس پاس کے خوب صورت منظروں میں کھوئے رہتے اور رات کو ایک دوسرے کے پیار میں ڈوب جاتے۔ چند روز بعد ہم اس مندر اور راجہ سری نواس کی کہانی بھی بھول گئے۔

اور یہ ہمارے وہاں آنے کے دسویں دن کی بات ہے' اس سے ایک دن پہلے بہت تیز ہوا چلی تھی جس سے آشا کو نزلہ ہوگیا تھا۔ ڈاک بنگلہ کی دیکھ بھال کے لیے تین آدمیوں کا اسٹاف تھا وہی ہمارا کھانا بھی بناتا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور آشا ٹہلنے نکل جاتے تھے اور ندی کے کنارے تک گھوم کر آتے تھے۔ چاندنی راتوں میں منظر اور زیادہ پراسرار ہوجاتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے مندر کے قریب سے گزرتے ہوئے ندی تک جاتے اور اسی طرح واپس آجاتے تھے۔ بیچ بیچ میں رک کر ہم ایک دوسرے کو پیار بھی کرتے رہتے تھے۔ ان لمحوں میں کتنی لذت ہوتی تھی اگر میں شاعر بھی ہوتا تو ان لمحوں کو الفاظ میں قید نہیں کرسکتا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ صرف چائے اور دو ٹوسٹ لے لیے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم آج مت چلو۔ آرام کرو۔ میں ٹہل کر ابھی آتا ہوں۔''

''جلدی آنا۔'' اس نے کہا۔

''بس ابھی آیا۔'' میں نے جواب دیا اور جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

ڈاک بنگلہ کے پیچھے دروازہ سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ ہر طرف اندھیرا تھا لیکن آسمان ہیروں سے بھرے تھال کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی نے ہر طرف پراسرار دھندسی پھیلا دی تھی۔ اس مدھم اجالے نے ماحول کو خواب ناک بنا دیا تھا۔ میں اس کیفیت میں کھو گیا اور میرے قدم خود بخود اس پگڈنڈی پر اٹھنے لگے۔ عجیب بات یہ تھی کہ مجھے تنہائی کا احساس بھی نہ ہوا۔

اب آپ سے کیا چھپاؤں آشا سے بیاہ کے بعد میرے اندر ایک جذبہ ابھرنے لگا تھا جو مجھے کوئی نظم لکھنے پر اکسا رہا تھا۔ اس رات میں اپنے خیالات کو سمیٹ کر نظم کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے قدم لاشعوری طور پر ندی کی طرف بڑھنے لگے لیکن جب میں مندر سے کچھ آگے بڑھ گیا تو اچانک محسوس ہوا کہ کچھ گڑبڑ تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چیز کم ہو گئی ہے جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں لیکن میرا ذہن تو نظم سوچنے میں لگا ہوا تھا اس لئے سمجھ نہ سکا۔

آخر میں ندی کے کنارے پہنچ گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا نظم اب میرے دماغ میں مکمل ہونے لگی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ جتنے اشعار میں نے کہے ہیں۔ انہیں بھول نہ جاؤں اس لیے جلدی جا کر لکھ لوں۔

میں اٹھ کر واپس چلنے لگا تو اس وقت پہلی بار مجھے خیال آیا کہ آج ابھی تک چاند نہیں نکلا تھا۔

اور پھر میرا دل دھک سے رہ گیا' مجھے یاد آ گیا آج اماوس کی رات ہے' اس کے ساتھ ہی مجھے اس کمی کا احساس بھی ہو گیا جو مندر کے پاس سے گزرنے کے بعد مجھے محسوس ہوتی تھی جب میں مندر کے قریب سے گزر رہا تھا تو وہ سنگ مرمر کے مجسمے اپنی جگہ پر نہیں تھے۔

یہ سوچتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں ہو کر سارے جسم میں پھیل گئی۔

لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ فوراً ہی میں نے خود کو تسلی دی۔

''تم احمق ہو سوشیل۔ بھلا مجسمے وہاں کہاں جائیں گے تم شعر کہنے کی دھن میں انہیں دیکھنا بھول گئے ہو گے۔''

پھر بھی نہ جانے کیوں میرے من کو شانتی ملی اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس چلنے لگا اس وقت میں نظم بھی بھول گیا تھا مندر کے قریب آیا تو میری جان میں جان آئی۔ مجسمے اپنی جگہ کھڑے تھے' اس وقت مجھے اپنی بزدلی اور وہم پر ہنسی بھی آئی۔ پنڈت نے کہا تھا کہ سال میں ایک اماوس کی رات کو مجسمے گاؤں میں چلے جاتے ہیں اور گاؤں والے شام سے ہی دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور یہ وہی اماوس کی رات تھی لیکن مجسمے گاؤں میں گھومنے کی بجائے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ خود بخود میرے پاؤں ان مجسموں کی جانب اٹھ گئے۔ تاروں کی روشنی میں سنگ مرمر کے یہ مجسمے بڑے پراسرار لگ رہے تھے۔ جیسے وہ مجسمے نہ ہوں بلکہ ملگجی دھند نے سمٹ کر مجسموں کی شکل اختیار کر لی ہو۔

میں سپاہیوں کے مجسموں کی قطار کے پاس گزرتے ہوئے راجہ کے مجسمے کے سامنے آ گیا ہوا۔

اچانک میرا دل بڑے زور سے اچھلا۔ سنگ مرمر کے سفید ہونٹوں پر لال لال کوئی چیز لگی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں کو چھوا۔

ایک بار پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل کی حرکت رک جائیگی۔

کوئی چپ چپی سی چیز مجسمہ کے ہونٹوں سے میری انگلی پر آ گئی۔ کوئی لال لال سی چیز خون ہو۔

میں نے گھبرا کر مجسمے کے بدن سے ہی انگلی پونچھنی چاہی تو اچانک میری نظر مجسمہ کے ایک ہاتھ پر گئی۔

اس کے ہاتھ کی ایک انگلی غائب تھی۔

اس سے پہلے کئی بار میں مجسمہ کو دیکھ چکا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالکل ٹھیک تھیں۔

نہ جانے کیوں فوراً مجھے آشا کا خیال آیا اور میں پاگلوں کی طرح ڈاک بنگلہ کی طرف دوڑنے لگا۔

ہانپتا کانپتا میں ڈاک بنگلہ تک پہنچا۔ پچھلے جس دروازے سے میں ٹہلنے کے لیے نکلا تھا وہ کھلا پڑا تھا میں اندر قدم رکھتے ہی پکارا۔

''آشا۔'' اندر بالکل سناٹا تھا۔

نوکر ڈاک بنگلہ سے کچھ فاصلے پر بنے کوارٹرز میں رہتے تھے۔ میں نے سوچا شاید آشا سو گئی ہے۔ میں ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا بیڈ روم تک پہنچا' بیڈ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جب کہ یہ دروازہ بھی ہوا نہ آنے کی وجہ سے میں بند کر کے گیا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے پکارا۔

''آشا۔''

اور میری آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔

بستر پر سے لحاف نیچے پڑا تھا۔ آشا بستر پر ساکت پڑی تھی۔ اس کے جسم پر گردن کے پاس ایک ڈیڑھ انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔ آشا کی پھٹی پھٹی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں اور اس کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے اس نے کوئی بہت ہی دہشت ناک چیز دیکھی ہو۔

میرے منہ سے چیخ نکلی۔

''آشا.....'' اور میں آشا پر گر پڑا۔ میرے گرنے سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور اس کے ہاتھ سے کوئی چیز نیچے گر پڑی میری نظریں اس چیز پر پڑیں۔

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

وہ چیز راجہ رام نو اس کے مجسمے کی انگلی تھی۔

اس کے بعد میں اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

تنہائی

سعدیہ لیاقت

کی تھی وفا اس امید پے ہم نے
کہ تنہائی میں کوئی ساتھی تو ہوگا
دل ناداں نے پر یہ نہ جانا
وفا کا صلہ بیوفائی ہی ہوگا
آسرا تھا کوئی اور نہ سہی سایہ تو ہوگا
اک رات جانا اندھیرے میں وہ بھی نہ ہوگا
روتے تھے اکثر جس پہ سر رکھ کر
میسر ہم کو وہ کاندھا بھی نہ ہوگا
مر ہی جاتے جس کی محبت میں ہم
ایسا کوئی مجنوں کوئی رانجھا نہ ہوگا
کھو جاتے جس کی وسعتوں میں ہم
ایسا کوئی سمندر کوئی آسماں نہ ہوگا
کرتے جس سے گھنٹوں دل کی باتیں
ایسا کوئی ہمدم' کوئی ہمراز نہ ہوگا
بانٹ سکیں جس سے اپنی تنہائی ہم
ایسا کوئی ہم نشیں' کوئی ہم نوا نہ ہوگا
دیتے رہے ہم ساتھ دوسروں کا سدا
معلوم نہ تھا اپنے ہی کوئی ساتھ نہ ہوگا

☆☆

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

کوشلیا کو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی حد تک راضی کرچکی تھی۔ اس کی اصل مرضی کا اندازہ تو اس کی زبان سے ہی ہوسکتا تھا۔ پانی وغیرہ پی کر میں اٹھی اور باتیں کرتی ہوئی نائیکہ کے قریب جاکھڑی ہوئی۔ وہ سمجھی کہ شاید میں اس کی لچھے دار باتوں سے متاثر ہورہی ہوں۔

نامعلوم مہم

ایس اے ہاشمی

اس شمارے کی ایک مہماتی کہانی

"بس ...... بس سندری بس......! اب اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کلاشنکوف کی تمام گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔" احاطے کے نسبتاً تاریک حصے آتی ہوئی ایک کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے دوڑتے ہوئے قدم زمین پر جم گئے۔ میں نے بے اختیار ہاتھ سر سے بلند کرلیے مبادا اندھیرے میں موجود شخص کسی غلط فہمی کی بناپر مشتعل ہوکر مجھ پر گولی چلادے۔

آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ شخص اندھیرے سے چاند کی روشنی کی زد میں آیا۔ اس کے ہاتھوں میں کلاشنکوف دبی ہوئی تھی اور وہ اپنی حرکات وسکنات سے پوری طرح چکنا نظر آرہا تھا۔ وہ قد آور اور مضبوط کاٹھی کا شخص تھا۔ اور اپنے انداز سے بڑا پھرتیلا نظر آرہا تھا۔ اس کی بے ترتیب داڑھی سینے تک آرہی تھی اور اس کے جسم کا اوپری حصہ کپڑوں سے بے نیاز مگر بالوں سے بھرا ہوا تھا ہاں البتہ پچھلے دھڑ پر اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اپنی مجموعی وضع قطع سے وہ کوئی پنڈت وغیرہ قسم کی چیز نظر آرہا تھا۔

"بڑی چلبلی ہے ری تو، آج میں تیرا سا چنچل پن نکال دوں گا۔" اس نے آہستہ قدموں سے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں جواب میں خاموشی سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتی رہی۔ رنگ کے معاملے میں وہ انتہائی بدنصیب ثابت ہوا تھا یعنی بالکل سیاہ توے کی مانند تھا۔ مگر اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ میرے خیال میں اس کے پورے جسم میں صرف اس کی آنکھیں ہی اس قابل تھیں جو توجہ کے لائق تھیں۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں خاصا فاصلہ ہونے کے باوجود مجھے اپنے جسم میں گھستی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ کوئی عام کم زور سا دشمن تو صرف اس کی آنکھوں سے ہی ڈر کر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتا ہوگا۔ مگر میں کوئی عام دشمن نہیں تھی۔ میں برابر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے نزدیک آتے ہوئے دیکھتی رہی۔

ابھی وہ پوری طرح میرے نزدیک نہیں آیا تھا کہ تاریکی میں اس کا پاؤں کسی شے سے الجھا اور وہ بری طرح بدکا، شور شرابے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے راستے میں بلی کے بچے حائل ہوئے تھے۔ بے خبری میں اس کا پاؤں تاریکی میں سوئے ہوئے بلی کے بچوں پر پڑ گیا تھا۔ نو وارد اس ناگہانی افتاد پر ایک لمحہ کے لیے بوکھلا گیا۔ اور ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ہٹ گئی۔

بس یہی مختصر لمحہ میرے لیے کافی تھا۔ میں پل بھر میں اپنی جگہ سے بلند ہوئی اور اگلے ہی لمحے میری بھرپور لات اس کے جبڑے پر پڑی۔ وہ بری طرح ڈکرایا اور سنبھلنے کی کوشش میں خلاف میں اندھوں کی طرح لہراتے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی میں پھر حرکت میں آئی۔ اب کی بار میرا ہدف اس کی پسلیاں تھیں۔ ضبط کی کوشش کے باوجود اس کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ پھر زمین پر گر گیا۔ زمین پر گرتے ہی اس نے زبردست پھرتی کا مظاہرہ کیا اور لوٹ لگاتے ہوئے مجھ سے اپنا فاصلہ کم کیا اور نہایت سرعت سے اس کی ٹانگ میری پنڈلی پر لگی۔ مجھے اپنی پنڈلی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں سنبھلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے زمین پر گر گئی۔

اب کی بار میں نے بھی سیاہ رو پنڈت کی تقلید کرتی ہوئے زمین پر گرتے ہی لوٹ لگائی اور کچھ دور جا کھڑی ہوئی۔

دوسری جانب پنڈت بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہاں البتہ وہ شاید غصے میں مغلظات پر اتر آیا اور کراٹے کا پوز بناتا ہوا پینترے بدلنے لگا۔ اس کی کلاشنکوف کہیں اندھیرے میں جاگری تھی۔

اس نے کراٹے کا ایک مخصوص پوز بناتے ہوئے مجھ سے اپنا فاصلہ کم کیا اور پھرتی سے لات گھمائی مگر میں بھی ہوشیار تھی۔ میں نے گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے اس کے وار کو ناکام کیا اور زمین پر بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکاتے ہوئے تیزی سے گھومی اس بار میرا ہدف اس کی پنڈلی تھی ضرب لگتے ہی وہ ڈگمگا کر رہ گیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر میں اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے حق میں نہیں تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ یہ لڑائی زیادہ دیر جاری رہی تو اس کی مدد کو کوئی بیرونی کمک پہنچ سکتی ہے۔ اندرونی کمک کی طرف سے میں بالکل مطمئن تھی کیونکہ مجھ پر پہرہ دینے والے دونوں افراد کمرے میں مردہ پڑے تھے۔ اس کے ڈگمگانے کے دوران میری دوسری لات اس کی ران اور پھر ناف پر پڑی۔ اب کی بار وہ بہت زور سے ڈکرایا تھا اور لہراتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر وہ زیادہ دیر تک مشین کی مانند چلنے والے میرے ہاتھ برداشت نہ کرسکا تھا۔ نڈھال ہوکر اس

نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں اس کے جسم سے اتر آئی اور آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔

وہ ایک وسیع و عریض مکان تھا اور میں اس وقت مکان کے احاطے میں موجود تھی۔ احاطے کی دیواریں چھوٹی تھیں۔ دروازے کے ساتھ ہی دیوار کے قریب ایک کھٹارہ سوزوکی کھڑی تھی۔ شاید یہ لوگ اس گاڑی میں یہاں تک آئے تھے بلکہ مجھے بھی بے ہوشی کی حالت میں اسی گاڑی سے لایا گیا ہوگا۔ احاطے میں جگہ جگہ خودرو جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا اور اس کے درمیان ایک پختہ روش تھی مگر وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی اور چھوٹے چھوٹے گڑھوں سے اٹی اپنی تباہ حالی کی خاموش زبان سے داستان بیان کر رہی تھی۔

ایک سرسری جائزے سے فارغ ہو کر میں سوزوکی کی جانب بڑھی۔ سردست میرے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں تھی۔ باہر نکل کر کم از کم مجھے یہ تو علم ہو جاتا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ مجھے تو ابھی تک اغوا کرنے والوں اور ان کے مقاصد کا بھی علم نہیں تھا۔

مجھے صبح نو بجے ایک اہم مشن پر لندن روانہ ہونا تھا۔ اسی لیے فی الحال میں اس معاملے میں مزید الجھنے کے بجائے فرار کو ترجیح دے رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں نے پنڈت کو ہوش میں لانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

سوزوکی کی تلاش کے بعد حسب توقع معلوم ہوا کہ اس کی چابی اگنیشن سے غائب ہے۔ میں نے اپنے سر میں لگی بال پن کی مدد سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور دو مخصوص تاروں کو ملا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر میرے لیے اس خستہ حال مکان سے نکلنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ باہر دور تک ویرانی کا راج تھا اور خاصی دور شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

مین روڈ پر پہنچ کر گاڑی اندازے سے سیدھی سڑک پر ڈال دی۔ سڑک خاصی کشادہ اور ہموار تھی گو کہ رات ہونے کے باعث ٹریفک کی آمد و رفت خاصی کم تھی مگر بڑی گاڑیوں اور بسوں کی آمد و رفت سے یہ اندازہ بخوبی ہو رہا تھا کہ میں اس وقت ہائی وے پر سفر کر رہی ہوں اور تیزی سے شہر سے قریب تر اور اپنے نامعلوم دشمنوں سے دور ہوتی جا رہی ہوں۔ چند منٹ بعد میں شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی دکانیں بند تھیں مگر دکانوں پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے جن پر ہندی اور انگریزی میں نہ صرف دکانوں کے نام لکھے تھے بلکہ شہر کا نام بھی موجود تھا۔ شہر کا نام پڑھ کر میں بری طرح چونک اٹھی۔ میں صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد میں تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ مجھے اغوا ہوئے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ رات مجھے کلکتہ میں میرے بنگلے سے اغوا کیا گیا تھا۔ جبکہ صبح مجھے اپنے نئے مشن کے سلسلے میں لندن روانہ ہونا تھا۔ دن گزر گیا اور اب رات تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری لندن کی فلائٹ مس ہو گئی مگر پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اغوا کرنے والے کون لوگ ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے۔

جہاں سے میں ابھی فرار ہو کر آئی ہوں' وہاں مجھے اب سے تقریباً چار گھنٹے قبل ہوش آیا تھا' وہاں پہرے پر موجود دونوں افراد انتہائی گھامڑ اور بیوقوف تھے یا پھر بہت ہی چالاک۔ میرے لاکھ سوال کرنے پر بھی کوئی معقول جواب نہیں دے پائے تو میں نے ان سے عورت کی ازلی زبان بولنا شروع کی جو فوراً ہی ان کی سمجھ میں آنی شروع ہو گئی اور ان کی رال ٹپکنے لگی مگر اس حالت میں بھی وہ کچھ اگلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ دراصل انہیں کسی نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور میری نگرانی کا انہیں معقول معاوضہ دیا گیا تھا۔ میں انہیں بے ہوش کر کے نکل جانا چاہتی تھی مگر ان میں سے ایک ضرورت سے کچھ زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور میرے ارادے کو بھانپ کر تیزی سے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی اپنی فراٹل کی جانب بھاگا۔ نتیجے

میں میری کھڑی ہتھیلی کے ایک ہی وار سے اپنی گردن کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی میرے جسمانی سحر سے آزاد ہو گیا اور اس سے قبل کہ وہ میری لیے کوئی دشواری کھڑی کرتا' میرے ہاتھ میں اس کے مردہ ساتھی کی رائفل آ گئی جس کی ایک ہی گولی نے اس کے سینے میں روشن دان کھول دیا تھا۔ ان دونوں کرائے کے محافظوں سے مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ اس ویرانے میں دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے اور اس کھنڈر نما مکان میں ان دو محافظوں سے علاوہ کوئی تیسرا محافظ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا رائفل کے دھماکے کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی مگر پھر بھی احتیاطی تدابیر کے طور پر میں نے کسی سستی کا مظاہرہ کیے بغیر قرار کو ترجیح دی اور باہر نکل پڑی۔

باہر ہی میرا سامنا سیاہ روپنڈت سے ہوا جو میرے اندازے کے مطابق پہلے سے اس مکان میں موجود نہیں تھا۔ وہ نہ صرف ابھی آیا تھا بلکہ رائفل کے فائر کی آواز سے چوکنا ہو کر مسلح پوزیشن میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ میری خوش قسمتی اور اس کی بدقسمتی تھی کہ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا اور اس کی یہ صورت پنڈت کو بے ہوش کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

میں اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ مجھے ہوش اس وقت آیا' جب ایک مکان کے باہر کھڑی ہوئی زرق برق لباس میں ملبوس موٹی سی عورت پر میری نظر پڑی اور میں چونک اٹھی' اتنی رات گئے یہ عورت دروازے پر کھڑی کیا کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آس پاس کا جائزہ لے ڈالا۔ گو کہ گلی میں سناٹے کا راج تھا مگر بیشتر مکانوں میں روشنی ہو رہی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس گلی کے مکین ذرا دیر تک جاگنے کے عادی ہیں۔

میں نے ذہن میں فوری فیصلہ کیا۔ میری پہلی ترجیح کسی محفوظ ٹھکانے پر شب بسری تھی۔ دن کے اجالے میں نہ صرف میں اپنے دشمنوں سے بہتر طور پر نمٹ سکتی تھی بلکہ ان کے چھکے بھی چھڑا سکتی تھی' میں نے اس عورت کے نزدیک ایک گاڑی روکی اور نیچے اتر آئی۔ اب کی بار وہ عورت چونکی تھی۔ اسے اتنی رات گئے کسی خوبصورت لڑکی کے اس طرح آنے کی ہرگز توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس کی حیرت میں میرے موجودہ حلیے کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ میں دو سیڑھیاں عبور کر کے موٹی عورت کے نزدیک پہنچ گئی اور اس سے قبل کہ وہ حیرت کے سمندر سے باہر نکلتی' میں نے اس کا بازو پکڑا اور آہستہ سے اسے اندر دھکیلتی ہوئی بولی۔

''یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا پہلے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔'' میرے درشت روی پر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کے آثار نمودار ہوئے مگر پھر وہ ہمت کر کے بولی۔

''لڑکیاں تو بہت دیکھی ہیں' ہمارا تو نگوڑا کام ہی یہ ہے مگر ایسی لڑکی پہلی بار دیکھی ہے جو اپنے قدموں سے چل کر یہاں تک آئے۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی راہداری عبور کر کے ہم ایک خاصے بڑے کمرے میں پہنچے' یہاں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ گانے بجانے کا سامان رکھا تھا' نہیں فرش پر چار افراد دنیا و مافیا سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔ اس ہال نما کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

ہم رکے نہیں بلکہ سے متصل دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے میں نائٹی پہنے ایک خوبصورت لڑکی بیڈ پر آلتی پالتی مارے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ گو کہ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا مگر پھر بھی وہ خاصی خوبصورت تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہاتھ رک گئے مگر کھانا دیکھ کر مجھے بڑی شدت سے بھوک کا احساس ہوا اور میرے پیٹ میں گدھوں اور گھوڑوں نے ریس لگانا شروع کر دی۔

''اری نگوڑی' اب تو میرا بازو چھوڑ کہیں نیل نہ پڑ گیا ہو۔'' نائیکہ نے جھلا کر کہا اور جھٹکا دے کر بازو

چھڑا لیا۔

''سن موٹی ایک بات کان کھول کر سن لے۔ میں یہاں رات گزاروں گی اور صبح چلی جاؤں گی جاتے جاتے تمہیں اتنی دولت دے جاؤں گی کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔'' آخری جملے میں' میں نے اسے لالچ دیا تھا تاکہ وہ میرے قابو میں رہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

''ارے! رات ٹھہرنے کی تم نے اچھی کہی' ایک کیا تم سو راتیں ٹھہرو۔ ہماری دولت تو تمہاری حسین صورت ہے' تم سے دولت تو ہم خود وصول کر لیں گے۔'' نائیکہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

''اپنی بکواس بند کرو' میری ایک رات ہی تم برداشت کر لو تو بڑی بات ہے۔ سو راتوں کے خواب بھی مت دیکھنا۔ جاؤ جا کر میرے لیے کھانا لاؤ' میں اس لڑکی کے ساتھ اسی کمرے میں کھانا کھاؤں گی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ مگر وہ بھی بڑی ڈھیٹ تھی فوراً ہاتھ نچا کر کے بولی۔

''ارے..... ارے' تو تو ایسے حکم چلا رہی ہے جیسے یہ کوٹھا تیرا ہے اور نائیکہ ہم نہیں تو ہے۔'' اس کے الفاظ سن کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے مزید سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''الو کی پٹھی' تجھ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کر اور دیکھ اگر میرے بارے میں کسی کو اطلاع دینے کی غلطی کی تو میں مرتے مرتے بھی تیری گردن ضرور توڑ دوں گی سمجھی۔''

''ہاں ہاں سمجھ گئے۔ چلاؤ مت جاتے ہیں' یہ ہماری لاڈلی بیٹی کوشلیا ہے' اسے تنگ مت کرنا۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور میں کوشلیا کے سامنے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

''میرا نام رانی ہے' کیا تم واقعی اس موٹی نائیکہ کی بیٹی ہو۔'' میں نے مسکرا کر کوشلیا سے سوال کیا۔ اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں اب بھی مجھے تک رہی تھیں۔ اس کے گہرے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور بیٹھے ہونے کے باعث بیڈ تک آ رہے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکیں اور بولی۔

''پتا نہیں پر جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے' ان کو اپنی کہتی ہوں! پر تم کون ہو۔''

''میں اپنا نام تو تم کو بتا ہی چکی ہوں اور کیا بتاؤں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں نے بلا تکلف کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔

''نہیں میرا مطلب ہے۔ تم کہاں سے آئی ہو' کیا کرتی ہو اور اتنی رات گئے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے۔

''اگر میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دینے بیٹھ جاؤں تو پوری رات گزر جائے گی۔ تمہاری تسلی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ میں یہاں تمہارے ساتھ رات گزاروں گی' ایک ایسی رات جسے تم ساری زندگی یاد رکھو گی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا اور اس نے جھینپ کر نظریں چرا لیں اور توجہ ہٹانے کے لیے کھانے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد موٹی نائیکہ ایک تھال میں بہت سا کھانا لے آئی' اس دوران میں کوشلیا سے گھما پھرا کر سوالات کرتی رہی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ موٹی نائیکہ کا نام امبر بائی ہے اور بازار حسن میں اس کا کوٹھا کوشلیا کے باعث بہت مشہور ہے۔ لوگ دور دور سے کوشلیا کا گانا سننے اور رقص دیکھنے آتے ہیں۔ اور ان دنوں امبر بائی کوشلیا کی نتھ اتارائی کی رسم کے سلسلے میں دام کھرے کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے اور غالباً میرے متعلق بھی اس نائیکہ نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے شیشے میں اتار کر کوٹھے پر بٹھا دے گی۔ اس طرح اس کے کوٹھے کی رونق میں چار چاند لگ جائیں گے۔ کوشلیا سے مزید جو باتیں معلوم ہوئیں' وہ یہ تھیں کہ اس وقت کوٹھے میں کوشلیا اور امبر بائی کے علاوہ چار سازندے موجود تھے جو بڑے کمرے میں

سو رہے تھے۔

موٹی نے کھانے کا تھال بیڈ پر رکھا اور کرسی کھسکا کر ہمارے قریب بیٹھ گئی۔

''دیکھ غصہ مت کرنا' تو تو میری بیٹی کوشلیا جیسی ہے پر یہ تو بتا نگوڑی اتنی رات گئے تو کہاں سے آ رہی ہے اور یہ حلیہ تو نے کیا بنا رکھا ہے۔ کیا کسی سے لڑائی جھگڑا کر کے آ رہی ہے۔'' موٹی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''نگوڑی' غالباً اس کمبخت کا تکیہ کلام تھا۔ میں اندازہ لگا چکی تھی کہ موٹی کی موجودگی میں کوشلیا سے استفادہ کرنا تقریباً ناممکن ہے لہٰذا میں نے موٹی کے متعلق ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا۔ فی الحال میں موجود سازندوں کی طرف سے اہم فیصلہ کر لیا تھا۔ فی الحال ہال میں موجود سازندوں کی طرف سے مجھے کچھ زیادہ فکر نہیں تھی' کیونکہ ان میں سے کوئی بھی مکان کے اندرونی حصے میں نہیں آتا ہوگا۔ لے دے کر یہ موٹی نائیکہ اور کوشلیا رہ جاتی تھیں۔ کوشلیا کے ساتھ میں کچھ وقت گزارنے کا موڈ بنا چکی تھی اور اب رہ جاتی ہے نائیکہ تو اس کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مجھے سب سے پہلے باہر موجود گاڑی کو کہیں دور چھوڑ کر آنا تھا کیونکہ یہ گاڑی میری بہت بڑی شناخت بن سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں کھانے سے فارغ ہو گئی۔ کوشلیا مجھ سے پہلے ہی ہاتھ کھینچ چکی تھی۔ میرے فارغ ہوتے ہی اس نے تمام برتن اٹھائے اور قریب رکھی ہوئی میز پر رکھ دیئے۔ اس دوران امبر بائی مسلسل بولتی رہی۔ وہ گھما پھرا کر مختلف انداز میں سوالات کرتی رہی اور میں ہوں ہاں میں اسے جواب دیتی رہی۔ میں نے اپنا انداز ایسا ہی رکھا تھا کہ وہ میری کسی بات پر بھڑک نہ جائے کیونکہ اس طرح کام خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور بہرحال مجھے یہاں ابھی چھ گھنٹے مزید گزارنے تھے۔

کوشلیا کو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی حد تک راضی کر چکی تھی۔ اس کی اصل مرضی کا اندازہ تو اس کی زبان سے ہی ہو سکتا تھا۔ پانی وغیرہ پی کر میں اٹھی اور باتیں کرتی ہوئی نائیکہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ سمجھی کہ شاید میں اس کی لچھے دار باتوں سے متاثر ہو رہی ہوں۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی گفتگو کے تسلسل کو روکا اور ایک ہاتھ اس کے سر سے بلند کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو۔ امبر بائی میرے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھو۔ تمہیں اس میں ننھے ننھے جگنو چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔'' میری بات سن کر وہ قدرے گردن گھما کر میری پھیلی ہوئی ہتھیلی کو گھورنے لگی مگر وہاں سے کیا خاک نظر آتا کچھ ہوتا تو دیکھتا۔

''اری نگوڑی! میری تو کمبخت نظر ہی خراب ہے' کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔'' نائیکہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا اور اپنی گردن مزید اونچی کر لی۔ اس کے ساتھ ہی میرا دایاں ہاتھ گردش میں آیا اور کھڑی ہتھیلی کی نپی تلی ضرب اس کی گدی پر پڑی اور وہ چمکتے ہوئے جگنو دیکھنے کی حسرت دل میں لیے اناٹھیل ہو گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر آتی' میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور نہایت احتیاط سے فرش پر لٹا دیا۔ یہ سب انتہائی قلیل عرصے میں ہوا۔

نائیکہ کا حشر دیکھ کوشلیا کے منہ سے بے اختیار چیخ برآمد ہوئی اور وہ دوڑ کر میرے نزدیک آ گئی۔

''کیا تم نے اسے مار دیا۔'' اس نے گھبرا کر پوچھا اور میرا بازو تھام لیا۔ میں اس کی اس ادا پر مر ہی تو گئی۔ خوف زندگی کے اس عالم میں بھی وہ مجھے بے انتہائی حسین لگی تھی۔

''نہیں مارا نہیں بلکہ صرف بے ہوش کیا ہے۔ اب یہ چار پانچ گھنٹے یونہی بے خبر پڑی رہے گی اور ہم عیش کریں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا اور مسکرا دی۔ مگر وہ اب بھی کھنچی کھنچی سی اور گھبرائی ہوئی تھی۔

مجھے اسے اپنے ڈھب پر لانے کے لیے تھوڑی بہت کوشش کرنا ہوگی۔ میں نے سوچا اور پھر وہی ہوا

جو میں چاہتی تھی۔ کوشلیا زیادہ دیر تک میرے حربوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور جلد ہی میرے سامنے مکمل طور پر چاروں شانے چت ہوگئی اور کچھ ہی لمحات میں ہم دونوں آنکھیں موندے سورگ میں پہنچ گئے جہاں ہر طرف کیف تھا' ایک انوکھی مستی تھی۔ جس میں مدہ جزر تھے' طوفان تھا جو ہمیں جوش میں اپنے اندر سمونے کی کوشش کررہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا ہوگا کہ طوفان کی شدت کم ہوگئی' لہروں کا زور ٹوٹتے دم توڑ گیا۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو کوشلیا آنکھیں موندے بے ترتیبی سے بستر پر بکھری ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ پرنیل اور سرخ دائرے میرے جنون کا منہ بولتا ثبوت فراہم کررہے تھے۔

کچھ وقت یونہی گزار کر کوشلیا اٹھی اور لباس درست کرتی ہوئی بیڈ سے اتر گئی۔ میں نے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ نظریں چرانے لگی۔ اپنی شرمیلی اداؤں سے وہ قطعی اس کوٹھے کی مکین نہیں لگتی تھی اگر وہ مجھے کہیں اور ملی ہوتی تو میں ہرگز اسے کوئی کوٹھے والی تصور نہیں کرتی۔ اس کی اداؤں میں معصومیت اور حیا کا تاثر بڑا گہرا تھا۔ ''کہاں چلیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اطمینان سے بیٹھیں' میں آپ کے لیے دودھ لاتی ہوں۔'' اس نے مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔ اس سے قبل کہ میں اسے روکتی' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں بستر سے اتری اور قریب میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ کو اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں چلی گئی۔ میں نے منہ پر چھپکے مارے تاکہ ذہن سے نیند کا خمار ختم ہو۔ کھانا کھانے اور آسودگی کے حصول کے بعد نیند آنا لازمی تھی اور میں اسی سے بچنا چاہ رہی تھی کیونکہ مجھے ابھی باہر کھڑی گاڑی کو بھی ٹھکانے لگانا تھا۔ اس کے علاوہ بھی باقی رات میرا سونے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل کر اپنی تنظیم کے باس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی تاکہ انہیں پوری صورت حال سے آگاہ کرسکوں۔ منہ ہاتھ دھو کر میں بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ کوشلیا ایک ٹرے میں دودھ کے دو گلاس لیے کمرے میں داخل ہوئی اور میرے برابر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑی ادا سے مسکراتی ہوئے ایک گلاس مجھے دیا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ دودھ زیادہ گرم نہیں تھا لہٰذا میں چند گھونٹ میں اسے خالی کرگئی۔ کوشلیا نے میری تقلید کی اور اپنا گلاس خالی کر کے دونوں گلاس ٹرے میں رکھ کر باہر نکل گئی۔

مجھے حیرت تھی کہ کوشلیا نے اب تک مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا' نہ ہی اس نے میرے متعلق جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ نائکہ کو بے ہوش کرنے کے بعد بھی اس نے کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ میرے ساتھ بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا تھا' جبکہ میں اس کے لیے اجنبی تھی اور میرا اس کوٹھے پر آنے کا انداز بھی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ میرے خیال میں تو اسے شدید مزاحمت کرنی چاہیے تھی اور اگر وہ کسی وجہ سے نائکہ سے بدظن تھی اور مجھ پر بھروسہ کررہی تھی تو بھی کم از کم میرے متعلق کچھ معلومات حاصل کرتی مگر وہ میرے ساتھ اسی طرح تعاون کررہی تھی گویا میں ان کی کوئی معزز مہمان ہوں۔ یہ بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ مجھے بہرحال اس لڑکی کو کھنگالنا چاہیے۔

یہ خیال آتے ہی میں بیڈ سے اٹھی مگر چکرا کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مجھ پر اچانک شدید نیند کا غلبہ طاری ہوا تھا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا اور ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی مگر اب کی بار بھی مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ میں بیڈ سے اٹھ تو گئی مگر دو تین قدم چل کر ہی لڑکھڑائی' نیند کی دیوی میرے دماغ پر قبضہ جمانے میں مصروف تھی۔ کوشلیا میری توقع سے زیادہ چالاک اور پھرتیلی نکلی تھی۔ اس نے مجھے شک کا موقع دیے بغیر میرے دودھ میں نیند کی کوئی دوا حل کی اور اپنی اداؤں کے جال میں الجھا کر دودھ پلانے میں کامیاب ہوگئی۔ میرے بے خبری کے باعث اس کا وار مکمل طور پر کامیاب رہا۔

میں اپنی قوت ارادی کے بل پر دروازے تک پہنچ پائی تھی مگر سنبھلنے کی لاکھ کوشش کے باوجود لہراتی ہوئی دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ گرتے گرتے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے میں نے اتنا دیکھا کہ دروازے کے قریب ہی کوشلیا کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

عالم مدہوشی میں کیا ہوا' مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی۔ میں دھوکے سے کھلائی گئی مسکن دوا کے باعث دنیا و مافیہا سے بے خبر رہی۔ اگر اس دوران کوئی میرے ٹکڑے بھی کردیتا تو مجھے خبر نہ ہوتی۔ مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو کسی آرام دہ بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ میرا سر بھاری بھاری سا ہورہا تھا اور کمرے میں بھنبھناہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ اپنی سخت تربیت کے باعث ہوش میں آتے ہی میں نے آنکھیں نہیں کھولیں بلکہ دم سادھے حالات کا جائزہ لیتی رہی۔ کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں رہنے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آتا گیا۔ کوشلیا کا خیال آتے ہی مجھ پر شدید غصہ طاری ہوا مگر میں بے خود پر قابو پاتے ہوئے کمرے میں گونجنے والی بھنبھناہٹوں پر توجہ مرکوز کردی۔ میں مکمل طور پر ہوش میں آچکی تھی اور کمرے میں ہونے والی نائکہ امبر بائی اور اپنے دشمن سیاہ رو پنڈت کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکتی تھی۔ وہ دونوں تیز تیز لہجے میں باتیں کررہے تھے اور ان کی باتوں کا موضوع میری ذات ہی تھی۔

''دیکھو امبر بائی' ہم یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں ہماری دشمن دے دو ہم خاموشی سے چلے جائیں گے۔'' پنڈت نے درشت لہجے میں کہا۔

''ارے نگوڑے' میں پھول سی بچی کیوں تمہارے حوالے کردوں۔ یہ کوٹھا ہے کوٹھا۔ یہاں جسموں کے دام دیئے پڑتے ہیں' کوئی مفت کی دکان نہیں کھول رکھی ہے ہم نے۔'' امبر بائی نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

''مفت کی دکان کی بچی! یہ لڑکی ہماری گاڑی لے کر فرار ہوئی تھی اور اب گاڑی تمہارے کوٹھے کے باہر سے اور لڑکی اندر سے برآمد ہوئی ہے اور تم کہتی ہوں ہم مفت کا مال لے جارہے ہیں۔'' پنڈت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں چٹاخ کی زوردار آواز گونجی اور امبر بائی کی چیخ بھی سنائی دی۔

تھپڑ کھاتے ہی امبر بائی کچھ دیر تو خاموش رہی پھر مغلظات اور کوسنوں پر اتر آئی۔ پنڈت نے غصے میں آکر مزید دو چار اور تھپڑ رسید کردیے۔ اس دوران ان کے درمیان تکرار جاری رہی۔

جب نائیکہ نے زیادہ شور مچایا تو پنڈت نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر نائیکہ کے منہ پر مارے اور کمرے میں موجود اپنے دیگر ساتھیوں کو مجھے اٹھانے کا حکم دیا۔ اس سے قبل کہ پنڈت کے ساتھی مجھے اٹھانے کے لیے آگے بڑھتے' میں بستر پر اٹھ بیٹھی۔

''پنڈت جی' تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہاں چلنا ہے چلو' میں خود چل رہی ہوں۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کے ساتھیوں کو روکتے ہوئے کہا اور ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔ میرے یوں کھڑے ہونے پر میری طرف بڑھنے والے اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئے' انہیں میری جانب سے مزاحمت کی توقع تھی لیکن میں خاموشی سے ان کے ہمراہ چل پڑی۔

پنڈت کے دو ساتھی میرے آگے اور دو پیچھے چل رہے تھے' جبکہ پنڈت خود میرے برابر میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر نائیکہ امبر بائی خاموش ہوچکی تھی۔ شاید اس نے خاموشی سے پنڈت کی دی گئی رقم پر صبر کرلیا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ مزید رقم کے اصرار پر کہیں اس سے بھی ہاتھ دھونا نہ پڑ جائیں۔

باہر گلی میں وہ سوزوکی بھی کھڑی تھی جو میں رات کو لائی تھی اور اس کے پیچھے ایک بند ہڈ کی ویگن بھی موجود تھی' غالباً میری نشاندہی رات والی سوزوکی

سے ہوئی تھی اور یہ لوگ بند ہڈ والی گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ پنڈت کے ایک ساتھی نے سوزوکی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' جبکہ دوسرا بند ہڈ والی گاڑی کی ڈرائیونگ نشست پر بیٹھ گیا۔ پنڈت نے اپنی سربراہی میں مجھے گاڑی کے پیچھے حصے میں بٹھادیا میرے ساتھ اس کے دو ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ بظاہر وہ لوگ غیر مسلح نظر آرہے تھے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ان کے ہاتھوں میں آتشی ہتھیار نظر آنے لگیں گے لہٰذا فی الحال میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی دروازے کو باہر سے بند کردیا گیا۔ پنڈت ہماری گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔

کیبن کا دروازہ بند ہونے سے خاصا اندھیرا ہوگیا تھا مگر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جالی لگی ہونے کے باعث باہر کی روشنی اندر آرہی تھی جس کے باعث کیبن میں مکمل اندھیرے کا راج نہیں تھا۔ پنڈت کا ایک ساتھی جالی کے قریب اور دوسرا دروازے کے نزدیک بیٹھا تھا۔ میں ان کے درمیان اس طرح بیٹھی تھی کہ مجھے جالی نظر تو آرہی تھی مگر راستوں کا علم نہیں ہورہا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ کر آنکھیں موندلیں۔

گاڑی کا سفر تیزی سے ہموار راستے پر نامعلوم منزل کی جانب جاری رہا اور میں آنکھیں بند کیے اپنے حالات کا جائزہ لیتی رہی۔ میرے جسم پر اب بھی وہی لباس تھا جس میں' میں پنڈت کے ساتھیوں کو ہلاک کرکے فرار ہوئی تھی۔ میرا لباس خاصا بوسیدہ ہوچکا تھا۔

پنڈت کے ساتھ آتے وقت نائیکہ امبر بائی کے کوٹھے کے کمرے میں دیوار پر لگے کیلنڈر پر میں آج کی تاریخ پڑھ چکی تھی اور اسی وجہ سے تشویش کا شکار تھی۔ آج تیرہ اکتوبر تھی جبکہ میں کلکتہ میں اپنے گھر میں دس اکتوبر کی رات کو سوئی تھی یعنی صبح گیارہ اکتوبر تھی اور مجھے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میری سیٹ تنظیم کی جانب سے ریزرو کردی گئی تھی۔ دس اکتوبر کی رات کو میرے اغوا کا مطلب یہ ہوا کہ میرے اغوا کنندگان نے مجھے تین روز قبل اغوا کیا تھا۔ انہوں نے دو روز مجھے مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھ کر خود سے بیگانہ رکھا' اس دوران بمبئی سے یہاں تک کا طویل سفر طے کیا گیا۔ مجھے بارہ اکتوبر کی رات کو ہوش آیا تھا اور ہوش میں آنے کے تقریباً چار گھنٹوں کے اندر ہی میں پنڈت کے دو ساتھیوں کو جو میری نگرانی پر مامور تھے کو ہلاک کرکے فرار ہوگئی تھی۔ فرار کے دوران میری پنڈت سے بھی جھڑپ ہوئی اور میں اسے زیر کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب میں دوبارہ اسی پنڈت کی گرفت میں تھی۔ میرے خیالات مختلف زاویوں سے ادھر ادھر بھٹکتے رہے مگر میری سمجھ میں اپنے اغوا اور پنڈت سے دشمنی کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکی۔ میں اس وقت چونکی جب گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے رکی اور اس کا انجن بند کردیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد باہر سے لاک کھولنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔

سب سے پہلے میری نظر ایک خوبصورت عورت پر پڑی جو پنڈت کے ساتھ باہر کھڑی تھی اور مجھے نیچے آنے کا اشارہ کررہی تھی۔ اس نے پیلے رنگ کی نہایت سادہ سی ساڑی پہن رکھی تھی۔ عمر زیادہ ہونے کے باوجود اس کا بدن سڈول اور مضبوط تھا۔ پہلی نظر میں مجھے وہ بڑی پرکشش لگی۔

گاڑی سے اتر کر میں پنڈت اور خوبصورت عورت کے ہمراہ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چل دی۔ یہ کوئی ریاان مندر تھا جو جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مختلف جگہوں پر عارضی تعمیر کرکے اسے استعمال کے قابل بنایا گیا تھا۔ مندر میں صرف ہماری گاری داخل ہوئی تھی سوزوکی کو غالباً کہیں اور روانہ کردیا گیا تھا۔ راستے میں کئی پنڈت نظر آئے جنہوں نے سیاہ رو پنڈت کو پرنام کیا' یہ مندر عام پوجا کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہوگا اور شاید شہر سے باہر ہوگا جبھی یہ لوگ اتنی آزادی سے اپنی نقل وحرکت

جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مختلف راہداریاں عبور کرتے اور کئی بند کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم لوگ ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچ گئے یہاں پہلے سے پانچ مسلح پنڈت موجود تھے جو ہمیں دیکھ کر مستعد ہوگئے۔ میرے دائیں بائیں سیاہ رو پنڈت اور خوبصورت داسی تھی' جبکہ میرے ساتھ کیبن میں موجود دونوں افراد اور ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ ہی ہال میں داخل ہوئے تھے۔

ہال کے وسط میں پہنچ کر پنڈت نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔

"دیکھ چلبلی' ہم زیادہ چھل کپٹ نا ہی جانت ہیں۔ ہمرا نام پنڈت کرشنا ہے اور ہم کالی کے داس ہیں جو کچھ ہم تجھ سے پوچھت ہیں صحیح صحیح بتادے اور بیش کرو رنہ ہم مار مار کر تیرا حلیہ بگاڑ دیوا۔"

میں خاموش رہی تو اس نے کچھ توقف کے بعد پھر بولنا شروع کیا۔ "تو ہم کا بتلا کہ وہ میزائل کا نقشہ تونے کہاں چھپایا ہے۔" پنڈت نے پوچھا اور مجھے گھورنے لگا۔

اس کے سوال پر میں پریشان ہوگئی تھی کیونکہ میں خود کسی میزائل کے نقشے سے لاعلم تھی۔ اول تو اگر مجھے علم ہوتا' تب بھی میں زبان نہیں کھولتی مگر جب مجھے قطعی کچھ خبر نہیں تھی تو بھلا میں اس کمبخت پنڈت کو کیا جواب دیتی۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے خاموش کھڑی رہی۔

"کاہے دیکھے ہمری طرف ٹکر ٹکر ہم تجھ سے کچھ پوچھت ہیں۔ کہاں ہے وہ میزائل کا نقشہ۔" میں اس بار بھی خاموش رہی۔ پنڈت کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر تیزی سے میرے قریب آیا اور اس کا ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلی گئی۔ میری آنکھوں کے گرد ستارے چمکنے لگے اور بے اختیار آنکھوں میں پانی آگیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ہال میں موجود تمام مسلح افراد کے ہتھیاروں کا رخ اپنی جانب دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

پنڈت اس پر نہیں رکا بلکہ اس کی بار اس نے مزید آگے بڑھ کر میرے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور میرے بائیں پاؤں پر اپنا داہنا پاؤں مارا۔ میں تلملا کر رہ گئی۔ پنڈت نے بغیر کسی توقف کے ایک زوردار گھونسا میری ناک پر جڑا جس سے میری ناک سے خون بہہ نکلا۔ میں پنڈت کے مزید عذاب سے بچنے کے لیے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی اور قمیض کے دامن سے ناک سے بہنے والا خون صاف کرنے لگی۔

پنڈت پر جنون سوار ہوچکا تھا' وہ آگے بڑھا مگر اس سے قبل کہ وہ کوئی اور وار کرتا میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے اور پھر کی طرح گھومتے ہوئے اپنی دائیں لات لٹو کی مانند پنڈت کی پنڈلی پر ماری اور پنڈت لڑکھڑا کر رہ گیا لیکن میرے اس اقدام سے یہ فائدہ ہوا کہ فوری طور پر پنڈت کی پیش رفت رک گئی۔ مگر میری لات کھا کر وہ اور غضب ناک ہوگیا۔ پنڈت کو لڑکھڑاتا دیکھ کر اس کے کئی مسلح جواری میری جانب بڑھے تھے مگر پنڈت نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

"ہو بل دیو' ہو گوپال ذرا اس چھوکریا کو اس ستون سے باندھ دیو۔" پنڈت نرائن کرشن زوردار آواز میں دہاڑا اور کمرے کے ایک حصے سے دو موٹے تازے پنڈت میری طرف بڑھے اور مجھے گھسیٹ کر ایک ستون کے قریب لے آئے۔ چند منٹ بعد وہ رسی کی مدد سے مجھے ستون سے باندھنے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ دونوں پنڈت اپنی کارروائی سے فارغ ہوکر اپنی سابقہ جگہوں پر جا کھڑے ہوئے تو پنڈت نرائن کرشن آگے بڑھا۔ اب کی بار بھی اس کا زوردار تھپڑ میرے گال پر پڑا تھا۔

"بول ری سندری' کیوں چپ سادہ رکھی ہے' بتا میزائل کا نقشہ کہاں رکھت ہے۔ نہیں تو ہم تو ہارے کپڑے اتار دیویں گے۔" وہ بولا اور اس کے وہ فوراً اس نے میری قمیض کا اگلا حصہ دونوں ہاتھ سے پکڑ کر نیچے تک چیرتا چلا گیا۔ بے بسی کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ میری نگاہیں کمرے میں دور کھڑی داسی سے ٹکرائیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں

اپنے لیے ہمدردی کے تاثرات اور عجیب سی چمک نظر آئی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتی۔ بے بسی کا تاثر مجھ پر صرف ایک لمحے طاری رہا مگر دوسرے ہی لمحے میں پھر سے پرعزم تھی۔ میں جان چکی تھی کہ اول تو پنڈت میری لاعلمی پر قطعی یقین نہیں کرے گا کیونکہ ان لوگوں نے کسی ٹھوس بنیاد پر ہی مجھے اغواء کیا ہے اور اس میں کس طرح ان لوگوں کو اپنی لاعلمی کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی تو پھر بھی یہ مجھے مار کر کہیں پھینک دیں گے۔ لہٰذا فی الحال میری خاموشی ہی میری زندگی کی ضمانت تھی۔

میری بدستور خاموشی پر پنڈت آگ بگولا ہوگیا اور طیش میں آکر آگے بڑھا۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی اور وار کرتا' دور کھڑی ہوئی داسی چند قدم آگے بڑھی اور پنڈت کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو نرائن کرشن' اس سندری کو کچھ مت کہو۔'' داسی کی آواز سن کر پنڈت کے قدم مشینی انداز میں رک گئے۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ داسی کسی بڑی حیثیت کی حامل ہے اور جب پنڈت بولا تو اس کے لہجے میں احترام تھا۔

''مگر سروج دیوی' یہ لاتوں کی بھوت ہے' باتوں سے نا ہی مانت ہے۔'' نرائن نے کسی قدر ادب سے کہا۔

''نہیں' اسے کھول کر میرے کمرے میں بھیج دو۔'' داسی نے حکمیہ انداز اختیار کیا اور انتظار کیے بغیر نکاسی کے راستے کی طرف چل دی۔

پنڈت نرائن نے بل دیو کو مجھے کھولنے کا حکم دیا اور خود بھی ہال سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے سروج دیوی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ کمرہ نسبتاً صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ سروج نے مجھے فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر بٹھایا اور مجھے اوڑھنے کے لیے چادر دی جس سے میں نے اپنے جسم کے عریاں حصوں کو ڈھانپ لیا۔ اس دوران پنڈت کا چیلا سروج کے اشارے پر جا چکا تھا۔

سروج نے ایک پیالے میں پانی بھرا اور کپڑا گیلا کر کے میرے چہرے سے خون کے دھبوں کو صاف کرنے لگی۔ صفائی کے بعد اس نے میرے زخموں پر کوئی دوا لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا پیالہ تھا جو اس نے مجھے دے دیا۔ اس دوران ہمارے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ جوں ہی میں نے دودھ ختم کیا' دیوی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں سے پیالہ لے لیا اور جھک کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں چونک اٹھی۔ اب کی بار میں نے غور سے دیوی کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی چمکدار اور پرکشش تھیں۔

''گھبراؤ مت' مجھے تم اپنی دوست سمجھو میرا نام سروج کپور ہے اور میں کالی مائی داس انٹرنیشنل کی ادنیٰ سی کارکن ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور میرے ہونٹوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ پنڈت کے تشدد کے باعث بننے والے نقش و نگار کے سبب میری مسکراہٹ بھی ڈراؤنی ہوگئی ہو۔

ہم خاصی دیر باتیں کرتے رہے۔ سروج میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا۔

کالی مائی داس انٹرنیشنل کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں اس تنظیم کے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔

اس تنظیم کی شاخیں دنیا کے کئی ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ کالی مائی داس انٹرنیشنل میں سینکڑوں پنڈت شامل تھے بلکہ اگر اسے پنڈتوں کی تنظیم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کبھی کبھی علاقائی غنڈوں کو بھی کرائے پر حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا اصل دھندا منشیات کی فروخت اور مندروں پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ اپنے پسندیدہ مندروں پر اپنے کارکنوں کو تعینات کرتے ہیں جو ان مندروں کو اڈوں کے طور پر استعمال کرتے ہوئے

منشیات کی فروخت کا کام کرتے ہیں۔ مگر میرے ساتھ صورت حال دوسری تھی۔ میرا منشیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ میں ایک انٹرنیشنل لیول کی تنظیم کی اہم رکن تھی اور ہم بھی کوئی قانونی کام نہیں کرتے تھے مگر کالی مائی داس انٹرنیشنل اور ہماری تنظیم علیحدہ علیحدہ تھیں اور ان لوگوں سے ہمارا آج تک ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ مگر پنڈت نرائن کرشن مجھ سے کسی میزائل کے نقشے کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا تو یہی مقصد ہوا کہ یہ لوگ ملکی معاملات میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ مگر میری بدنصیبی کہ میں کسی میزائل کے نقشے سے قطعی بے خبر تھی۔

باتوں کے دوران سروج نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور ہم چٹائی پر ہی دراز ہوگئے تھے۔ بلاشبہ سروج حسین اور تجربہ کار تھی۔ یہ اس کا تجربہ ہی تھا کہ میں بھول گئی کہ اس وقت میں خطرناک پنڈتوں کی قیدی ہوں جنہیں ذرا بھی احساس ہوجاتا کہ میں ان کے لیے بے مصرف ہوں تو وہ میری جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ سروج کپور کے ہاتھوں میں تجربے کا جادو تھا تو میں بھی ان راہوں کی پرانی کھلاڑی تھی۔

آسودگی کے بعد مجھے نیند نے آلیا گو کہ ابھی دن کا وقت تھا اور میں رات کو بھی نیند کی دوا کے باعث خاصی طویل نیند لے چکی تھی مگر میری بے وقت کی نیند میں میرے موجودہ حالات کا بڑا عمل دخل تھا جن کے باعث میں ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات اور پنڈت کے وحشیانہ بلکہ ہتک آمیز تشدد کے باعث میں بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ایسے میں سروج جیسی ساتھی کا ملنا نعمت سے کم نہیں تھا۔

پنڈت نرائن کرشن کا بھیانک وجود نیند کے دوران بھی مجھے بے چین کرتا رہا۔ خواب میں' میں نے دیکھا کہ کوئی دیو مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور میں اس سے بچنے کے لیے جنگل بیابان میں ادھر ادھر دوڑتی پھر رہی ہوں مگر وہ کم بخت ہر بار مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور مجھ پر بے تحاشہ تشدد کرتا ہے۔

اس بھیانک خواب نے میرے ذہن پر اس قدر اثر کیا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جوں ہی میں نیند سے بیدار ہوئی تو مجھے معلوم ہوا' یہ خواب نہیں بلکہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی اور میں بروقت بیدار ہوگئی تھی۔ دراصل سروج کپور میری نیند سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ہپناٹزم کا عمل کر رہی تھی اگر میں کچھ دیر بیدار رہتی تو وہ مجھے ٹرانس میں لینے میں کامیاب ہوجاتی اور میں خود اپنی زبان سے اپنا کچا چٹھا بیان کر دیتی۔ میری عین وقت پر بیداری نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا جس پر وہ سخت مشتعل ہوگئی تھی۔

اس نے شدید اشتعال کے عالم میں میرے چہرے پر تابڑ توڑ تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اس سے قبل کہ میں سنبھلتی یا اس کا ہاتھ روکنے میں کامیاب ہوتی' اس کا ایک زوردار گھونسا میری گدی پر پڑا اور میری آنکھوں کے گرد جگنو چمکنے لگے او میرا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں دوبتا چلا گیا۔

نہ جانے بے ہوشی کا عرصہ کتنی دیر جاری رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو سروج کے کمرے میں ہی چٹائی پر دراز پایا اس وقت کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں آنکھیں کھولے چھت کو تکتی رہی۔ مجھ پر نقاہت طاری تھی اور ذہن مفلوج ہو چکا تھا۔ سروج کے تشدد کے باعث میرے چہرے پر کئی جگہ نیل پڑ گئے ہوں گے جو کہ فی الحال مجھے نظر نہیں آرہے تھے اور اس کمرے میں آئینہ نام کی کسی چیز کا وجود نہیں تھا جس سے میں اپنے چہرے کا معائنہ کر سکتی۔ بہرحال فی الحال مسئلہ چہرے کے بگڑنے کا نہیں بلکہ آزادی کا تھا' مجھے ہر حالت میں ان خونخوار پنڈتوں سے اپنی جان چھڑا کر آزادی حاصل کرنی تھی یا کم از کم کسی طرح ایک فون کر کے اپنی تنظیم کے گجرات کے بیورو آفس کو اطلاع کرنی تھی تاکہ کوئی میری مدد کو آسکے ورنہ دوسری صورت میں ان پنڈتوں

سے جاں بخشی کی کوئی صورت نہیں آ رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک موٹا تازہ پنڈت کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر بغیر کچھ کہے الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نرائن کرشن اور سروج کپور اسی پنڈت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ اب کی بار وہ پنڈت خالی ہاتھ نہیں تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں کھانے کا تھال تھا جو اس نے سروج کے اشارے پر میرے قریب رکھ دیا۔

میں کل رات سے بھوکی تھی اور اب شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے لہٰذا بھوک کا لگنا فطری امر تھا۔ میں نے کسی کی پرواہ کیے بغیر کھانے کے تھال سے کپڑا ہٹایا اور بلا تکلف کھانے میں لگ گئی۔

سروج کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"دیوی جی! ہم تمہارے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم کس آرگنائزیشن کے لیے اور کس عہدے پر کام کر رہی ہو اور تمہاری سماجی حیثیت کیا ہے۔" کچھ توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر اس سے قطع نظر ہمارے انٹیلی جنس بیورو کی اطلاع کے مطابق بھارتی ادارے ریسرچ آف سائنس و ٹیکنالوجی برائے آرمز سے دھنیش میزائل کا نقشہ چوری کیا گیا ہے۔ اس نقشے کو محفوظ ہاتھوں میں پہنچانے کا ٹاسک تمہاری آرگنائزیشن کو دیا گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق نقشہ کا بلیو پرنٹ تمہاری تحویل میں ہے اور ہمیں وہ بلیو پرنٹ چاہیے۔"

سروج نے خاموش ہو کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں بدستور کھانے میں مصروف رہی مگر میرا ذہن تیزی سے سروج کے بیان کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے اس موقع پر مذاکرات کرنا چاہئیں۔ مکمل خاموشی بھی میرے حق میں مناسب نہیں ہو سکتی۔

"سنو دیوی سروج کپور صاحبہ! پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ ہندوستان کے ریسرچ آف سائنس و ٹیکنالوجی برائے آرمز سے دھنیش میزائل کا نقشہ چوری کرنے والے کون لوگ تھے۔"

"تمہارا یہ سوال بالکل فضول ہے کیونکہ اب اس کا وقت گزر چکا ہے مگر اب جبکہ تم نے زبان کھول ہی لی ہے تو میں تمہیں جواب ضرور دوں گی۔ دھنیش میزائل کا نقشہ دو انگریز فری لانسروں نے چوری کیا ہے اور اسے ملک سے باہر پہنچانے کا ٹاسک تمہاری تنظیم کو سونپا گیا ہے۔ یہ کام تمہاری آرگنائزیشن کو سونپنے کی بھی وجہ ہے، وہ یہ کہ نقشے کی چوری کا بھارت کی خفیہ تنظیم 'را' کو علم ہو گیا ہے اور انہوں نے ایک فری لانسر ڈیوڈ کو ایئرپورٹ سے گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر ڈیوڈ نے را کے دو ایجنٹوں کو ہلاک کر کے فرار ہونے کی کوشش کی اور خود بھی مارا گیا۔" سروج نے میرے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

"اور اس کے دوسرے ساتھی کا کیا بنا اور میزائل کا نقشہ کہاں گیا۔"

"اس کا دوسرا ساتھی جیرالڈ، ڈیوڈ کی ہلاکت سے چند گھنٹے قبل ہی ملک چھوڑ چکا تھا۔ دراصل را کے کسی کارکن سے اس کے روابط تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ را کا وہ کارکن بھی اس کام میں ڈیوڈ اور جیرالڈ کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے را کی سرگرمیوں کی اطلاع بروقت اسے پہنچا دی اور وہ اپنے ساتھی کو اندھیرے میں رکھ کر ملک سے فرار ہو گیا۔ فرار ہونے والے انگریز کا تمہارے اس راموجی سے بھی دوستانہ تھا۔ اس نے ان سے بات کی اور فلم کو کسی مخصوص مقام پر پہنچانے کا وعدہ لیا۔ دونوں کے درمیان ایک معقول رقم پر معاملہ طے ہو گیا۔"

سروج نے تفصیل سے میرے سوال کا جواب دیا، اس کے خاموش ہوتے ہی میں بول پڑی۔

"جب تمہاری انٹیلی جنس بیورو اتنی مستعد ہے اور اتنی تفصیلات حاصل کر سکتی ہے تو وہ اب بے بس کیوں ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہ تمام تفصیلات صرف انٹیلی جنس بیورو نے فراہم نہیں کیں بلکہ مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں دوسری بات یہ کہ ہماری انٹیلی جنس

تنظیم بے بس نہیں بلکہ محتاط ہو گئی ہے کیونکہ را بڑی شد و مد سے نقشے کو تلاش کر رہی ہے اور ہم کسی بھی طرح را سے ٹکرانا نہیں چاہتے۔"

میں خاموشی سے سوچتی ہوئی نگاہوں سے سروج کو دیکھتی رہی۔ اس دوران پنڈت بالکل خاموش رہا۔ مذاکرات کی تمام ذمہ داری سروج نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھی تھی۔

"آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔" بالآخر میں نے وہ نازک سوال کر ہی دیا جس پر میری زندگی کا دار و مدار تھا۔

"صرف اور صرف دھنیش میزائل کا بلیو پرنٹ نقشہ۔" سروج کپور نے حتمی لہجے میں کہا اور خاموش ہو گئی۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے لاعلم ہوں تو۔" میں مکمل طور پر ان کا آئندہ کا پروگرام سامنے لانا چاہ رہی تھی۔

"ناممکن!" سروج نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ یقیناً اس کے پاس پکی رپورٹ تھی، تبھی وہ اتنی پریقین تھی۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔ "آرگنائزیشن کے ممبئی کے باس راموجی ممبئی سے باہر نہیں گئے تھے اور ان کے بعد دوسری اہم شخصیت تم ہو۔ واقعات اور شہادتوں کو ملانے سے ہمیں یقین ہوا ہے کہ بلیو نقشے کو طے شدہ مقام پر پہنچانے کی ذمہ داری تمہیں ہی سونپی گئی ہے۔"

سروج کے دلائل ٹھوس تھے مگر میری بدقسمتی کہ مجھے اس بارے میں قطعی کچھ خبر نہیں تھی۔

اس معاملے کے بہت سے پہلو ابھی تشنہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی یہ کہ مجھے ایک ایسے معاملے میں ملوث کیا جا رہا تھا جس کے متعلق میرے بھگوان کو بھی علم نہیں تھا۔ میرا ذہن کمپیوٹر کی رفتار سے بھی زیادہ تیز کام کر رہا تھا۔ دراصل ان کے یقین میں بھی میرے تحفظ کا پہلو شامل تھا۔ اگر ان کا یقین اتنا پختہ نہ ہوتا تو وہ مجھے پالنے کی ہرگز ضرورت محسوس نہیں کرتے اور پہلی فرصت میں میرا کام تمام کر دیا جاتا۔

اب مجھے ان کے اس یقین سے ہی فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے آخری سوال کیا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس بلیو پرنٹ نقشے کو کہاں پہنچانا تھا۔"

"دیکھو پوجا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہماری آرگنائزیشن کے لیے کسی کو مار کر کچرے کے ڈھیر پر پھینک دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے لہٰذا مجھ سے زیادہ اڑنے کی کوشش مت کرو بس صرف اتنا یاد رکھو کہ ہم تمہیں مارنے سے قبل نقشہ کے حصول کے لیے تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ ادھیڑ ڈالیں گے۔ تمہاری موت اتنی آسان نہیں ہو گی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ نقشہ کس محفوظ مقام پر پہنچانا ہے۔ یہ تم سے بہتر کوئی اور نہیں جان سکتا۔" سروج نے غضبناک لہجے میں جواب دیا۔ وہ میرے پے در پے سوالات سے مشتعل ہو گئی تھی۔

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ مہلت چاہیے۔"

"دیوی جی، اس کتیا کو میرے حوالے کر دو، آدھے گھنٹے میں یہ فرفر بولنے لگی تھی۔" میری بات پر پنڈت نے مشتعل ہو کر کہا مگر سروج نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تمہیں کتنا وقت چاہیے۔"

"کم از کم چوبیس گھنٹے کل اسی وقت میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔" میں نے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں چوبیس گھنٹے بہت ہیں۔ کل دوپہر تک تمہیں سوچنے کی آزادی ہے۔ کل ہمارے باس پنڈت پریا کپور احمد آباد آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن مجھے پہننے کے لیے کم از کم دوسرا لباس دو اور بیرونی رابطے کے لیے موبائل فون بھی چاہیے۔"

"قطعی نہیں! اب زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں دوسرا لباس مل جائے گا مگر موبائل فون

فراہم نہیں کیا جاسکتا۔" سروج نے چڑ کر کہا۔ مذاکرات کی طوالت کے باعث وہ کچھ زچ ہوگئی تھی۔ بہرحال پھر بھی اس نے تحمل سے میرے تمام ہی سوالات کے جواب دے دیئے تھے۔

اپنی بات ختم کرکے اس نے پنڈت نرائن کرشن کو میرے متعلق کچھ ہدایت دیں اور چلی گئی۔

☆☆

گھڑی نہ ہونے کی باعث صحیح وقت کا پتا نہیں چل رہا تھا مگر میرا اندازہ تھا' کہ رات کے تقریباً بارہ بجے سے زیادہ کا وقت ہوگا۔ مجھے جس کمرے میں قید کیا گیا تھا۔ وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں آمدورفت کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا اور ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ کھڑکی کے بالکل سامنے اسٹول پر اوپری لباس سے محروم صرف دھوتی پہنے ایک چیلا بیٹھا تھا جو میری نگرانی پر مامور تھا۔

کمرے کے ایک حصے میں دری بچھا کر اسے آرام دہ حالت میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس پر میں اب تک آرام کرتی رہی تھی۔ دراصل مجھے رات گہری ہونے کا انتظار تھا۔ سروج کے جانے کے بعد مجھے پنڈت نے ایک صاف ستھرا لباس فراہم کردیا تھا جو اس وقت میرے جسم پر موجود تھا۔

میں کھڑکی کے نزدیک کھڑی ہوگئی اور بے مقصد کھٹ پٹ کرنے لگی۔ مقصد پہرے دار چیلے کو اپنی جانب متوجہ کرنا تھا۔ میری کھٹ پھٹ سے اونگھتے ہوئے چیلے نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا اور مجھے موجود پاکر اٹھ کر قریب آگیا۔ "تم کیا کررہی ہو۔ جاؤ جاکر اطمینان سے سوجاؤ۔" چیلے نے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی' اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "انگڑائی کے باعث میرے جسم کے نشیب و فراز کچھ اور نمایاں ہوگئے جس سے چیلے کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اب کی بار وہ بولا تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ "نیند نہیں آرہی تو میں کیا کروں' کیا ساری رات تم سے باتیں کروں۔"

"تو اس میں حرج کیا ہے۔ میرے جیسی خوبصورت لڑکی سے بات کرنے کا موقع تمہیں روز روز تھوڑی ملے گا۔"

میں نے نشیلے لہجے میں کہا اور اس کا سلاخ پر رکھا ہاتھ چوم لیا۔ میری بے باکانہ حرکت سے اس کی عقل کھٹکوں سے بھی کئی فٹ نیچے چلی گئی اور اس کی آنکھوں میں ہوس کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا جو میری کامیابی کی دلیل تھا۔ مزید چند منٹ کی عاشقانہ گفتگو کے بعد وہ مکمل طور پر میری گرفت میں آگیا اور کمرے میں آنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگا۔ کمرے کا دروازہ بند ضرور تھا مگر باہر سے تالا نہیں تھا' صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ سروج کو اپنے ماتحتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے تالا لگوانے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

میری آمادگی پر اس نے اردگرد کا ایک چکر لگا کر جائزہ لیا۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا اور کسی کی مداخلت کا امکان بھی نہیں تھا۔ وہاں سے مطمئن ہوکر اس نے نہایت آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگادی اور وحشیوں کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میرا ہاتھ اس کی پشت سے ہوتا ہوا گدی پر آیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گدی میرے مارشل آرٹ کے ماہر ہاتھ کی آہنی گرفت میں تھی پھر اس سے قبل کہ اس کے منہ سے آواز برآمد ہو' میرے دوسرے ہاتھ کا بھرپور گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا اور ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔ میں نے اسے گرنے نہیں دیا بلکہ پوری احتیاط سے زمین پر لٹادیا۔ میں ان کمبخت پنڈتوں اور ان کے چیلوں کو معاف کرنے کے بالکل موڈ میں نہیں تھی اور چن چن کر بدلہ لینے کا ارادہ رکھتی تھی لہٰذا میں نے اسے زمین پر لٹا کر اس کی گردن مخصوص انداز میں پکڑے اور زور دار جھٹکا دیا۔ کڑاکے کی آواز سے اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا اور

اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی اور اس کی روح کو آزادی مل گئی۔ چیلے کو اس کے انجام تک پہنچا کر میں نے نہایت احتیاط سے دروازے کی کنڈی گرائی اور باہر آگئی۔

باہر آکر اس نے چند لمحے آس پاس کی سن گن لی اور محتاط قدموں سے راہداری کی طرف بڑھ گئی۔ راہداری عبور کرکے میں جوں ہی نیچے اترنے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھی' دیوار کے ساتھ اسٹول پر بیٹھا ہوا ایک پہرے دار اونگھتے ہوئے چونک پڑا۔ مگر میں اونگھتی ہوئی یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا لہٰذا میں پوری طرح مستعد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پہرے دار کے سنبھلنے سے قبل ہی اس کا منہ میں نے اپنے مضبوط پنجے کی گرفت میں لیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن کی ہڈی مارشل آرٹ کے مخصوص داؤ کے طویل ٹوٹ کر گردن ڈھلک چکی تھی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور تیزی سے نیچے اترتی چلی گئی۔ اس مرتبہ میں نے ایک کام یہ کیا کہ مرنے والے چیلے کا ماؤزر اپنے قبضے میں کرلیا۔ ان حالات میں یہ چھوٹا سا ہتھیار بھی بڑی نعمت تھا۔

سامنے ہی چند گز کے فاصلے پر صدر دروازہ تھا مگر یہاں سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا' لہٰذا میں نے دائیں جانب کی دیوار کا رخ کیا جو نسبتاً زیادہ اونچی نہیں تھی۔ مجھے دیوار تک پہنچنے اور زقند بھر کر اسے عبور کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر جوں ہی میرے پاؤں زمین پر ٹکے' نہ جانے کہاں سے وہ کمبخت پنڈت بل دیو نمودار ہوا۔

"خبردار!" وہ مجھ پر پستول تانتے ہوئے چیخا۔ میں نے فوراً ہی ہاتھ سر سے بلند کردیئے' مبادا پنڈت کو گولی ہی چلادے۔ اس وقت گولی کی آواز میرے لیے ایٹم بم سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ قرب و جوار میں درجنوں کی تعداد میں مسلح پہرے دار موجود ہوں گے۔ انہیں کسی طرح میرے فرار کا علم ہوگیا تو میرے لیے بڑی دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

"اری سندری!! یہ تو ہے' تو باہر کیسے نکل آئی۔" بل دیو شدید حیرانی سے میری طرف آتا ہوا بولا اور یہیں سے اس کی سنجیدگی کے لمحات شروع ہوگئے۔ حیرانی میں وہ میرے کچھ زیادہ ہی قریب آگیا تھا۔

میں نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پکڑی اور اپنا دائیاں گھٹنا پوری قوت سے اس کی ناف پر مارا' ضبط کے باوجود اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے اسی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس کی کلائی پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرتے ہوئے ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کی کلائی کا جوڑ کھول دیا۔ پستول پنڈت کے ساتھ ہے چھوٹ کر اندھیرے میں کہیں دور جا گرا۔ اس سے قبل کہ وہ چیختا میرے ہاتھ اس کی گردن پر پہنچ گئے اور میں دونوں ہاتھوں کی مدد سے پوری قوت صرف کرتے ہوئے اس کا گلا دبانے لگی۔ پنڈت نے بڑے ہاتھ پیر مارے مگر یہاں بازی میں یا پنڈت' پر آکر ٹھہری تھی اور ظاہر ہے' فی الحال میرا جان دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا میں جان لینے پر کمربستہ تھی۔

چھ سات منٹ کے بعد ہی نہ صرف پنڈت کی مزاحمت دم توڑ گئی بلکہ اس کے ہاتھ پیر بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ میں مزید پانچ منٹ اور اس کا گلا دباتی رہی۔ جب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ اب پنڈت کبھی نہیں اٹھے گا تو میں نے اسے چھوڑ دیا لیکن اس بار بھی میں نے یہ احتیاط ضرور کی کہ اس کے بے جان لاشے کے گرنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ اسے احتیاط سے زمین پر لٹا کر میں نے تیزی سے ایک سمت دوڑ لگا دی کیونکہ اس طرح بہت دور روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ممکن ہے' وہ کوئی سڑک ہو اور مجھے لفٹ مل سکے۔

میں دوڑتی رہی۔ زمین پر پڑے ہوئے چھوٹے بڑے پتھروں نے میرے ننگے پاؤں کو زخمی کردیا تھا مگر مجھے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں اپنے فرار کا عقدہ کھلنے سے قبل ان منحوس پنڈتوں کی پہنچ سے

دور نکل جانا چاہتی تھی اندازاً دو میل دوڑ کر طے کرنے کے بعد میں اس روشنی کے قریب پہنچ گئی جو سڑک کے کنارے لگے کھمبے کی روشنی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سڑک تھی' کھمبے کے ساتھ ہی کسی فیکٹری کا اشتہاری بورڈ لگا ہوا تھا جس پر علاقہ کا نام بھی درج تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ میں قصبہ ودودھرا کے قریب ہوں اور ودودھرا یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ صوبہ گجرات میرا دیکھا بھالا صوبہ تھا۔ مگر جس سچویشن سے دوچار ہو کر میں یہاں آئی اور واپس جا رہی ہوں' اس میں کوئی بھی مخلص علاقے کی نشاندہی سے پریشان ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کسی سواری کا انتظام ہو جائے تو میں یہاں سے ودودھرا تک باآسانی جا سکتی تھی۔

میں نے سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کیں اور کاغذ کے ٹکڑوں سے اپنے پاؤں کے زخم صاف کرنے لگی۔

آدھے گھنٹے بعد سے ہیڈ لائٹ کی روشنی مجھے اپنی سمت آتی دکھائی دی اور میں سڑک کے درمیان میں کھڑی ہو گئی۔

وہ کوئی موٹر سائیکل تھی۔ موٹر سائیکل میرے نزدیک آ کر رک گئی اور پر ایک لحیم شحیم پولیس والا بیٹھا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ میرا زوردار مکا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ یقیناً اسے چند تارے بلکہ کہکشاں تک نظر آ گئی ہوں گی۔ اس کے لہراتے ہی گاڑی ایک ہچکی لے کر بند ہو گئی اور وہ اپنی گاڑی سمیت زمین پر گر پڑا۔ میں نے گھسیٹ کر اسے سڑک سے خاصی دور لے جا کر لٹا دیا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ فوری طور پر یہ پولیس والا کسی کی نظروں میں آئے اور اس کی موٹر سائیکل اور میری تلاش شروع ہو جائے۔

کچھ ہی دیر بعد موٹر سائیکل سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ رات کا وقت ہونے کے باعث مجھے موٹر سائیکل کی سواری زیادہ معیوب نظر نہیں آئی' ہاں البتہ دن کے اوقات میں' میں لوگوں کی توجہ کا مرکز ضرور بن جاتی۔

عمارت بالکل خالی تھی۔ یہاں داخلے کے لیے میں نے دیوار کا راستہ اپنایا تھا اور بال پن کی مدد سے دروازہ کھول کر میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ عمارت کا مین گیٹ بند تھا اور وہاں چوکیدار پہرے پر موجود تھا۔ یہ کوئی سرکاری عمارت تھی۔ دن کے اوقات کار میں یہاں چہل پہل رہتی ہو گی مگر فی الحال ویرانی کا راج تھا جو میرے لیے اس وقت نعمت سے کم نہیں تھا۔

میں نے سب سے پہلے گیلے کپڑے سے اپنے تلوؤں کے زخم صاف کیے جن پر خون خشک ہو کر جم گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر فون کی تلاش شروع کر دی جو مجھے ایک نسبتاً بڑے اور صاف ستھرے کمرے میں بہ آسانی مل گیا مگر یہاں بھی مجھے اپنی قفل شکنی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

میں نے فوراً ہی گجرات کے بیورو آفس کے نمبر ملائے۔ دوسری طرف گھنٹیاں بجتی رہیں' آٹھویں گھنٹی پر میں مایوس ہو کر فون رکھنے والی تھی کہ ریسور اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو کون۔'' ریسور میں کھردری مردانہ آواز سنائی دی۔

''رمشا لو فور' کلکتہ۔ مجھے مدد چاہیے۔'' میں نے اپنا تنظیمی کوڈ بتایا اور مختصر ترین الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔ میری بات سن کر دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر کہا گیا۔ ''آپ اس فون نمبر پر رابطہ کریں۔'' اس نے نمبر بتایا جو میں نے ذہن نشین کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے لائن بے جان کر دی گئی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ تنظیم کے بیورو آفس میں بیٹھے ہوئے شخص نے مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا فون کرنا اسے ناگوار گزرا ہو۔ اس نے میری پرابلم بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔

بہرحال زیادہ سوچ بچار کے بجائے میں نے اس کا بتایا ہوا نمبر ڈائل کیا' اس بار تیسری گھنٹی پر ریسور اٹھا لیا گیا۔

''کون۔'' ریسیور میں مردانہ آواز ابھری۔

''رمشا لو فور کلکتہ۔'' میں نے کوڈ دہرایا۔ میرا کوڈ سنتے ہی دوسری جانب سے بے تابی سے پوچھا گیا۔

''تم کہاں ہو۔'' میں نے اس جگہ کا نام بتایا تو وہ بولا۔ ''تم فوراً کسی بھی طرح احمد آباد پہنچو اور یہ ایڈریس ذہن نشین کرو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پتہ بتایا جو میں نے یاد کر لیا پھر وہ مزید بولا۔

''تم اب کسی بھی تنظیمی کارکن سے رابطہ نہیں کرو گی۔ راموجی سمیت تمام صوبوں کی بڑی قیادت زیر زمین جا چکی ہے۔ 'را' نے ہمارے خلاف بڑا آپریشن شروع کر دیا ہے۔ ہم بھی صرف تمہاری وجہ سے یہاں بیٹھے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ تمہیں اغوا کر کے احمد آباد کے قریب لایا گیا ہے لیکن ہم تمہاری مدد کرنے سے قاصر تھے اور یہ صورت حال اب بھی قائم ہے۔ تمام ساتھی اور قیادت بکھر چکی ہے۔ تمہیں اس مکان کے دروازے پر لگے لیٹر باکس میں سے ایک لفافہ نکالنا ہو گا جو تمہارے لیے ہے' اس میں تمہارے لیے کوڈ ورڈز میں ہدایات تحریر ہیں۔ اس فون کے بعد میں تمہیں یہاں نہیں ملوں گا لہٰذا میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سمیت کسی سے ملنے کی کوشش مت کرنا' صرف اپنی جان بچانا کیونکہ تمہاری زندگی اس وقت سب سے قیمتی ہے۔'' وہ یقیناً گجرات کے بیورو آفس میں کسی بڑی حیثیت کا حامل ہو گا' جب ہی اسے خاصی معلومات تھیں مگر میں اب تک اندھیرے میں تھی اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''آخر مجھے کس مشن پر کام کرنا ہے اور یہ سب کیا ہو رہا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''سنو دیوی! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ تمہارا زندہ رہنا اور زندہ سلامت بھارت سے نکل کر لندن پہنچنا پوری تنظیم کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔''

''مگر سر!'' میں نے کہنا چاہا مگر دوسری طرف سے میری بات کاٹ دی گئی اور کہا گیا۔

''او۔ کے سو فار۔'' اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

اس گفتگو نے مجھے مزید الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایک طرف پنڈت مجھ سے میزائل کے نقشے کا مطالبہ کر رہے تھے' دوسری جانب تنظیم کی قیادت زیر زمین جا چکی تھی۔ تیسری بیورو آفس کی اطلاع کے مطابق 'را' میدان میں کود پڑی تھی اور مجھے ان سے بچنا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ مجھے سختی سے کسی تنظیمی ساتھی سے ملنے یا مدد حاصل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ آخر ان سب کی توجہ کا مرکز میں ہی کیوں بنی ہوں جبکہ میں خود مشکلات کا شکار رہی ہوں بہرحال حالات جو بھی ہوں' مجھے ان سے لڑ کر ہی زندہ رہنا تھا۔ میرا تو کام ہی یہ تھا۔

میں نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم سے اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا اور کچھ دیر آرام کی غرض سے کمرے میں موجود بڑی سی میز پر لیٹ گئی۔

☆☆

احمد آباد میں اپنا مطلوبہ مکان تلاش کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے لیٹر باکس سے بڑے سائز کا خالی لفافہ اور ایک پیرا شوٹ' کپڑے کا بنا ہوا تھیلا برآمد ہوا۔ یہ تھیلا ایسا تھا کہ اسے ڈوری کی مدد سے کٹ کی شکل میں کمر سے باندھا جاتا ہے۔ میں نے فوراً ہی تھلے کو کمر سے باندھ کر اپنا بوجھ کچھ کم کیا اور ایک سنسان گلی میں پہنچ کر لفافہ پھاڑ ڈالا۔ لفافے میں خاصی تعداد میں کرنسی نوٹ اور فضائی سفر کا ٹکٹ تھا جس کے مطابق مجھے آج سے تیسرے دن دلی سے بذریعہ ہوائی جہاز لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔

لفافے میں موجود خط میں مجھے خاص ہدایت کی گئی تھی کہ میں فوراً سے پیشتر احمد آباد چھوڑ کر دلی

پہنچوں اور وہاں سے مقررہ تاریخ پر اپنا سفر کروں۔ اس کے ساتھ میرے دیگر کاغذات بھی تھے' یہ مکمل کاغذات تھے مگر یہ کاغذ پر میری تصویر کی جگہ کسی دوسری لڑکی کی تصویر چسپاں کی گئی تھی۔ اس کے متعلق مجھے خط میں وضاحت کی گئی تھی کہ میرا اپنی موجود شکل میں سفر کرنا انتہائی خطرناک ہے لہٰذا میک اپ کر کے مجھے خود کو کاغذات میں موجود تصویر کی شکل میں ڈھالنا تھا۔ کاغذات کے علاوہ بھی اس لڑکی کے مختلف زاویے سے اتارے گئے مزید چھ فوٹو گراف لفافے میں موجود تھے جن سے مجھے مدد مل گئی تھی۔ میک اپ کا مکمل سامان تھیلے میں موجود تھا۔

اب مجھے کسی محفوظ مقام کی تلاش تھی جہاں میں اطمینان سے بیٹھ کر میک اپ کر سکوں۔ اس مقصد کے لیے میں پیدل ہی گلیوں میں تانک جھانک کرتی رہی۔ مجھے کسی ایسے مکان کی تلاش تھی جو مکینوں سے محروم ہوتا کہ میں کم از کم دو گھنٹے وہاں اطمینان سے گزار سکوں۔

پچھلی گلی میں میرے مطلب کا کوئی مکان نہیں تھا۔ یہ گلی نسبتاً کشادہ تھی اور اس کے دونوں جانب مکانوں کی قطاریں ترتیب سے بنی ہوئی تھیں۔ پیچھے سے کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں اسے جگہ دینے کی نیت سے سائیڈ میں ہو گئی۔ وہ کوئی کار تھی جو آگے جا کر رکی اور ریورس ہو کر میرے نزدیک آ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوش شکل نوجوان براجمان تھا۔

"آیئے پلیز' میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" نوجوان نے نہایت خوش خلقی سے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اگلا دروازہ کھول دیا۔

مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات نظر آئے مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ میرے لیے نوجوان کا چہرہ قطعی اجنبی تھا۔ بہرحال جو ہو گا دیکھا جائے گا' میں جھجکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"کہاں جائیں گی مادام۔" اس نے بدستور خوش اخلاقی سے پوچھا اس بار اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ میرے خیال میں وہ مجھے کوئی آوارہ لڑکی سمجھ رہا تھا لہٰذا میں نے بھی اسے مایوس کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں آپ لے جائیں۔" میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ میرے خواب پر اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گاڑی کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

دس منٹ کی مختصر ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ایک بنگلے میں داخل ہو رہی تھی جو باہر سے بند تھا۔ اس کا دروازہ نوجوان نے خود کھولا اور گاڑی اندر لے آیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نوجوان کے ساتھ اس کے بے سجائے خوبصورت بیڈروم میں تھی۔ میں نے غور سے نوجوان کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ نکلتے ہوئے قد کسرتی جسم والا خوبصورت نوجوان تھا۔ مگر اس کے بالوں کی کٹنگ اور چال ڈھال مجھے خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی مخصوص وضع قطع سے کسی سرکاری ایجنسی کا اہلکار نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے کمرے کی سجاوٹ کی تعریف کی تو نوجوان کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"محترمہ! تم یہاں کی کس کس چیز کی تعریف کرو گی۔ یہاں کی ہر چیز تمہیں حیران کر دے گی بلکہ کچھ دیر بعد تم اپنی یہاں موجودگی پر بھی حیران نظر آؤ گی۔"

اس کی ذو معنی گفتگو سے میرے ذہن میں خطرے کی سرخ لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ نے صوفے پر سنبھل کر بیٹھے ہوئے اس کی جانب دیکھا مگر اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ قائم تھی جس نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

"ریلیکس بے بی! گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔" اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا' یوں لگ تھا' جیسے وہ مجھ سے کھیل رہا ہے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو' میں بالکل نہیں سمجھی۔"

الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ جب تک صورت حال واضح نہیں ہو جاتی' میرا انجان بنے رہنا ہی مناسب تھا۔

اس نے کہا۔ "ریلیکس ہو کر بیٹھو میں سب کچھ سمجھاتا ہوں۔" اس نے مجھ سے اپنا فاصلہ کم کیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ہم دونوں بیڈروم میں بچھے ہوئے خاصے کشادہ صوفے پر براجمان تھے جس کا بیشتر حصہ خالی تھا۔

میں بدستور حیران نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ "محترمہ! آپ کو سارے ہندوستان میں تلاش کیا جا رہا ہے اور آپ احمد آباد کی گلیوں میں سیر سپاٹے میں مصروف ہیں۔"

اس کے الفاظ میرے لیے کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھے۔ اس کی باتوں سے جہاں میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوئی تھی' وہیں میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیوں کی چیخ پکار تیز ہو گئی۔ میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا اور اپنی اداکاری برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے سارے ہندوستان میں کیوں تلاش کیا جا رہا ہے۔ تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ سکا ہے۔"

"اچھا!" اس نے حیرت سے کہا۔ یقیناً اس کی حیرت مصنوعی تھی پھر صوفے سے اٹھا اور الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو۔ میں تمہاری ساری الجھن دور کرتا ہوں۔" تھوڑی دیر وہ الماری میں کچھ تلاش کرتا رہا پھر ایک لفافہ لے کر صوفے پر آ گیا۔ لفافے میں سے ایک تصویر نکال کر اس نے میری جانب بڑھائی جسے دیکھ کر میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ یہ میری ہی تصویر تھی۔ یقیناً میرے سامنے بیٹھا شخص جس نے اپنا نام وجے گپتا بتایا تھا' کا تعلق بھارت کی خفیہ تنظیم را سے تھا اور اسے میری تلاش پر مامور کیا گیا تھا۔ اب یہ اس کی لاٹری اور میری بدقسمتی تھی کہ میں خود سے خود چل کے ہوئے آم کی طرح اس کی گود میں آ گری تھی۔ وہ میرے متعلق بہت پراعتماد تھا اور میں آسانی سے اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اب میرے پاس دو ہی راستے رہ جاتے تھے یا تو میں اس کو ہلاک کر کے فرار ہو جاؤں یا پھر اسے اعتماد میں لے کر لالچ وغیرہ دے کر اپنا کام نکالوں۔ فی الحال میرے لیے دوسرا راستہ مناسب تھا۔ را کے کسی ذمہ دار کو ہلاک کرنے کے بعد میری سلامتی کے لیے شدید خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر یہ کسی لالچ میں نہیں آیا اور کسی طور پر ماننے پر آمادہ نہ ہوا تو انتہائی مجبوری کی حالت میں پہلا راستہ تو بہرحال کھلا تھا۔ میں کسی بھی وقت اس سے دوبدو مقابلہ کر سکتی تھی۔ میں نے چند لمحات میں تمام حالات کا تجزیہ کیا اور راستے کا تعین کرنے کے بعد بولی۔

"تم کون ہو اور میری یہ تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی۔"

"تم بالکل درست سمجھ رہی ہو۔ میں ادنیٰ سا سرکاری کارکن ہو۔" اس نے حیرت انگیز طور پر میرے ذہن کو پڑھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ مزید بولا۔ "را کا انٹیلی جنس ونگ پورے بھارت میں خفیہ طور پر تمہیں تلاش کر رہا ہے اور ہر شہر کے سربراہ کو تمہاری تصاویر اور دیگر تفصیلات پہنچا دی گئی ہیں۔ میرے پاس بھی تمہاری تصاویر اور دیگر معلومات پرسوں پہنچی ہیں۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ جسے بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے میری پہنچ میں آ سکے گی۔ تم تو میری ترقی کا زینہ ہو۔"

"تو کرو ترقی' رک کیوں گئے۔" میں نے اس کا ہاتھ معنی خیز انداز میں دباتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا۔

میری بے باکانہ حوصلہ افزائی اور مجھ پر اپنی برتری کے زعم میں وجے گپتا کی گستاخیاں حد سے سوا ہوتی چلی گئیں۔ میری مجبوری کہ مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ میں نے اس کے متعلق اپنے فیصلے میں کچھ ترمیم کر لی تھی۔ یہ تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ گپتا

مجھ جیسے ترقی کے زینے کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دے گا۔ میری گرفتاری سے اسے محکمے میں فرش سے عرش پر پہنچا دے گی لہٰذا اس کا کسی لالچ میں آنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ فی الحال یہی لالچ تھا اور وہ یہ خزانہ سمیٹنے میں مصروف تھا۔

وہ اپنے معاملات میں مصروف رہا اور میرا ذہن تیزی سے اپنے حالات وواقعات کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆

بھارت کے اہم ادارے ریسرچ آف سائنس وٹیکنالوجی برائے آرمز سے دھنیش میزائل کا نقشہ چوری کیا گیا جو کہ دو انگریز فری لانسروں ڈیوڈ اور جیرالڈ نے چوری کیا تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی را کو اس نقشے کی چوری کا علم ہو گیا اور ان کا انٹیلی جنس ونگ خفیہ طور پر حرکت میں آ گیا اور جلد ہی یہ پتہ لگا لیا گیا کہ یہ کام دو انگریز جرائم پیشہ افراد کا ہے اور جلد ہی ایک انگریز ڈیوڈ کو ملک سے فرار ہوتے ہوئے ایئرپورٹ سے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی نتیجتاً را کے دو اہلکار ہلاک ہو گئے اور بدلے میں رانے ڈیوڈ کی گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

دوسرا انگریز خاصا چالاک نکلا۔ وہ خطرے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا لہٰذا اس نے نقشے کی حفاظت کی اور اسے محفوظ مقام تک پہنچانے کے سلسلے میں ہماری آرگنائزیشن کے باس راموجی سے رابطہ کیا جو اس کے دیرینہ شناسا تھے اور معقول معاوضے کے عوض نقشے کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کی ذمہ داری سونپ دی اور خود خفیہ طور پر ملک سے باہر نکل گیا یا بھارت میں ہی کہیں روپوش ہو گیا۔

باس نے اس نقشے کا کیا کیا، مجھے کچھ خبر نہیں۔ مگر اس نقشے کی واپسی کے لیے را کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ان کے ساتھ ہی پنڈتوں کی بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیم کالی مائی داس انٹرنیشنل بھی نقشے کے حصول کے لیے میدان میں کود پڑی۔ را اس ضمن میں سرکاری میڈیا استعمال کرتے ہوئے میری اور تنظیم کے دیگر افراد کی تلاش کر سکتی تھی جو اس لیے نسبتاً آسان ہوتا مگر اس میں حکومت اور حکو مشنری کی بدنامی تھی اور حکومت مخالف پارٹیاں ا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جتا کو سڑکوں پر آتیں، اس طرح یہ بڑا اسکینڈل بن جاتا اور حکو کے لیے پریشانیوں کے کئی دروازے کھل جا لہٰذا را نے نقشے کے حصول کے لیے خفیہ طور پر کوشش جاری رکھی۔

ان لوگوں کو مجھ پر کیوں شک ہوا۔ یہ بات تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ بہرحال شک کی بنیاد پر پنڈتوں نے مجھے اغوا کیا اور کلکتہ احمد آباد کے مضافات میں لے آئے۔ اس دور مجھے دو روز تک مسکن دواؤں کا استعمال کروا کر سے غافل رکھا گیا۔ میں نے ان کو خاصا جانی نقصا پہنچا کر وہاں سے راہ فرار اختیار کی اور گجرات بیورو آفس سے رابطہ کیا مگر یہاں ایک نئی کہانی میر منتظر تھی۔ یہاں کے سربراہ کے مطابق ہما آرگنائزیشن کی قیادت زیر زمین جا چکی تھی جس باس راموجی بھی شامل تھے۔ کچھ نہیں کہ وہ بھارت میں ہیں یا ملک سے باہر نکل چکے ہیں بہرحال میرے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ صرف کالی مائی داس انٹرنیشنل کے پنڈتوں کو میر تلاش تھی بلکہ را کا انٹیلی جنس ونگ بھی میری تلاش سرگرداں تھا جس کی تصدیق ہو چکی تھی اور اب روپ بدل کر ملک سے باہر جانا ضروری ہو گیا ورنہ اگر میں رایا پنڈتوں کے ہتھے چڑھ گئی تو خود مجھ سے فائدہ ہوتا۔ ان کی گرفت میں آنے کے میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ میرے مائی اور را دونوں ہی خطرناک تھے کیونکہ دونوں کی حد تک شبہ تھا کہ میرا دھنیش میزائل کے نقشے کوئی تعلق ضرور ہے۔ اب میرے لیے ایک تو آسان ترین صورت یہ تھی کہ میں خود کو را کے حوالے کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں مگر اس میں قباحت تھی کہ وہ لوگ ہرگز میری بے گناہی پر یقین نہیں

کریں گے اور اگر کسی طرح وہ میری بے گناہی پر یقین کرنے کو تیار بھی ہو گئے تو اتنی آسانی سے میری جان نہیں چھوٹے گی۔ میری پرانی فائلیں کھل جائیں گی اور درجنوں ایسے کیسز سامنے آئیں گے جن سے میرا دامن بچانا ناممکن ہو گا۔

دوسری طرف تنظیم کی جانب سے سختی سے ہدایت تھی کہ میں سرکاری اہلکاروں سے اپنی حفاظت کرتے ہوئے ہر حالت میں لندن پہنچوں۔ سردست تمام تر حالات واقعات کی روشنی میں میرے لیے تنظیمی ہدایات پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں اپنے خیالوں میں اتنی منہمک تھی کہ مجھے خبر ہی نہ ہو سکی کہ وجے کب اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے برابر میں بیڈ پر بے جان لاش کی طرح پڑ گیا ہے۔

اسے آرام دہ حالت میں پا کر میں اٹھی اور بیڈ پر پلتی مار کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہولے ہولے اس کی ہتھیلی سہلانے لگی۔ وہ جاگ رہا تھا مگر بدستور پڑا رہا۔ میں ہپناٹزم کے اصولوں کے مطابق مخصوص انداز سے اسے ٹرانس میں لانے کی کوششیں کرتی رہی۔ وجے نے میرے اس عمل کو میری ادا سمجھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور آدھے گھنٹے میں ہی وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

میں نے مختلف طریقوں سے اس کے ٹرانس میں آنے کا یقین کیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ گہری تنویمی نیند میں ہے تو میں اسے ہدایات دینے لگی۔

میں نے اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ مجھ سے ملاقات اور میری احمد آباد میں موجودگی کو یکسر فراموش کر دے گا اور چار گھنٹے کی پرسکون نیند کے بعد جب بیدار ہو گا تو خود کو معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف رکھے گا۔ وہ اپنے بڑوں کی ہدایت کے باوجود میری تلاش میں کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کرے گا اور اگر کبھی میری نشاندہی ہو بھی جاتی ہے تو اسے نظر انداز کر دے گا۔ اس کو اچھی طرح ہدایت دے کر میں نے اسے چار گھنٹے سونے کے لیے چھوڑ دیا اور خود لیٹر باکس سے حاصل کردہ تھیلے سے سامان نکالنے لگی۔

دو گھنٹے کی ماہرانہ محنت کے بعد میں، میں نہیں بلکہ کاغذات کے مطابق مرتا سنگھ بن چکی تھی جسے دو روز بعد دلی ایئرپورٹ سے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے بازار جا کر اپنے لیے چار جوڑے کپڑے، جوتے اور دیگر ضروریات کا سامان خریدا جو ایک چھوٹے سے بیگ میں سما گیا۔ میں نے ضروری کاغذات اور رقم اپنے لباس میں محفوظ کی اور اپنی آمد کے تمام نقوش مٹا کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس میک اپ میں کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا پھر بھی میں نے اپنی چال میں تبدیلی کر لی تھی۔ راستے میں تمام غیر ضروری سامان کو تلف کر کے میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دی، مجھے دلی جانا تھا۔

دلی ایئرپورٹ پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ میں پورے اعتماد سے سیکورٹی کے سامنے سے گزرتی ہوئی اور دیگر مراحل طے کرتی ہوئی بہ آسانی جہاز میں بیٹھ گئی۔ اپنی شکست سنبھالتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا، گویا ہزاروں من وزن میرے سر سے اتار دیا گیا ہو اور میں ہلکی ہو گئی ہوں لیکن پھر بھی میں دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ آخری مراحل میں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ جہاز جلد سے جلد پرواز کرے اور میں بھارت کی سرحدوں سے دور نکل جاؤں۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا، جب مسافروں کو سگریٹ نوشی کی ممانعت اور بیلٹ باندھنے کی ہدایات دی گئیں اور جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد جہاز آسمان کی بیکراں وسعتوں میں عازم سفر تھا۔ سیفٹی بیلٹ سے نجات حاصل کر کے مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے اور جہاں کا عملہ اپنی خدمات میں مصروف ہو گیا تھا۔ ان میں خوبصورت یونیفارم میں ملبوس، سرسراتے آنچلوں والی شوخ و چنچل

حسینائیں خاصی نمایاں تھیں جن کی مسکراہٹ دلوں پر بجلیاں بن کر گرتی تھی ان میں گہری سیاہ آنکھوں والی اور گوری رنگت کی ایک ایئر ہوسٹس میرے دل کو بھا گئی اور میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر اسے بلانے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ اگر میں اپنی نشست پر موجود اطلاعی بٹن دباتی تو کوئی بھی میرے پاس آ سکتی تھی جو مجھے منظور نہ تھا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ وہی ایئر ہوسٹس میری قطار میں آئے تو میں اسے اشارے سے بلاؤں۔ میری دعا تیر کی طرح میری جانب آئی اور بڑی ادا سے مسکراتے ہوئے فدویانہ لہجے میں بولی۔

"یس مادام! فرمایئے۔"

"کچھ کام ہے تم سے....."

"مجھے حکم کریں' میں کوشش کروں گی۔" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ اب بھی موجود تھی۔

"کیا تم میرے ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر گفتگو کر سکتی ہو۔" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"فی الحال تو یہ ممکن نہیں لیکن کھانے پینے سے فارغ ہو کر بیشتر مسافر سو جائیں گے' اس وقت آپ اسٹاف کیبن میں آ سکتی ہیں۔" اس دفعہ اس کی آواز خاصی مدھم تھی اور وہ میرے کچھ نزدیک بھی آ گئی تھی جس سے اس کی سانسوں کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ جانے لگی تو میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا اور خود سے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"کیا وہاں ہم فرصت سے بات کر سکیں گے۔"

"کیوں نہیں۔" یہاں سے فرصت ملتے ہی تمام اسٹاف کچن میں کھانا کھانے چلا جائے گا اور اس طرح ہم آزادی سے بات کر سکیں گے۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور آگے چل دی۔ اس کی چال میں مدھم سا لوچ تھا جو اس کے سراپا میں بے انتہا کشش کا باعث تھا اور اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ میں اس کے سراپا میں کھو سی گئی۔ پھر میری ذہنی رو بدلی اور میرا ذہن بھٹک کر اپنے حالات کی طرف چل نکلا۔

آج ۱۷ اکتوبر تھی' جب کہ میری ملاقات تنظیم کے مقامی باس راموجی سے آٹھ اکتوبر کو ایک ہوٹل میں ان کی خواہش پر ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بہت جلد مجھے ایک مشن پر ملک سے باہر جانا ہوگا۔ جس کی تفصیلات اور تاریخ سے مجھے جلد آگاہ کر دیا جائے گا۔ راموجی سے اس مختصر ملاقات میں چائے کا دور بھی چلا اور میں وہاں سے آ گئی۔ اسی شام میرے سینے میں دائیں جانب مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا اور میں بے حال ہو گئی' اسی دوران باس کا فون آ گیا اور میں کوشش کے باوجود ان سے اپنی تکلیف کو چھپا نہ سکی۔ میری تکلیف کے باعث باس نے فوراً تنظیم کے ڈاکٹر اور دو کارکنوں کو میرے بنگلے میں بھیج دیا۔

ڈاکٹر نے مجھے چند دوائیں کھلائیں اور انجکشن لگایا جس سے مجھے خاصا سکون حاصل ہوا اور میں سو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں دوسری جگہ پر تھی۔ تنظیم کا ڈاکٹر اور ایک نرس میرے کمرے میں موجود تھے۔ میرے ہوش میں آنے کے کچھ دیر بعد باس راموجی بھی کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایکسرے رپورٹ کے مطابق میرے سینے میں ایک رسولی ہے اور ڈاکٹر کے مطابق اس کا آپریشن فوری طور پر ہونا ضروری تھا۔ یہ ایک معمولی سا آپریشن ہوگا اور اس میں ایک دو روز میں مکمل طور پر صحتیاب ہو جاؤں گی۔ میں نے آپریشن کے معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی مگر باس نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ میرا آپریشن کرا لینا ہی مناسب ہے کیونکہ چند روز میں مجھے ایک اہم مشن پر روانہ ہونا ہے اور اس کے لیے میرا مکمل طور پر صحت مند ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا میں رضامند ہو گئی۔ مجھے دو گھنٹے بعد آپریشن روم میں لے جایا گیا جہاں آپریشن سے قبل مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں مجھ پر کیا گزری' مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی البتہ ہوش آنے پر باس اور ڈاکٹر وغیرہ نے مجھے آپریشن کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

میں مزید دو روز یعنی دس اکتوبر اس بنگلے میں رہی' یہ تنظیم کے ڈاکٹر کا بنگلہ تھا جو خاص مواقع پر استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں مکمل طور پر صحتیاب ہو کر گھر آ گئی۔

شام کو باس نے فون پر میری خیریت دریافت کی اور بتایا کہ مجھے کل دوپہر کی فلائٹ سے لندن کے لیے روانہ ہونا ہے' اس سلسلے میں میرے کاغذات مکمل کرا لیے گئے ہیں اور میری سیٹ بھی ریزرو کرائی جا چکی ہے۔

باس نے مجھے بتایا کہ میرا اصل مشن لندن پہنچنے کے بعد شروع ہوگا۔ لندن پہنچ کر مجھے ایک فون پر رابطہ کرنا ہوگا اور رمیان مشرا کا کوڈ استعمال کرتے ہوئے اپنی شناخت کرانی ہوگی۔ مجھے اپنے مشن سے متعلق ہدایات وہیں سے موصول ہوں گی۔ باس نے مجھے سختی سے ہدایت کی کہ اس وقت تک جب تک میں لندن نہ پہنچ جاؤں کسی بھی حالت میں تنظیم کے کسی رکن سے ملاقات نہیں کروں گی اور نہ کسی قسم کا کوئی رابطہ قائم کروں گی۔ نہ صرف یہ بلکہ بڑی سے بڑی افتاد پڑ جانے پر بھی مجھے تنظیم سے اپنے تعلق کو قطعی ظاہر نہیں کرنا ہے۔ لندن پہنچنے کے بعد مجھے اگلی ہدایات دی جائیں گی۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دس اکتوبر کی رات کو مجھے اغوا کر لیا گیا اور اس کے بعد سے اب تک میں مختلف جان لیوا مراحل سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی اور اب بھی منزل سے دور تھی۔ میں نہ جانے کب تک آنکھیں موندے خیالات میں ڈوبی رہتی کہ کسی نے آہستگی سے میرا بازو ہلایا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی حسین ایئر ہوسٹس تھی۔ "کیا سو گئی تھیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"نہیں تو تمہارے ہی خیالوں میں گم تھی۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا اور اس کے گالوں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

"میں اسٹاف کیبن میں جا رہی ہوں آپ آ جائیں۔" اس بار بھی اس کی آواز مدھم تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ دلنشین چال کے ساتھ آگے چل دی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی عام سے انداز اسٹاف کیبن کی طرف جا رہی تھی۔

کیبن میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا پھر بھلا مجھے گستاخیوں سے کون روک سکتا تھا۔ میری پیار بھری تعریفوں کے باعث وہ جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ میں پہلے ہی تاڑ چکی تھی کہ وہ خود بھی انہی راہوں کی مسافر ہے لہٰذا مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور میں اسے دوست بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ کیبن میں کسی بھی وقت کوئی آ سکتا تھا لہٰذا اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے لندن کو مرکز بنا کر ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اس کا نام لکشمی تھا اور تعلق بھارت کے شہر گوا سے تھا۔ وہ ایک سال سے ایئر ہوسٹس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس کا لندن میں ذاتی فلیٹ تھا جہاں وہ کبھی کبھار ہی ٹھہرتی تھی۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے پاس لندن میں ذاتی فلیٹ حاصل کرنے کے لیے رقم کہاں سے آئی۔ یہ سراسر غیر اخلاقی سوال ہوتا۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا' پیڑ گننا میری عادت نہیں تھی۔

لندن ایئرپورٹ پر چیکنگ کے مراحل سے گزرنے کے بعد مجھے خاصا انتظار کرنا پڑا کیونکہ لکشمی کو اپنے افسران سے چند گھنٹے کی چھٹی درکار تھی اور وہ یہ وقت میرے ساتھ اپنے فلیٹ میں گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں بھی ہوٹل کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتی تھی پھر سب سے بڑی بات اس کے فلیٹ میں فون کی سہولت بھی موجود تھی جہاں میں پوری بے فکری اور رازداری سے فون کر کے اپنی لندن آمد کی اطلاع دے سکتی تھی۔

ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی بھری پری شاہراہ پر دوڑتی ہوئی لکشمی کی دوست کے گھر کی جانب جا رہی تھی۔ جو لکشمی کے فلیٹ کے راستے میں ہی کسی

اپارٹمنٹ میں رہتی تھی، لکشمی کو اس سے چند منٹ کے لیے ضروری کام تھا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد لکشمی نے ایک پرشکوہ عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کر کے مجھے ساتھ لیتی ہوئی چوتھے فلور پر پہنچ گئی۔ کال بیل کے جواب میں جس پری پیکر نے دروازہ کھولا بے شک وہ تعریف کے قابل تھی۔ وہ نیلی آنکھوں اور گوری رنگت والی انگریز لڑکی تھی جس نے اوپری حصے میں ایک باریک بنیاد اور نچلے حصے میں صرف نیکر پہن رکھا تھا۔ غالباً وہ گھر میں سادہ لباس پہننے کی عادی تھی۔

ابتدائی رسمی، کلمات کے بعد لکشمی مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اپنی دوست مارگریٹ کے ہمراہ فلیٹ کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ اس سے قبل مارگریٹ نے مجھے فریج سے کولڈ ڈرنک کی ٹھنڈی بوتل نکال کر دی تھی۔

میں دھیرے دھیرے ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لیتی کمرے کی دیواروں پر سجی خوبصورت پینٹنگز کا جائزہ لیتی رہی، بلاشبہ مارگریٹ بہت باذوق تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر مجھے لندن میں کچھ عرصہ قیام کا موقع ملا تو میں مارگریٹ سے دوستی ضرور کروں گی۔

جونہی میں نے بوتل ختم کر کے تپائی پر رکھی، وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئیں اور ہم مارگریٹ سے الوداعی سلام کر کے واپس ہو لیے۔ مارگریٹ سے ہاتھ ملاتے وقت میں نے ہولے اس کا ہاتھ دبایا اور وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائی جس سے اس کے موتیوں جیسے دانت نمایاں ہو گئے۔ ذرا ہی دیر بعد ہم دونوں پرائیویٹ ٹیکسی میں لکشمی کے فلیٹ کی جانب جا رہے تھے۔

لندن بہت صاف ستھرے اور باذوق لوگوں کا شہر ہے۔ سڑکوں اور فٹ پاتھ پر بے حجاب حسن ہی حسن بکھرا پڑا تھا مگر مجھے فی الحال اس حسن سے زیادہ اس فون نمبر کی فکر تھی جو مجھے ازبر تھا اور جس پر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دینی تھی۔

چند لمحوں بعد ڈرائیور نے ہمیں ایک اپارٹمنٹ کے سامنے اتار دیا۔ ٹیکسی کا بل ادا کر کے ہم عمارت کی جانب بڑھے ہی تھے کہ عقب سے آنے وا ایک تیز رفتار سیاہ کار ہمارے نزدیک آ کر بریکوں کی پرشور آواز سے رکی۔

ہم دونوں ہی اچھل پڑے۔ مگر اس سے قبل کہ، کچھ سمجھ پاتے، سیاہ کار سے دو مسلح افراد باہر آئے اور تیزی سے ہمارے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کمبخت یہاں کیسے آ گئے اور مجھے کیسے ڈھونڈ لیا۔ یہ وہ فوری سوال تھے جنہوں نے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے اور میں گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

وہ پنڈت نرائن کرشن اور اس کا دست پنڈت گوپال تھا۔ میں نے نرائن کرشن اور گوپال کو گھور رہی۔ دونوں ہی بہترین تراش کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے اور عجیب سے لگ رہے تھے۔ سیاہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی کالا انگریز بیٹھا تھا جو اپنی شکل سے ہی کوئی شریف آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمیں کور کرنے کے بعد نرائن کرشن نے کالے سے کچھ کہا جسے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے باعث میں نہیں سن سکی مگر اس کی بات مکمل ہوتے ہی کالے نے جھٹکے سے سیاہ گاڑی آگے بڑھائی اور تیز رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

"کاہے کو ٹکر ٹکر دیکھت ہے ہمکا سندری! کا حیران ہے۔" نرائن کرشن نے میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس اچانک افتاد پر لکشمی بدحواس تھی مگر ریوالور کی موجودگی اور پنڈتوں کے تیور دیکھتے ہوئے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

"چل ری تو اپنے پھلیٹ ما چل، ہم بھی دیکھت ہیں توہار پھلیٹ۔" پنڈت نے لکشمی کے بازو پر ریوالور سے ٹہوکا دیا اور اسے آگے کی جانب دھکیلا۔ اس وقت تک میں اپنے حواس پر قابو پا چکی

تھی اور ذہن اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیزی سے گردش میں آ چکا تھا۔ میں نے لکشمی کو آنکھوں کے اشارے سے حوصلہ دیا اور آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

نرائن کرشن اور گوپال نے اپنے ریوالور اپنے کوٹ کی جیبوں میں اس طرح رکھ لیے کہ جب بھی ضرورت پڑے فوری طور پر انہیں استعمال میں لایا جا سکے۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ ہم دونوں آگے تھیں، ہمارے ساتھ نرائن کرشن چل رہا تھا اور چند قدم کا فاصلہ رکھتے ہوئے گوپال ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

ان کمبخت پنڈتوں نے اپنا آپریشن اتنی تیزی اور نظم وضبط سے مکمل کیا تھا کہ مجھے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، ساتھ ہی انہیں میری حیرت کا فائدہ بھی حاصل رہا۔ اپنی حیرت کے باعث وقتی طور پر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں اور پنڈت کامیاب ہو گئے تھے۔ حیران میں اب بھی تھی مگر اب میرا ذہن دوسرے زاویے سے بھی بہت کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ اس ترتیب سے چلتے ہوئے ہم تیسرے فلور پر واقع لکشمی کے فلیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ لکشمی نے ہضمی قفل میں چابی گھمائی اور ہم یکے بعد دیگرے اندر داخل ہو گئے۔

فلیٹ خوبصورت اور اتنے قرینے سے سجایا گیا تھا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہنے لگا مگر ان منحوس پنڈتوں کی بے جا مداخلت کے باعث میری تمام حسرتیں دل میں ہی رہ گئیں۔

اندر آتے ہی گوپال نے پلٹ کر پھرتی سے دروازہ بولٹ کیا اور ریوالور نکال کر تیزی سے لکشمی کی جانب بڑھا۔ اس سے قبل کہ میں اسے روکتی، اس نے پستول کے دستے سے ایک زوردار ضرب لکشمی کی کنپٹی پر لگائی اور لکشمی تیورا کر صوفے پر گر پڑی۔ لکشمی کی تکلیف کو محسوس کر کے میں اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر گوپال میری طرف بڑھا مگر میں چوکنا تھی اور اس کو اتنی آسانی سے اپنی کھوپڑی پر طبع آزمائی کی اجازت دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ نرائن نے میرے تیور بھانپ کر اپنی کوٹ کی بیرونی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے بولا۔ "نہ...... نہ...... سندری! حرکت میں برکت ہوئے ہے، پر حرکت انسان کا نرکھ میں بھی پہنچا دیت ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ مزید چوکنا انداز میں کھڑا ہو گیا، لکشمی کو بے ہوش کر کے گوپال نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس حال میں ہے، گوپال نے کوٹ کی جیب سے نائیلون کی رسی نکالی اور میرے ہاتھ پشت پر باندھ کر مجھے صوفے پر بٹھا دیا۔

اب سچویشن کچھ یوں تھی کہ لکشمی اپنے خوبصورت فلیٹ میں صوفے پر بے ہوش پڑی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر پابندھ کر صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا اور میرے پیچھے گوپال ریوالور ہاتھ میں لیے مستعد کھڑا تھا۔ میرے مقابل پنڈت نرائن کرشن ایک آرام دہ کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے اپنا ریلوالور کوٹ کی بیرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ بڑے شوق سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب سی سرخوشی اور فتح مندی کا احساس ہو رہا تھا جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ اگر اس کی خوشی صرف میرے قابو میں آنے پر تھی تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس سے قبل بھی دو مرتبہ مجھے اپنا قیدی بنا چکا تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ وہ مجھے زیادہ دیر اپنی قید میں نہیں رکھ سکا۔ میرے خیال میں اس کے احساس فتح مندی کی کوئی اور وجہ رہی ہو گی۔

چند لمحے ہم دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں جنگ چلتی رہی۔ میں مسلسل پلک جھپکائے بغیر پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتی رہی۔ بلاشبہ پنڈت کی آنکھوں میں آگ ہی آگ تھی۔ اس کی نگاہوں کی چبھن آنکھوں کے راستے دل و دماغ میں اتر کر انہیں منجمد کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مگر میں بھی برسہا برس سے انہی راہوں کی مسافر تھی۔ مجھ پر یہ حربے اتنی آسانی سے

کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر پنڈت کے لبوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے پلک جھپکتے ہوئے کہا۔

"ہمرا اب بھی وہی سوال ہے' مگر یاد رکھ سندری' اس بار ہم انتجار نا ہیں کریں گے یا تو تو ہم کا نقشہ دے یا گوپال تو ہار کا گولی مارے گا۔" اس کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ میں جھرجھری لے کر رہ گئی۔

مجھے یقین تھا کہ اس مرتبہ پنڈت واقعی خوفناک موڈ میں ہے اور اگر اس کا مطالبہ پورا نہیں ہوا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ اس وقت وہ پوری طرح بالادست تھا اور اسے من مانی کارروائی سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے وقت حاصل کرنے کی نیت سے پوچھا۔

"نقشہ تو میں تمہیں دے دوں گی مگر تم میری حیرانی دور کردو۔" میں رکی پھر بولی۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچے اور یہ کہ تمہیں میری موجودگی کا علم کیسے ہوا۔" میری بات سن کر پنڈت کا سر غرور سے کچھ اور بلند ہو گیا اور اس کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"سن سندری! نرکھ میں جانے سے پہلے یہ بھی سن لے' ہم کالی کے داس ہیں۔ جب تو مندر سے پھرار ہوئی تو ہم کا باس ہریا کپور کی بڑی پھٹکار سننا پڑی۔ ہم نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ ہم تو ہاری تلاش واسطے ایک دن اور ایک رات بھوکے پیاسے رہ کر کالی کا ٹھن جاپ کریں گے' بس ہم اپنی دھن کے پکے ہیں۔ ہم ڈوب گئے' کالی کو خوش کرن واسطے اور کالی ہم سا بہت خوش ہوئی۔"

جوش خطابات میں پنڈت کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کالی نے ہم کا بتایا کہ ہمری کٹھناؤں کا حل سات سمندر پار ہے اور ہم کا نقشہ بھی تو ہار سے ہی مل سکت ہے اور تو دیکھ سندری' ہم تو ہار تک پہنچ ہی گوا۔" وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب تو ہم کا بتا کہ تو کا فیصلہ کرت ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا مگر اس حالت میں بھی اس کے چہرے کی ازلی خباثت کم نہیں ہوئی تھی۔

اس کی باتوں کے دوران میں یوگا کے مخصوص انداز میں سانس روکے بیٹھی رہی اور اپنی کلائیوں کو سکیڑتے ہوئے رسی کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو چکی تھی لیکن میں اپنے ہاتھ بدستور پشت پر کیے اسی طرح بیٹھی رہی۔ میرے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کے تاثرات گہرے ہو گئے جن سے پنڈت دھوکا کھا گیا۔

میرے نزدیک آ کر اس نے جوں ہی اپنی بات مکمل کی' میں نے پوری قوت سے صوفے کو پشت کی طرف دھکیلا اور خود اٹھتے ہوئے اپنے سر کی زوردار ٹکر نرائن کرشن کی ناف پر ماری۔

دونوں ہی پنڈتوں کو میری بے بسی کا پورا یقین ہو چکا تھا اور انہیں میری طرف سے کسی جارحانہ کارروائی کی قطعی کوئی توقع نہیں تھی۔ ان کا یہ اطمینان اور بے خبری میرے کام آئی۔ صوفی پیچھے دھکیلنے سے گوپال لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر کسی کونے میں جا پڑا۔ میری ٹکر سے نرائن کرشن کئی قدم پیچھے ضرور ہوا مگر زمین پر گرنے سے قبل سنبھل گیا۔ اس سے قبل کہ اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں جاتا' میں اپنی تمام تر پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی اور میرا ایک زوردار پنچ پنڈت کی ناک پر پڑا اور اس کی نکسیر پھوٹ پڑی مگر میرے پاس اس کی ناک سے بہتے ہوئے خون کا نظارہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کا دائیاں ہاتھ اپنے گرفت میں لیا اور جوڈو کراٹے کے مخصوص داؤ لگاتے ہوئے زوردار جھٹکا مار کر کڑاہٹ کی پرشور آواز سے پنڈت کی کلائی کا جوڑ کھل گیا اور وہ بری طرح ڈکراتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کو بھی اپنے لیے حرام سمجھتے ہوئے فضا میں الٹی قلابازی کھائی اور تڑپ سے اٹھتے ہوئے گوپال کے سر پر پہنچ گئی۔ اس کی

میری دائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور گوپال کی کھوپڑی بج اٹھی۔ پھر گویا مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں نے اپنی تمام تر تربیت کا مظاہرہ ان چند لمحوں میں گوپال اور دوبارہ قلابازی کھاتے ہوئے نرائن کرشن کے سر پر پہنچ گئی۔

نرائن نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی تکلیف کو برداشت کیا اور بائیں ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا مگر اسے چلانے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ میری زوردار ٹھوکر کے نتیجے میں ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور میں نے اس کے چہرے کو اپنے تربیت یافتہ گھونسوں کی باڑ پر رکھ لیا۔

میں پنڈت کو قطعی کوئی موقع دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ اور اس کھیل کو اب ختم کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ لندن کی سرزمین پر میرے ہاتھوں کوئی قتل نہ ہو۔ کیونکہ میرے علم کے مطابق لندن پولیس بھارت کی پولیس سے قطعی مختلف تھی بھارت میں چار چھ قتل معمول کی بات تھی مگر یہاں ایک بھی قتل پوری انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور یہاں کی پولیس حیرت انگیز سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شدید خواہش کے باوجود دونوں پنڈتوں کو مارنے کے بجائے صرف بے ہوش کیا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ میری ضربات کے نتیجے میں وہ دونوں کئی گھنٹوں کے لیے ناکارہ ہو چکے ہیں مگر پھر بھی میں نے ان دونوں کو رسی کی مدد سے اچھی طرح باندھا اور صوفے کو درست حالت میں کر کے انہیں اس کے پیچھے لٹا دیا۔

میرا ارادہ لکشمی کو ہوش میں لانے کا تھا مگر اس سے زیادہ ضروری میرا فون کرنا تھا۔ میں نے لکشمی کو اس کے حال پر چھوڑا اور تپائی پر رکھے ہوئے فون کی جانب بڑھ گئی۔

"ہیلو! رمیان مشر۔"! لائن ملتے ہی میں نے کوڈ دہراتے ہوئے اپنی شناخت کروائی۔ دوسری جانب ایک لمحے کو سکوت چھا گیا' دوسرے ہی لمحے بے تابی سے پوچھا گیا۔

"آپ کہاں ہیں۔ ہمارے آدمی نے ایئرپورٹ سے آپ کا پیچھا کیا تھا مگر آپ کسی لڑکی کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں چلی گئیں۔ وہ رپورٹ دینے کے لیے قریب ہی گلی میں واقع پی سی او سے فون کرنے گیا' واپس لوٹا تو آپ جا چکی تھیں۔ اب آپ کہاں ہے۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے اپنا پتا بتایا تو وہ بولا۔

"آپ اپنے فلیٹ سے نکل کر نیچے سڑک پر آئیں۔ بلیو کار میں نیلی جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس ایک شخص 'دیوی زندہ باد' کے کوڈ سے اپنی شناخت کرائے گا۔ آپ اپنا کوڈ بتا کر اس کے ساتھ بیٹھ جائیں' وہ آپ کو یہاں لے کر آئے گا اور آپ اپنا موجودہ حلیہ بھی بتا دیں۔" میں تیزی سے اپنا حلیہ بتاتی چلی گئی۔ میری بات ختم ہوتے ہی دوسری جانب سے 'اوکے' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے لکشمی پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور دل ہی دل میں الوداع کہتے ہوئے فلیٹ سے باہر نکل گئی۔ مجھے لکشمی کو اس طرح چھوڑنے کا بے حد افسوس تھا۔ نیچے پہنچ کر مجھے پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد ہی ایک بلیو کار میرے نزدیک آ کر رکی اور اس میں سے نیلی جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس ایک دراز قامت نوجوان برآمد ہوا۔ میرے نزدیک آ کر اس نے نہایت ادب سے مجھے پرنام کیا اور اپنا کوڈ دہرایا۔ میرا جوابی کوڈ سن کر اس نے مودبانہ انداز میں پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ کوئی ہندوستانی ہی تھا اور اپنے انداز سے خاصا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ گاڑی مناسب رفتار سے مختلف سڑکوں اور ذیلی سڑکوں سے گزرتی رہی اور میرے خیالات بھی تیزی سے ذہن کی اسکرین پر

چلتے رہے۔

پنڈت کا غیر متوقع طور پر مجھ تک پہنچنا بلاشبہ میرے لیے حیرت ناک تھا۔ مگر وہ کم بخت کالے جادو کا ماہر تھا اور اس نے اپنی جادوئی صلاحیتوں سے نہ صرف میرا پتہ چلالیا تھا بلکہ اپنے علم کی روشنی میں وہ یہ دعویٰ بھی کررہا تھا کہ میزائل کا نقشہ میرے پاس ہے۔ میرے نزدیک اس کا یہ دعویٰ مضحکہ خیز تھا۔ میں اب تک اس نتیجے پر پہنچی تھی اگر کسی دشمن میزائل کا نقشہ واقعی چوری ہوا تھا تو مجھے ٹارگٹ بنا کر تنظیم کے بڑوں نے دشمنوں کی توجہ میری جانب مبذول کروائی اور انہیں الجھا کر نقشے کو محفوظ مقام پر پہنچادیا لیکن یہ بات مجھے اس لیے ہضم نہیں ہورہی تھی کہ اس میں مجھے بے خبر رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ اس معاملے میں میرا باخبر ہونا تنظیم کے لیے زیادہ موثر ثابت ہوسکتا تھا اور میں باخبر ہوتے ہوئے نقشے کے حصول میں سرگرداں افراد کو زیادہ بہتر طور پر اپنے پیچھے لگاسکتی تھی۔ اب اصل معاملہ تو باس سے ملاقات پر ہی معلوم ہوسکتا تھا مگر یہاں باس سے ملاقات کے چانسز ففٹی ففٹی تھے کیونکہ اگر وہ کسی طرح فرار ہوکر ملک سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو پھر لازماً لندن پہنچے ہوں گے کیونکہ ہمارا لندن کا نیٹ ورک بڑا مضبوط تھا اور اگر بدقسمتی سے وہ ابھی تک ہندوستان میں ہی ہیں تو پھر میں اپنا لندن کا مشن مکمل کرکے ہی ان سے ملاقات کرسکتی تھی۔

میں اپنے خیالات سے چونکی تو گاڑی ایک خاصے بڑے مکان کے لان میں رک چکی تھی اور میرا رہنما میرے اترنے کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔ لان سے گزر کر ہم ایک نسبتاً بڑے مگر خوبصورت ڈرائنگ روم میں پہنچے اور میں اپنے رہنما کے اشارے پر ایک صوبے پر براجمان ہوگئی۔

”آپ کمرے کی سجاوٹ سے لطف اندوز ہوں، میں آپ کے لیے چائے لاتا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور مکان کے اندرونی حصے کی جانب بڑھا تو میں بولی۔ ”چائے وغیرہ کے تکلف کے بجائے آپ میری آمد کی اطلاع متعلقہ لوگوں کو دیں تاکہ جلد سے جلد کام نمٹایا جاسکے۔“

”میڈم! آپ کی آمد کی اطلاع متعلقہ افراد تک پہنچ چکی ہے اور وہ جلد ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔ فی الحال آپ کو یہیں آرام کرنا ہوگا۔ اور میرے خیال میں آرام کے دوران چائے سے اچھا شغل کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس نے رک کر جواب دیا اور مسکراتے ہوئے مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

چند ہی منٹ بعد وہ ٹرے میں بھاپ اڑاتی چائے لیے کمرے میں داخل ہوا اور کپ میری جانب بڑھادیا۔ میں نے ٹرے میں ایک کپ دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ”کیا تم چائے نہیں پیو گے۔“

”نہیں میڈم، میں ادنیٰ سا کارکن ہوں، ہمیں افسران کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی ممانعت ہے۔“

”مگر میں تو کوئی افسر نہیں، تمہاری مہمان ہوں۔“

”پھر بھی میڈم، ابھی تنظیم کے اعلیٰ افسران آنے والے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔“ اس نے عاجزی سے کہا اور میں چپ ہوگئی۔ مگر میں نے اسے اپنے مقابل صوفے پر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں ہولے ہولے گرم چائے کی چسکیاں لیتی رہی، اس دوران ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ وہ نوجوان خاصا کم گو تھا یا شاید مجھ سے مرعوب تھا۔ مگر اس کی خاموشی میرے لیے مفید تھی۔ میں خاموشی سے چائے پیتی ہوئی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

مجھے لکشمی کو اس طرح فلیٹ میں بے یارومددگار چھوڑنے کا بے انتہا دکھ تھا مگر میں جانتی تھی کہ دونوں پنڈت صرف بے ہوش ہوئے تھے اور ہوش میں آنے کے بعد لکشمی ان کے لیے بالکل بے ضرر ثابت ہوگی۔ لہٰذا وہ اس پر وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے اور کسی بھی حال میں مقامی پولیس کے بکھیڑے میں پڑنے کی ہرگز

کوشش نہیں کریں گے میں جانتی تھی کہ اس قسم کے جرائم پیشہ افراد پولیس وغیرہ کے معاملات سے کوسوں دور بھاگتے ہیں اور اپنے معاملات خود ہی نمٹانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس طرح میرے خیال میں لکشمی کو فوری طور پر کوئی جانی یا کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا، بس ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ خوفزدہ ہوسکتی تھی اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ مجھے چائے ختم کیے ہوئے ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان کو دیکھا تو وہ مجھے دھندلا دھندلا نظر آیا۔ اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا، یقیناً میری چائے میں بے ہوشی کی دوا ملائی گئی تھی اور میں بغیر کسی شک وشبے کے پورا کپ اپنے حلق سے نیچے اتار چکی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں دوبارہ صوفے پر گر پڑی، سنبھلنے کی کوشش میں، میں ڈگمگاتی اور صوفے سے لڑھک کر فرشی قالین پر آرہی۔ میرا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

کتنے گھنٹے یا کتنی صدیاں بیت گئیں، کچھ خبر نہیں ہوسکی۔ جب مجھے ہوش آیا تو کمرے میں بھنبھناہٹ کا احساس ہوا، چند ہی لمحوں بعد میں پوری طرح آنکھیں کھول چکی تھی۔ سب سے پہلے جس شخص پر میری نظر پڑی، وہ باس راموجی تھے۔ ان کے برابر میں ایک ادھیڑ عمر کا وجیہہ شخص کھڑا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے جس سے اس کی شخصیت بے انتہا پرکشش ہوگئی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر وہ نوجوان کھڑا تھا جو مجھے لکشمی کے فلیٹ سے لایا تھا اور بعد میں بے ہوشی کی دوا ملی چائے پلائی تھی۔ باس کے عقب میں سفید چمڑی والی انتہائی حسین اور نرم ونازک سی لڑکی کھڑی اپنی گہری نیلی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔

یا حیرت! یہ سب کیا ہے۔ مجھے اس نوجوان نے کیوں بے ہوش کیا تھا اور اب باس اور دیگر افراد کی موجودگی کا کیا سبب ہے۔ ان سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے اپنا جائزہ چند لمحوں میں مکمل کیا اور باس کے احترام میں بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر باس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے لیٹے رہنے کو کہا اور میری خیریت دریافت کی۔ مجھے اٹھتے وقت اپنے سینے میں دائیں جانب تکلیف کا احساس ہوا، میں نے ہاتھ سے ٹٹولا تو وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں چندروز قبل رسولی کا آپریشن ہوا تھا۔

میری آنکھوں میں حیرتوں کے دریا بہہ رہے تھے اور اس سے قبل کہ میں باس سے کچھ پوچھتی، باس نے میرا مدعا سمجھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بیڈ کے سرہانے رکھے بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”بالکل ایزی ہوجاؤ پوجا، فکر کی کوئی بات نہیں ہے، تم محفوظ ہو اور اپنوں میں ہو۔“ ان کی تقلید میں وہ ادھیڑ عمر وجیہہ شخص اور پیاری سی گڑیا بھی بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں پوری تفصیل بتاتا ہوں تاکہ تمہاری الجھن دور ہو۔“ باس نے کہا۔ اس دوران ایک خوبصورت لڑکی نرس کا لباس پہنے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے جوس دے کر چلی گئی جسے پی کر مجھے کچھ توانائی محسوس ہوئی۔

یہ کمرہ اپنی سجاوٹ سے قطعی اسپتال کا کمرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر میرے سینے پر پٹی کی موجودگی اور نرس کا نظر آنا میری سمجھ سے بالاتر تھا مگر میں خاموش رہی۔ مجھے باس کے بولنے کا انتظار تھا۔ ”اب تم کیسا محسوس کررہی ہو۔“ باس نے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں سر! مگر یہ سب کیا ہے۔“ آخر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میرے اندر کی الجھن میرے لبوں پر آگئی۔ باس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھری اور وہ بولے۔ ”سب سے پہلے تو میں کمرے میں موجود افراد کا تعارف کرواتا ہوں۔“ باس نے ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔ ”یہ لندن بیورو کے باس مسٹر ہاروے ینگ ہیں۔“ مسٹر ہاروے ینگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر گردن ہلائی۔ ”یہ ہماری تنظیم کی بڑی فعال کارکن مس لورین ہیں اور وہ ہیں سکھیر لندن بیورو

کے آفس انچارج' اب میں تمہیں اصل کہانی سناتا ہوں۔'' تعارف مکمل کر کے باس کچھ دیر خاموش رہے' جسے اپنے یادداشت کو مجتمع کر رہے ہوں۔

''پچھلے دنوں میرے ایک دیرینہ دوست جیرالڈ فرائیڈ نے مجھ سے کلکتہ میں رابطہ کیا اور فوری طور پر ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ امریکہ کا شہری اور مین ہلٹن کا رہائشی ہے۔ وہ بطور فری لانسر مختلف ملکوں کے فوجی اور سیاسی راز چرا کر بیچتا ہے۔ ملاقات ہونے پر جیرالڈ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ایک ساتھی ڈیوڈ کی مدد سے بھارت کے تحقیقاتی ادارے ریسرچ آف سائنس و ٹیکنالوجی برائے آرمز سے دھنیش نامی ایک انتہائی جدید ترین میزائل کا نقشہ چرایا ہے۔ بھارتی حکومت اگلے ماہ اس کا تجربہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ حکومت کو نقشے کی چوری کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے نقشے کے حصول اور ملزمان کو پکڑنے کی ذمہ داری کو سونپ دی۔ اس ضمن میں را کا انٹیلی جنس ونگ حرکت میں آ گئی اور انہوں نے ملک سے باہر جانے والے تمام راستوں کی خفیہ ناکہ بندی کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہماری تنظیم اس نقشے کو برطانیہ پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لے جس کے لیے اس نے ہمیں معقول معاوضہ کی پیشکش کی۔ معاوضہ کروڑوں میں تھا لہٰذا میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی سی ردو کد اور ابتدائی شرائط کے بعد ہم نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیرالڈ سے ملاقات کے دوران بگ باس سے فوج پر مسلسل رابطہ رہا اور آخری فیصلہ انہوں نے ہی کیا۔ جیرالڈ دھنیش میزائل کا بلیو پرنٹ نقشہ مجھے دے کر چلا گیا۔ یہ انتہائی چھوٹے سائز کی مائیکرو فلم کی صورت مین تھا۔ بگ باس نے دو گھنٹے بعد رابطہ کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ دو گھنٹے بعد باس نے پورا پلان بتایا' وہ یہ تھا کہ مائکرو فلم کو ایک کیپسول میں رکھ کر کس کارکن کے سینے میں آپریشن کے ذریعے رکھ دیا جائے اور اسے لندن روانہ کر دیا جائے۔ اس طرح نقشے کی مائیکرو فلم بہ آسانی لندن پہنچ جائے گی اور یہاں اسے جیرالڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ باس نے اس پلان پر فوری عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میرے پاس یوں تو بہت سے کارکن ہیں مگر یہ انتہائی خفیہ اور اہم ترین مشن تھا۔ ذرا سی لغزش را کو ہماری بو پر لگا سکتی تھی جو اپنی خجالت مٹانے کے لیے ہندوستان میں ہماری تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ انہی تمام خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ مشن تمہیں سونپنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ خود تمہیں بھی اصل مشن سے بے خبر رکھا جائے تاکہ تم ذہنی طور پر دباؤ کا شکار نہ رہو۔ تمہیں جو چائے پلائی گئی تھی' اس میں ڈاکٹر کے مشورے سے ایسی دوا حل کی گئی تھی کہ چائے پینے کے تقریباً چار پانچ گھنٹوں بعد سینے میں دائیں طرف شدید درد ہوتا ہے۔ پروگرام کے مطابق وہی ہوا۔ چار گھنٹے بعد میں نے تمہیں فون کیا تو تم درد سے تڑپ رہی تھیں۔ میری ہدایت پر تمہیں فوراً ڈاکٹر نے چیک کیا اور بے ہوشی کا انجکشن لگا کر ڈاکٹر کے بنگلے پر پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر کا بنگلہ کبھی کبھار اہم مواقع پر تنظیمی ساتھیوں کے لیے اسپتال کے کام بھی آتا ہے۔ تمہارا درد دس منٹ بعد ہی ختم ہو گیا تھا مگر ہوش میں آنے کے بعد تمہیں بتایا گیا کہ تمہارے سینے میں رسولی ہے جس کا فوری آپریشن کرانا ضروری ہے۔ تمہارے ٹالنے پر میں نے اصرار کر کے تمہیں آپریشن کرانے پر مجبور کیا اور اس طرح تم آپریشن کے مرحلے سے گزریں۔ سینے کے آپریشن کے دوران وہ کیپسول جس میں دھنیش میزائل کے نقشے کی مائیکرو فلم تھی' تمہارے سینے کے خاص حصے میں رکھ کر ٹانکے لگا دیئے گئے۔ دو دن آرام کے بعد تم بالکل صحتیاب ہو کر گھر آ گئیں۔

تمہارے ملک سے باہر جانے کے انتظامات مکمل تھے اور تمہاری سیٹ ریزرو کرائی جا چکی تھی لہٰذا میں نے تمہیں فون کر کے دوسرے روز لندن روانہ ہونے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ تم

کسی بھی تنظیمی ساتھی سے ملاقات نہیں کرو گی اور نہ ہی کسی بھی طرح اپنا تنظیم سے کوئی تعلق ظاہر کرو گی۔ دراصل یہ ہدایت بطور احتیاط دی گئی تھی تاکہ اگر بدقسمتی سے تم پکڑی جاؤ اور مائیکرو فلم کسی طرح تم سے برآمد ہو جائے تو تنظیم کے باقی ساتھی محفوظ رہیں۔

یہاں ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ ہم کالی مائی داس انٹرنیشنل کی سرگرمیوں سے بے خبر رہے اور تمہاری سیکورٹی کا انتظام نہیں کیا جس کے باعث ان کا داؤ چل گیا۔ وہ بڑی سرعت سے تم تک پہنچے اور تمہیں اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دراصل ان کی کامیابی کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کافی عرصے سے دھنیش میزائل کے نقشے کے حصول کے لیے کوششوں میں لگے ہوئے تھے جس میں انہیں ناکامی کا سامنا ہوا مگر جوں ہی جیرالڈ نقشے کی مائیکرو فلم اتارنے اور اسے باہر نکالنے میں کامیاب ہوا انہیں خبر ہو گئی اور وہ پوری طرح فعال ہو گئے۔ لاکھ کوشش کے باوجود جیرالڈ ان کے ہتھے نہیں چڑھ سکا اور فلم میرے حوالے کر کے زیر زمین چلا گیا۔ کسی طرح کالی مائی داس انٹرنیشنل کی انٹیلی جنس کے افراد کو جیرالڈ اور میرے دیرینہ تعلقات کا علم ہو گیا۔ ذرا سی کھوج سے انہوں نے پتہ چلا لیا کہ ان دنوں میری زیادہ تر مصروفیات تمہارے ساتھ رہی ہیں اور یہ کہ دوسرے روز تم ملک سے باہر جا رہی ہو لہٰذا انہیں یقین کی حد تک شبہ ہو گیا کہ جیرالڈ نے وہ نقشہ مجھے دیا ہے اور میں نے اسے محفوظ مقام تک پہنچانے کی ذمہ داری تمہیں سونپی ہے لہٰذا تمہیں اغوا کر لیا گیا۔

ہم سے ایک اور اندازے کی غلطی یہ ہوئی کہ ہم فوری طور پر اس معاملے کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکے جس کے باعث بھارت میں تنظیم کے کافی افراد شک کی بنا پر را کے ہتھے چڑھ گئے اور فوری طور پر تمام قیادت کو زیر زمین جانا پڑ گیا۔ میں خود بھی بڑی مشکل سے بچتا بچاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ہمیں اپنے ذرائع سے علم ہو گیا تھا کہ پنڈتوں نے تمہیں اغوا کر کے گجرات پہنچایا ہے مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ را کے فعال ہونے کے بعد ہمارا سارا نیٹ ورک بکھر کر رہ گیا تھا اور ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ مگر پھر بھی خطرہ مول لیتے ہوئے گجرات کے ہیورو آفس کا فون رابطہ فعال رکھا گیا اور نئے سرے سے تمہارے کاغذات تیار کروائے گئے تاکہ تم ایک نئے چہرے سے بہ آسانی بھارت کی سرحد عبور کر سکو۔

یہاں پہنچ کر جوں ہی تم نے رابطہ کیا' ہماری پوری ٹیم تیار تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ تم اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ضرور لندن پہنچو گی لہٰذا فیصلہ یہ کیا گیا کہ فوراً تمہارا آپریشن کر کے وہ کیپسول سائز مائیکرو فلم برآمد کی جائے تاکہ متعلقہ لوگوں تک پہنچا کر سودے کی تکمیل ہو اور اب تم ہمارے سامنے ہو' ایک دو روز آرام کے بعد تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔'' باس نے اپنا طویل بیان ختم کیا اور مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ چند لمحے کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا۔ آخر میں نے ہی یہ سکوت توڑا اور بولی۔ ''لیکن سر! اگر مجھے مائیکرو فلم کے متعلق بتا دیا جاتا تو میں بہتر طور پر کام کر سکتی تھی۔''

''نہیں! بلکہ تم ذہنی طور پر شدید دباؤ کا شکار ہو جاتیں۔ تمہارے ذہن پر ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا' ایک تو مائیکرو فلم کی حفاظت اور دوسرے خود اپنی جان کی حفاظت تم پر لازمی ہو جاتی۔ تمہیں اس فلم سے بے خبر رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ تم پوری بے جگری سے حالات کا مقابلہ کرتی رہیں' تمہارے ذہن پر صرف اپنی بقا کی دھن رہی اور دیکھو تم بالکل صحیح سلامت ہم میں موجود ہو۔ اب تم چند روز اسی بنگلے میں آرام کرو' یہ بنگلہ مکمل طور پر تمہاری دسترس میں ہے اور تم جتنے دن چاہو لندن میں قیام کرو۔ لندن کی سیر کے لیے مس لورین تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' باس نے کمرے میں موجود نیلی آنکھوں والی ساحرہ کی جانب اشارہ کیا اور میں مسکرا دی۔ مشن کی کامیابی پر باس کا انعام میرے ذوق کے مطابق تھا۔

بے وجود

دانش کمال

اسرار و تحیر میں لپٹی ایک عجیب موضوع پر اپنی نوعیت کی منفرد تحریر

ایمرسن نے افسوس زدہ انداز میں سر ہلایا۔ لارسن نے گہری سانس لے کر سلسلہ کلام جوڑا۔ "سامنے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے پولیس اسٹیشن کا نیون سائن نظر آرہا تھا۔ میں کار سے اتر کر سیدھا پولیس اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مجھ میں دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی جس انداز میں حادثہ رونما ہوا تھا اور جس طرح گاڑی سائیکل سوار لڑکی کو کچلتی ہوئی گزری تھی۔

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

لارسن کو بہت تاخیر سے احساس ہوا کہ درحقیقت اس کے لیے اسی دن سے پریشانیوں کا آغاز ہوگیا تھا جس دن سائیکل سوار لڑکی اس کی کار کے نیچے آکر کچلی گئی تھی۔ وہ واقعہ تو خیر اپنی جگہ تھا لیکن اصل پریشانی ایک ایسے تھیٹر میں شروع ہوئی جہاں عریاں رقص پیش کیے جاتے تھے۔

لارسن مسلسل تین دن سے اس تھیٹر کی خاص الخاص رقاصہ کوئین کا رقص دیکھنے جارہا تھا۔ اس کا اصل نام تو نہ جانے کیا تھا لیکن اسٹیج پر وہ کوئین کے نام سے معروف تھی اور اس کا رقص بلاشبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قسم کے رقص کے لیے اس کی جسمانی ساخت بھی غضب کی تھی۔

تین دن تک مسلسل اس کا رقص دیکھنے کے بعد آخر کار لارسن نے فیصلہ کیا کہ اسے کوئین سے ملنا چاہیے۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئین کو یہی رقص اپنے اپارٹمنٹ میں پیش کرنے کی دعوت دے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ تھیٹر کے ہال کے بجائے تنہا اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر کوئین کا یہ رقص دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہوگا پھر ضروری نہیں تھا کہ بات رقص تک ہی محدود رہتی۔ بات آگے بھی جاسکتی تھی۔

چنانچہ تیسری رات جب رقص ختم ہوا اور کوئین اسٹیج کے عقب میں غائب ہوئی تو لارسن اپنے ذہن میں یہی خیالات لیے اسٹیج کے عقبی دروازے پر جا پہنچا۔ دس ڈالر کا ایک نوٹ اس نے دربان کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے منہ پھیر کر گویا اپنی 'لاعلمی' میں لارسن کو اندر جانے کا موقع دے دیا۔ اندر ایک قطار میں آرٹسٹوں کے ڈریسنگ روم تھے۔ ایک دروازے پر سنہری ستارے چسپاں دیکھ کر لارسن کو اندازہ ہوگیا کہ وہ اس تھیٹر کی سپر اسٹار 'کوئین' کا کمرا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"کیا بات ہے۔" اندر سے کوئین کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً یہی سمجھی تھی کہ وہ تھیٹر سے ہی تعلق رکھنے والا کوئی فرد تھا۔ شاید وہ شو ختم ہونے کے فوراً بعد اپنے دروازے پر کسی اجنبی کے آ پہنچنے کی توقع نہیں کرسکتی تھی۔ لارسن نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی اپنا مقصد بیان کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا' اس لیے اس نے نہایت شائستگی سے پوچھا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں۔"

"ایک منٹ....." کوئین کی آواز آئی ذرا توقف کے بعد وہ بولی۔ "ہاں..... آجاؤ۔"

وہ اندر پہنچا تو کوئین نیلے رنگ کے ایک چغے

لبادے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ لارسن کو دیکھ کر اس کی شفاف نیلی اور خوب صورت آنکھوں میں قدرے حیرت ابھر آئی۔ لارسن نے احتراماً گردن کو ذرا خم دیا پھر سیدھا ہوتے ہوئے نہایت سادہ' صاف اور واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کردیا۔

اسے یہ تو اندازہ تھا کہ کوئین یکدم آمادگی کا اظہار نہیں کرے گی۔ وہ کچھ ہچکچاہٹ' کچھ تامل کا مظاہرہ کرے گی لیکن جب وہ اسے بھاری معاوضے کی پیش کش کرے گا تو آخر کار وہ مان جائے گی۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ چھوٹے سے اس بدنام تھیٹر میں اسے کیا ملتا ہوگا۔ وہ اسے جتنا معاوضہ دینے کا سوچ رہا تھا' اسے یقین تھا کہ اتنا وہ تھیٹر سے پورے مہینے میں بھی نہیں کما پاتی ہوگی۔

لیکن کوئین کا ردعمل اس کی توقع اور اندازوں سے بہت مختلف تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بہت بری طرح اس پر چیخنے چلانے لگی۔ وہ اسے جن الفاظ اور خطابات سے نواز رہی تھی' وہ بہت ہی توہین انگیز تھے پھر اس نے اس سے بھی بڑھ کر ایک حرکت کی جو لارسن کے خیال میں اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ لارسن اس وقت جتنی توہین محسوس کر رہا تھا' وہ گویا اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ دراصل کوئین نے آگے بڑھ کر اسے ایک تھپڑ رسید کردیا تھا۔

تب گویا لارسن کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا' اس نے اپنا ریوالور نکالا اور عین کوئین کے دل میں گولی اتار دی۔ اس کے بعد وہ تھیٹر سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر چلا گیا۔ اسے اپنے مرتعش اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے چند ڈرنکس لینا پڑے پھر وہ آرام سے سو گیا۔

وہ اس وقت گہری نیند میں سویا ہوا تھا جب رات گئے پولیس اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچی اور انہوں نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ وہ بہت حیران نظر آرہا تھا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔

☆☆

مارٹ ایمرسن کو فوج داری مقدمات کے سلسلے میں شہر کے چند بہترین وکیلوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس وقت گولف کھیل کر کلب کی عمارت میں

واپس آیا تھا جب اسے پیغام ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ خاتون جج ایمنڈا سے رابطہ کرے۔ اس نے فوری طور پر رابطہ کیا۔

"گڈ مارننگ یور آنریس!" اس نے کہا۔

"خیریت تو ہے۔ آپ نے مجھے کیسے یاد کرلیا۔"

"یہ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔" جج ایمنڈا نے کہا۔ "کیا تم کچھ دیر تک میرے چیمبر میں پہنچ سکتے ہو۔"

"میں ایک گھنٹے بعد پہنچ جاؤں گا۔" ایمرسن نے وعدہ کیا اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ واقعی جج ایمنڈا کے چیمبر میں موجود تھا۔

"ایک بار پھر گڈ مارننگ یور جج شپ!" وہ بولا۔ "اب تو بتا ہی دیں کہ مسئلہ کیا ہے۔"

"تمہارے لیے ایک کیس ہے۔ بشرطیکہ تم اسے قبول کرو۔" خاتون جج نے گہری سانس لے کر کہا۔ "پچھلی رات ایک شخص کو قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے اور وہ اس وقت تک کوئی بیان دینے کے لیے تیار نہیں ہے جب تک کسی وکیل سے مشورہ نہ کرلے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کا کوئی وکیل نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی وکیل سے واقف ہے کیونکہ اپنے دعوے کے مطابق اس سے پہلے وہ زندگی میں کبھی کسی ایسے مسئلے سے دوچار نہیں ہوا جس میں اسے وکیل کی ضرورت پڑتی۔ چیف نے یہ میری ذمے داری لگا دی کہ میں اس کے لیے وکیل کا بندوبست کروں۔ میرے ذہن میں فوراً تمہارا نام آیا۔"

"تمہارا مطلب ہے مجھے سرکار کی طرف سے اس شخص کو وکیل صفائی مقرر کیا جا رہا ہے۔" ایمرسن کے لہجے میں اب بے تکلفی آ گئی۔ "مجھے ایک اور کیس مفت لڑنا پڑے گا۔"

"نہیں، یہ مفت کا کیس نہیں ہے۔ نوجوان ملزم بہت زیادہ دولت مند تو نہیں لیکن خوشحال ضرور ہے۔ شہر کے سماجی حلقوں میں اس کی شخصیت اچھی خاصی جانی پہچانی ہے۔ وہ تمہاری فیس آسانی سے افورڈ کرسکتا ہے۔"

"پھر تو میں فوراً ہی فرض کرلیتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہوگا۔" ایمرسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں اس کا نام جان سکتا ہوں۔"

"اگر تم اخباری کالم پڑھنے کی زحمت کرتے ہو تو شاید تمہارے لیے اس کا نام شناسا ہو۔ وہ بھی کالم نگار ہے۔ اس کا نام لیولارسن ہے۔" جج ایمنڈا نے بتایا۔

"نام تو میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔" ایمرسن نے سر ہلایا۔ "میں نے ابھی تک آج کے اخبارات نہیں دیکھے۔ کیا تمہیں واقعے کی کچھ تفصیلات معلوم ہیں۔"

"یس تمہارے لیے کافی مشکل ثابت ہوگا۔" جج مسکرائی۔ "شاید اسی عذر کا سہارا لیتا پڑے کہ وقتی طور پر ملزم دیوانگی کا شکار ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس سے یہ جرم سرزد ہوگیا۔ مقتولہ میجسٹک تھیٹر کی ایک رقاصہ تھی جو کوئین کے نام سے معروف تھی۔ وقوعے کی رات بہت سے لوگوں نے شو کے دوران میں لارسن کو تماشائیوں میں بیٹھے دیکھا تھا اور کوئین کا ایکٹ ختم ہوتے ہی اسٹیج کے پیچھے جاتے بھی دیکھا تھا۔ درحقیقت اسی کی زبانی حلیہ وغیرہ سن کر پولیس لارسن تک پہنچ سکی تھی۔ دربان نے چند منٹ بعد اسے واپس جاتے بھی دیکھا تھا اور اسی دوران میں کئی لوگوں نے ایک فائر کی آواز سنی تھی۔ لارسن کے جاتے ہی کوئین اپنے ڈریسنگ روم میں مردہ پائی گئی تھی۔"

"میں چوکیدار کو جھوٹا ثابت کر دوں گا۔" ایمرسن بولا۔

"لیکن اس سے پہلے یہ سن لو کہ پولیس کو لارسن کے اس رات پہنے ہوئے کوٹ کی جیب سے ایک ریوالور ملا تھا اور لیبارٹری ٹیسٹ سے ثابت ہوگیا کہ کوئین اسی ریوالور سے چلائی گئی گولی سے ہلاک ہوئی ہے۔" جج نے گویا اس کی خوش فہمی دور کی۔

ایمرسن نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے سر ہلایا پھر پوچھا۔ "بہرحال ملزم نے ابھی تک

کوئی باقاعدہ بیان تو نہیں دیا۔"

"نہیں، البتہ جب اسے جگا کر اور الزام بتا کر گرفتار کیا گیا تو دونوں پولیس والوں نے اسے سخت حیرت کے عالم میں اور خود کلامی کے سے انداز میں یہ ضرور کہتے سنا۔ "اوہ خدایا۔ اس کا مطلب ہے وہ سچ مچ کی عورت تھی! تمہارے خیال میں اس سے لارسن کی کیا مراد تھی۔"

"یہ تو فی الحال مجھے اندازہ نہیں۔" ایمرسن بولا۔ "لیکن اگر اس نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا تو میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔"

☆☆

ایک گارڈ لیولارسن کو لے کر آیا اور ملاقات کے کمرے میں ایمرسن کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ ایمرسن نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے محسوس کیا کہ لارسن کافی حد تک پرسکون تھا۔ وہ پریشان نہیں تھا بلکہ حیران نظر آ رہا تھا۔ وہ تیس کی عمر کا ایک وجیہہ آدمی تھا اور حوالات میں بھی بدحال دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رسمی باتوں کے بعد وہ بولا۔ "مسٹر ایمرسن! مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے وکیل صفائی کی حیثیت سے کیس لڑیں۔ میں نے آپ کی شہرت سنی ہے اور اب مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ مجھے خود آپ کا خیال کیوں نہیں آیا۔ بہرحال، کسی بھی ذریعے سے سہی لیکن آپ سے رابطہ تو ہوگیا۔ کیا آپ میرا کیس لینے سے پہلے میری کہانی سننا چاہیں گے یا بہرحال میں میرا کیس لڑنے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں ہر حال میں تمہارا کیس لڑنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے باوجود میں تمہاری کہانی ضرور سننا چاہوں گا۔" ایمرسن بولا۔

لارسن ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کمرے میں ایسے آلات نصب نہیں ہیں جن کے ذریعے ہماری گفتگو سنی جا سکے۔" اب اس کا لہجہ بھی دوستانہ ہوگیا تھا۔

"نہیں..... مجھے یقین ہے کہ یہاں ہماری گفتگو صرف ہم تک ہی محدود رہے گی۔" ایمرسن بولا۔ "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم پر جو الزام لگایا گیا ہے کیا یہ درست ہے۔"

"ہاں۔" لارسن نے اطمینان سے جواب دیا۔

ایمرسن اس کے جواب سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوا اور بولا۔ "جن پولیس آفیسرز نے تمہیں گرفتار کیا، انہوں نے تمہیں حیرت سے کہتے سنا تھا۔ 'اوہ خدایا! اس کا مطلب ہے وہ سچ مچ عورت تھی!' اس سے تمہاری کیا مراد تھی۔"

"میں اس وقت واقعی بہت بری طرح حیرت زدہ تھا۔ مجھے صحیح طرح تو یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا لیکن میں نے اس مفہوم کی کوئی بات ضرور کی تھی مگر یہ بات اس وقت تک تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک میں شروع سے سارا قصہ نہ سناؤں۔"

"تم اطمینان سے سناؤ۔ ضروری ہوا تو میں ساری بات دو تین نشستوں میں سن لوں گا۔ میں تمہارے کیس کی سماعت شروع ہونے میں تین چار ماہ کی تاخیر کرا سکتا ہوں۔" ایمرسن بولا۔

"یہ قصہ تقریباً ساڑھے پانچ ماہ پہلے اپریل کی تین تاریخ کو منگل کے دن شروع ہوا۔ میں مضافاتی علاقے میں ایک پارٹی میں شرکت کے بعد اپنی گاڑی میں گھر واپس آ رہا تھا۔"

"قطع کلامی معاف۔ تم اکیلے تھے۔ خود ڈرائیو کر رہے تھے اور نشے میں نہیں تھے۔" ایمرسن نے تصدیق چاہی۔

"میں نے تھوڑی بہت پی رکھی تھی۔ لیکن بہرحال میرے حواس پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی آدھے گھنٹے تک اپنی کھلی چھت والی جیگوار میں ڈرائیو کرنے اور خنک ہوا کے تھپیڑے لگنے کے بعد میرے حواس اور بھی بہتر ہو چکے تھے۔ میں کچھ ایسی زیادہ تیز رفتاری سے بھی ڈرائیو نہیں کر رہا تھا۔ میں وائن اسٹریٹ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔"

"اس کا مطلب ہے پولیس اسٹیشن سے بھی چند فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔" ایمرسن نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔" ایمرسن نے سر ہلایا۔ "اس وقت صبح

کے ڈھائی بج رہے تھے۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اچانک ہی ایک گلی سے ایک لڑکی سائیکل پر سوار، تیزی سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ سائیکل کو جتنی تیزی سے چلانا ممکن ہو سکتا ہے، وہ اتنی تیزی سے چلا رہی تھی اور اچانک ہی عین میری گاڑی کے سامنے آ گئی۔ وہ سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ سر پہ ٹوپی تھی اور اس کے سرخ بال ٹوپی کے نیچے سے ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی بائیسکل بھی سرخ رنگ کی تھی۔ بریک لگانے سے پہلے گو کہ میں صرف ایک لمحے کے لیے اسے دیکھ سکا تھا لیکن وہ تمام منظر اب بھی اپنی تمام جزئیات سمیت میرے ذہن میں محفوظ ہے۔"

"تم نے اپنی دانست میں بروقت بریک لگائی۔" ایمرسن نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں جتنی تیزی اور جتنی قوت سے بریک لگا سکتا تھا، میں نے لگائی لیکن اس سے ایک ثانیے پہلے کا منظر تو خاص طور پر میرے ذہن سے محو نہیں ہوتا جب اس نوعمر لڑکی نے اپنی عینک کے عقب سے دہشت زدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے سڑک پر گھسٹتے ہوئے میری کار اس سے جا ٹکرائی۔ میں نے جب بریک لگائی اس وقت کار کی رفتار چالیس میل فی گھنٹا ہوگی لیکن ظاہر ہے کار فوراً تو نہیں رکتی۔ میرے بریک لگانے کے باوجود کار اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ سائیکل وغیرہ ٹوٹنے کی آوازیں ابھریں جن کی بازگشت اب بھی میرے کانوں میں ابھرتی ہے اور مجھے بڑی خوفناک محسوس ہوتی ہے۔ کار دو تین مرتبہ اوپر نیچے بھی ہوئی۔ وہ لڑکی اور سائیکل وغیرہ پر سے گزرتی ہوئی تقریباً چالیس فٹ آگے جا کر رکی۔"

ایمرسن نے افسوس زدہ انداز میں سر ہلایا۔

لارسن نے گہری سانس لے کر سلسلہ کلام جوڑا۔ "سامنے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے پولیس اسٹیشن کا نیون سائن نظر آ رہا تھا۔ میں کار سے اتر کر سیدھا پولیس اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مجھ میں دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی جس انداز میں حادثہ رونما ہوا تھا اور جس طرح گاڑی سائیکل سوار لڑکی کو کچلتی ہوئی گزری تھی اس سے مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ اس کے بچنے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا۔"

"میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو ان لوگوں کو بہت دیر میں جا کر میری بات سمجھ میں آئی۔ آخر کار دو پولیس والے میرے ساتھ روانہ ہوئے۔ جائے حادثہ پر پہنچ کر ہم نے دیکھا، جیگوار اسی طرح سڑک پر ترچھی کھڑی تھی جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس آن تھیں لیکن انجن بند ہو چکا تھا۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ کار کے پیچھے سڑک پر ٹائروں کے رگڑ کے گہرے نشانات بھی موجود تھے لیکن......"

"وہاں نہ تو لڑکی تھی اور نہ ہی سائیکل۔" ایمرسن نے بات مکمل کی۔

لارسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے اندازے کی تائید کی اور بولا۔ "حد تو یہ ہے کہ وہاں خون کا ایک قطرہ یا سائیکل کی کوئی ذرا سی ٹوٹی ہوئی چیز بھی نہیں تھی۔ کار پر کہیں ذرا رگڑ کا نشان بھی نہیں تھا۔ پولیس والے مجھے پاگل سمجھنے لگے۔ انہوں نے کار بھی سڑک سے خود ہٹا کر ایک طرف کھڑی کر دی اور مجھے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جا کر پوچھ گچھ کرنے لگے۔"

"میں نے کسی دوست سے رابطہ کرنے اور اس کے ذریعے کسی وکیل کی خدمات حاصل کر کے وہاں سے نکلنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ میرا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ شاید لاشعوری طور پر میں وہیں رہنا چاہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی واضح نہیں تھا کہ میں وہاں سے نکلوں گا تو کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا۔ میں صرف کسی کونے میں اکیلا بیٹھ کر کچھ سوچ بچار کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار مجھے اس کا موقع مل گیا۔"

"انہوں نے مجھے ذرا باعزت انداز میں ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ وہ کم از کم ایسی کوٹھری نہیں تھی جس میں نشے میں دھت شرابیوں کو پھینکا جاتا تھا۔

ان کا رویہ بھی میرے ساتھ اچھا ہی رہا۔ انہوں نے کسی قسم کی سختی یا بدتمیزی نہیں کی۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں بہرحال ایک معزز آدمی تھا۔ کوٹھری میں پہنچ کر بھی میں نے سونے کی کوشش نہیں کی اور سوچتا رہا کہ آخر یہ کیا چکر تھا لیکن ظاہر ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"دوسری صبح پولیس کا ایک ماہر نفسیات میرے پاس آیا اور اس نے سوال جواب کے ذریعے میرا نفسیاتی تجزیہ شروع کر دیا۔ اس وقت میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے اپنی بات پر زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ میرا پیچھا چھوٹنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ میں نے تسلیم کر لیا کہ پچھلی رات شاید مجھے وہم ہوا تھا یا میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ یوں آخر کار پولیس نے میری جان چھوڑ دی اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔"

لارسن ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "تمہیں میری کہانی پر یقین آیا یا نہیں۔ کیا تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو۔"

"صرف ایک سوال......" ایمرسن بولا۔ "ہو سکتا ہے تمہارے دفاع کے سلسلے میں ہمیں یہی موقف اختیار کرنا پڑے کہ تم پر دیوانگی کا دورہ پڑا تھا۔ کیا اس صورت میں ضرورت پڑنے پر مذکورہ پولیس والے تمہارے بیان اور اس سارے واقعے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

لارسن قدرے افسردگی سے مسکرایا۔ "مجھے تو پولیس سے واسطہ پڑنے کا تجربہ اسی طرح یقینی اور واضح طور پر یاد ہے جس طرح لڑکی کا اپنی گاڑی تلے کچلے جانا یاد ہے لیکن اب مجھے معلوم نہیں کہ یہ واقعہ ان پولیس والوں کے ریکارڈ پر ہے یا نہیں اور وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں یا نہیں...... بہرحال میں اپنی طرف سے تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ اس میں کوئی فرضی بات شامل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ بیان جاری رکھو۔" ایمرسن نے سر ہلایا۔

"میں نے پولیس والوں کے سامنے تو کہہ دیا تھا کہ شاید مجھے وہم ہوا تھا لیکن حقیقت میں تو میرا یہ خیال نہیں تھا۔ میں نے ایک گیراج سے کار کو مکمل طور پر چیک کرایا۔ اس پر آگے پیچھے، اوپر نیچے کہیں کوئی خراش تک نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ تصدیق کرنا چاہی کہ کیا اس رات اس حلیے کی کوئی لڑکی بائیسکل پر کسی گھر سے نکلی تھی۔ کیا کسی نے اسے دیکھا تھا۔ کیا کوئی اسی طرح کی کسی لڑکی کے وجود سے واقف تھا۔"

"ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے میں نے ہزاروں ڈالر خرچ کر کے ایک سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں جس نے جائے وقوعہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کو چھان مارا لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ اس شکل صورت اور حلیے کی کوئی لڑکی بائیسکل سمیت یا بائیسکل کے بغیر اس علاقے میں پائی جاتی تھی۔ سرخ بالوں والی چند نوعمر لڑکیوں کا پتا چلا لیکن وہ سب اس سے بہت مختلف تھیں۔"

"اس کے بعد میں نے خود اپنے طور پر ایک ماہر نفسیات سے رجوع کیا۔ وہ شہر کا ایک مشہور اور مہنگا نفسیاتی ڈاکٹر تھا۔ میں دو ماہ تک باقاعدگی سے اس کے پاس جاتا رہا لیکن یہ نہیں جان سکا کہ اس واقعے کے بارے میں اس کی کیا رائے تھی یا وہ اس کی کیا توجیہہ پیش کر سکتا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ نفسیات دان کس طرح انسان کے لفظوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکائے رکھتے ہیں۔ آخر کار میں نے اسے بھی وقت کا زیاں سمجھتے ہوئے اس کے پاس جانا چھوڑ دیا۔"

"تاہم میں نے اس دوران میں اپنے چند دوستوں سے اس قسم کے واقعات کے بارے میں اور خاص طور پر اپنے تجربے کے بارے میں تبادلہ خیال شروع کر دیا۔ ایک پروفیسر کا نظریہ میرے دل کو لگا۔ وہ یوں تو یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر تھا لیکن وجود اور

عدم وجود کے نظریے پر اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کی باتوں سے گویا مجھے کچھ سراغ سا ملا کہ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی کیا تشریح ممکن ہو سکتی تھی۔ میں نے خود اس موضوع پر مطالعہ شروع کر دیا۔ مجھے گویا اپنے سوال کا جواب ملنے لگا لیکن گزشتہ رات کے واقعے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اپنے مطالعے کے بعد میں نے جو رائے قائم کی تھی۔ یا جو میں سمجھنے لگا تھا وہ کسی حد تک غلط تھا۔"

گفتگو کے اس موڑ پر پہنچ کر لارسن نے گھڑی دیکھی اور تھکے تھکے انداز میں جماہی لے کر بولا۔ "یہ قصہ میرے اندازے سے زیادہ وقت لے گیا۔ اب میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ باقی باتیں کل پر نہ اٹھا رکھیں۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" ایمرسن نے فوراً کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆

دوسرے روز دوبارہ ان کی ملاقات ہوئی تو ایمرسن بولا۔ "وائن اسٹریٹ والے پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ میں یہ واقعہ درج ہے کہ تم نے وہاں جا کر حادثے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے ان دونوں پولیس والوں سے بھی بات کی ہے جو تمہارے ساتھ تمہاری کار تک گئے تھے اور وہاں انہوں نے حادثے کا کوئی معمولی سا نشان تک نہیں پایا تھا۔"

"میں بات وہیں سے شروع کروں گا جہاں میں نے چھوڑی تھی۔" لارسن بولا۔ "وجود عدم وجود کے فلسفے پر کتاب پڑھتے پڑھتے ایک اور نظریہ میرے سامنے آیا جس کے خالق یونانی تھے۔ اس نظریے کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ کائنات دراصل انسان کے تخیل کی پیداوار ہے۔ یعنی جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا تو کائنات میرے تخیل کی پیداوار تھی۔ اصل میں صرف میرا اپنا وجود حقیقی تھا اور میرے اردگرد جو کچھ بھی مجھے نظر آ رہا تھا۔ جو افراد بھی دکھائی دے رہے تھے وہ میرے تخیل کی پیداوار تھے۔ وہ صرف میرے ذہن میں موجود تھے' حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔"

"یعنی۔" ایمرسن کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ "تمہارا مطلب ہے کہ وہ لڑکی جو بظاہر تمہاری کار کے نیچے آ کر کچلی گئی' درحقیقت تمہارے تخیل کی پیداوار تھی اس لیے تمہارے اپنے خیال کے مطابق جب وہ مر گئی تو دنیا میں اس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔"

"ہاں' میرے ذہن میں اس کی یہی وضاحت آئی۔ تب میں نے سوچا کہ اس نظریے کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ میں جان بوجھ کر کسی کو قتل کر کے دیکھوں کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اس طرح اس نظریے کی تردید بھی ہو سکتی تھی۔" لارسن بولا۔

"لیکن میرے دوست! قتل تو روز ہوتے رہتے ہیں اور لاشیں اس طرح ہرگز غائب نہیں ہوتیں کہ پیچھے ان کا نام و نشان تک نہ رہے۔" ایمرسن نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن وہ میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوتے نا۔ اس وقت بات صرف میری ہو رہی ہے۔" لارسن بولا۔ "اگر دنیا واقعی صرف میرے تخیل کی پیداوار ہے تو بائیسکل والی لڑکی میرے ہاتھوں قتل ہونے والی پہلی جاندار تھی۔"

ایمرسن ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "چنانچہ تم نے اس نظریے کی تصدیق کے لیے ایک اور قتل کر کے دیکھا۔ تم نے کوئین کو گولی ماردی مگر اس کی لاش کیوں غائب نہیں ہوئی۔"

لارسن اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا۔ "کوئین سے پہلے میں نے ایک اور قتل کیا تھا۔ وہ ایک مرد تھا۔ یہ تقریباً ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اب اس کا نام وغیرہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا بھی بعد میں کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ گویا ایک بے وجود شخص تھا لیکن چونکہ اسے قتل کرنے سے پہلے مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ ایک بے وجود شخص ثابت ہوگا اس لیے میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے نہایت احتیاط سے قتل کیا

تھا تاکہ بعد میں اگر اس کی لاش دریافت بھی ہو جائے تو اس کے قتل کا الزام مجھ پر نہ آئے لیکن قتل کے بعد اس کا معاملہ بہرحال ایسا ہی رہا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا چنانچہ میں نے سمجھا کہ میرے نظریے کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد میں اپنے پاس ریوالور رکھنے لگا اور میں نے یہ سوچ لیا کہ میں جس وقت چاہوں' کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ حتیٰ کہ میں نے اس تصور کو اخلاقی طور پر بھی برا محسوس نہیں کیا کیونکہ میں جسے بھی قتل کرتا وہ صرف میرے تخیل کی پیداوار ہوتا۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہ ہوتا۔"

ایمرسن نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد لارسن بولا۔ "میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں۔ پرسوں رات سے پہلے میں نے اس ریوالور کو استعمال نہیں کیا تھا۔ اس بدبخت ڈانسر نے مجھے اتنے زور سے تھپڑ رسید کیا کہ چند سیکنڈ کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے بالکل غیر ارادی طور پر ریوالور نکالا اور اسے شوٹ کر دیا۔"

ایمرسن نے ایک بار پھر ہنکارا بھرا اور بولا۔ "لیکن نہ تو اس کی لاش غائب ہوئی اور نہ وہ بے وجود عورت ثابت ہوئی۔ اس سے تو تمہاری تھیوری بالکل غلط ثابت ہو گئی۔"

"نہیں بالکل غلط نہیں البتہ اس میں ترمیم ہو گئی ہے۔" لارسن بولا۔ "گرفتاری کے بعد سے میں بہت سوچ بچار کرتا رہا ہوں اور میں نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کوئین چونکہ ایک بے وجود شخصیت ثابت نہیں ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید صرف میں ہی اس دنیا کا حقیقی اور صاحب وجود انسان نہیں ہوں بلکہ یہاں اور بھی مجھ جیسے حقیقی انسان موجود ہیں۔ یعنی دنیا میں بے وجود اور وجود والے' دونوں طرح کے انسان موجود ہیں لیکن بظاہر ان میں امتیاز کرنا مشکل ہے اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کن کی تعداد کتنی ہے۔ میری مثال لے لو میں نے تین قتل کیے۔ ان میں سے دو انسان بے وجود ثابت ہوئے لیکن تیسری عورت صاحب وجود نکل آئی مگر اس سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ دنیا میں وجود والے اور بے وجود انسانوں کا تناسب کیا ہوگا۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ کھوکھلے سے انداز میں ہنسا اور بولا۔ "میں چونکہ اس موضوع پر بہت سوچتا رہا تھا شاید اس لیے رات میں نے اسی سلسلے میں ایک بے ربط سا خواب بھی دیکھا۔ میں نے دیکھا جیسے حقیقی وجود رکھنے والوں کا آپس میں بڑا ایکا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ان میں یک جہتی ہے اور وہ زیادہ تر معاملات میں ایک دوسرے کو مشورے اور ہدایات دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہ جائیداد بھی ایک حقیقی قسم کی چیز ہے..... وجود رکھتی ہے۔ لیکن خیر یہ خواب اتنا اہم نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب میرے دفاع کے لیے تم کیا حکمت عملی اختیار کرو گے۔"

"ظاہر ہے وہی دیوانگی کے دورے والا بہانہ گھڑنا پڑے گا۔" ایمرسن بولا۔ "میں ایک ماہر نفسیات کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔ اس کا نام گلبرٹ ہے۔ بہت ہی لائق ڈاکٹر ہے۔ غالباً وہ اس شہر کا سب سے بڑا ماہر نفسیات ہے۔ کئی کیسوں میں اس نے میرے ساتھ کام کیا ہے اور ہم نے وہ سب جیتے ہیں۔ تم اس سے بالکل اسی طرح کھل کر بات کرنا جس طرح مجھ سے کر رہے ہو۔"

☆☆

ایمرسن کے آفس میں اس کی سیکریٹری نے اسے اطلاع دی کہ ڈاکٹر گلبرٹ اس سے ملنے آیا تھا۔ ایمرسن نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

گلبرٹ نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور بلاتمہید بولا۔ "میں نے لارسن کا نفسیاتی تجزیہ کر لیا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ لڑکپن میں اس کے سر پر چوٹ لگی تھی جس سے اس کی یادداشت جاتی رہی تھی۔ بہت

طویل عرصے تک اس کا علاج ہوتا رہا اور جوانی میں یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی یادداشت مکمل طور پر واپس آچکی ہے۔ اب بھی گویا اس کے ذہن میں جھماکے سے ہوتے ہیں جن میں کبھی اسے الہامی سے انداز میں کوئی بات یاد آجاتی ہے۔ جیسے اس نے اپنا خواب تمہیں سنایا تھا اور کبھی چند لمحوں کے لیے اس کی یادداشت غائب ہوجاتی ہے۔ اگر سچ مچ کا ایک قتل کرنے سے پہلے ہماری اس سے ملاقات ہوجاتی تو شاید ہم اس کا علاج کر لیتے لیکن اب ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ اس کی کہانی ریکارڈ پر آئے اس لیے عدالت میں کسی بھی بہانے سے اسے بچانا ٹھیک نہیں۔"

"اچھا تو تمہارا یہ مشورہ ہے۔" ایمرسن نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے مجھے اب وہ ضروری فون کال کرنی ہی پڑے گی۔ مجھے یہ کام کچھ اچھا نہیں لگ رہا لیکن مجبوری ہے۔ کرنا ہی پڑے گا۔ پہلے میں فون کرتا ہوں پھر جا کر لارسن سے ملتا ہوں۔"

گلبرٹ رخصت ہوگیا تو ایمرسن نے اپنے ڈائریکٹ فون پر خود ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "مڈلینڈ رئیل اسٹیٹ کمپنی۔"

"ہارورڈ! تمہارا یہ فون بالکل محفوظ ہے۔" ایمرسن نے دریافت کیا۔ "اس پر ہماری گفتگو سن لیے جانے کا کوئی خطرہ تو نہیں۔"

"نہیں، تمہیں معلوم ہے یہ میرا ڈائریکٹ نمبر ہے۔" دوسری طرف سے رئیل اسٹیٹ کمپنی کے مالک نے ہارورڈ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس اس وقت کوئی موجود تو نہیں ہے۔" ایمرسن نے مزید تصدیق چاہی۔

"نہیں، میں اپنے کمرے میں اکیلا ہوں۔" ہارورڈ نے گویا اسے تسلی دی۔

"اچھا تو سنو..... کوڈ نمبر چوراسی کی فائل کمپیوٹر میں چیک کرو۔ اس میں لیولارسن نامی ایک شخص کا کارڈ ہوگا۔ اس کا کارڈ وجود والے لوگوں کی فائل سے نکال کر بے وجود لوگوں کی فائل میں لگا دو۔ یہ کام فوری طور پر کرنا ہے۔ یہ آدمی اب ہمارے لیے خطرہ بن گیا ہے۔ اس کا معاملہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا۔ میں کل اس سلسلے میں تفصیلی رپورٹ بھیج دوں گا۔ اسے ریکارڈ میں شامل کر لینا۔"

فون بند کر کے اس نے میز کی دراز سے ایک پستول نکالا۔ اس پر سائیلنسر فٹ کیا اور پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا جہاں لارسن حوالات میں بند تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے لارسن کو ملاقات کے کمرے میں بلوایا اور جب گارڈ رخصت ہوگیا تو اس نے بریف کیس سے پستول نکال کر نہایت اطمینان سے اسے گولی مار دی۔ اس نے چند سیکنڈ انتظار کیا۔ اس دوران میں لارسن کی لاش یوں غائب ہوگئی کہ اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔

ایمرسن نے پستول بریف کیس میں رکھا اور خاموشی سے وہاں سے رخصت ہولیا۔ اب وہ جج ایمنڈا کے چیمبر میں پہنچا اور خوش گوار لہجے میں بولا۔

"ہیلو یور جج شپ! آج کوئی میرے سامنے لیولارسن نامی کسی شخص کا تذکرہ کر رہا تھا۔ تمہیں معلوم ہے یہ شخص کون ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے تو یہ نام ہی آج پہلی بار سن رہی ہوں۔" جج ایمنڈا نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"شاید یہ کوئی فرضی نام ہو۔ درحقیقت اس شخص کا کوئی وجود نہ ہو۔" ایمرسن نے نہایت معصومیت سے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں عین ممکن ہے۔" جج ایمنڈا نے سر ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کیا۔

"خیر، یہ کوئی اہم بات نہیں ہے میں تو یونہی بر سبیل تذکرہ بات کر رہا تھا۔ اب میں چلتا ہوں پھر کسی وقت ملاقات ہوگی۔" ایمرسن نے کہا اور چیمبر سے نکل آیا۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

طلسم کدہ

حسن علی خان

میلارڈ نے بڑھ کر ہال کے دروازے کو کھول دیا۔ وہاں موجود لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ لڑکا اور لڑکی اضطراری طور پر اپنی کرسیوں سے کھڑے ہوگئے' مگر میلارڈ زینے تک نہیں گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو چیک کر رہے تھے۔ وقت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ ویسے بھی طوفان کی وجہ سے وقت تھم گیا تھا۔ طوفان ہی آپس کے تصادم اور ٹکراؤ کو روک رہا تھا۔

اس شمارے کی ایک انوکھی تحریر

ہال میں گہری تاریکی تھی۔ میرے علاوہ وہاں سات افراد تھے۔ چار مرد اور تین عورتیں لیکن وہ سب اس طرح خاموش تھے' جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہاں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں' زوروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سرائے جہاں اس وقت ہم سب موجود ہیں اپنی جڑوں سے اکھڑ جائے گی۔

میرے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے' مگر میرا دل کسی نازک پتے کی طرح لرزیدہ تھا۔ اس لیے کہ وہ چار مرد اور تین عورتیں میری دشمن تھیں۔ تاریکی میں کیا ہونے والا تھا' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ "ٹک..... ٹک..... ٹک۔" وقت کا ایک ایک لمحہ رینگتا ہوا گزر رہا تھا۔

میں نیویارک سے اتنی چھوٹی جگہ پر کیوں آیا تھا۔ میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔ میں نے اپنی کار گھنی جھاڑیوں اور خودرو کھجور کے درختوں کے قریب روکی اور اسے لاک کر کے سرائے کی طرف چل پڑا۔ وہ سڑک پار ہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر گردو پیش کا جائزہ لیا۔ دو آدمی پیٹرول پمپ کے نزدیک کھڑے تھے اور ان دو عورتوں کو گھور رہے تھے جو سرائے کی کھڑکیاں اور روشن دان بند کر رہی تھیں۔ یہ کسی مرد کا کام تھا' مگر کوئی ان کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

میں ان کی مدد کرنے کے خیال سے آگے بڑھا۔

آسمان پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک غبار چھاتا جا رہا تھا اور سورج تانبے کے کسی طباق کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ موسم کی بے ہنگم اور ناگوار کیفیت صبح سے تھی' جب میں ڈیٹونا کے ساحل سے روزانہ ہوا تھا۔ میں جوں جوں جنوب کی طرف سفر کرتا رہا' گرمی اور حبس میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس وقت جب کہ میں میامی پہنچ چکا تھا' طوفان کی آمد آمد تھی۔

وہ عورتیں' جو سرائے کی کھڑکیاں بند کر رہی تھی' ان میں سے ایک لڑکی تھی جو سیڑھی پر کھڑی تھی۔ کھڑکیوں کے قبضے زنگ آلود تھے' اس لیے لڑکی کو دقت پیش آ رہی تھی۔ اس لڑکی کا سراپا حسین اور دلکش تھا' جسم بے حد متناسب اور رنگت کھلی ہوئی' اس کے بال گہرے سیاہ تھے اور آنکھیں شربتی۔

کافی دشواری کے باوجود وہ صرف ایک کھڑکی بند کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ دوسری عورت کا جسم فربہ اور تھلتھلا تھا۔ اس کے شانے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سیڑھی تھامے کھڑی تھی۔

میں ان دونوں کے قریب پہنچا تو معمر عورت نے میرا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اگر وہ معمر خاتون مسز جوڈی اور وہ لڑکی مونیکا تھی تو میرا خیال ہے کہ میں بارہ سو میل کا فاصلہ طے کر کے بالکل صحیح جگہ پر آ گیا تھا۔

''مسز جوڈی آپ کا مزاج کیسا ہے۔'' میں نے ملائم لہجے میں کہا۔

''معاف کرنا نوجوان' میں نے اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ میرے لیے اس کی آنکھوں سے بے گانگی جھلک رہی تھی۔

''گزشتہ سال جب میں لاک اسپرنگ جا رہا تھا' تو اس وقت سرائے میں ٹھہرا تھا' اس وقت تم سے ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''لیکن تمہاری سرائے میں ان گنت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں' اس لیے تم سب کو تو یاد نہیں رکھ سکتیں۔'' میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ یہ قہقہہ اس کردار کا حصہ نہیں تھا' جو اس وقت میں ادا کر رہا تھا بلکہ میں حقیقت میں اس وقت نہایت خوش گوار موڈ میں تھا۔

اگر وہ عورت حقیقت میں مسز جوڈی تھی تو میرے بیس ہزار ڈالر کے تھے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ میری جیب میں پہنچ چکے ہیں۔

اس نے میرا جائزہ لینے کے بعد کار کی نمبر پلیٹ کی طرف دیکھا' پھر میری طرف سر گھما کر پوچھا۔ ''اس وقت تم کہاں جا رہے ہو۔''

میں جنوب کی طرف جا رہا تھا اور مشرق سے آ رہا تھا اس لیے میں نے کہا۔ ''میں فلوریڈا جا رہا ہوں۔''

''وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔'' بڑھیا نے کہا۔ ''طوفان کی آمد آمد ہے ایسی صورت میں اگر تم سفر جاری رکھو گے تو دشواری میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

''مجھے بھی اس کا اندازہ ہے' اس لیے میں سرائے میں کچھ دیر ٹھہروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

میں اس لڑکی مونیکا کی طرف گھوما' جو سیڑھی سے اتر آئی تھی اور اسے اٹھا کر دوسری کھڑکی کی طرف جا رہی تھی۔ ''سیڑھی مجھے دے دو' ساڑی کھڑکیاں میں بند کر دوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔

اس لڑکی نے شہد میں گھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ وہ وہ اپنی مسکراہٹ سمیت میرے دل میں اترتی چلی گئی' لیکن میں سر تھما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ جب اس لڑکی کو حقیقت کا علم ہو جائے گا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔

میں نے تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھ سے سیڑھی لے لی اور باقی کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ دوسری کھڑکی بند کرتے وقت میں نے سرائے کے اندر نگاہ ڈالی اور اس کا جائزہ لیا۔ سرائے ایک طویل و عریض ہال پر مشتمل تھی' جس کے دو حصے کر دیے گئے تھے۔ ایک حصے میں بچ کا کاؤنٹر تھا اور وہاں چند میز' کرسیاں پڑی تھیں' جب کہ دوسرے میں ڈائننگ فلور تھا۔ اس وقت وہاں گراموفون بج رہا تھا اور گراموفون کے قریب ایک لحیم شحیم اور چوڑے شانوں والا آدمی کھڑا تھا۔ اس شخص کی پیٹھ میری طرف تھی اور ریکارڈوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایک نوجوان ریوالور لیے اس کی پشت پر کھڑا تھا' مجھے چاہیے تھا کہ میں اس منظر کو دیکھ کر چیخ پڑتا۔

مگر میرے نہ چیخنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ منظر کسی خواب کی طرح میرے سامنے اجاگر تھا۔ شاید مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں حقیقت سے دوچار ہوں' ممکن ہے یہ خیال بھی میرے شعور پر غالب آ گیا ہو کہ وہ نوجوان جوڑا کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں اٹھارہ انیس سال کے لگ رہے تھے اور ایسے جوڑے عموماً شام کو ریستورانوں میں نظر آتے ہیں۔

اس جوڑے نے چست پتلونیں اور پھول دار شرٹیں پہن رکھی تھیں۔ لڑکی کی نگاہ اچانک مجھ پر پڑی۔ اس نے لڑکے کے ریوالور والے ہاتھ کو چھپا کر اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جہاں میں کھڑا تھا۔ غالباً وہ بتانا چاہتی تھی کہ سرائے کے باہر بھی کچھ لوگ ہیں اور ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

لڑکا محتاط ہو گیا۔ اس نے ریوالور اپنے پتلون کی جیب میں رکھنا چاہا تھا کہ لڑکی نے ریوالور لے کر اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

عین اسی وقت وہ لحیم شحیم شخص بھی کھڑکی کی طرف گھوما۔ میں حیرت سے سیڑھی سے گرتے گرتے بچا۔ اس لیے کہ اس کے پھیلے ہوئے جبڑے اور چھوٹی آنکھوں سے میں اسے پہچان سکتا تھا کہ وہ نیویارک کا نامی گرامی بدمعاش میلارڈ ہے۔ اس نے ان دونوں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور گراموفون پر اپنا پسندیدہ ریکارڈ لگانے کے لیے ایک سکہ جیوک بکس میں ڈال دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ باہر سے زیادہ اندر ایک طوفان کروٹیں لے رہا ہے۔ وہ سرائے تھوڑی ہی دیر بعد قتل و غارت گری کی آماجگاہ بننے والی تھی۔

''اے مسٹر! کیا روشن دان بند کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔'' مونیکا نے نیچے سے پوچھا۔ وہ سیڑھی تھامے کھڑی تھی۔

''ہاں' ہر ایک چیز گرد آلود ہو گئی ہے' اس لیے کچھ دشواری پیش آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ دونوں آدمی جو پیٹرول پمپ کے نزدیک کھڑے تھے ٹہلنے والے انداز میں سرائے کے دروازے کی طرف آنے لگے۔ سخت گرمی اور لو کے باوجود وہ چست جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک فربہ تھا اور اس نے تاریک شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ دوسرا اکہرے جسم کا مالک تھا اور تھرکنے والے انداز میں چل رہا تھا' جیسے ڈانس کرنا اس کا پیشہ رہا ہو۔

''طوفان آئے گا تو کافی دیر رہے گا۔'' مونیکا نے ان سے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہو گا کہ تم لوگ ابھی سے چلے جاؤ۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ' میں تمہیں ایک حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں۔''

''تم ہماری فکر نہ کرو۔ ہم جہم ناسب سمجھیں

گئے' چلے جائیں گے۔'' سیاہ چشمے والے نے کہا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ سرائے کے اندر چلا گیا۔

اس کے لب و لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہے' مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میلارڈ کے ساتھی ہوں۔ ایسی صورت میں میرا کام آسان نہیں تھا۔ میں نے آخری کھڑکی بھی بند کردی اور نیچے آ گیا۔ اس وقت گرم ہوا کا ایک تھپیڑا میرے چہرے سے ٹکرایا اور مجھے سرتاپا جھلسا گیا۔

''تم لوگوں کو اندازہ نہیں' بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔'' مسز جوڈی نے کہا۔ ''میں اس طوفان سے کچھ بیشتر میامی آئی تھی اف! وہ کس قدر ہولناک طوفان تھا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے' پختہ مکانات گر گئے' جیسے کاغذ یا گتے سے بنے ہوں۔ کتنے لوگ زخمی ہوئے اور کتنے موت کا شکار' اس کی تو کوئی گنتی نہیں تھی۔''

''لیکن ہماری سرائے نہیں گرے گی' اس لیے کہ اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔'' مونیکا نے کہا۔ ''اس زمانے میں مکانات اتنے مضبوط نہیں ہوتے تھے۔''

ہم لوگ اس وقت سرائے کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ انہیں طوفان سے نہیں آدمی سے خوف زدہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آدمی بہت خوں خوار اور سفاک درندہ ہے۔ ہم سرائے میں داخل ہوگئے' سارے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے سے ہال میں تاریکی چھا گئی۔ اس لیے مسز جوڈی نے سوئچ آن کرکے بلب روشن کردیا۔ وہ دونوں نوجوان جو چست جینکوں میں ملبوس تھے اب کاؤنٹر کے قریب کھڑے تھے۔

''مجھے بیئر کا ایک گلاس دو۔'' چشمے والے نے کہا۔

مونیکا کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی۔ اس نے آئس بکس میں سے تین بوتلیں نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ ان میں سے ایک میرے لیے اور باقی دو نوجوانوں کے لیے تھیں۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ ران پر رکھ لیا اور کاؤنٹر کے قریب گیا۔ وہاں میں نے دائیں ہاتھ سے گلاس اٹھا کر اس میں بیئر ڈالی اور ترچھی نگاہوں سے میلارڈ کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی تک جیوک بکس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک ریکارڈوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ اچانک وہ کاؤنٹر کی طرف مڑا تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' وہ تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا' جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''کیا تم بیئر پیو گے میلارڈ۔'' اکہرے جسم والے نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔ میں بھی ایک گلاس بیئر پینا چاہتا ہوں گیری۔'' اس نے کہا اور مجھ پر ایک گہری نظر ڈالتا ہوا آگے جانے لگا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔'' اس نے ایک نزدیکی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یاد کرکے بتاؤ' کہاں دیکھا ہے۔'' میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''تم کوئی مقامی آدمی نہیں ہو۔''

''میں شکاگو سے آیا ہوں اور سیلز مین ہوں۔''

اس نے میرے قریب آ کر میرے پتلون کی بیلٹ پر ہاتھ مارا تو اس کی انگلیاں میرے ریوالور سے ٹکرائیں۔ ''تم ریوالور لے کر گھوم رہے ہو۔'' اس نے درشتی سے کہا۔

ہال میں اچانک سکوت چھا گیا۔ سب لوگ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ لڑکی کی انگلیاں اپنے ہینڈ بیگ کے کھٹکے پر سرک رہی تھیں' جہاں اس نے تھوڑی دیر پہلے ریوالور رکھا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی میری طرف جھک کر مجھے گھورنے لگے۔ مونیکا کے چہرے سے خوف جھلکنے لگا۔ اس نے مڑ کر اپنی ماں مسز جوڈی کو دیکھا' وہ بھی چوکنا ہوگئی تھی۔

''حقیقت یہ ہے کہ میں جیولری فروخت کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے سفر کے دوران ریوالور بھی رکھنا پڑتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔'' میلارڈ میری طرف دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ مجھ میں دلچسپی نہیں لے رہا ہو' مگر ہال کے دوسرے لوگ چوکنا ہوگئے تھے اور مجھے اس طرح سے دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔

ماں بیٹی نے بھی محسوس کرلیا کہ ہم گھومنے نکلے ہیں اور اتفاقاً ان کی سرائے میں آ گئے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ پچھلے مہینے سے جب رابرٹو نیو یارک سے فرار ہوا تھا تو اس وقت سے وہ لوگ ذہنی تشخاؤ میں مبتلا ہوں گے۔ وہ ہر شخص کو شک و شبے سے دیکھ رہی ہوں گی جو ان کی سرائے میں کچھ وقت ٹھہر کر کھانے پینے کے لیے آتا ہوگا۔

کم از کم میرے بارے میں تو وہ ہوشیار ہوچکی ہوں گی۔ ایسے میں ان کے کان کھڑے ہونا لازمی تھے کہ میرے پاس ریوالور بھی ہے لیکن وہ حقیقت میں کیسی دشواری میں مبتلا ہونے والی تھیں' اس کا انہیں ایک فیصد بھی اندازہ نہیں تھا۔

''تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے وہ کئی روز تک جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے اگر تم لوگ اس سرائے میں بند ہوکر نہیں بیٹھنا چاہتے ہو تو ابھی یہاں سے جاسکتے ہو۔'' مسز جوڈی نے بلند آواز سے کہا۔

''کیا طوفان کئی روز تک جاری رہے گا۔'' میلارڈ نے چونک کر کہا۔

''میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی' لیکن طوفان اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر اس دوران کھڑکی سے کوئی اپنی گردن باہر نکال دے تو اس کی گردن بھی ٹوٹ سکتی ہے۔''

''تم لوگوں نے سن لیا کہ یہ خاتون کیا کہہ رہی ہے۔'' میلارڈ نے کم عمر جوڑے کی طرف گھوم کر کہا۔ ''اگر تم لوگ یہاں سے جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو۔''

''یہ تو ٹھیک ہے' لیکن ہم باہر گئے اور ہم نے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں سفر کیا اور اسی دوران طوفان آ گیا تو یہ موجودہ صورت حال سے بھی بدتر ہوگا۔ ہم کسی حد تک یہاں خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ تم ہمیں مفید مشورہ دے رہے ہو' خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔'' نوجوان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''میں یہیں رہنے کو ترجیح دوں گا۔'' میلارڈ نے کہا۔

''ابھی وقت ہے۔ کہیں نہ کہیں نکلا جاسکتا ہے۔ اگر طوفان آ گیا تو تمہاری کار کاغذ کے پرزے کی طرح اڑنے لگے گی۔'' مسز جوڈی نے کہا۔

میں نے ہال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی' لیکن ایسا لگتا تھا کہ کوئی وہاں سے جانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ مونیکا کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر رہے تھے۔ اسے خود پر قابو پانے میں دقت ہو رہی تھی' میں یہ بھی جانتا تھا کہ اسے میری طرف سے سب سے زیادہ دھڑکا لگا ہوگا۔ اس لیے کہ میرے پاس ایک ریوالور بھی تھا۔

ماں بیٹی کے ظاہری رویے اور چہروں کے تاثرات دیکھ کر مجھے یہ یقین ہوگیا تھا کہ رابرٹو اسی عمارت میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔

''تم لوگوں کو یہاں سے چلا جانا چاہیے۔'' مسز جوڈی نے اضطراب سے کہا۔ ''اس لیے کہ تم.....'' وہ کہتے ہوئے اچانک خاموش ہوگئی اور غور سے سننے لگی..... پھر ہم سب نے بھی وہ آواز سن لی۔ دور کہیں کوئی درندہ یا عفریت چنگھاڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا لگا جیسے رفتہ رفتہ وہ عفریت نزدیک آتا جا رہا ہو۔

مسز جوڈی جو دروازے کے قریب کھڑی تھی جلدی سے باہر نکل گئی۔ میں اپنے اسٹول سے اٹھا

اور دروازے تک گیا۔ یہ علاقہ میامی شہر میں شامل تھا مگر یہاں اس سرائے کے علاوہ کوئی عمارت نہیں تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کھلا میدان تھا۔ دور خلیج بسکین سے گرد و غبار کا ایک طوفان مرغولوں کی شکل میں اٹھ رہا تھا اور تیزی سے کسی عفریت کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

اچانک دروازے کا ایک پٹ زور سے کھڑکھڑایا اور پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا سرائے میں داخل ہو گیا جس سے میز اور کاؤنٹر پر رکھی ہوئی چیزیں اڑ کر فرش پر جا گریں اور بکھر گئیں۔

"یہ دروازہ بند کرو ورنہ بہت نقصان ہوگا۔" میلارڈ چیخا۔

میں نے دروازے سے باہر قدم نکالنا چاہا تو ہوا کا ایک زوردار تھپیڑا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ طوفان کا کوئی معمولی جھونکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب طوفان اپنے عروج پر ہوگا تو سب چیزیں اڑی اڑی پھریں گی۔ میں نے اندر واپس جا کر دروازے کو بند کرنا چاہا تو مسز جوڈی نے سرعت سے میرا بازو تھام لیا اور بولی۔ "نہیں..... نہیں، دروازہ نہ بند کرو۔"

میں نے سوچا کہ غالباً اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ طوفان یہاں تک پہنچ گیا تو سب چیزیوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ خوف سے دھلی چادر کی طرح سپید ہو رہا تھا۔

اسے جو اندیشے دامن گیر تھے، میں ان سے کماحقہٗ واقف تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ سرتاپا سہمی ہوئی تھی۔ اس کے سہمنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا بیٹا رابرٹو دروازہ بند ہونے پر مکان میں قید ہو جائے گا۔ جب کہ یہاں جو لوگ جمع تھے وہ اسے ہلاک کرنے آئے تھے یا پھر گرفتار۔

میں خود مسز جوڈی کی سرائے میں میلارڈ اور ان دو نوجوانوں کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا، لیکن بے وقت طوفان آ گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے وہاں ٹھہرنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ طوفان سے کیسے بچا جائے۔

میں نے مسز جوڈی سے اپنا بازو چھڑا لیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ باہر رہ جائے گی اور تند ہوا اسے اڑا کر لے جائے گی تو وہ دروازہ بند ہونے سے پہلے اندر آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اب ہم ایک طرح سے محفوظ تھے۔

"پچھلا دروازہ بھی بند کر دینا چاہیے۔" مسز جوڈی نے گہرا سانس لے کر کہا اور سرائے کے اس حصے کی طرف دوڑی، جہاں ٹوائلٹ اور باتھ روم تھا۔ اس نے اپنا راز احمقانہ انداز میں کھول دیا تھا کہ وہ سامنے کا دروازہ کھلا رہنے دینا چاہتی تھی جبکہ پچھلا دروازہ بند رکھنا چاہتی تھی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میرے پیچھے بدمعاش میلارڈ بوٹوں سے دھمک پیدا کرتا آ رہا تھا۔

اس کمرے کے اندر کا دروازہ ایک چوکور ہال میں کھلتا تھا۔ دروازے کے ایک جانب ٹوائلٹ تھا اور اس کے آگے باتھ روم جبکہ دوسری جانب ایک زینہ اوپری منزل تک جاتا تھا۔ آخر میں ایک دروازہ تھا جو اس وقت بند تھا۔ میں اس دروازے کو اسی وقت دیکھ چکا تھا جب میں سیڑھی پر چڑھ کر کھڑکیاں اور روشن دان بند کر رہا تھا۔

مسز جوڈی نے اس دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر گھوم کر ہم لوگوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کچھ کہا۔ طوفانی ہوا کے بلا خیز شور کی وجہ سے میں نے اس کے لب تو حرکت کرتے دیکھ لیے، لیکن یہ سننے سے قاصر رہا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بہرحال وہ کچھ بھی کہہ رہی تھی، مجھے فریب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کا بیٹا رابرٹو اوپر کہیں چھپا بیٹھا ہے۔

وہ اضطرابی کیفیت میں اس طرف محض اس لیے آئی تھی کہ دروازہ کھول کر اسے فرار ہونے میں

مدد دے لیکن ہم لوگوں کے پیچھے آنے کی وجہ سے اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

وہ مڑی اور دروازے سے نکل کر پہلے والے ہال میں چلی گئی پھر کاؤنٹر کے پیچھے اپنی بیٹی مونیکا کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس کے لب حرکت کر رہے تھے، صاف لگتا تھا کہ وہ دعا مانگ رہی ہے۔

میلارڈ نے بڑھ کر ہال کے دروازے کو کھول دیا۔ وہاں موجود لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ لڑکا اور لڑکی اضطراری طور پر اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے، مگر میلارڈ زینے تک نہیں گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو چیک کر رہے تھے۔ وقت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ ویسے بھی طوفان کی وجہ سے وقت تھم گیا تھا۔ طوفان ہی آپس کے تصادم اور ٹکراؤ کو روک رہا تھا۔

میلارڈ اپنے اسٹول پر بیٹھنے کی بجائے ایسی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ زینے اور عقبی دروازے پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

میں نے بھی ایک مناسب سی جگہ تلاش کر لی اور ہال میں موجود لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈالنے لگا۔ ہاں بیٹی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھیں، پیٹرول پمپ کی طرف سے آنے والے دونوں نوجوان بیئر پینے میں مصروف تھے۔ لڑکا، لڑکی کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔

طوفان اب اس علاقے تک پہنچ چکا تھا اور اس کا قیامت خیز شور ہمارے اعصاب کو شکستہ کیے دے رہا تھا۔

"تمہارے بیلٹ میں ریوالور کی موجودگی مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہے، ڈیل اس سے ریوالور لے لو۔" میلارڈ نے چیخ کر کہا۔

ڈیل نے بیئر کا گلاس ہاتھ سے رکھا اور میری طرف یوں بڑھنے لگا جیسے ایک ڈالر ادھار لینے آ رہا ہو۔ دوسرا نوجوان گیری اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے ساکت بیٹھا تھا۔

"میں اپنا ریوالور اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے بیلٹ کو تھپتھپا کر کہا۔

"مجھے اعتراض ہے۔ تمہارے ریوالور رکھنے پر مجھے اعتراض ہے۔" گیری نے کہا۔ "اور میرے ساتھی کے تھرکنے پر غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔ وہ آسانی سے تمہیں گولی مار سکتا ہے اور متحرک چیزوں کا نشانہ بھی لے سکتا ہے۔"

میں نے وہی کیا جو ہر ایک عقل مند شخص کرتا ہے۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اسے کور کر لیا اور تلخ لہجے میں کہا۔ "گیری کی طرح میں بھی متحرک چیزوں پر نشانہ لگا سکتا ہوں۔"

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ڈیل ٹھٹک گیا۔

"اگر تم میں سے کسی نے کوئی حماقت کی تو نقصان اٹھائے گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ سب دم بخود رہ گئے اور ان میں سے کسی نے حرکت نہیں کی۔

"تم سیلز مین نہیں ہو سکتے۔" گیری نے دور سے کہا۔

"میں ایک طریقے سے سیلز مین ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

طوفانی ہواؤں کے شور میں کمی آ گئی تھی۔ اس لیے اب چیخ کر گفتگو کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم نیویارک کے پرائیویٹ جاسوس ایڈم ہو۔" میلارڈ نے گردن ہلا کر کہا۔

نوعمر لڑکی مسکرانے لگی، لیکن اس کا ساتھی لڑکا اپنی کرسی میں مزید دبک گیا۔ "یہ..... یہ پرائیویٹ جاسوس ایڈم ہے۔" مونیکا نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اور میں تمہارے بھائی رابرٹو کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔" میں نے اعتراف کیا۔

"میرے بیٹے رابرٹو نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔" مسز جوڈی نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا۔ "تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ سارا قصور

اس دوسرے آدمی میگاٹرے کا ہے' جس سے رابرٹو نیویارک میں ملا تھا۔''

''میگاٹرے نے ڈکیتی کی تھی اور پھر اس کار سے فرار ہو رہا تھا' جسے تمہارا بیٹا رابرٹو ڈرائیو کر رہا تھا۔ میگاٹرے نے ایک بینک کے گارڈ کو گولی بھی ماری تھی اس طرح سے وہ مجرم تھا اور رابرٹو شریک جرم۔ پر میگاٹرے ایک پولیس والے کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا پچاس ہزار ڈالر لے کر فرار ہو گیا۔''

''رابرٹو کو یہ معلوم تھا کہ جب میگاٹرے کو گولی لگ گئی تو اس نے چمڑے کی تھیلی جس میں پچاس ہزار ڈالر تھے' کار میں پھینک دی ہے۔'' مسز جوڈی نے کہا۔ ''وہ چونکہ فائرنگ سے بری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا' چنانچہ اس نے تیز رفتاری سے کار چلانا شروع کر دی' اس طرح سے اس پر یہ الزام عائد کر دیا گیا کہ وہ کار لے کر موقع واردات سے فرار ہوا ہے۔ جب وہ یہاں پہنچ گیا تو اسے رقم کی موجودگی کا پتہ چلا۔ وہ شریف لڑکا ہے' اس لیے پولیس کو اس کی اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن جب وہ پولیس کے روبرو جاتا تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا کہ وہ اس ڈکیتی میں میگاٹرے کا پارٹنر تھا۔ اس اعتراف کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس نے رقم کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ اس کا اب بھی یہی ارادہ ہے کہ اس کی سمجھ میں جوں ہی کوئی مناسب ترکیب آئی' وہ اس رقم کو واپس کر دے گا۔ تم سمجھ گئے نا' مناسب سی ترکیب کا مطلب ہے کہ پولیس کو یہ پتا نہ لگے کہ وہ یہاں میامی میں رہ رہا ہے۔''

''ممی بس اب خاموش رہو۔'' مونیکا نے اسے ٹوک دیا کیونکہ وہ اس راز سے پردہ اٹھا رہی تھی کہ رابرٹو اسی مکان میں ہے۔

وہ سب یوں مسکرانے لگے' جیسے بھیڑیا اپنے شکار کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔

''تمہاری ان باتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ رابرٹو اسی سرائے کی عمارت میں چھپا ہوا ہے اور رقم بھی اس نے یہیں چھپائی ہے۔'' میلارڈ بولا۔

''تم لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرے پاس ریوالور ہے۔ اس لیے کوئی قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔'' میں نے ریوالور لہرا کر کہا۔

میری باقی باتیں کوئی نہ سن سکا' بلکہ میں خود بھی نہ سن سکا اس لیے کہ گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہوا میں بلا کی سنسناہٹ اور تندی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مکان اپنی جڑوں سے اکھڑ جائے گا۔

اس سچویشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میلارڈ نے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالنا چاہا لیکن رعد و برق کے اس طوفان کی وجہ سے میری توجہ اس کی طرف سے نہیں ہٹی تھی۔ میں نے اپنے ریوالور سے فائر کیا تو گولی اس کے ہاتھ پر پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ہاتھ کی پشت پر خون نمودار ہو گیا۔ میلارڈ نے ایک چیخ ماری اور اپنا زخمی ہاتھ تھام لیا۔

میں نے بڑھ کر فرش سے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے کینہ تھا۔

''اگر تم نے حرکت کی تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی پر پڑے گی اور تمہارا بھیجہ باہر آ جائے گا۔'' میں نے انتباہی لہجے میں کہا۔

جب اس کے ہاتھ کی تکلیف بڑھ گئی تو اس کے چہرے پر کرب نظر آنے لگا۔ وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے زخمی ہاتھ پر رومال لپیٹ لیا۔

میرے لیے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ میں انہیں غیر مسلح کیسے کروں۔ اگر میں انہیں اس کا حکم دے بھی دیتا تو بیک وقت سب پر کیسے نگاہ رکھتا۔ خیال آیا کہ مسز جوڈی اور مونیکا سے مدد لوں۔ پھر میں نے اس خیال کو از خود مسترد کر دیا۔ اس لیے کہ وہ میری مدد کیوں کرتیں۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ریوالور سنبھال لیے۔ اب بارش ہلکی ہو گئی تھی اور ہوا کا شور بھی کم ہو گیا تھا۔

''تم لاکھ پھرتیلے سہی ایڈم' لین ہم تین ہیں اور تم ہم تینوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ریوالور جیب میں رکھ لو اور رقم کا سودا کر لو۔ برابر تقسیم کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ہر ایک کے حصے میں تقریباً ساڑھے سولہ ہزار ڈالر آئیں گے۔''

''اگر مجھے یہ کام کرنا ہی ہے تو مجھے تم لوگوں کو شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ قانون نے پہلے ہی میگاٹرے اور اس کے ساتھی کی گرفتاری پر پانچ ہزار ڈالر کا انعام رکھا ہوا ہے اور پانچ ہزار اس وقت ملیں گے جب لوٹ کی رقم واپس خزانے میں پہنچائی جائے گی۔''

''اگر تم میں تھوڑی سی بھی عقل ہے تو تم ہمارے ساتھ معاہدہ کر لو گے۔'' میلارڈ نے کہا۔ ''اس لیے کہ ہم رابرٹو کو لے جانے دیں گے اور لوٹ کی رقم میں سے تمہیں حصہ بھی مل جائے گا۔ دوسری صورت میں تم کچھ نہ کر سکو گے۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''میں اتنا سمجھ دار نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں میں آ کر.....''

دفعتاً ایک بار پھر تیز ہوا کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے اور بجلی بھی چلی گئی۔ میرا جملہ ناتمام رہ گیا۔ بجلی کے تار تند ہوا کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہال پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ باقی سات افراد میری جان کے دشمن تھے' اس لیے کہ وہ خود لوٹ کی رقم چاہتے تھے اور رابرٹو کو گرفتار کر کے نیویارک پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے تاکہ انعام لے سکیں۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے لیکن میں عملی طور پر ناکارہ ہو چکا تھا۔

''ڈھب..... ڈھب.....'' میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے اپنی دھڑکنوں کی آواز کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ میں اندازے سے بائیں طرف بڑھا۔ وہاں موت کا سا سناٹا تھا' اس لیے مجھے ہول آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اس ہال میں اکیلا ہوں۔

ٹٹول ٹٹول کر راستے کا تعین کرتا ہوا میں پچھلے ہال کی طرف جانے لگا۔ میں دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی مجھ سے رگڑ کھاتا ہوا قریب سے گزرا' میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زینے کی طرف گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ سب لوگ وہاں سے گزر کر زینے کی طرف جانے کی کوشش کریں گے۔

لمبے لمبے قدم رکھ کر میں بھی زینے کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے سیدھے ہاتھ کو میں ہوا میں لہرا رہا تھا اور زینے کو ٹٹول کر رہا تھا۔ اچانک میرا ہاتھ کسی کے پیروں سے ٹکرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مجھ سے آگے ہے۔ اچانک وہ ٹھہر گیا اور کچھ کہنے لگا۔ مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ کچھ پوچھ رہا ہو لیکن تاریکی کی وجہ سے اسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔

دفعتاً کسی نے لائٹر جلایا۔ ایک شعلہ چمکا اور میرے سامنے ڈیل کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس سے چند سیڑھیاں اوپر میلارڈ کھڑا تھا۔ اچانک نیچے سے فائر ہوا' گولی ڈیل کو لگی اور وہ چیخ مار کر مجھ پر گرا۔ میں نے دھکا دے کر اسے ایک طرف کر دیا۔ لائٹر بجھ گیا تھا' وہ سیڑھی سے لڑھک کر آوازیں نکالتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا' اس لیے کہ آگے موت میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ کس طرف جانا چاہیے کہ اچانک ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور مس کرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اس طویل و عریض ہال میں کسی نے ماچس جلائی تو ہلکی سی روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ مسز

جوڈی ایک لیمپ روشن کر رہی ہے۔ لیمپ روشن کرنے کے بعد وہ سیڑھیوں کے نزدیک آئی اور پھر ایک طرف اشارہ کر کے ہکلانے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا' وہ ڈیل تھا' جو گولی لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی گردن میں گولی کا سوراخ تھا' جو واضح نظر آ رہا تھا۔

روشنی کی وجہ سے سب کے دھندلائے ہوئے چہرے دکھائی دینے لگے تھے۔ میلارڈ دس بارہ زینے اوپر کھڑا تھا اور اس نے اپنا زخمی ہاتھ دبا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا' گیری نیچے کھڑا تھا' مگر وہ دہشت زدہ تھا' ڈیل کی ہلاکت نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ مونیکا اپنی ماں کے پیچھے ہی تھی۔ نوجوان جوڑا دروازے کے قریب ہراساں کھڑا تھا۔

میرا دماغ بار بار سوال کر رہا تھا کہ ڈیل پر کس نے گولی چلائی ہے۔ اس گولی پر میرا نام لکھا تھا مگر وہ ڈیل کو لگ گئی۔ میں نے عقبی دروازے کی طرف دیکھا وہ اب بھی بند تھا' مگر دروازے کو کھول کر بند کیا گیا تھا' نہایت آہستگی سے' اس لیے کہ میرے چہرے سے ہوا کا ایک جھونکا ٹکرایا تھا۔

ہواؤں کا شور تھم گیا تو میلارڈ نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''ایڈم تم بہت خبیث ہو۔ تم نے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ڈیل کو ہلاک کر دیا۔''

''گولی نیچے سے چلائی گئی ہے میلارڈ۔'' گیری نے کہا۔ ''میرا خیال ہے مسز جوڈی یا اس کی بیٹی نے فائر کیا ہے۔''

''تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔'' مسز جوڈی نے ناگواری سے کہا۔ اس کی سرائے میں ایک قتل ہو گیا تھا' لیکن وہ پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔

''یہ..... یہ کون ہے۔'' اس نے جیسے کان لگا کر آواز سنتے ہوئے کہا۔ دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

''تم سب لوگ ہال میں جاؤ۔'' میں نے ریوالور والا ہاتھ لہرا کر کہا۔ میلارڈ' گیری' وہ جوڑا اور مونیکا ہال میں چلے گئے۔

مسز جوڈی ابھی دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ اچانک بجلی آ گئی اور ہر چیز روشن ہو گئی۔ ''بجلی کی کمپنی طوفان کے دوران بھی کبھار لائٹ آف کر دیتی ہے۔'' مونیکا نے جواز پیش کیا۔

وہ اس وقت کچن کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب بجلی گئی تھی' تب بھی وہ اسی جگہ کھڑی تھی۔ غالباً سوئچ بورڈ اندر لگا تھا اور اس نے سوئچ آف کر کے لائٹ آف کی تھی' لیکن یہ وقت ان باتوں میں الجھنے کا نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں نے آئیڈیا لگا لیا تھا کہ اس نے تاریکی کیوں کی تھی۔

مسز جوڈی نے دروازے کی چٹخنی ہٹائی تو دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ ایک شخص' جو رین کوٹ پہنے تھا اور جس کے شانے سے رائفل لٹک رہی تھی' اندر آ گیا۔ ''اسٹیئر تم!'' مسز جوڈی نے بے ساختہ کہا۔ وہ اس کی آمد پر خوش نہیں ہوئی تھی۔

''تمہارے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' اس طویل القامت شخص نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس نے اپنے شانے سے رائفل اتارنا چاہی تھی' مگر کسی خیال کے تحت رک گیا۔ ''یہ کون ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''نیویارک کا ایک پرائیویٹ سراغ رساں۔'' مسز جوڈی نے کہا۔

''واقعی۔'' اس نے چونک کر کہا۔ ''میرا تعلق شہری پولیس سے ہے اور مجھے اسٹیئر کہتے ہیں۔ تم کون ہو۔''

''ایڈم۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو۔''

''جس کام سے تم آئے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مسز جوڈی ہمیں ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ تمہارا بیٹا رابرٹو ڈکیتی کی ایک واردات میں ملوث

ہے۔ اس لیے میں یہاں آیا ہوں..... مگر مسٹر ایڈم تم اتنی جلدی کیسے آ گئے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تو یہ اطلاع ابھی ابھی آئی ہے۔''

''میرے اپنے ذرائع ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ میامی کا ایک لڑکا میگاڑے کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔ جب کہ میگاڑے بدمعاش ہے اور چھوٹی بڑی وارداتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سراغ لگاتا ہوا اس عمارت تک پہنچ گیا' جہاں میگاڑے رہتا تھا۔ وہ فلیٹ خالی پڑا تھا۔ اس کی الماری سے مجھے ایک خط ملا' جو اس کی بہن نے اسے لکھا تھا' جس پر ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ میں اندازے سے یہاں آ گیا۔''

''تم ہاتھوں میں ریوالور کیوں لیے ہوئے ہو اور یہ بہت سے آدمی کون ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''یہ میگاڑے اور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ رابرٹو کے چکر میں آیا ہے کیونکہ اس کی گرفتاری پر انعام رکھا گیا ہے۔ اس کا ایک ساتھی ہلاک ہو گیا ہے کیونکہ نیچے سے کسی نے گولی چلائی تھی۔''

''ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پچھلے ہال کی طرف گیا۔ وہاں اس نے ڈیل کی لاش دیکھی اور سر ہلاتا ہوا واپس آ گیا۔

''کیا اسے ماں بیٹی میں سے کسی نے ہلاک کیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ مجھے زیادہ شبہ اس لڑکی پر ہے۔'' میں نے کہا اور نوجوان کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا' جس کے پرس میں' میں ریوالور دیکھ چکا تھا۔

سب لوگ چونک کر اس لڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ''یہ آدمی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں اور یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''مجھے لوسی کہتے ہیں اور یہ میرا شوہر جم ہے۔''

''ہم لوگ مغرب کی طرف جا رہے ہیں' یہاں کچھ پینے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔'' لڑکے نے کہا۔

''مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جب ڈیل نے ماچس جلائی تھی تو اس نے فائر کیا تھا تاکہ مجھے نشانہ بنا سکے لیکن اس کا نشانہ اچھا نہیں ہے لہٰذا گولی ڈیل کو لگ گئی اور وہ مر گیا۔ یقیناً میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اسے ڈر لگ رہا ہوگا۔ لوسی اور جم یہاں ان ہی پچاس ہزار ڈالر کے لیے آئے ہیں' جو رابرٹو نے بینک سے لوٹے تھے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔'' لوسی نے کہا۔

''اس کے پرس میں ایک ریوالور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اگر تم اسے لے کر دیکھو گے تو اس کی ایک گولی کم ملے گی اور ڈیل کی گردن سے نکالی جانے والی گولی کا اگر تجزیہ کیا جائے گا تو وہ اسی کے ریوالور سے چلائی ہوئی ثابت ہوگی۔''

لوسی نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور پرس کھول کر دیکھا۔ ریوالور پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر غیر یقینی انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''ان ماں بیٹی میں سے کسی نے اس ریوالور سے فائر کیا ہے اور پھر میرے پرس میں رکھ دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم غلط کہتی ہو۔ یہ ریوالور ان میں سے کسی نے تمہارے پرس میں نہیں ڈالا۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

''یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی۔'' اسٹیئر نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں ایک سراغ رساں ہوں اور باریک سے باریک بات کا خیال رکھتا ہوں۔''

اسٹیئر نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے وہاں میری موجودگی پسند نہیں آئی ہے۔ اس نے لوسی کا پرس مع ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر گیری کی تلاشی لے کر اس کے بغلی ہولسٹر سے ایک ریوالور نکال لیا۔ جم کی تلاشی لی تو ایک چاقو برآمد ہوا۔ جب کہ میلارڈ کا

ریوالور پہلے ہی میرے پاس تھا۔

اسٹیئر نے تلاشی کا کام مکمل کرلیا تو مجھ سے کہا۔ ”میں جب تک نیویارک فون کرکے تمہارے بارے میں تصدیق نہ کرلوں‘ اس وقت تک تم پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ دونوں ریوالور میز پر رکھ دو۔“

”سردست میں ریوالور کو اپنے پاس رکھنا پسند کروں گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”تو پھر۔“

”مجھے یہ بات پریشان کررہی ہے کہ اس طوفان بادوباراں میں تم رابرٹو کو گرفتار کرنے کیوں نکل پڑے۔ رابرٹو تو یہاں ایک مہینے سے ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا تو گرفتار ہوجائے گا۔ لہٰذا اس کی گرفتاری کے لیے طوفان میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے چند گھنٹوں کے لیے موخر بھی تو کیا جاسکتا تھا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”پھر یہ کہ نیویارک کی پولیس کبھی کسی کو ایسی مہم پر تنہا نہیں بھیجتی۔ تم اکیلے کیسے آگئے۔“

اسٹیئر کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے‘ لیکن وہ مجھے خون خوار نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔

”یہ جاسوس احمق نہیں ہے۔“ میلارڈ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”یہ انعام کی ساری رقم بلکہ اس سے زیادہ خود رکھنا چاہتا ہے۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ رابرٹو اوپر ہے۔“ اسٹیئر نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

”ہاں..... میرا اندازہ ہے۔“

”تم ان لوگوں کا خیال رکھو‘ میں اوپر جارہا ہوں۔“ اس نے اپنی رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس کے خلاف کچھ ہوا تو میں تمہارا لائسنس منسوخ کرادوں گا۔“

وہ پچھلے ہال میں گیا اور پھر زینے طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ میں نے مسز جوڈی اور اس کی بیٹی مونیکا کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پرسکون تھے اور وہ اضطراب کا شکار نہیں تھیں۔ باہر ہواؤں میں تندی بڑھ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وقت بہت دھیمے انداز میں گزر رہا ہے۔ ہم سب اسٹیئر کی واپسی کے منتظر تھے‘ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا‘ لیکن وہ اضطراب میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

”رابرٹو اوپر نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مگر تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ دوسروں کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔“

میلارڈ‘ گیری‘ لوسی اور جم ہمیں نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ ہم لوگ آپس میں لڑ پڑیں۔

”میں ٹوائلٹ کی طرف جارہا ہوں‘ منہ دھونے۔“ میں نے کہا۔

اسٹیئر دروازے میں کھڑا ہوکر مجھے ٹوائلٹ میں جاتے دیکھتا رہا۔ میں نے چند لمحے وہاں گزارے‘ پھر ٹوائلٹ سے نکل کر عقبی دروازے کی طرف اس طرح سے بڑھا کہ میلارڈ مجھے نہ دیکھ سکا۔ عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ کسی نہ کسی نے رابرٹو کو باہر نکلنے میں مدد دی ہے۔ دروازہ کھولا اور پھر بند کردیا ہے۔ یہ کام مونیکا کرسکتی تھی‘ کیوں کہ جب مسز جوڈی نے لیمپ روشن کیا تھا تو مونیکا عقبی ہال میں تھی۔ ماں بیٹی کو بہرحال اتنا تو اندازہ تھا کہ رابرٹو زینے پر کہیں کھڑا ہوگا‘ اس لیے انہوں نے تاریکی کرکے اسے فرار کرادیا۔

میں نے عقبی دروازہ کھولا تو ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا بارش کے ساتھ میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں جلدی سے باہر نکل گیا اور میں نے دروازہ باہر سے بند کرکے بولٹ چڑھا دیا۔ ہوا تیز تھی اور بارش ہورہی تھی‘ اس لیے میں نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ سہ پہر کا وقت تھا‘ لیکن نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں مدھم چاندنی میں کھڑا ہوں۔

ہوا کے ایک جھکڑ کے ساتھ کوئی چیز اڑتی ہوئی میری طرف آئی۔ میں گھبرا کر فرش پر لیٹ گیا۔ وہ چیز دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا‘ وہ سیڑھی تھی جسے میں نے روشن دان اور کھڑکیاں بند کرنے میں استعمال کیا تھا اور اس کے بعد اسے وہیں لگا کر کھڑا کردیا تھا‘ اگر میں بروقت لیٹ نہ جاتا تو سیڑھی اتنی زور سے مجھ سے ٹکراتی کہ میری زندگی کا خاتمہ ہوجاتا۔

میں اس وقت تذبذب کے عالم میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اندر جاؤں یا باہر رہ کر رابرٹو کو تلاش کروں۔ اگر مجھے وہ رقم حاصل کرنا تھی تو باہر رہنا مناسب تھا۔ مجھے اس طوفان سے مقابلہ کرنا تھا۔ عقبی دروازے کے قریب ایک درخت لگا تھا جو ہوا کے زور سے دہرا ہوا جارہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گیا اور اس سے لپٹ گیا۔

ہوا کی تیزی کی بنا پر زمین پر پڑی ہوئی چیزیں ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھیں۔ میں نے گردن گھما کر گردوپیش کا جائزہ لیا تو مجھے سرائے کے علاوہ کچھ فاصلے پر ایک اور عمارت بھی نظر آئی۔ میں درختوں اور جھاڑیوں کو پکڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائی گئی ایک جھونپڑی تھی۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ تیز ہوا کی وجہ سے جھونپڑی کانپ رہی تھی اور ہر لحظہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے بنیادوں سے اکھڑ کر دور جاپڑے گی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس طوفان بادوباراں میں رابرٹ زیادہ دور تک نہیں جاسکتا۔ طوفان سے بچنے کے لیے یقیناً اس نے اسی جھونپڑی میں پناہ لی ہوگی۔

میں جھونپڑے کے مزید قریب ہوگیا اور ایک درخت کی جڑوں کو تھام کر زمین پر لیٹ گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس لکڑی کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سر باہر نکلا۔ وہ قرب وجوار کا جائزہ لے رہا تھا اور سرائے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے پتلون سے ریوالور نکال لیا اور اس کی طرف رخ کرکے چیخ کر کہا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“

میں نے رابرٹو کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا‘ لیکن اس کی بہن کو تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکا تھا‘ اس لیے میں نے اسے پہچان لیا۔ بھائی بہن میں زبردست مماثلت تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر میرے ریوالور پر پڑی تو اس نے بے چارگی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ میں نے کہا۔ ”اندر چلو۔“ وہ اندر گیا تو میں بھی لپک کر جھونپڑی میں چلا گیا۔ جھونپڑی میں دائیں جانب ایک گدا بچھا تھا اور بائیں جانب ایک میز اور کرسی تھی۔ میز پر لیمپ روشن تھا۔

رابرٹو کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ چہرے سے معصوم لگتا تھا مگر میرا سابقہ ایسے مجرموں سے بھی پڑ چکا تھا جو چہرے سے اس سے زیادہ معصوم لگتے تھے‘ اس لیے میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لینے میں تامل نہیں کیا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں اور کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔

”تم کون ہو۔“ بالآخر اس نے پوچھا۔

”نیویارک کا ایک پرائیویٹ سراغ رساں۔“

”میرا ابھی یہی خیال ہے۔ جب میں زینے پر کھڑا تھا‘ تو میں نے تمہاری باتیں سنی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم مجھے گرفتار کرکے نیویارک لے جانا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔ میں تمہیں میامی پولیس کے حوالے کردوں گا۔ وہ تمہیں نیویارک پہنچانے کا بندوبست کرے گی۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں تم پر مقدمہ چلایا جائے گا۔“

”میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہی کچھ ہوگا۔ مجھے یہاں پناہ نہیں لینا چاہیے تھی‘ مگر میں یہاں

سے جاتا بھی تو کہاں۔ میرے چھپنے کے لیے کوئی اور جگہ بھی تو نہیں ہے۔ ساری عمر میں نے یہیں گزاری ہے' میں دل مضبوط کر کے پہلی مرتبہ اپنے گھر سے نکلا اور نیویارک گیا' لیکن مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ میگاٹرے کا ساتھ دینے پر مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ بہرحال اس میں میگاٹرے کا اتنا قصور نہیں ہے' جتنا لوسی کا۔ یہ سب لوسی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''لوسی تو میرا خیال ہے کہ یہاں موجود ہے۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں۔ جب وہ سرائے میں آئی تھی' میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھ پاتی' میں چھپ گیا۔ بات پرانی ہے' مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ اس کے توسط سے میری ملاقات میگاٹرے سے ہوئی۔ یہ سب دولت مند ہیں' جبکہ میں صرف ایک معمولی مزدور۔ اس وقت میگاٹرے نے مجھے کار ڈرائیونگ کی آفر دی تو میں نے اسے قبول کرلیا۔ حالانکہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تین سوڈالر روز کی پیشکش کررہا ہے تو ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مگر لوسی کو خوش رکھنے اور اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے میں نے یہ پیشکش قبول کرلی۔''

''تم سادہ لوح ہو' اس لیے تم نے تین سوڈالر روز کی پیشکش قبول کرلی' ورنہ لوٹ مار کے معاملے میں تو لوگ برابر کا حصہ طلب کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تو صرف لوسی کے خیال سے میگاٹرے کی آفر قبول کرلی' ورنہ میرے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے ایسا ناجائز اور غیر قانونی کام لینا چاہتا ہے۔'' رابرٹو نے کہا۔

''تم سادہ لوح ہونے کے ساتھ ساتھ احمق بھی ہو۔ اس لیے کہ بلاسوچے سمجھے لوسی کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ حالانکہ وہ کسی اور لڑکے سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ یہاں آئی ہے' اسے موقع ملا تو وہ تمہیں قتل کرنے سے بھی نہیں چوکے گی۔''

''اپنی ان حماقتوں پر میں اپنے کو ملامت کرتا رہتا ہوں۔ بہرحال اب میں اپنی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے ممی اور مونیکا کا خیال رہتا ہے کہ میرے بعد معلوم نہیں' ان لوگوں پر کیا گزرے گی۔''

''لوٹ کی رقم کہاں ہے۔''

''وہ یہیں ہے۔ ساری کی ساری' لیکن میں اسے حکام کے علاوہ کسی اور کو نہیں دوں گا۔'' وہ بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تم سمجھ دار ہوتے جارہے ہو۔''

''ہاں۔ مگر کافی ٹھوکریں کھانے کے بعد۔''

ہم باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہی جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور مونیکا اندر داخل ہوئی۔ وہ بارش میں بھیگتی ہوئی آئی تھی' اس لیے لباس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ اس کے نشیب وفراز نمایاں تھے۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور شانے پر بکھر رہے تھے۔

اس کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی' جس کی نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈال رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں نے تھوڑی سی بھی حرکت کی تو وہ گولی ماردے گی۔

''اب تم یہاں سے فرار ہوجاؤ رابرٹو۔'' اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر یہ خیال رکھنا کہ پولیس آفیسر اسٹیئر بھی سرائے سے باہر آگیا ہے اور تمہیں تلاش کررہا ہے۔''

جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مونیکا نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس لیے ہوا کے جھونکے اندر آنا شروع ہوگئے تھے۔ میں نے ایک سائے کو سرائے سے نکل کر آڑے ترچھے انداز میں چل کر جھونپڑی کی طرف آتے دیکھا۔ اس کے

لباس سے میں نے اسے پہچان لیا' وہ گیری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سرائے میں سے وہ اور اس کے علاوہ دوسرے لوگ رابرٹو اور اس کی رقم کے چکر میں نکل آئے ہیں۔ اسٹیئر کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان لوگوں کو روکتا۔ اسے تو خود رقم کی فکر تھی۔ وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔

''رابرٹو یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' مونیکا نے کہا۔

''میں بھاگ کر کہاں جاؤں۔'' رابرٹو نے بے بسی سے کہا۔

''یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ کہیں بھی چلے.....'' اس کا جملہ مکمل نہ ہوسکا اس لیے کہ ہوا کا ایک زبردست ریلا اندر آگیا تھا اور اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ میں نے لپک کر اس کی رائفل کی نال پکڑلی اور اس کا رخ دوسری طرف کردیا تاکہ اس کی انگلی اگر ٹریگر پر دب بھی جائے تو کوئی ہلاکت عمل میں نہ آئے لیکن میں کوشش کے باوجود اس سے رائفل چھیننے میں کامیاب نہ ہوسکا' اس لیے کہ اس نے رائفل کو نہایت مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''رابرٹو یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' اس نے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ اس کا تنفس تیز ہوگیا تھا' اس وجہ سے نشیب وفراز نمایاں ہوگیا تھا۔

مگر وہاں سے بھاگنے کے بجائے رابرٹو نے بہن کی مدد کا فیصلہ کیا۔ وہ دوڑ کر میرے قریب آیا اور میری پشت پر چڑھ کر اس نے گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔

میں ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا جبکہ دائیں سے میں نے رائفل کی نال تھام رکھی تھی۔ رابرٹو میری پیٹھ پر لدا ہوا تھا اور اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔

اس وقت میں اچھلنے کودنے اور بل کھانے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ رائفل کی نال کا رخ تو دوسری طرف تھا لیکن اس سے فائر ہوجاتا تو اس کا بھی امکان تھا کہ ہم میں سے کوئی زخمی نہ ہوجائے۔

اچانک جھونپڑی میں ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا اور ہم تینوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے گر گئے۔ کیچڑ پانی میں لت پت ہم تینوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سے دوسرے پر قابو پالیں۔

''دوستو! فرش سے اٹھ جاؤ اور اپنے ہاتھ اٹھالو۔ کیوں کہ صورت حال اب ہمارے قابو میں ہے۔ ہم ماسٹر آف دی سچویشن ہیں۔'' ایک گونج دار آواز آئی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لوسی اور اس کا بوائے فرینڈ جم نزدیک کھڑے تھے' جم کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ غالباً سرائے سے نکل کر انہوں نے اپنی کار سے اسلحہ نکال لیا تھا۔

میں اس وقت گویا مشکل میں تھا' اس لیے کہ میرا ریوالور والا ہاتھ رابرٹ کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ''تم لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوجاؤ۔'' لوسی نے کڑک کر کہا اور جم کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ جم نے مڑ کو جھونپڑی کا دروازہ بند کردیا' جس سے ہمیں ہوا کے جھکڑوں سے نجات مل گئی۔

☆☆

جم دروازے کی طرف پلٹ کر ہماری طرف آیا اور اس نے مونیکا کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل اور میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ اس نے میلارڈ کا بھاری ریوالور بھی میری ہپ پاکٹ سے نکال لیا۔

''اب بتاؤ کہ لوٹ کی رقم کہاں ہے۔'' لوسی نے گرج کر پوچھا۔

رابرٹو نے اس کی طرف زہر آلود نگاہ سے دیکھا۔ اس کے انداز تکلم سے وہ قطعی ہراساں نہیں تھا۔ ''اگر میں تمہاری ہدایت پر عمل نہیں کروں گا تو تم مجھے گولی ماردوگی۔ غالباً یہی سلوک قانون بھی کرے گا۔'' رابرٹو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک

ہے تو اپنا شوق پورا کرلو۔"

"لیکن میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گی۔ میں تمہاری بہن کو شوٹ کردوں گی ڈارلنگ۔" لوسی نے دھمکی دینے والے انداز سے کہا۔

اس کا انداز ایسا تھا کہ میں سہم گیا۔ اس لیے کہ لوسی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ موت کے ہزار روپ ہوتے ہیں' لیکن موت کا یہ روپ سب سے بھیانک تھا۔

"لوسی تم میری دوست رہ چکی ہو۔" رابرٹو نے اسے یاد دلایا۔

"میں وہ سب باتیں فراموش کرچکی ہوں۔" لوسی نے کرختگی سے کہا۔ "اس وقت مجھے ایک ہی بات یاد رہ گئی ہے کہ پچاس ہزار ڈالر تمہارے پاس ہیں' جن کی مجھے اشد ضرورت ہے۔ رابرٹو اس کے بارے میں اپنی زبان کو جلدی سے زحمت دو ورنہ۔"

"او کے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" رابرٹو نے بے چارگی سے کہا۔

"تمہیں یہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بتا دو کہ رقم کہاں رکھی ہے۔" لوسی نے غضب ناک ہوکر کہا۔ اس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔

رابرٹو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' لیکن ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔ اس لیے کہ کوئی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ "قانون کے نام پر دروازہ کھولو۔" کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ تو وہی پولیس والا معلوم ہوتا ہے۔ اب کیا کریں۔" جم نے تشویش سے کہا۔

"بہت آسان سی بات ہے۔ تم جا کر دروازہ کھولو' مگر آڑ میں رہنا' جوں ہی اس کی نگاہ ہم پر پڑے گی وہ ہمیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دے گا۔ تم دروازے کی آڑ سے نکل کر اس پر قابو پالینا۔" لوسی نے کہا۔ "ٹھیک ہے نا۔"

جم نے اثبات میں سر ہلا دیا' مگر وہ اضطراب میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کے اعصاب لوسی کی طرح مضبوط نہیں ہیں۔

مونیکا چیخی تا کہ باہر کھڑا اسٹیئر محتاط ہو جائے' لیکن پہلی بات یہ کہ ہوا کا شور تھا اس لیے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ صرف شور وغل یا چیخوں سے اسٹیئر کیا نتیجہ اخذ کرسکتا تھا۔

میں اس توقع پر فرش سے اٹھنے لگا کہ لوسی کسی لمحے میری طرف سے غافل ہوگئی تو میں اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دوں گا' لیکن لوسی نے اس کا اندازہ لگالیا اور چیخ کر حکم دیا کہ میں جہاں پڑا ہوں' وہیں پڑا رہوں۔

جم نے دروازے کی آڑ میں ہوکر اسے کھول دیا مگر دروازہ کھلتے ہی اسٹیئر اندر نہیں آیا بلکہ اس کے بجائے ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا اندر آیا' اسٹیئر کو تو ہوا نے اچھال کر تقریباً دس فٹ دور پھینک دیا تھا۔

لوسی کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور صاف لگ رہا تھا کہ اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ وہ دھپ سے جم کو ساتھ لے کر گری' جو ہوا کے زور سے وہاں تک آگیا تھا۔

فرش پر گرتے ہی لوسی کا ریوالور چل گیا' مگر کوئی اس کی زد میں نہ آسکا' اس لیے کہ اس کا رخ چھت کی طرف تھا' اسی اثناء میں ہوا کچھ ایسی تیز چلنے لگی کہ اس جھونپڑی کی چھت اڑ گئی۔ اب ہم سب کھلے آسمان تلے کھڑے تھے اور بارش ہمارے جسموں کو بھگو رہی تھی۔

ہوا کی تندی میں کوئی کمی نہ آئی اور جھونپڑی کی ایک دیوار بھی گر پڑی۔ پھر تو زبردست طوفانی تھپیڑے اندر آنے لگے' جس سے تین اور دیواریں لرزنے لگیں اور جھونپڑی میں رکھی چیزیں گرداب میں گھومنے لگیں' کرسی یکایک کمرے میں زور سے ناچنے لگی پھر اوپر اٹھی اور جھونپڑی سے باہر چلی گئی۔ اس کے بعد میز بھی ایک دیوار سے رگڑ کھاتی باہر نکل گئی۔

میں فرش سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس میں کامیاب نہیں ہو پارہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پرشور آواز کے ساتھ جھونپڑی کی بقیہ تین دیواریں بھی گرگئیں۔ لکڑی کے بہت سے تختے کھڑکھڑاتے ہوئے ہمارے اوپر آگرے۔

میں لکڑی کے فرش سے چپکا پڑا رہا۔ پھر ہوا کے زور سے وہ چوبی تختے بھی اڑنا شروع ہوگئے۔ جب میرے گرد پڑے ہوئے تختے ہٹ گئے تو میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ جھونپڑی میں موجود لوگ تتر بتر ہوگئے تھے' لوسی میرے نزدیک ساکت پڑی تھی' اس کی کنپٹی میں ایک بڑا سا سوراخ ہوچکا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لکڑی کا کوئی ٹکڑا آکر اس کی کنپٹی پر لگ گیا ہے' اس لیے اس کی موت واقع ہوگئی ہے۔ اس کی انگلیوں میں اب بھی ریوالور پھنسا ہوا تھا۔

میں اس کی انگلیوں سے ریوالور نکالنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ میری نظر مونیکا پر پڑی جو ایک بھاری تختے کے نیچے سے رینگ کر نکل رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور چہرے پر جابجا خراشیں پڑی تھیں۔ وہ ایک طرف اشارہ کرکے اضطراب سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

میں نے اس طرف گھوم کر دیکھا' جم فرش پر اوندھا پڑا تھا اور اڑ کر جھونپڑی کے آخری گوشے میں چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں مونیکا کی رائفل دبی ہوئی تھی اور وہ میرا نشانہ لگانے کی کوشش کررہا تھا' لیکن تیز ہوا کی وجہ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ زخمی معلوم ہوتا تھا ورنہ دو چار گولیاں چلا چکا ہوتا۔

میں نے لوسی کی انگلیوں سے ریوالور نکالنا چاہا' لیکن ممکن نہ ہوا' اس لیے کہ اس کی انگلیاں اکڑ چکی تھیں۔ جب کہ جم کہنیوں کے بل اٹھ کر میرا نشانہ لینے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے دو چار جھٹکے دیے تو ریوالور پھسل کر لوسی کی انگلیوں سے نکل گیا۔

جم نے گولی چلائی مگر اس کا نشانہ بہک گیا اور گولی میری ران کو چھوتی ہوئی گزر گئی' میری ران کا وہ حصہ گرم ہوگیا' جم کا سر جھک گیا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی تھی۔

مجھے موقع مل گیا۔

جم نے دوسرا فائر کرنا چاہا لیکن میرے ہاتھ میں دبے ریوالور کی نال سے گولی نکلی اور ٹھیک اس کی پیشانی پر پڑی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ تب مجھے رابرٹو نظر آیا۔

وہ بیس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں پتھر دبا ہوا تھا' غالباً اس سے پہلے بھی وہ ایک پتھر سے جم کی کھوپڑی کو نشانہ بنا چکا تھا اس لیے جم کا نشانہ بہک گیا تھا۔ گویا اس نے ایک طرح سے میری جان بچائی تھی۔

مونیکا دوڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ اس نے رابرٹو کو سہارا دے کر اٹھایا۔ رابرٹو اٹھ گیا' مگر ہوا میں اتنی تیزی تھی کہ ان کے گر پڑنے کا احتمال تھا' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑھکتے ہوئے دور چلے جاتے۔ خود مجھے بھی کافی دقت پیش آرہی تھی' اس لیے میں جھکا ہوا تھا اور میں نے فرش کا ایک تختہ تھام رکھا تھا۔ اچانک ہوا اتنے زور سے چلی کہ میں نے جو تختہ پکڑ رکھا تھا وہ چرچرا کر اپنی جگہ سے اکھڑ گیا۔

میں نے اسے چھوڑ کر دوسرا تختہ تھام لیا۔

پہلا تختہ ٹوٹ جانے سے اس کے نیچے ایک گڑھا نمایاں ہوگیا تھا اور اس گڑھے میں ایک چرمی تھیلی رکھی تھی۔ غالباً رابرٹو نے رقم کی تھیلی گڑھے میں رکھنے کے بعد اس پر لکڑی کا تختہ ٹھونک دیا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے وہ تھیلی نکال لی' مگر پھر اپنی حماقت کا احساس ہوا اس لیے کہ میرے اطراف میں موجود لوگ باآسانی اس تھیلی کو دیکھ سکتے تھے۔ یاد آیا کہ جھونپڑی کی چھت

اڑنے سے پہلے میں نے اسٹیئر کو دروازے پر منڈلاتے دیکھا تھا اگر وہ کسی درخت کی آڑ میں ہوا تو اس تھیلی کو دیکھ لے گا اس لیے میں نے تھیلی چھوڑ دی۔ وہ اسی گڑھے میں جا کر گر گئی۔

اچانک عقب سے قدموں کی چاپ ابھری تو میں پلٹ کر اس طرف ہو گیا۔ اسٹیئر جوتوں سے دھمک پیدا کرتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنی رائفل سے میرا نشانہ لے رکھا تھا لیکن میرے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال بھی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ گویا ہم ایک دوسرے کو گولی مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

وہ میرے قریب آ کر رک گیا اور اس نے کہا۔ ”گویا تم نے رقم تلاش کر لی۔“

”ہاں۔ اس لیے انعام کا حق دار بھی میں ہی ہوں۔“

”اس بارے میں بعد میں گفتگو کریں گے۔ پہلے وہ تھیلی میرے حوالے کر دو۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

میں نے تھیلی دینے میں کوئی عجلت نہیں برتی۔ اس لیے کہ مجھے اس کی طبیعت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پولیس والے ایمان دار ہوتے ہیں اور بے ایمان بھی۔

اس لیے میں نے تھیلی نہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

”تھیلی بہت مناسب جگہ پر پڑی ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔“ میں نے کہا۔

میرا کورا سا جواب سن کر اس کے چہرے پر برہمی کے آثار ابھر آئے۔ اس لیے کہ معاملہ پچاس ہزار ڈالر یا کم از کم انعام کے دس ہزار کا تو ضرور تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے گولی مارنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ یہ بات وہ نہایت آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ میں اس کے فرائض کی بجا آوری میں آڑے آ رہا تھا۔ میں بہرحال ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اس لیے اس کی بات پر یقین کر لیا جاتا۔

دوسری طرف میرے لیے بھی یہ مشکل تھی کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ معاملہ رقم ہی کا نہیں، خود میری زندگی کا بھی تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ وہ کھڑا تھا اور میں بیٹھا، تیز ہوا کے ساتھ آئی ہوئی بارش ہماری بصارت کو معدوم کر رہی تھی، اس لیے ہم نے اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ سے چھجا سا بنا رکھا تھا۔

دائیں جانب سے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا، وہ ایک سیڈان تھی، جو ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کار میں میلارڈ اور گیری بیٹھے تھے۔ میلارڈ پسنجر سیٹ پر تھا اور کھڑکی سے ایک ہاتھ نکالے فائرنگ کر رہا تھا۔

”ڈز..... ڈز.....“ گولیاں میرے دائیں بائیں سے گزرنے لگیں، گیری کار ڈرائیو کر رہا تھا، اس لیے میلارڈ بہ آسانی فائرنگ کر رہا تھا۔

وہ ہمارے مشترکہ دشمن تھے، لہٰذا ہمیں ان کا مشترکہ مقابلہ کرنا تھا۔ چنانچہ اسٹیئر میرے نزدیک فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ ”تم کار کے ٹائروں پر فائر کرو، میں اس حرام زادے کو دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ ٹکایا اور فائرنگ شروع کر دی۔

”ڈز..... ڈز۔“ گولیاں کار کی باڈی پر پڑنے لگیں۔ تیسری گولی دائیں جانب کے ٹائر پر لگی، ایک زور کا دھماکہ ہوا اور سیڈان کی رفتار دھیمی ہو گئی۔

”دھائیں..... دھائیں..... دھائیں۔“ اسٹیئر کی رائفل بھی گرج رہی تھی۔ میلارڈ نے کھڑکی سے نیچے ہو کر خود کو بچانا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک گولی اسے چاٹ گئی، چند لمحوں پہلے جہاں اس کی ناک تھی، وہاں ایک بڑا سا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی دلخراش تھی۔

اس کی لاش گیری پر گری تو اس کے ہاتھ سے کار کا اسٹیئرنگ نکل گیا اور کار کسی مخمور سانپ کی طرف لہرانے کے بعد ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

گیری سراسیمگی میں کار سے کودا اور ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ اسٹیئر نے اپنی رائفل اس کی طرف اٹھا دی، مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ گیری کی ٹانگوں کا نشانہ لینے کے بجائے اس کے سینے کا نشانہ لے رہا تھا۔ گویا وہ نہیں چاہتا تھا کہ گیری زندہ بچنے پائے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے بعد میری باری ہے اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بس یہی ایک موقع تھا کہ میں کچھ کر گزرتا لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ گیری کو گولی مارتا، میں نے اپنے ریوالور کے دستے سے اس کی دائیں کنپٹی پر ایک زوردار ضرب لگا دی۔ اتنی زور سے نہیں کہ اس کی کنپٹی میں سوراخ ہو جاتا یا پھر اس کی کھوپڑی پھٹ جاتی۔ میں نے بس تلی ضرب لگائی تھی تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو جائے۔

ہوا بھی یہی کہ اس کے حلق سے ایک بے معنی سی آواز نکلی اور پھر اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور سر بتدریج لکڑی کے فرش سے جا لگا۔

مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ بارش کا پانی مسلسل اس پر گرے گا تو وہ تھوڑی سی دیر میں ہوش میں آ جائے گا۔ جہاں تک اس واقعے کا تعلق ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک بھاری تختہ اس کے سر پر آن لگا تھا، اس لیے وہ بے ہوش ہو گیا۔ حالانکہ اس نے مجھے کنپٹی پر ضرب لگاتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ کسی دوسرے کے سامنے یہ بات کہتا تو کوئی گواہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوران میں گیری بھاگتا ہوا سرائے کے پیچھے جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بہرحال اسے اپنی زندگی بچ جانے پر میرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے چاروں طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ اس لیے کہ بارش تھم گئی تھی اور ہوا کی سنسناہٹ بھی کم ہو گئی تھی۔ میں بے جان سا اوندھا پڑا تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی، میں نے سر اٹھایا تو رابرٹو کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ لوسی اور جم کی لاشوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کین گاہ بے ہوش اسٹیئر اور میلارڈ کی تباہ شدہ کار کی طرف گئی، میلارڈ دوری کے باوجود کار کے اسٹیئرنگ پر ڈھلکا ہوا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ تم اب تک فرار ہو چکے ہو گے۔“ میں نے کہا۔

”فرار ہونا مجھے ایک بزدلانہ اقدام لگا، اس لیے کہ لوسی سمیت اتنے سارے لوگ محض میری وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ پہلے اس گڑھے سے رقم کی تھیلی نکالو اور اس کے بعد مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔“ میں نے کہا۔

اس نے گڑھے سے چرمی تھیلی نکال کر میرے حوالے کر دی اور اس کے بعد مجھے سہارا دے کر سرائے کی طرف جانے لگا، جس کے دروازے پر مسز جوڈی اور مونیکا متفکر سی کھڑی تھیں۔

”اس نے تمہیں پکڑ لیا۔“ مونیکا نے اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”نہیں۔ میں نے فرار ہونے کا خیال ترک کر دیا ہے۔“ رابرٹو بولا۔ ”میں خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

”رابرٹو کا معاملہ اتنا خراب نہیں ہوا ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بچ جائے۔“

میرے جملے کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ماں بیٹی میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھیں، جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ میں رابرٹو کے ساتھ سرائے میں داخل ہو گیا تو مونیکا نے مجھے بیٹھنے

کے لیے کرسی پیش کی' گیری کی گولی لگنے سے میری ران سے خون بہہ رہا تھا۔

''طوفان زیادہ دیر کا نہیں تھا۔'' میں نے صورت حال پر تبصرہ کیا۔

''یہ نہ سمجھو کہ طوفان ختم ہوگیا ہے۔'' مسز جوڈی نے کہا۔ ''ابھی اس سے بھی شدید طوفان آئے گا۔ ایک کے بعد دوسرا طوفان آتا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ درمیان میں البتہ سناٹا چھا جاتا ہے۔''

''تم لوگوں کو صرف طوفان کی فکر ہوتی ہے' تم ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے' جو طوفان سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں اور اپنی جیبوں میں ریوالور رکھ کر گھومتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

رابرٹو نے رقم کی تھیلی فرش پر رکھ دی اور گہرا سانس لے کر بولا۔ ''اس میں پچاس ہزار ڈالر ہیں اور میں مجرم کی طرح تمہارے سامنے ہوں۔ اب تم جو سلوک کرنا چاہو' مجھے منظور ہے۔''

''مجھے یہ رقم نہیں چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''دوسرا طوفان آنے سے پہلے تم اپنی کار میں نزدیکی پولیس اسٹیشن تک جاؤ گے' پھر وہاں جا کر یہ کہو گے کہ خود کو قانون کے حوالے کرنے آئے ہو۔ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے' اس کی تفصیلی رپورٹ دے دینا' مگر یہ نہ کہنا کہ تم نے فرار کی کوشش کی تھی۔''

''پھر۔''

''تم یہ کہنا کہ تمہیں اندیشہ تھا کہ کوئی رقم لوٹنے کی کوشش نہ کرے' اس لیے تم اسے پولیس اسٹیشن لے آئے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے اور اصل مالکان تک پہنچ جائے۔''

''لیکن تم مجھے اس رقم کے ساتھ نہیں لے گئے تو تمہیں انعام نہیں ملے گا۔'' رابرٹو نے حیرت سے کہا۔

''تم نے میری زندگی بچائی ہے' اس لیے میں اب انعام کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔''

میں نے کہا۔

''مگر مجھے تو دونوں صورتوں میں جیل نصیب ہوگی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق تو کافی پڑتا ہے' تمہارے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ تمہارا ماضی صاف ستھرا ہے' اس کے علاوہ میگا ٹرے نے دھوکے سے تمہیں اپنی کار ڈرائیو کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ پھر یہ کہ تم اپنی مرضی سے خود کو قانون کے حوالے کر رہے ہو اور لوٹ کی رقم بھی لوٹا رہے ہو' اس طرح سے تمہارا جرم بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میں تمہارے حق میں گواہی دوں گا کہ تم نے دشمنوں سے مقابلہ کیا اور کس طرح سے میری جان بچائی ہے۔ یہ سب باتیں جیوری کو متاثر کریں گی' جس طرح سے مجھے تم نے اپنی سادہ لوحی اور معصومیت سے متاثر کیا ہے اس طرح سے تم ارکان جیوری کو بھی متاثر کر لو گے۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہیں دو سال کی سزا ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ چھ مہینے کے بعد پیرول پر رہا کر دیا جائے۔''

''تم اپنے دس ہزار ڈالر کا انعام چھوڑ رہے ہو۔'' مونیکا نے حیرت سے کہا۔

''دس ہزار ڈالر ہی نہیں' میامی تک آمد و رفت کے اخراجات بھی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ایک بڑے مقصد کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ رابرٹو رہائی پا کر واپس آئے گا اور ایک نئی زندگی شروع کر دے گا' تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ہم سب ایک چھوٹے سے گروپ کی شکل میں کھڑے تھے۔ ماں' بیٹی' بیٹا اور میں۔ ان کے چہرے ایک نئی امید اور روشن مستقبل کے خیال سے چمک رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی کی خوش خبری کی دمک تھی۔

میرے لیے یہ سب چیزیں انعام کی رقم سے زیادہ قیمتی تھیں۔

اس فنکار کی کہانی جس کی بیوی وفا کے امتحان میں سرخرو ٹھہری

لاجواب

فن کار کو اپنے فن کا دائرہ اپنے پرستاروں تک ہی محدود رکھنا چاہیے اگر ان کی فن کاریاں گھر میں داخل ہو جائیں تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ایک اداکار کی کہانی اسے اپنی شریک حیات کی آزمائش مقصود تھی۔

سید عاطر شمیم

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

وسیم فلم انڈسٹری کا مصروف ترین اداکار تھا۔ وہ بیک وقت کئی زیر تکمیل فلموں میں کام کر رہا تھا۔ بطور ہیرو اس کی کئی فلمیں پے در پے سپر ہٹ ثابت ہوئی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ فائنانسر ہر اس فلم میں پیسا لگانے کے لیے آنکھیں بند کر کے تیار ہو جاتے تھے جس میں وسیم ہیرو ہوتا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ فلم کا آخری سین بار بار ری ٹیک ہونے کے باوجود او کے نہیں ہو رہا تھا۔ ڈائریکٹر اس مختصر سے سین کو آج ہی فلمانا چاہتا تھا لیکن بقول ڈائریکٹر' ہیروئن وہ رسپانس نہیں دے پا رہی تھی جو وہ چاہتا تھا...... وسیم بری طرح تھک چکا تھا۔ وہ کافی پینے کے لیے اسٹوڈیو میں بنے کافی ہاؤس میں آبیٹھا۔ وہاں میک اپ آرٹسٹ سجاد پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ وسیم اس کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں دوست تھے۔

کافی پیتے ہوئے دونوں گپ شپ کرتے رہے' اور اس دوران میں موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف وسیم کی بیوی جمیلہ تھی جس سے وسیم نے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ وسیم کو تین بار فون کر چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کے انتظار میں اب تک

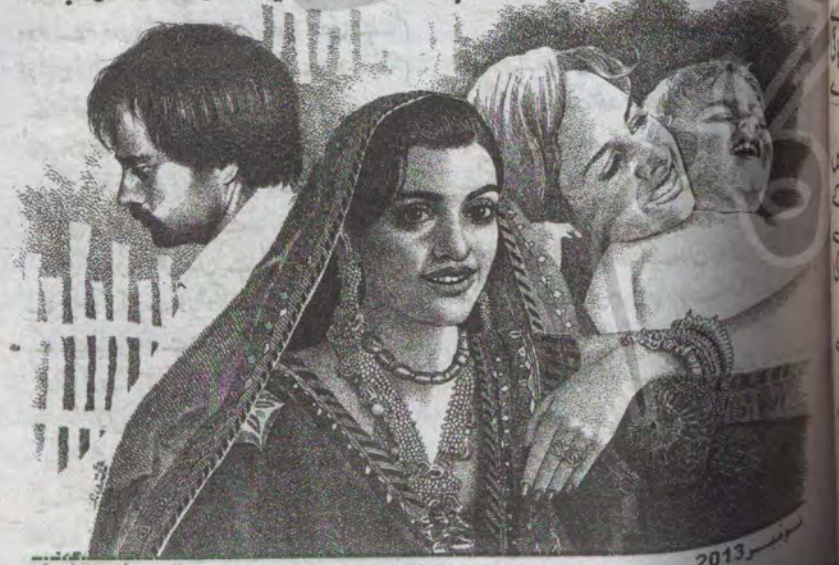

جاگ رہی تھی۔ وسیم نے اسے وجہ بتائی اور ایک گھنٹے کے اندر آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

"جمیلہ اب بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا وہ شادی سے پہلے چاہتی تھی۔" سجاد نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔" وسیم کی مسکراہٹ میں تفاخر کی جھلک تھی۔

"لیکن وسیم!" سجاد نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ہم لوگ رات گئے تک شوٹنگ میں مصروف رہتے ہیں اور ہماری بیویاں گھروں میں ہمارے انتظار میں جاگتی رہتی ہیں۔ مجھے تو شک ہونے لگتا ہے کہ ہماری مستقل غیر موجودگی ان کے لیے بے وفائی کی راہیں نہ ہموار کر دے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔"

"میں سنجیدہ ہوں ڈیئر!" سجاد نے کہا۔ "میرے ذہن میں تو ایک آئیڈیا بھی ہے اور میں جلد ہی اس پر عمل کروں گا۔"

"بہر حال..... میں جمیلہ کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" وسیم نے کہا اور لمحے بھر کے توقف کے بعد بولا۔ "فرض کرو اگر میرے ذہن میں ایسا خیال آتا بھی ہے تو میں کس طرح معلوم کر سکتا ہوں کہ جمیلہ اب میری وفادار نہیں رہی اور اس نے دوسرے مردوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ کم از کم بیوی خود تو یہ بات شوہر کو بتانے سے رہی۔" وسیم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سجاد کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا۔ محض وقت گزاری کی خاطر صرف گپ شپ کے لیے اس موضوع پر بول رہا ہے۔

"یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔" سجاد نے کہا۔ "تم یہ ظاہر کرو کہ آؤٹ اور شوٹنگ کے لیے آٹھ دس دن کے لیے باہر جا رہے ہو پھر یہیں رہ کر اپنے گھر کی نگرانی کرو۔"

"نہیں..... یہ بہت مشکل کام ہے اور۔"

"میں نے تمہیں بتایا تا کہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے جس پر میں عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" سجاد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو..... تم بھی اس پر عمل کر سکتے ہو۔"

"وہ کیا آئیڈیا ہے۔" وسیم نے بدستور بے پروائی سے پوچھا۔

"میں میک اپ کا ماہر ہوں۔ میں تمہارا ایسا میک اپ کروں گا کہ تمہاری بیوی بھی تمہیں نہیں پہچان پائے گی۔ تم یہ ظاہر کرو کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے دس دن کے لیے لاہور سے باہر جا رہے ہو اور میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارا ایسا بھیس بدل دوں گا کہ جمیلہ کو اپنی بانہوں میں لے کر پیار بھی کرو وہ یہ نہیں جان سکے گی کہ تم اس کے شوہر ہو۔ اس طرح تمہیں اپنی بیوی کو کسی کی بانہوں میں دیے بغیر یہ معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری بیوی کس قسم کی ہے۔"

"کیا واقعی تمہیں یقین ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچان پائے گی۔" وسیم نے پہلی بار دلچسپی لی۔

"ہاں' بالکل میں اپنی بیوی کو اسی طرح آزماؤں گا۔" سجاد نے جواب دیا۔ "سب سے مشکل کام آواز کا ہے' جس کے لیے میرے پاس ایک گولی ہے جسے منہ میں ڈالنے کے بعد آواز بدل جاتی ہے۔"

☆☆

سجاد کی اس دن کی گفتگو نے وسیم کو تجسس میں مبتلا کر دیا۔ وہ جمیلہ کی حرکات و سکنات پر غور کرنے لگا۔ کبھی کبھی اسے خود پر بہت غصہ آتا کہ وہ کیوں خوامخواہ اپنی محبت کرنے والی بیوی پر شک کرنے لگا ہے لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ سجاد کی ترکیب کو ضرور آزمائے گا۔ اس نے کوشش کر کے ہفتے کا وقت نکال لیا اور ایک دن بیوی کو بتایا کہ وہ شوٹنگ کے سلسلے میں مری جا رہا ہے اور اس کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوگی۔

دو دن بعد وسیم ایک پختہ عمر زمیندار کے روپ میں اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ "میں رانا محفوظ حسین ہوں۔" وسیم نے اپنی بیوی سے کہا۔ "دو دن قبل جب آپ کے شوہر ہمارے شہر آئے تو میں لاہور آئے ہوئے تھا۔ وہ آج کل پورے یونٹ کے ساتھ ہماری حویلی

میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے آپ کے نام یہ خط دیا ہے اور بہت اصرار کیا تھا کہ میں آپ کے ہاں ہی قیام کروں۔"

وسیم کی بیوی نے خط کو غور سے پڑھا اور اسے گھر کے اندر بلا لیا۔

رانا محفوظ حسین کے روپ میں وسیم نے اپنی بیوی کی گاہے بہ گاہے تعریفیں شروع کر دیں۔ اس کی ذہانت' حسن' خوش اخلاقی اور انداز گفتگو کی بہت تعریف کی۔ پھر اس نے وہ تمام داؤ' آزما ڈالے جن سے وہ اپنی بیوی کو اپنی طرف راغب کر سکتا تھا۔ اس نے زمیندار کے بہروپ میں اپنی بیوی پر حاوی ہونے کی انتہائی کوشش کی لیکن اس کی تمام کوششوں کے باوجود اس کی بیوی نے اس پر التفات کی ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

آخر کار ایک ہفتہ بعد وہ مان گیا کہ اس کی بیوی باکردار اور اس کی وفادار ہے۔ اس نے اپنے بہروپ کو توڑ ڈالا اور اپنی بیوی کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اس کی وفاداری کی تعریف کی اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا پھر تو جمیلہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ اس نے اس کے کردار پر شک کیا تھا لیکن وسیم نے اسے منا لیا۔

دوسرے دن وسیم اسی کافی ہاؤس میں سجاد سے ملا۔ سجاد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دس دن پہلے ان دونوں نے اپنی اپنی وفاداری کو آزمانے کے بعد آج کے دن یہیں ملنے کا وقت طے کیا تھا۔

"کہو وسیم! کیا سامنے آیا تمہارے۔" سجاد نے اس کے بیٹھتے ہی قدرے استہزائیہ سے انداز میں پوچھا۔

وسیم نے پوری روداد سنا دی اور آخر میں بولا۔ "مجھے یقین تھا کہ جمیلہ مضبوط کردار کی مالک ہے اور ہفتے بھر کی کوششوں میں' میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکا۔ تم اپنی سناؤ۔ تم نے اپنی بیوی کو کیسا پایا۔"

سجاد نے گویا اس کا آخری جملہ سنا ہی نہیں۔ تعجب اور قدرے رشک کے سے انداز میں اس سے پوچھا۔ "واقعی.....! تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہفتہ بھر تمہارے ساتھ رہنے کے باوجود۔"

"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں اب تم اپنی کتھا سنا ڈالو۔"

"مم..... میں' میں اپنی کتھا کیا سناؤں۔" سجاد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "میری اور تمہاری کہانی ملتی جلتی ہے۔ فوزیہ بھی ایک وفادار بیوی ہے..... اچھا وسیم اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆

دو ماہ بعد ہی فلم ایوارڈ کے فنکشن میں جمیلہ کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جس سے وہ بہت متاثر ہو گئی۔ اس نوجوان کی گھنی مونچھیں تھیں اور بال گھنگھریالے تھے۔ مجموعی طور پر اس میں عورتوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ اس کا نام اشرف چوہان تھا اور وہ بہت بڑا فلم ڈسٹری بیوٹر تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ملنے لگے اور شوہر کی غیر موجودگی میں جمیلہ اسے اپنے گھر میں بلانے لگی۔

یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ ایک دن اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے' اس کا شوہر وسیم دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

"تو یہ بات ہے۔" چند لمحے وہ ساکت کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو گھورتا رہا پھر تلخ لہجے میں بولا۔ "آخر کار میں نے تمہیں بے وفائی کرتے ہوئے پکڑ ہی لیا۔ مجھے تمہاری وفا پر کتنا یقین تھا اور تم نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا۔"

پہلے تو جمیلہ وحشت زدہ ہو گئی لیکن پھر گویا کوئی معقول جواب اس کو سوجھ گیا اور قدرے سنبھل کر بولی۔ "اوہ..... وسیم ڈارلنگ! میں بھی تمہاری طرح حیرت زدہ ہوں۔ میں سمجھ رہی تھی اس نوجوان کے بہروپ میں تم ہی ہو۔"

وسیم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہونٹ سی دیے ہوں۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ عذر بہر حال معقول تھا۔

اس شمارے کی ایک دلچسپ تحریر

رنگین رفاقتوں کے بیوپاری ایک عمر رسیدہ شخص کا عجیب فسانہ۔ اسے اپنی عزت نفس اور وقار بہت عزیز تھا' وہ دوسروں کی نظروں میں حقیر ہونا نہیں چاہتا تھا اور اسے اپنا بھرم رکھنے کا ایک خوب صورت موقع مل ہی گیا۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنے اوسان برقرار رکھنے والے سیاہ کار کا فسانہ

عزت مآب

وقار بن سعید

اس شمارے کی ایک دل گداز تحریر

لنچ مجھے اعلیٰ درجے کے ایک کلب میں گن اسٹون کے ساتھ کرنا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میرے جسم پر سیاہ سوٹ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس اب یہی ایک سوٹ قدرے بہتر حالت میں رہ گیا تھا۔ کوئی اور اس قابل نہیں تھا جسے پہن کر میں ایسی جگہوں پر جا سکتا جہاں دولت مند شرفا اور معززین کی آمد و رفت رہتی ہو۔

کلب میں گن اسٹون میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''یہ سیاہ سوٹ کیوں پہنا ہوا ہے۔''

''میرے دوسرے سوٹ ڈرائی کلینر کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ پہلے میں جواب دینے لگا تھا کہ میں ایک جنازے میں شرکت کرنے کے بعد سیدھا یہاں آ رہا ہوں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بعد گن اسٹون فوراً پوچھے گا کہ انتقال کس کا ہوا تھا۔ اس سوال کا جواب دینے میں شاید مجھے کچھ دقت پیش آتی۔ جو لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں اور مشاقی سے جھوٹ بولتے ہیں' انہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مخاطب کا اگلا سوال کیا ہو گا اس لیے یا تو وہ اس کا بھی جواب تیار رکھتے ہیں یا پھر ایسی بات ہی نہیں کرتے جس سے ان کے لیے کوئی دشواری پیدا ہونے کا امکان ہو۔

گن اسٹون میرے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ وہ لنچ کا آرڈر دے چکا تھا۔ اس روز کلب کا خصوصی لنچ سرو کیا جا رہا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ یہ لنچ سی فوڈ پر مشتمل ہوتا تھا۔ میں نے بھی انہی چیزوں کا آرڈر دیا جو گن اسٹون نے منگائی تھیں۔ وہ میرا کلائنٹ تھا اور میں نے اپنی پسند اور ناپسند کو کلائنٹ کی مرضی کے مطابق ڈھالے رکھنے کا ہنر بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔ اس سے کلائنٹ ایک لاشعوری سی خوشی محسوس کرتا تھا اور ہر کاروبار میں کلائنٹ کی خوشی بے حد اہم ہوتی ہے خواہ وہ لاشعوری ہی کیوں نہ ہو۔

درحقیقت گن اسٹون میرے ابتدائی گاہکوں میں سے تھا۔ وہ اب ستر سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ وہ اس وقت سنگاپور آیا تھا جب یہ ملک محض اپنے ربڑ کے جنگلات کی وجہ سے مشہور تھا اور یہاں صرف تھوڑی سی دکانیں اور گودام پائے جاتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وہ جاپانیوں کی قید میں بھی رہا تھا اور اس نے کافی تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں۔

اب وہ عمر کے جس حصے میں تھا اور جیسی اس کی صحت تھی' اسے دیکھ کر مجھے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی روز میں اسے کسی لڑکی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر جاؤں گا تو مجھے اس کی موت کی اطلاع ملے گی۔ اس کے جسم کا انجن کسی روز چلتے چلتے اچانک ہی بند ہو جائے گا' مشینری جام ہو جائے گی۔ ہوٹل کا کمرا چونکہ میرے نام پر بک کرایا گیا ہو گا اس لیے یہ صورت حال میرے لیے اچھی خاصی پریشانی کا باعث ہو گی اور مجھے حکام کے سامنے بعض ناروا سی باتوں کی وضاحت کرنی پڑے گی۔

کھانا آ چکا تو میں نے کہا۔ ''آج شام کے لیے میں نے بلیو مون ہوٹل میں کمرا بک کرایا ہے مسٹر گن اسٹون۔''

اس نے ایک جھینگے میں کانٹا پیوست کر کے اسے اٹھایا اور ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اس سے پہلے تم نے میرے لیے کبھی بلیو مون میں کمرا بک نہیں کرایا۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔ ''بہرحال ہوٹل اعلیٰ درجے کا ہے۔ وہاں کی سروس بہت عمدہ ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ دوسرے کسی ہوٹل میں کمرا خالی نہیں تھا۔ اس لیے مجبوری بھی تھی۔''

''یہ بتاؤ کہ وہاں مجھے جو کھانا ملے گا وہ بھی عمدہ ہو گا نا۔'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اس بار میں نے آپ کے لیے جس ڈش کا انتخاب کیا ہے وہ نہایت عمدہ اور لاجواب ہے۔'' میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے طمانیت سے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہوا۔ ہر قسم کی دکانداری میں گاہک کے اطمینان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس وقت ہم مچھلی کھا

رہے تھے۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔
''مچھلی کیسی ہے۔''
''بہت عمدہ اور لذیذ۔'' میں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں مچھلی سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔
''میری مچھلی تو بالکل بکواس ہے۔'' وہ ناک منہ چڑھاتے ہوئے بولا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پر خیال سے لہجے میں کہا۔ ''اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مچھلی کچھ۔''
''باسی ہے۔'' گن اسٹون نے جملہ مکمل کیا۔
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائید کی اور اسے مچھلی کی پلیٹ ایک طرف کھسکاتے دیکھ کر اپنی پلیٹ بھی ایک طرف کھسکا دی۔
''بڑے جھینگے بھی کچھ اچھے نہیں ہیں۔'' وہ ناگواری سے منہ چلاتے ہوئے بولا۔
اس بار میں نے جواب دینے سے پہلے ایک بڑا جھینگا پورا چبا لیا۔ وہ بے حد لذیذ تھا لیکن میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... واقعی...... ان کے بارے میں بھی آپ کی رائے ٹھیک ہی ہے۔ ان میں وہ لذت نہیں ہے جو بڑے جھینگوں میں ہونی چاہیے۔''
اس بار بھی میں نے اس کی تقلید میں جھینگوں کی پلیٹ ایک طرف کھسکا دی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ایسی ہی رائے ظاہر کرتا، میں نے جلدی جلدی ان میں سے کچھ پر ہاتھ صاف کر دیا۔ غنیمت تھا کہ اس وقت تک میرا پیٹ بھر چکا تھا جب گن اسٹون نے ویٹر کو بلوا کر کئی پلیٹیں تقریباً جوں کی توں اٹھوا دیں۔ اتنے اعلیٰ کلب میں بیٹھ کر ایسا کرنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت تھی اور یہ حوصلہ گن اسٹون جیسے خوشحال آدمی میں ہی ہو سکتا تھا۔ مجھ جیسا آدمی ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ویٹر کے چہرے سے اندازہ کیا کہ وہ بعض پلیٹوں کو تقریباً جوں کی توں واپس لے جانے میں توہین محسوس کر رہا تھا۔
''اس جگہ کا معیار بالکل گرتا جا رہا ہے۔'' گن اسٹون نے ویٹر کے جانے کے بعد تبصرہ کیا۔
''اس کے باوجود اگر یہ لوگ از راہ کرم مجھے اس کلب کا ممبر بنانا گوارا کریں تو میں بہ خوشی بن جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔
گن اسٹون نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر گن اسٹون گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے سویٹ ڈش کا وقت ہو گیا ہے۔''
سویٹ ڈش ہم کھا چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ کسی اور سویٹ ڈش کی بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا کوڈ ورڈ تھا اور وہ اسے استعمال کر کے خاصا محظوظ ہوتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح وہ ایک بہت ذہانت بھرا مذاق کرتا تھا۔ اس کی فرمائش کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں جینی کو راستے سے پک کرنے کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔
جینی، ملایا کی رہنے والی تھی۔ میرا تجربہ تھا کہ پرانے اور عمر رسیدہ گاہک ملائی لڑکیوں کو پسند کرتے تھے اور انہیں دوسری قومیتوں اور نسلوں کی لڑکیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ عیاشی کے میدان میں نئے نئے اترنے والے چینی لڑکیوں کی طرف لپکتے تھے جب کہ ملائی مرد، ملائی لڑکیوں کو ہی پسند کرتے تھے۔ میرے کئی کلائنٹ چینی مرد بھی تھے جو لمبی تڑنگی آسٹریلین لڑکیوں کو پسند کرتے تھے۔ جرمن کلائنٹس کو عموماً تامل لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ انگریزوں کی بس ایک ہی ترجیح ہوتی تھی کہ لڑکی نوجوان ہونی چاہیے۔ ویسے وہ ان لڑکیوں اور عورتوں کو زیادہ پسند کرتے تھے جن کی ظاہری شباہت کسی حد تک لڑکوں جیسی ہوتی ہو۔
امریکیوں کو صاف ستھری کھلنڈری قسم کی لڑکیاں پسند تھیں جنہیں وہ کوئی نہ کوئی نک نیم بھی

دینے کی کوشش کرتے تھے جب کہ انگریزوں کی عادت تھی کہ انہیں جو لڑکی مہیا کی جاتی تھی وہ اس کا اصل نام جاننے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ امریکی ان لڑکیوں کو ہوٹل کے پول میں سوئمنگ سکھانے کی کوشش کرتے تھے حالانکہ اس سے ان کا خرچ تیزی سے بڑھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ٹیکسی میں سفر کرتے وقت بھی چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ فٹ پاتھ پر ان کے ہمراہ چلتے وقت بھی ان پر گرے جاتے تھے اور کم نشے میں ہونے کے باوجود اپنے آپ کو زیادہ نشے میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
امریکیوں کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وطن واپس جا کر بھی ان میں سے بعض ان لڑکیوں کو خط لکھتے رہتے تھے اور لڑکیاں ان کے جواب لکھوانے کے لیے میری جان کھاتی رہتی تھیں۔
جینی کو امریکیوں نے پیار سے 'جیم پوسٹ' کا نام دیا تھا۔ وہ ملائی تھی مگر اس کا نام امریکی لڑکیوں جیسا تھا اور مختصر بھی تھا لیکن امریکیوں کو شاید اس کا امریکیوں جیسا نام پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بڑی اچھی اور قابل بھروسا لڑکی تھی۔ وعدے کے مطابق ہمیشہ صحیح وقت اور مقررہ جگہ پر پہنچ جاتی تھی مزید یہ کہ اس سے رابطہ بھی آسان تھا۔ اس کے پاس موبائل فون تھا۔
وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق آج بھی شنگھائی بینک کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔ چھوٹا سا ایک سوٹ کیس اس کے پیروں کے قریب رکھا تھا۔ یہ سوٹ کیس میں نے ہی اسے دے رکھا تھا اور محض دکھاوے کے لیے تھا۔ جب آپ کسی ہوٹل میں جا کر کمرا لیتے ہیں، اگر اس وقت آپ کے پاس ایک آدھ سوٹ کیس موجود ہو تو ذرا اچھا معلوم ہوتا ہے۔
ہم ٹیکسی میں وہاں پہنچے تھے۔ میں نے اتر کر جینی کے لیے دروازہ کھولا اور وہ مسکراتی ہوئی پچھلی سیٹ پر گن اسٹون کے ساتھ آ بیٹھی۔ میں پہلے ہی کی طرح ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس میں نے اپنی ٹانگوں کے درمیان رکھ لیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔
جینی بدستور مسکرا رہی تھی۔ گو کہ اس کے دانت کچھ ایسے خوب صورت نہیں تھے لیکن وہ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ہونٹ بھرے بھرے اور خوب صورت تھے۔ اگرچہ اس کا شمار دبلی پتلی لڑکیوں میں ہی کیا جا سکتا تھا لیکن جہاں جہاں سے اس کا جسم بھرا بھرا ہونا چاہیے تھا وہاں سے خوب بھرا بھرا تھا اور وہ عام ملائی لڑکیوں کی طرح تھکی ہاری اور لٹی پٹی نہیں لگتی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک تازہ دم اور شگفتہ نظر آتی تھی۔
''جیک! آج تم بڑے اسمارٹ لگ رہے ہو۔'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔
''یہ تمہارا حسن نظر ہے سویٹ ہارٹ!'' میں نے کہا۔
''ان سے ملو...... یہ ہیں مسٹر گن اسٹون۔ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔'' میں گردن موڑے ترچھا ہو کر بیٹھا تھا اور اس سے باتیں کر رہا تھا۔
جینی نے گن اسٹون سے مصافحہ کیا اور شیریں لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔ ''جیک کے دوست عموماً بہت اچھے انسان ہوتے ہیں۔ امید ہے آپ بھی ایسے ہی ہوں گے۔''
گن اسٹون نے اس کے خیال کی تائید یا تردید نہیں کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''جیک! تمہاری وہ چھوٹی سی کار کہاں ہے۔''
''مکینک کے پاس۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں کچھ گڑبڑ تھی۔ مرمت ہو رہی ہے۔''
حقیقت یہ تھی کہ وہ معمولی سی کار بک چکی تھی جو کبھی جینی اور گن اسٹون جیسے مہربانوں کو ان کی عارضی منزلوں تک پہنچانے میں کام آتی تھی۔ ان دنوں حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ دھندا بہت مندا

جا رہا تھا۔ لڑکیوں کو ہم جیسے درمیانی خدمت گزار افراد کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ تمام معاملات براہ راست ہی طے کرنے لگی تھیں اور یوں خاصی رقم بچا لیتی تھیں۔ بس اب تو جینی جیسی کچھ وضع دار لڑکیوں کا دم غنیمت تھا۔

ٹیکسی بلیو مون ہوٹل کے سامنے جا رکی۔ اونچی ٹوپی والے دربان نے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور گن اسٹون نیچے اتر آیا۔ میں نے ٹیکسی سے باہر نکل کر سوٹ کیس دربان کو پکڑا دیا۔ اس میں کچھ رسالے اور ایک فرسٹ ایڈ بکس تھا۔ یہ چیزیں محض جگہ بھرنے اور سوٹ کیس کو کچھ وزنی بنانے کے لیے اس میں ڈالی گئی تھیں لیکن پھر بھی فرسٹ ایڈ بکس کی افادیت بھی بہرحال اپنی جگہ تھی۔ کبھی کبھار اس کی ضرورت بھی پڑ ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو سردرد کی گولیاں اور چھوٹی موٹی خراشوں پر لگانے والی پلاسٹر بینڈیج ہی کبھی کبھار کام آ جاتی تھی۔

استقبالیے پر پہنچ کر میں نے رجسٹر میں دستخط کیے۔ منیجر میری طرف دیکھ کر یوں خوش خلقی سے مسکرا رہا تھا جیسے مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا اور گویا میں اس کے ہوٹل میں قیام کرنے اکثر ہی آتا رہتا تھا۔ اس نے گن اسٹون اور جینی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

"تم اس فرانسیسی کار کا پیچھا چھوڑو اور ایک موریس لے لو۔ فرانسیسی کاریں بے کار ہوتی ہیں۔" گن اسٹون نے مشورہ دیا۔ وہ ابھی تک میری کار کے موضوع پر اٹکا ہوا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں اس وقت رجسٹر کی خانہ پری میں مصروف تھا۔

ہم استقبالیے سے روانہ ہوئے تو لابی میں موجود بیل بوائے اور لفٹ آپریٹر نے گہری نظر سے جینی کا جائزہ لیا۔ جن لڑکیوں سے میرا رابطہ رہتا ہے وہ گلیوں میں چلتی پھرتی اور شراب خانوں میں بیٹھی اچھی خاصی اونچے طبقے کی دکھائی دیتی ہیں لیکن اعلیٰ درجے کے چمکتے دمکتے ہوٹلوں میں پہنچ کر ان کی شخصیت کا تاثر کچھ بدل جاتا ہے۔ وہ کچھ ماندی پڑ جاتی ہیں۔ وہ وہاں بالکل ہی اجنبی تو دکھائی نہیں دیتیں لیکن پھر بھی کچھ الگ سی نظر آتی ہیں۔ بیل بوائے اور لفٹ آپریٹر شاید اسی لیے غور سے جینی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ کا یہ موریس کار والا مشورہ میرے دل کو لگا ہے۔" میں نے لفٹ میں پہنچ کر گن اسٹون کی بات کا جواب دیا۔

"مجھے تو امریکی کاریں پسند ہیں۔" جینی بولی۔

"مجھے امریکی کاریں بالکل پسند نہیں۔" گن اسٹون بولا۔

ساتویں فلور کے کمرے میں پہنچ کر بیل بوائے نے سوٹ کیس ایک طرف تپائی پر رکھا تو اس میں سے رسالوں کے پھسلنے کی سرسراہٹ ابھری۔ بیل بوائے ابھی تک صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ اپنی رٹی رٹائی تقریر دہرانے لگا۔ "یہ باتھ روم ہے۔ یہ فلاں لائٹ کا سوئچ ہے۔ یہ فلاں لائٹ کا۔ مجھے بلانا ہو تو یہ نمبر ملائیے۔ روم سروس کے لیے وہ نمبر ملائیے۔"

میں نے اس کی تقریر میں وہ مداخلت کی اور وہ ڈالر اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے رخصت کر دیا۔ جینی اس وقت ڈبل بیڈ کے کنارے پر بیٹھی اپنا کنگن اتار کر ستائشی انداز میں اپنی سڈول کلائی کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں اور گن اسٹون دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ گن اسٹون نے اپنی دانست میں جینی کی نظر بچا کر میری کہنی دباتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ لڑکی ہے کیسی؟"

"جیسی دیکھنے میں نظر آ رہی ہے، حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ اچھی۔"

گن اسٹون کی سانس ابھی سے تیز تیز چل رہی تھی۔ ایک بار پھر اسی اندیشے نے میرے ذہن میں سر ابھارا۔ کہیں گن اسٹون آج اس سے محاذ

لڑتے ہوئے جان ہی نہ دے دے۔ کتنا برا لگے گا جب اخباروں میں خبریں آئیں گی کہ بلیو مون ہوٹل کے فلاں کمرے میں ایک لکھ پتی بوڑھا کس حالت میں پایا گیا۔ ہوٹل کی بھی خاصی بدنامی ہوگی اور میرے ساتھ بھی یقیناً کچھ اچھا سلوک نہیں ہوگا۔

گن اسٹون ایک صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میرے اندیشے مجھے کچھ زیادہ پریشان کرنے لگے۔ میں نے وہاں سے جلد رخصت ہو لینا ہی بہتر سمجھا۔

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں تاکہ تم دونوں بہتر طور پر ایک دوسرے سے واقف ہو سکو۔ فی الحال خدا حافظ۔"

راہداری میں آ کر میں نے دیکھا، لفٹ ابھی اسی فلور پر تھی۔ لفٹ چلانے والے لڑکے نے مجھے تنہا واپس آتے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ بظاہر وہ بٹنوں کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میں اس کی گدی دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ اس وقت مسکرا رہا تھا۔ اب اسے یقیناً صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ یقیناً مجھ پر ہنس رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی گدی پر ایک گھونسا رسید کر دوں۔

اپنی اس خواہش پر قابو رکھتے ہوئے میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

"ٹونی لا۔" اس نے میری طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسی لیے اس سے نام پوچھا تھا۔ اپنا نام بتاتے وقت انسان سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

میں نے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو مسٹر ٹونی لا.....! اور ادھر ادھر غیر ضروری باتیں کرتے نہ پھرنا..... غیر ضروری باتیں کرنے والے کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔"

اسے یہ پانچ ڈالر دیتے وقت مجھے اچھا خاصا قلق ہو رہا تھا۔ ہاتھ ویسے ہی تنگ تھا۔ ابھی گن اسٹون کی طرف سے بھی تازہ ترین خدمت کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ اگر میں لفٹ کی طرف آنے کے بجائے پچھلی طرف والی ہنگامی سیڑھیوں کے راستے نیچے چلا جاتا تو یہ پانچ ڈالر بچا سکتا تھا لیکن اس وقت میں ساتویں منزل پر تھا۔ میرا معمول تو یہی تھا کہ لڑکی اور گاہک کو کمرے میں چھوڑنے کے بعد ہنگامی زینے سے ہی اتر جاتا تھا لیکن آج مسئلہ ساتویں منزل کا تھا۔ نوجوانی کا دور ہوتا تو ساتویں منزل سے اترنا بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن اب ادھیڑ عمری کا زمانہ تھا۔ جس میں اس قسم کی مشقتیں گراں گزرنے لگتی ہیں۔

نیچے پہنچ کر میں لابی سے گزرنے کے بجائے لاؤنج کی طرح چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا تھا۔ شام ضروری اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے بعد بھی میں بار میں بیٹھ ایک ڈرنک لینے کا متحمل ہو سکتا تھا۔ کسی عالیشان ہوٹل کے بار میں بیٹھ کر پینے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میں بار میں جا بیٹھا اور چند لمحے تک ادھر ادھر دیکھ کر سجاوٹ اور شان و شوکت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر اس کتابچے کے ورق پلٹنے لگا جو استقبالیہ کلرک نے مجھے دیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سنگاپور میں کن کن نئی رنگینیوں کا اضافہ ہوا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ حالات بہتر ہوئے تو میں بھی کبھی بلیو مون جیسے ہوٹل میں ایک نہایت پرتعیش ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں، نفیس کمبل اوڑھ کر اور دنیا کے تمام تفکرات سے بے نیاز ہو کر ایک ہفتے تک پڑا سوتا رہوں گا۔

ہوٹل کے لاؤنج کا فرش اطالوی ٹائلوں سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر کئی مشہور آرٹسٹوں کی پینٹنگز آویزاں تھیں اور عین میرے سر پر ایک ایسا فانوس آویزاں تھا جسے دیکھ کر مجھے یہی گمان گزرتا

تھا کہ اس کی تیاری میں برسوں لگ گئے ہوں گے۔

میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے ڈرنک کی چسکیاں لے رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک بے عنوان سے اضطراب کا احساس ہوا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید میرے لاشعور میں وہی پرانا خوف سر ابھار رہا ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں گن اسٹون اپنی جان سے نہ گزر جائے مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے اضطراب کی وجہ کچھ اور تھی۔

میں نے دزدیدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور مجھے اپنے اضطراب کی وجہ معلوم ہوگئی۔ لاؤنج میں ادھر ادھر سات آٹھ سیاح بیٹھے ہوئے تھے اور وہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سب نے مجھے گن اسٹون اور جینی کے ساتھ اوپر جاتے اور پھر تنہا واپس آتے دیکھا تھا۔ انہیں یقیناً میرے پیشے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لفٹ چلانے والے لڑکے کی طرح وہ بھی سمجھ چکے تھے کہ معاملہ کیا تھا۔

وہ مجھ پر ہنس تو نہیں رہے تھے لیکن ان کے دلوں میں اس وقت یقیناً حقارت اور تمسخر کے جذبات تھے۔ اگر میں جوان ہوتا تب بھی شاید وہ صرف اس حد تک تبصرہ کر کے رہ جاتے کہ کیا تیز و طرار اور شاطر لڑکا ہے لیکن ادھیڑ عمر آدمی میں اگر تیزی و طراری ہو بھی تو مشکل سے ہی نظر آتی ہے۔ اس عمر میں اس قسم کے کام کرنے والا زیادہ مکروہ اور قابل نفرت لگتا ہے۔

میں نے بے پروائی کے اظہار کے لیے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور دوبارہ کتابچے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسی اثنا میں مجھے اپنے ٹخنوں پر کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ میں نے سر جھکا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں نے موزے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ میری شرمندگی کچھ اور بڑھ گئی۔ میرا لباس تو کافی حد تک مناسب تھا لیکن اتنے شاندار ہوٹل میں، میں موزوں کے بغیر صرف جوتے پہنے بیٹھا تھا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ میں اتنا غائب دماغ ہو چکا ہوں کہ موزے پہننا ہی بھول گیا تھا۔ شاید اس سے بھی میرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو میرے پیشے کا اندازہ کرنے میں مدد ملی تھی۔

میرا دل چاہا کہ فوراً اٹھ کر وہاں سے چل دوں لیکن میں یہ سوچ کر باز رہا کہ اس طرح زیادہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ ان لوگوں کا کیا ہے۔ یہ تو سیاح ہیں۔ یہ اگر میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی رائے قائم بھی کرتے ہیں تو اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ سب آج یہاں ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بنکاک جا چکا ہوگا، کوئی جاپان اور کوئی کہیں اور۔

اس کے علاوہ میں نے غیر محسوس طور پر اپنی پتلون کو آہستگی سے ذرا نیچے کھسکانے کی بھی کوشش کی تاکہ ٹخنے ذرا چھپ جائیں۔ اسی دوران میں ایک سفید فام عورت سے میری نظر ملی۔ وہ غالباً امریکی تھی۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن جونہی میری نظر اس سے ملی وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں بظاہر ایک بار پھر کتابچے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ وہ دوبارہ میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے کچھ اور لوگ بھی میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ میں اندر ہی اندر روہانسا ہوگیا۔ آخر میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ سب مجھے اس طرح مرکز نگاہ بنا کر مجھے میرے اپنی ہی نظر میں قابل رحم کیوں بنا رہے تھے۔ میں یہاں صرف ایک ڈرنک سے لطف اندوز ہونے آیا تھا اور اس وقت میں صرف یہ ایک ڈرنک ہی افورڈ کر سکتا تھا۔

اچانک لاؤنج میں نصب چھوٹے سے لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری۔ ”توجہ فرمائیے..... عزت ماب بشپ بریڈلے کے لیے ٹیلیفون کال ہے۔

اگر وہ لاؤنج میں موجود ہوں تو براہ کرم استقبالیے پر آجائیں۔“

لاؤڈ اسپیکر ایک خوب صورت ڈبے میں چھپا ہوا تھا جس کے منہ پر سیاہ کپڑا تنا ہوا تھا جو آواز کے ساتھ ذرا سا تھرتھرا رہا تھا۔ اعلان ختم ہونے پر بھی لاؤنج میں سے کوئی نہ اٹھا۔ کئی نظریں البتہ لاؤڈ اسپیکر کی طرف اٹھ گئیں۔ اعلان کرنے والا منتظر سے انداز میں خاموش ہو چکا تھا۔ لاؤنج میں ایک اعصاب شکن سا سکوت چھا گیا تھا۔ سب جیسے دم سادھے بیٹھے تھے۔ چند سیکنڈ کے سکوت کے بعد اعلان دہرایا جانے لگا۔

”عزت ماب بشپ بریڈلے کے لیے ٹیلی فون کال ہے۔ اگر وہ لاؤنج میں موجود ہوں تو براہ کرم استقبالیے پر آجائیں۔“

تب میں اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ گلاس میں نے میز پر رکھ دیا تھا۔ میں نے یوں لاؤڈ اسپیکر والے باکس کی طرف دیکھا جیسے اعلان کرنے والے نادیدہ شخص کو کسی غیبی طاقت کی مدد سے مطلع کرنا چاہ رہا ہوں کہ میں آرہا ہوں۔ پھر میں حتی الامکان پروقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا استقبالیے کی طرف چل دیا۔

مجھے معلوم تھا اس وقت لاؤنج میں بیٹھے وہ تمام افراد دل ہی دل میں شرمندہ اور اپنی نظر میں نادم ہو رہے ہوں گے جو چند لمحے پہلے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اب اپنی بدگمانی پر خود کو ملامت کر رہے ہوں گے اور اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں گے۔ ”خدا کی پناہ.....! ہم اس شخص کو کیا سمجھتے رہے..... وہ تو بشپ تھا۔“

اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے میں چند لمحے کے لیے استقبالیے پر یونہی کوئی رسمی سی بات کرنے کے لیے رک بھی گیا تاکہ عقب سے لوگ وہاں بھی میری جھلک دیکھ لیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا لاؤڈ اسپیکر پر بشپ کے لیے اب مزید اعلان نہیں دہرایا جائے گا۔

چند لمحے بعد میں ہوٹل سے باہر آگیا اور کونے پر پہنچ کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر گن اسٹون اور جینی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

کہاں سے لاؤں؟

سعدیہ لیاقت

نئے دن، نئی راتیں کہاں سے لاؤں؟
جو ٹوٹ نہ جائیں وہ امیدیں کہاں سے لاؤں؟
مٹ گئیں مٹتے، تمام ہی حسرتیں
کہاں سے نئی آس، نئی امیدیں لاؤں؟
ٹوٹ گئے سبھی باری، باری
کہاں سے نئے خواب نئی نیندیں لاؤں؟
جو خوشیوں سے بھر دیں دل کو میرے
کہاں سے وہ بیتے دن میں لاؤں؟
جو دل کو میرے نئے زخم نہ دیں
کہاں سے وہ احباب وہ رشتے لاؤں؟
جو روشن کر دے اندھیری دنیا میری
کہاں سے وہ ماہتاب وہ ستارے لاؤں؟
جو ٹوٹ کر زخمی نہ کریں دامن کو میرے
کہاں سے وہ خواب میں پورے لاؤں؟
اب تو روح پر ہیں اتنے داغ سعدی
بے داغ جسم و جاں کہاں سے لاؤں؟
دل میں ہمت ہی نہیں نئے سپنے سجانے کی
پھر نئی محبتوں کے جہاں کیسے بساؤں؟

☆☆

کولہو کے بیل کی مانند چکر کاٹنے سے فرار کی کوشش کرنے والے دو دوستوں کی داستان

جینے کا قرینہ

سید ذوالفقار حیدر

دو دوستوں کی کہانی وہ زندگی کی یکسانیت سے بیزار تھے اور تنوع چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے شب و روز کچھ مختلف طریقے سے گزریں۔ اس کے لیے انہوں نے پوری منصوبہ بندی کی مگر عمل درآمد سے پہلے وہ اچھی طرح غور کرنا چاہتے تھے اور اسی غور و فکر کے دوران میں دنیا بدل گئی

اس شمارے کی ایک انوکھی کہانی

وہ اتوار کی رات تھی۔ میاں بیوی اپنے ایک دوست جوڑے کے ہاں کافی وقت گزارنے کے بعد کار میں گھر واپس جا رہے تھے۔ جب رے نے تجویز پیش کی کہ راستے میں کہیں رک کر کافی پی جائے۔

صوفیہ بولی۔ ”میں نے محسوس کیا ہے کہ اتوار کو رات گئے تک تمہارا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا اور اگر ہم گھر چلے بھی جاتے ہیں تو تمہارا سونے کو جی نہیں چاہتا۔ تم اپنے آپ کو کسی نہ کسی مشغلے میں الجھا لیتے ہو۔ جاگنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہو۔“

رے نے گہری نظروں سے صوفیہ کو دیکھا اور گاڑی ایک کیفے کے سامنے روک دی۔ رے اٹھائیس سال کا تھا اور صوفیہ چوبیس سال کی تھی۔ دونوں کے بال سنہرے تھے۔ صوفیہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نہ صرف خود جاگتے ہو بلکہ مجھے بھی جگائے رکھنے کی کوشش کرتے ہو۔ آج رات بھی ہم پہلے ہی فل اور جینی کے گھر سے اتنی دیر میں اٹھ کر آئے ہیں کہ شاید وہ بے چارے ہمیں اٹھا کر باہر پھینکنے کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے اور اب تمہیں کافی پینے کی سوجھ رہی ہے تاکہ ہم مزید بہت دیر تک نہ سو سکیں۔“

”فل کے دل میں یقیناً ایسا کوئی خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دے۔“ رے نے اپنے دوست کے بارے میں اعتماد سے کہا۔

”ہاں..... شاید تمہارا خیال صحیح ہو۔“ صوفیہ نے تسلیم کیا۔ ”دراصل وہ بھی تمہاری ہی طرح اتوار کی رات کو دیر تک جاگنے والوں میں سے ہے۔ جینی نے مجھے بتایا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے شعوری طور پر پیر کی صبح تم دونوں کا کام پر جانے کو جی نہیں چاہتا اور تم اس تصور سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ پیر کی صبح سے پھر وہی روزمرہ کا معمول شروع ہونے والا ہے۔“

وہ کیفے میں جا بیٹھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کیفے میں ان کے علاوہ صرف ایک گاہک اور تھا۔ وہ گاڑی میں ہائی وے پر گشت کرنے والا پولیس آفیسر تھا۔ جینی بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں اور فل کو اپنے کام سے نفرت ہے۔“

رے ایک لمحے کے لیے پرخیال سے انداز میں چپ رہا پھر بولا۔ ”نہیں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے کام سے نفرت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے اپنے کام سے محبت بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر تم کوئی اور ملازمت کیوں نہیں تلاش کر لیتے۔“ صوفیہ نرمی سے بولی۔ ”ابھی تم نوجوان ہو۔

ایک طویل زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے۔ تم کوئی ایسا کام کیوں نہیں تلاش کرتے جسے کرتے ہوئے تم خوشی محسوس کرو۔“

”تم تو بالکل میری ماں کے انداز میں بات کر رہی ہو۔“ رے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں تعلیم ختم کر رہا تھا اور وہ ہر وقت یہ جاننے کے لیے میرے پیچھے لگی رہتی تھیں کہ میں کیا کام کرنا پسند کروں گا۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں ہر مرد کے لیے ایک لڑکی اور ایک ملازمت ایسی ضرور ہوتی جو اسے اچھی لگے۔ مجھے وہ لڑکی تو مل گئی جو اچھی لگی تھی لیکن ملازمت ایسی نہیں ملی۔“

”میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جنہوں نے کوئی پیشہ اختیار کرنے یا کوئی مخصوص ملازمت حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔“ صوفیہ بولی۔

”میں بھی ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں بلکہ ان میں سے بعض تو میرے ساتھی بھی رہے ہیں۔ میرا ایک کلاس فیلو دس سال کی عمر میں ہی کہا کرتا تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ وہ ڈاکٹر ہی بنا۔ وہ روزانہ بارہ چودہ گھنٹے کام کرتا ہے اور بڑا خوش ہے۔ ایک اور لڑکا تھا۔ وہ آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ اس میں قدرتی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ وہ کسی سے سیکھے بغیر ہی تصویریں بنانے لگا تھا۔ وہ اس وقت کمرشل آرٹسٹ ہے اور اپنے پیشے سے بہت خوش ہے۔ وہ کچھ اور کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اسے لوگوں پر رشک آتا ہے جو ساری زندگی اپنی پسند کا کام کرتے ہیں لیکن دنیا زیادہ تر مجھ جیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔“

”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔“ صوفیہ بولی۔

”تمہارا خیال غلط ہے ہنی۔“ رے مسکراتے ہوئے بولا۔

صوفیہ نے اس سے بحث نہیں کی۔ اس دوران میں ان کی کافی آ گئی۔

رے کافی میں شکر ملاتے ہوئے بولا۔ ”میں نالائق یا کاہل نہیں ہوں بات بس اتنی ہے کہ میرے پاس کوئی خصوصی ہنر نہیں ہے۔ دنیا مجھ جیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو نوکری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہماری

کوئی خاص پسند ناپسند نہیں ہوتی۔ بس جو نوکری ملتی ہے' کر لیتے ہیں۔ میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹ ایگزیکٹو ہوں اور اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ میں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ اس کام میں کبھی کبھی مشکلات بھی آتی ہیں اور دوسری بہت سے ملازمتوں کی طرح اس کے اچھے برے پہلو بھی ہیں۔ میرے خیال میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ گراں گزرتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس نوکری میں میری زندگی کا زیادہ تر وقت صرف ہو جاتا ہے۔"

"وہ کیسے۔" صوفیہ قدرے حیرت سے بولی۔

"خود حساب لگا لو۔ میں صبح ساڑھے چھ بجے اٹھتا ہوں' جب عموماً اندھیرا ہوتا ہے۔ سات بجے میری گھر واپسی ہوتی ہے۔ یہ سارا وقت نوکری ہی کے سلسلے میں صرف ہوتا ہے۔ اس میں دفتر جانے کی تیاری' آنے جانے کا بس کا سفر وغیرہ شامل ہے۔ اگر میں آٹھ گھنٹے سوتا ہوں تو سمجھو چوبیس گھنٹوں میں سے یہ کل بیس گھنٹے تو نکل گئے۔ ہفتے میں پانچ دن یہی معمول رہتا ہے تو سمجھ لو یہ میری زندگی کا بیشتر حصہ ہے۔" وہ مسکرایا اور ملائمت سے بولا۔ "بہرحال میں شکوہ نہیں کر رہا ہوں..... تقدیر کا رونا نہیں رو رہا ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ یہ تو بات چھڑ گئی اس لیے ذکر کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔

اس سے اگلے اتوار کو فل اور اس کی بیوی جینی ان کے ہاں آئے۔ فل' رے کا سب سے پرانا دوست تھا۔ انہوں نے سان فرانسسکو میں اکٹھے پرورش پائی تھی اور ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ اب ان کی بیویاں بھی ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ دونوں جوڑوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔

اس رات بارش ہو رہی تھی اور باہر خوب ٹھنڈ تھی لیکن اندر چھوٹے سے آتش دان کے سامنے وہ چاروں حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صوفیہ اور جینی صوفے پر تھیں جبکہ رے اور فل قالین پر نیم دراز تھے۔ ان کے درمیان کئی کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور فل ایک رائٹنگ پیڈ پر نہایت انہماک سے رنگین مارکرز کے ذریعے رنگ برنگے دائرے بنا رہا تھا۔ رے نہایت توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دونوں کوئی بہت ضروری کام کر رہے ہوں۔ کمرے میں خاموشی تھی۔

آخر فل نے پیڈ قالین پر رکھ دیا اور اپنی بیوی جینی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ اس کے بنائے ہوئے سرخ رنگ کے گول گول دھبوں جیسے دائروں کو دیکھ رہی تھی۔ رے نے ہرے رنگ کی اسی سائز کی ٹکیاں سی بنائی تھیں۔ ان کے ساتھ ٹیڑھے ترچھے تیر کے نشان بھی بنے ہوئے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا یہ تجربہ کامیاب بھی ہوگا یا نہیں۔" جینی بولی۔

"حالانکہ یہ دونوں چودہ مرتبہ ہمیں اس کی تفصیل بتا چکے ہیں۔" صوفیہ نے لقمہ دیا۔

"میں پندرہویں مرتبہ بھی بتا دیتا ہوں۔" رے مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم تجرباتی فلموں کی دنیا میں ایک انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فل کے ایک دوست کے پاس جدید مووی کیمرا ہے اور میرے ایک جاننے والے کے گھر میں بلیئرڈ کی میز ہے۔ ہم کیمرا بلیئرڈ کی میز کے عین اوپر نصب کر کے' بلیئرڈ کی گیندوں کی پوزیشن بار بار ایک خاص ترتیب سے بدل بدل کر ایک ایک فریم پکچرائز کریں گے۔ جب اس فلم کو چلایا جائے گا تو ایسا معلوم ہوگا کہ بلیئرڈ کی گیندیں بڑے زبردست ردھم کے ساتھ مخصوص رقص کر رہی ہیں۔ فلم میں اس رقص کی مخصوص موسیقی شامل کی جائے گی اور اس فلم کا عنوان بلیئرڈ بیلے' ہوگا۔ اسے دیکھنے والے سحر زدہ ہو کر رہ جائیں گے۔"

"سننے میں تو یہ بات اچھی لگ رہی ہے لیکن نہ جانے تمہاری توقعات پوری ہوں یا نہیں۔" جینی بولی۔

"اور اس میں وقت بھی تو بہت لگے گا۔" صوفیہ بولی۔

"ہاں..... اس میں تو شک نہیں۔" فل نے تسلیم کیا۔

"تم یہ کام کیوں کر رہے ہو۔" جینی نے جاننا چاہا۔

دونوں مردوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر فل بولا۔ "صرف لطف اندوز ہونے کے لیے یہ بیسویں صدی کے ان چند کاموں میں سے ہوگا جو کسی خاص مقصد کے بغیر صرف لطف اندوز ہونے کے لیے کیے جائیں گے۔"

جینی نے اثبات میں سر ہلایا اور صوفیہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ آج رات میں ہی یہ بھوت ان دونوں کے سر سے اتر جائے گا۔ تمہیں یاد ہے اس سے پہلے ان لوگوں پر مونوپلی سے بہتر ایک کھیل ایجاد کرنے کی دھن سوار ہوئی تھی اور اس سے پہلے بھی انہوں نے ہمارے گیراج میں ایک کاروبار شروع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈاک کے ذریعے چیزیں فروخت کرنے کا پروگرام تھا۔ یہ سب اتوار کی رات دیکھے جانے والے وہ خواب ہیں جو صبح ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں..... جاگتی آنکھوں کے خواب۔" صوفیہ نے اس سے اتفاق کیا۔ "یہ وہی اتوار کی رات کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لاشعوری ہتھکنڈے ہیں۔" جینی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ اس وقت سوا بارہ بجے تھے۔ "تم یقین کرو گی ایک اتوار کی رات ساڑھے بارہ بجے فل باہر جا کر کار دھونے پر تل گیا۔ معلوم ہے جواز کیا پیش کر رہا تھا۔ کہنے لگا' چاند نکلا ہوا ہے اور موسم بھی خوشگوار ہے۔ ایسے موسم میں اور چاندنی رات میں اس سے پہلے ہم نے کبھی اپنی کار نہیں دھوئی۔ اب تم ہی بتاؤ' ایسی دلیل کے جواب میں انسان کیا کہہ سکتا ہے۔"

فل اٹھ بیٹھا اور گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بناتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "میں بتاؤں ہم لوگ کیوں ایسا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی ہے اصل میں یہ سب اپنے اپنے تفکرات سے فرار حاصل کرنے کی کوششیں ہیں۔ میری مثال لے لو..... میری تنخواہ ملنے میں اس وقت پورے ساڑھے تین دن باقی ہیں اور ہم اس وقت کنگال ہیں۔ میرے اور میری بیوی کے پاس اس وقت صرف تین ڈالر ہیں۔ اب میں تنخواہ ملنے تک دوپہر کا کھانا گھر سے لنچ باکس میں دفتر لے کر جایا کروں گا۔ پہلے میں اور میری بیوی ہنس کر یہ بات کیا کرتے تھے کہ آخر پیسے جاتے کہاں ہیں لیکن اب ہم یہ بات کرتے ہیں تو غیر ارادی طور پر سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہم اس موضوع پر بہت سوچنے لگے ہیں کہ آخر پیسا جاتا کہاں ہے۔"

رے اور صوفیہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "پراپرٹی ڈیلر نے جب ہمیں مکان دلایا تھا تو بڑے سرسری سے لہجے میں کہا تھا۔ "یہ آپ کو ساڑھے چھتیس میں پڑے گا۔ صرف ساڑھے چھتیس کہہ دینے سے رقم کچھ زیادہ بڑی محسوس نہیں ہوتی اور کافی عرصے تک مجھ پر یہی تاثر قائم رہا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ حقیقت میں اس طرح کہنا چاہیے۔ "یہ آپ کو ساڑھے چھتیس ہزار ڈالر میں ملے گا۔" اگر یہ الفاظ تم ذرا دھیرے دھیرے ادا لرو تو رقم کا بوجھ کچھ اور بڑھ جائے گا۔ مجھے یہ رقم ادا کرنے میں چوبیس سال لگیں گے۔ درحقیقت رقم صرف ساڑھے چھتیس ہزار ڈالر ہی نہیں ہوگی۔ اس دوران میں' میں اس کے ساتھ چوبیس ہزار ڈالر سود اور سولہ ہزار ڈالر مختلف قسم کے ٹیکسوں کی مد میں بھی ادا کر چکا ہوں گا۔ مکان کی مرمت اور دیکھ بھال پر بھی اس دوران میں ہزاروں ڈالر خرچ ہو چکے ہوں گے۔ تب پہنچ جا کر یہ نوبت آئے گی کہ ہم میاں بیوی تم دونوں کو یہ کہہ کر دعوت پر بلا سکیں کہ آج ہم صحیح معنوں میں اس گھر کے مالک ہو گئے۔ یعنی انسان کو صرف سر چھپانے کا ٹھکانہ بنانے کے لیے برس ہا برس سخت محنت مشقت کرنا پڑتی ہے۔"

ایک طویل سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”اس کے علاوہ ہم لوگ کار کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ کبھی یہ حساب لگانے کی کوشش مت کرنا کہ قسطوں پر خریدی ہوئی کار ہمیں کتنے میں پڑتی ہے۔ آج کل ہمیں ایک اوسط درجے کی کار چھ سات ہزار ڈالر میں ملتی ہے۔ ہر چند سال بعد کار بدلنی بھی ہوتی ہے۔ اس کی مرمت، دیکھ بھال، انشورنس وغیرہ کے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح زندگی کا کچھ اور قیمتی حصہ کار رکھنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ زندگی کا چوتھا حصہ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے رقم کمانے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ ضرورت کو جو بھی چیز ہم خریدتے ہیں اس میں الگ سے ٹیکس کی بھرمار ہے۔ بس یہی ضروریات زندگی پوری کرنے میں ہماری زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ میں حیرت سے سوچتا ہوں کہ اس میں ہماری اپنی مرضی سے..... محض اپنی تفریح طبع کی خاطر چند گھنٹے ضائع کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ اگر ہم بلیئر ڈبیلے کا منصوبہ بنانے لگتے ہیں تو وہ محض وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اتوار کی رات کو اپنی نیند کے وقت میں سے چند گھنٹے چرا کر اس قسم کے منصوبوں کو دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں گویا اپنی جانوں پر مزید ظلم کرتے ہیں۔“

فل نے خاموش ہو کر مضطربانہ انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ وہ اکثر ہی مضطرب نظر آنے والا ایک قد آور اور مضبوط شخص تھا۔ رے اٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ”ان خواتین کے سامنے یہ تقریر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ درحقیقت ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

کچھ دیر بعد فل اور جینی رخصت ہو گئے۔

اگلے سنیچر کو موسم خوشگوار تھا۔ رے آفس تو بس میں جاتا تھا کیونکہ اسے کافی طویل سفر کرنا ہوتا تھا لیکن اس روز چھٹی تھی۔ وہ صوفیہ کو کچھ بتائے بغیر کار لے کر نکلا تو رات کو تقریباً آٹھ بجے واپس آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک شریر سی چمک تھی۔

”کل ہم، فل اور جینی کے ساتھ پکنک پر جا رہے ہیں۔“ اس نے اعلان کیا۔ ”لیکن یہ مت پوچھنا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ یہ ایک سرپرائز ہوگا۔“

اتوار کو دن روشن تھا اور اچھی خاصی حرارت لیے ہوئے تھا۔ ٹھنڈ یکدم ہی غائب ہو گئی تھی۔ دو چاروں فل کی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ سفر خاصا طویل تھا لیکن راستے میں بھی رے نے بتا کر نہیں دیا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ آخر کار وہ رے کی رہنمائی میں ہائی وے چھوڑ کر ایک دیہی سڑک پر مڑے۔ چند میل کے سفر کے بعد انہوں نے وہ سڑک بھی چھوڑ دی اور تقریباً ایک میل تک ایک کچی سڑک پر رواں رہے۔ آخر ایک جگہ رے نے گاڑی روکوائی۔ مردوں نے پکنک کا سامان اٹھایا اور عورتیں ان کے پیچھے پیچھے ایک پگڈنڈی پر چل پڑیں جو جنگل سے گزر رہی تھی۔

دو فرلانگ چل کر وہ کھلی جگہ میں آ گئے۔ اب انہوں نے چاروں طرف دیکھا تو خود کو ایک خوب صورت، سرسبز اور پرفضا مقام پر پایا۔ ڈھلان میں شفاف پانی کا نالا بہہ رہا تھا۔ پس منظر میں سرسبز پہاڑ تھے۔ جگہ جگہ رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکے پودے پھیلے ہوئے تھے۔ خوب صورت درختوں کے جھنڈ ماحول کے فطری حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔

پہاڑی نالے کے کچھ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا، وہ اچھا خاصا چوڑا تھا۔ تالا کیا تھا، ایک ندی ہی تھی جس کے دونوں کناروں پر صاف ستھرے پتر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ شفاف پانی میں انہیں مچھلیاں تیرتی دکھائی دیں۔ وہ نہایت عمدہ نسل کی مچھلیاں تھیں جن کے قتلے شہر میں سربند ڈبوں میں بہت مہنگے داموں ملتے تھے۔ جینی تو یہ سب کچھ دیکھ کر فوراً اشتیاق سے بچوں کی طرح شور مچانے لگی۔

وہیں بیٹھ کر انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا پھر صوفیہ نے تھرموس سے کافی انڈیلی جس سے ابھی تک بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کافی نوشی کے دوران میں فل نے

پرتجسس نظروں سے رے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مانا کہ یہ ایک خوب صورت جگہ ہے اور ہمیں یہاں آ کر بڑی خوشی ہوئی ہے پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ پکنک کے لیے یہ جگہ بہت دور ہے۔ میرا خیال ہے تم نے یہ سفر محض پکنک کے لیے نہیں کیا۔“

رے نے یوں مسکراتے ہوئے سر ہلایا جیسے وہ اس کے ان کہے سوالوں کو سمجھ رہا ہو۔ کافی کی چسکی لے کر وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”ہاں..... بلاشبہ یہ ایک خوب صورت جگہ ہے اور یہاں چاروں طرف ایسی ہی خوب صورتی بکھری ہوئی ہے۔ کل ایک مقامی شخص نے مجھے اس علاقے کی سیر کرائی تھی۔ وہ ایک طرح کا گائیڈ اور اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ یہ جگہ چونکہ شہری آبادی، سڑک اور بجلی، گیس، پانی وغیرہ کی لائنوں سے کافی ہٹ کر ہے اس لیے یہاں زمین کی قیمت بہت کم ہے۔ تقریباً دو سو ڈالر فی ایکڑ۔“

اس نے بغور تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ”ایک وقت میں آپ یہاں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتے اور یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جہاں تک ہماری نظر جا رہی ہے، وہاں تک کی زمین ہم تمام تر خوب صورتی کے ساتھ چند سو ڈالر میں خرید سکتے ہیں۔“

جینی سر ہلاتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولی۔ ”کیا تم گرمیوں میں یہاں کچھ وقت گزارنے کے انتظامات کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔“

”ہاں..... گرمیوں میں تو یہاں رہنا خاص طور پر بہت ہی خوش گوار تجربہ ہوگا۔“ رے بولا۔ ”ہم درختوں سے لکڑی کاٹ کر خود اپنا کیبن تیار کر سکتے ہیں۔ ہماری زمین پر موجود تمام درخت بھی ہماری ملکیت ہوں گے۔ گو کہ انہیں کاٹنا اور کیبن تیار کرنا ایک پرمشقت کام ہوگا لیکن ناممکن بہرحال نہیں ہے اور پرمشقت کام مجھے پسند ہے۔ تمہیں بھی پسند ہے نا فل۔“

فل نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہم دونوں مل کر اپنے لیے الگ الگ کیبن تیار کر سکتے ہیں۔ شروع میں خواہ ایک ایک کمرے پر مشتمل کیبن بنائیں۔ آنے والے برسوں میں رفتہ رفتہ ہم جتنے کمروں کا چاہیں، اضافہ کر سکتے ہیں۔ ان پر کوئی لاگت نہیں آئے گی۔ اصل لاگت بس اپنی محنت ہوگی اور اس میں بھی لطف آئے گا۔ اگر تم المونیم کی کھڑکیاں لگانا چاہو گے اور فرش پر وینائل کی شیٹ بچھانا چاہو گے تو بس ان پر تھوڑا سا خرچا ہوگا۔ کچھ کیلوں اور نٹ بولٹوں وغیرہ کا خرچ ہوگا۔ اگر ہم آتش دان بنالیں گے تو سردیاں بھی نہایت پرلطف گزریں گی۔ کیا خیال ہے۔ یہاں کرسمس گزارنا ایک انوکھا تجربہ نہیں ہوگا۔“

فل اس کی تائید میں مسلسل سر ہلائے جا رہا تھا لیکن جینی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس میں شک نہیں کہ جگہ خوب صورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم دونوں مل کر کیبن بھی بنا سکتے ہو لیکن آدھا دن یہاں آنے میں اور آدھا واپس جانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ تم کیبن کس وقت بناؤ گے۔ اگر ویک اینڈ پر بھی آ کر بناؤ گے تو ہفتے میں تمہیں صرف ایک دن ملے گا۔“

”میں روزانہ شہر سے آ کر یا صرف ویک اینڈ پر آ کر کیبن بنانے کی بات نہیں کر رہا۔“ رے بولا۔

سب نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ رے اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔ ”میں جو بات کرنا چاہتا ہوں، اگر تم اسے صبر و تحمل سے سن سکو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا اور میری بات ختم ہونے سے پہلے کوئی ہنسنے کی کوشش نہ کرے۔“

پھر وہ فل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے اتوار کو تم نے جو بات کی تھی، وہ بالکل درست تھی۔ میں پورا ہفتہ اس موضوع پر سوچتا رہا ہوں۔ ہم لوگ واقعی سر چھپانے کا ایک چھوٹا سا ٹھکانا بنانے کے لیے ساری زندگی ایسی محنت و مشقت میں گزار دیتے ہیں جو اعصابی تناؤ کا باعث ہوتی ہے۔ اس مکان پر ہزاروں ڈالر خرچ ہوتے ہیں جو ایک

چھوٹے سے قطعہ زمین پر بنا ہوتا ہے۔"

اس نے بازو پھیلا کر چاروں طرف اشارہ کیا۔

"لیکن یہاں ہم اس کا عشر عشیر خرچ کر کے اس سے سو گنا زیادہ زمین حاصل کر سکتے ہیں اور اسی لاگت میں مکان بھی بن جائے گا جس پر کوئی قرضہ نہیں ہو گا۔ کوئی قسط نہیں ہوگی۔ طرح طرح کے ٹیکس نہیں ہوں گے۔ یوں سمجھو کہ یہ مکان بنا کر تم اپنی زندگی کے کتنے ہی قیمتی سال بچا لو گے۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ان کی طرف جھکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "کیا تم میں سے کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ آخر ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔"

چند لمحے کے سکوت کے بعد صوفیہ کسی بچے کو سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔ "ہم یہاں مستقل کیسے رہ سکتے ہیں رے۔ یہاں رہ کر تم نوکری کہاں کرو گے۔"

"میں نوکری کروں گا ہی نہیں بے بی!" رے مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہی تو اصل نکتہ ہے۔ مجھے نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ تم نے کبھی سوچا کہ ہمیں نوکری کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ صرف سر چھپانے کا ٹھکانا' خوراک' لباس اور چند آسائشیں حاصل کرنے کے لیے۔ اگر ہم یہاں برائے نام لاگت پر اپنا مکان بنا لیتے ہیں تو پھر خوراک کا مسئلہ آتا ہے۔ شہر میں جب تم ایک ڈیڑھ ڈالر میں کھانے پینے کی کسی چیز کا چھوٹا سا ایک ڈبہ خریدتی ہو تو تم درحقیقت صرف کھانے پینے کی چیز کی قیمت ادا نہیں کرتیں بلکہ ٹین کے اس ڈبے' اس پر چپکے ہوئے رنگین لیبل کی قیمت بھی ادا کرتی ہو۔ اس کے علاوہ تم اس ڈبے سے وابستہ دوسرے بہت سے اخراجات میں بھی اپنا حصہ ادا کرتی ہو۔ مثلاً پیکنگ' باربرداری' گوداموں کا کرایہ اور دوسرے خرچ جس میں وہ ڈبا سجایا گیا ہوتا ہے۔ فرض کرو اس ڈبے میں تھوڑی سے مٹر کے دانے ہیں۔ انہیں خریدتے وقت ہم بھول ہی جاتے ہیں کہ مٹر زمین پر اگتے ہیں اور ان کی اصل قیمت برائے نام ہوتی ہے۔ یہاں ہم تقریباً مفت میں جتنے چاہیں مٹر اگا سکتے ہیں۔ صرف آدھا ایکڑ زمین ہم سبزیوں کے لیے مخصوص کر دیں تو اپنی ضرورت سے زیادہ مٹر' گاجریں' آلو' پالک' پیاز' ٹماٹر سب ہی کچھ اگا سکتے ہیں۔"

فل حیرت زدہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو بلکہ دو تین نسل پہلے تو یہ کام لوگوں کے معمولات میں شامل تھے۔ وہ اپنی ضرورت کی سبزیاں اور پھل بازار سے نہیں خریدتے تھے بلکہ اپنے اپنے گھروں کے پیچھے فاضل زمین پر کاشت کرتے تھے۔ گرمیوں میں چیزیں تازہ تازہ استعمال کرتے تھے اور سردیوں میں انہیں مختلف شکلوں میں محفوظ کر کے مرتبانوں میں رکھ لیتے تھے۔ اور ہاں...... میرے پاس تو شاٹ گن بھی ہے۔ سردیوں میں اگر ہم تین چار ہرن شکار کر لیں گے تو ان کا گوشت کئی ہفتوں کے لیے کافی ہوگا۔"

"اور باقی ہفتے کیسے گزریں گے۔" جینی بولی۔

"ان چیزوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔" فل نرمی سے بولا۔ "ہم کون سا کل ہی یہاں منتقل ہو رہے ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ تجویز دلچسپ ہے۔"

رے بولا۔ "بے شک ہمیں کبھی کبھار صرف گوشت ہی نہیں' دوسری چیزیں بھی خریدنی پڑیں گی' مثلاً نمک' چینی' آٹا وغیرہ حتیٰ کہ ہم تھوڑی بہت وہ چیزیں بھی خریدیں گے جنہیں درحقیقت تعیشات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں تنگی ترشی یا تکلیف کی زندگی نہیں گزاریں گے۔ ہم اگر سال میں صرف تین چار ماہ بھی کام کریں گے تو ہماری تمام ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں گی۔ یہاں آس پاس فارم ہیں' لکڑیاں چیرنے کے کارخانے ہیں' چھوٹے موٹے گاؤں دیہات ہیں' کہیں کہیں سڑکیں بن رہی ہیں' اس کی انگ کی تفریح گاہیں موجود ہیں۔ ان سب جگہوں پر دنوں' ہفتوں اور مہینوں کی بنیادوں پر کام مل جاتا ہے۔ ہر سال ہم ہزار دو ہزار ڈالر بھی

کما لیا کریں گے تو وہ ہماری ضروریات کے لیے کافی ہوں گے۔ یہاں رہ کر لباس کے طور پر ہمیں مہنگے مہنگے بزنس سوٹ پہننے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ موٹے' سستے کپڑے کی شرٹ اور جینز سے سارا سال کام چلتا رہے گا۔"

صوفیہ کسی حد تک پھٹ پڑنے کے سے انداز میں بولی۔ "لیکن...... رے بجلی' پانی اور گیس کے بغیر کیسے گزارہ ہوگا۔ تفریح کے لیے ہم کہاں جایا کریں گے۔ کبھی کبھار پڑھنے کے لیے اخبار' رسالے اور کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ دوسرے لوگوں سے ہماری شناسائی اور ملاقات کا سلسلہ کیا ختم ہو جائے گا۔ کیا ہم شہری دنیا سے بالکل کٹ کر رہ جائیں گے۔"

رے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تحمل اور رسان سے بولا۔ "پریشان مت ہو ڈیئر! کوئی تمہاری کنپٹی پر بندوق رکھ کر تمہیں یہاں سکونت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر رہا۔ ابھی صرف بات ہو رہی ہے۔ غور و خوض کے لیے ہمارے پاس کئی ہفتے ہیں۔ ابھی تو ویسے بھی برسات کا موسم ہے۔ ابھی ہم کیبنوں کی تعمیر شروع نہیں کر سکتے۔"

وہ جب واپس روانہ ہوئے تب بھی یہی گفتگو جاری تھی۔ جینی بولی۔ "لگتا ہے تم دونوں مردوں نے اپنی نوکریوں اور شہری زندگی کو تج دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

فل بولا۔ "میں اس پر غور کر رہا تھا۔ شہری زندگی کے لوازمات میں سے مثال کے طور پر اس کار کو ہی لے لو۔ میری کار کی تو ابھی قسطیں باقی ہیں لیکن رے اپنی قسطیں پوری کر چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس کی کار کی مرمت اور دیکھ بھال کے اخراجات شروع ہو جائیں گے جو اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک یہ نئی کار نہیں لے لیتا اور اس کے بعد پھر نئے سرے سے قسطوں کا چکر شروع ہو جائے گا لیکن اگر ہم دونوں آج اپنی کاریں فروخت کر دیں تو ہمارے پاس اتنی رقم آ جائے گی کہ اس کا صرف تیسرا حصہ خرچ کر کے ہم ایک فورڈ وین خرید سکتے ہیں جو ڈیزل سے چلتی ہے۔"

"خدا ہمارے حال پر رحم کرے......" صوفیہ بڑبڑائی۔

فل نے گویا اس کی سنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "اس گاڑی سے ہم دونوں جوڑوں کی ضرور پوری ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے گیراج بھی ہم اپنے مکانوں کے قریب بنا لیں گے۔ وہ باربرداری تو میں کام آ سکتی ہے اور سستی ہونے کے باوجود بڑی مضبوط گاڑی ہوتی ہے۔ انجن اتنا سادہ ہوتا ہے کہ میں اور رے خود بھی اس کی مرمت کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بھی ہوگا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ہم قریبی قصبے کا چکر لگا سکتے ہیں حتیٰ کہ دو چار ماہ بعد سان فرانسسکو کا چکر بھی لگا لیا کریں گے۔"

"بالکل۔" رے نے پرجوش انداز میں تائید کی۔ "یہ فینسی کاریں صرف اپنی شوشا اور غیر ضروری تعیشات کی وجہ سے مہنگی ہوتی ہیں اور قسطوں پر لینے کی وجہ سے مزید مہنگی پڑتی ہیں۔"

وہ فل کے گھر پہنچے تب بھی اسی موضوع پر بات جاری تھی۔ دونوں عورتوں نے سینڈوچ گرم کیے۔ صوفیہ انہیں سینڈوچ دیتے ہوئے بولی۔ "یہ بجلی کے چولھے پر پکے ہیں۔ امید ہے تم برا نہیں مناؤ گے۔" اس کا لہجہ قدرے استہزائیہ تھا۔

رے سنجیدگی سے بولا۔ "یہ بھی ہم لوگوں کا وہم ہے کہ بجلی زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ میرے دادا کے گھر میں بجلی نہیں تھی اور وہ نیویارک شہر کے مرکز میں رہتے تھے۔ ان کی زندگی بھی ہنسی خوشی گزر گئی۔"

"میرے والدین جس کاٹج میں موسم گرما گزارتے تھے وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔" فل بولا۔ "ہم مٹی کے تیل کے لیمپوں کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ میں اس وقت چھوٹا تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ لیمپ کتنی عمدہ روشنی دیتے تھے۔ ہماری بات تو خیر چھوڑو...... کسی زمانے میں تو فرانس اور انگلینڈ

کے بادشاہ اور ملکہ وغیرہ بھی بغیر بجلی کے رہتے تھے۔"

"اور انہیں بلوں کے عذاب بھی لاحق نہیں تھے۔" رے مسکراتے ہوئے بولا۔ "مٹی کے تیل کا خرچ بجلی سے کہیں کم ہوتا ہے۔"

"بہت خوب......" صوفیہ نے سر ہلایا۔ "یوں گویا تم نے بجلی اور گیس کے مسئلے کا حل تو پیش کر دیا۔ اور پانی کا کیا ہوگا۔"

رے نے فل کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری بیوی سمجھتی ہے کہ پانی صرف ٹونٹیوں سے نکلتا ہے۔ دنیا میں اور کہیں پانی نہیں پایا جاتا۔" پھر وہ صوفیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تازہ شفاف اور صحت بخش پہاڑی معدنیات سے مالا مال بے حساب پانی ہمارے دروازے کے سامنے بہہ رہا ہوگا مائی ڈیئر! تم اس خوب صورت پہاڑی ندی کو بھول گئیں جو ہم نے وہاں دیکھی تھی۔ ویسا صاف ستھرا پانی تو ہمیں زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ اگر ضروری ہوا تو میں اور فل مل کر اس پانی کو پائپوں کے ذریعے گھر میں لانے کا بھی بندوبست کرلیں گے۔ ویسے ہم دونوں بالٹیوں کے ذریعے پانی بھر کر لانے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گے۔ کیوں فل۔"

"بے شک۔" فل فوراً بولا۔ "مردوں کو اللہ نے اسی قسم کے کاموں کے لیے بنایا ہے۔ یہ لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم ہمیں انہی کاموں کے لیے دیے گئے تھے۔ سارا دن میزوں پر بیٹھنے کمپیوٹروں کے بٹن دبانے اور کاغذوں پر لکیریں کھینچنے کے لیے نہیں دیے گئے تھے۔ اگر تم غور کرو تو احساس ہوگا کہ انسان کتنے غیر فطری انداز میں اپنی زندگی کو ضائع کر رہا ہے۔ اپنے جسم اور دماغ پر چربی کی تہیں چڑھا رہا ہے۔ اصل زندگی تو کچھ اور ہے جسے ہم نے خوامخواہ ناممکن سمجھا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اب بھی وہ زندگی ہماری رسائی میں ہے۔ بس تھوڑی سی ہمت کرنے کی بات ہے۔"

دونوں عورتوں کا خیال تھا کہ جس طرح ہر اتوار کو دونوں مردوں کے سر پر کوئی نیا بھوت سوار ہوتا تھا' اسی طرح یہ بھی ایک نیا بھوت تھا۔ انہیں امید تھی کہ پیر کو جونہی ہمیشہ کی طرح مصروف زندگی کے معمولات شروع ہوں گے' یہ بھوت بھی ان کے سر سے اتر جائے گا لیکن خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔

جمعرات کو جینی نے صوفیہ کو فون کیا۔ "فل تو اس معاملے میں سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو آج کل اس کے علاوہ کسی موضوع پر بات ہی نہیں کرتا۔"

"یہی حال رے کا بھی ہے۔" صوفیہ بولی۔

"میں تو پریشان ہونے لگی ہوں۔" جینی بولی۔ "اگر وہ اسی طرح صبح و شام اس موضوع پر بات کرتے رہے تو ایک نہ ایک دن ہمیں بھی قائل کرلیں گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد صوفیہ بولی۔ "سچ پوچھو تو میں تو کچھ قائل ہونے ہی لگی ہوں اور پھر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر رے اس تجویز کے بارے میں اتنا پرجوش ہے اور اس طرح کی زندگی کے تصور سے اتنا خوش ہے تو مجھے اس کو اس خوشی سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ مجھے اس کو یہ تجربہ کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ اگر وہ خود ہی اس سے بیزار ہو جائے تو الگ بات ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "ویسے میں بھی کل سارا دن اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ذرا تم بھی غور کرو۔ ہمارے گھروں میں گیس' بجلی' پانی' فون سب کچھ موجود ہے۔ ہر کام کرنے کے لیے مشینیں موجود ہیں جو انسان کا وقت بچانے کے لیے ایجاد ہوئی تھیں۔ جدید زندگی کی ہر آسائش ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے باوجود ہم صبح سے شام تک گھرداری میں مصروف رہتی ہیں۔ بڑی مشکل سے چھٹی والے دن وقت نکلتا ہے اور ابھی تو ہمارے بچے بھی نہیں ہیں۔ جب بچے ہوں گے تو مصروفیت کا کیا عالم ہوگا۔"

جینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ بھی سوچوں میں الجھ گئی تھی۔ تب صوفیہ گہری سانس لے

کر بولی۔ "اس لیے میں سوچتی ہوں کہ ہمیں بھی خوشی خوشی ان کے تجربے میں شریک ہو کر دیکھ لینا چاہیے۔ شاید وہ زندگی ہماری موجودہ زندگی سے زیادہ دلچسپ اور پرلطف ہو جس کا نقشہ رے اور فل کھینچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے۔"

تب جینی نے بھی گہری سانس لی اور بولی۔ "شکر ہے یہ بات تم نے پہلے کہہ دی۔ میں تمہارے منہ سے سننا چاہ رہی تھی۔ فل اس سلسلے میں دن رات میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ شاید وہاں کی تمام تر دشواریوں کے باوجود زندگی زیادہ اچھی محسوس ہو۔ ہم اپنے آپ کو زیادہ صحت مند اور اپنے دل میں زیادہ ترنگ محسوس کریں۔"

آئندہ اتوار کو وہ فل کے گھر میں چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے تو دونوں عورتوں کی درخواست پر اس موضوع پر مسلسل بات چیت بند کر دی گئی تھی لیکن فل کاغذوں پر نقشے بنا کر رے کو سمجھا رہا تھا کہ چوبی مکان بنانے کے لیے بھاری شہتیر کس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاتے تھے۔ یہ طریقے اس نے گزشتہ روز پبلک لائبریری میں ایک کتاب میں پڑھے تھے۔

وہ خاموش ہوا تو جینی بولی۔ "ہم اس سلسلے میں ایک ایک پہلو پر کئی کئی مرتبہ بات کر چکے ہیں۔ اب ہمیں سنجیدگی سے آخری مرتبہ غور کرنا چاہیے اور کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہیے۔"

فل تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں دو ہفتے اس سلسلے میں بالکل خاموش رہ کر صرف غور کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اگر ہم اس پر متفق ہوئے تو صحیح معنوں میں دل سے متفق ہوں گے۔"

"اس موضوع پر خاموش ہونے سے پہلے میں چند باتوں کی وضاحت کردوں۔" رے بولا۔ "ہماری اس تجویز کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم تیرہویں یا اٹھارہویں صدی میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے کہ اپنی کپاس اگا کر اس کا دھاگا بنائیں پھر اس سے اپنے لیے کھڈی پر کپڑا خود تیار کریں۔ اپنا صابن خود تیار کریں۔ ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ ہم صرف اپنی ضروریات زندگی کو محدود کریں گے اور فضولیات کو ترک کر دیں گے۔ جن فضول چیزوں پر خوامخواہ ہماری زندگی خرچ ہو رہی ہے' انہیں زندگی سے نکال دیں گے۔ صرف انہی بنیادی چیزوں کے لیے محنت کریں گے جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔"

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر بولا۔ "مثلاً دوائی کے طور پر ہمارے لیے پنسلین اپنے پاس رکھنی ضروری ہوگی لیکن کمر سینکنے کے لیے فینسی برقی لیمپ ضروری نہیں ہوگا۔ جب ہم فضولیات کو ترک کر دیں گے تو ہمارے پاس زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے زیادہ وقت ہوگا۔ ہم زیادہ صحت مندانہ زندگی گزاریں گے۔ ہمارے پاس پڑھنے کے لیے بھی زیادہ وقت ہوگا۔ ہر مہینے ہم کتابیں اور رسالے لایا کریں گے۔ وہ کتابیں بھی پڑھیں گے جن کے بارے میں ہم ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں کہ وقت ملے گا تو پڑھیں گے۔ کتابیں خریدنا بھی ضروری نہیں ہوگا۔ قریبی قصبے میں اچھی خاصی لائبریری موجود ہے۔"

پھر اس کی آنکھوں کی چمک اور لہجے کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ "ہم شطرنج اور تاش کھیلا کریں گے۔ دوسرے مشاغل کے لیے بھی ہمارے پاس وقت ہوگا۔ ہم جنگلی جانوروں اور مچھلی کے شکار پر جایا کریں گے۔ باغبانی کریں گے۔ سردیوں میں اس کی انگ کریں گے۔ حتیٰ کہ کبھی وقت نکال کر ہم خود اپنے لیے ایک سوئمنگ پول بھی تیار کریں گے۔ وہ خوب صورت اور جدید قسم کا سوئمنگ پول تو نہیں ہوگا لیکن بہرحال سوئمنگ پول ہوگا۔ وہاں ہمارے نئے دوست بھی بنیں گے۔ پرانے دوستوں میں بھی شاید کچھ لوگ ایڈونچر کے طور پر سفر کر کے وہاں آنے کی ہمت کر لیا کریں اور وہاں آ کر وہ یقیناً بہت لطف اندوز ہوا کریں گے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ ”بلکہ مجھے تو لگتا ہے ان میں سے بعض لوگ جب ہمارا طرز زندگی دیکھیں گے اور غور کریں گے کہ یہ سب کچھ اتنا مشکل نہیں تو وہ بھی اسی طرح وہاں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ میں اور صوفیہ سوچ رہے تھے کہ اب ہمیں والدین بھی بن جانا چاہیے اور مجھے معلوم ہے تم دونوں میاں بیوی بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہے ہو۔ ہمارے بچوں کے حق میں بہت بہتر ہوگا کہ وہ وہاں جنم لیں۔ وہ زیادہ عمدہ اور فطری ماحول میں پرورش پائیں گے۔ یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ دنیا سے کٹے ہوئے ہوں گے۔ وہاں آس پاس فارم ہیں۔ ان کے مالکوں اور کارندوں کے بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے بچے ان کے ساتھ کھیل سکیں گے۔ دو میل سے بھی کم فاصلے پر ایک اسکول ہے۔ ہم انہیں وہاں داخل کرا دیں گے اور ان علاقوں کے بچے دو میل کا فاصلہ تو پیدل طے کر لیتے ہیں۔“

وہ گویا چشم تصور سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہی صحیح معنوں میں ایک بھرپور زندگی سے آشنا ہوں گے۔ وہ تنگ و تاریک کمروں میں ٹی وی پر احمقانہ کارٹون فلمیں یا تشدد اور شور شرابے سے بھرپور فلمیں دیکھ کر اپنے ذہنوں کو سست اور پراگندہ نہیں کریں گے۔ انہیں ندی نالوں، جنگلوں کھیتوں، کھلیانوں، باغوں، پھلوں، سبزیوں جنگلی جانوروں، موسموں اور آڑے ترچھے راستوں کے بارے میں بچپن سے سب کچھ معلوم ہو گا۔ ہم اور ہمارے بچے بیسویں صدی میں رہتے ہوئے ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے جن سے انسان محروم ہو چکا ہے۔“

باقی تینوں افراد نے اس کی تقریر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ہفتے تک وہ اپنے معاہدے پر قائم رہے اور ان میں سے کسی نے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔ وہ ہفتے بعد وہ اتوار کو فل کے گھر میں ناشتے کے لیے یکجا ہوئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر عورتیں برتن دھو چکیں اور مردوں نے سگریٹ سلگا لیے تو رے نے فل کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔ ”ہاں..... تو تم دونوں نے کیا سوچا۔“

”تم بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا۔“ فل نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

رے ایک لمحے خاموش رہا پھر گویا سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے بولا۔ ”فل! میں معذرت چاہتا ہوں۔ ہم میاں بیوی دو ہفتے کے لیے اس موضوع پر بات نہ کرنے کے عہد پر قائم نہیں ہو سکے۔ پچھلے دو دنوں سے ہم اس موضوع پر بات کر رہے ہیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ ہم الجھن میں پڑ گئے ہیں۔“

اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”اصل میں اس دوران میں حالات میں ایک تبدیلی آ گئی ہے۔“

”تبدیلی۔ کیسی تبدیلی۔“ فل نے ایک نظر اپنی بیوی کی طرف دیکھنے کے بعد پوچھا۔

”بات تو بہت لمبی چوڑی ہے۔ میں اور صوفیہ اس کے بارے میں گھنٹوں تبادلہ خیال کرتے رہے ہیں لیکن مختصر بات بس اتنی ہے کہ دفتر میں میری ترقی ہو گئی ہے۔“ رے نے ٹٹولنے والے انداز میں دونوں میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لیا پھر مدافعانہ لہجے میں بولا۔ ”میری تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں تم میری بات کو سمجھ سکو یا نہیں۔“

فل نے اچانک ہی ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں بہت اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ کیونکہ ہم میاں بیوی بھی اس قسم کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا قصہ ہوا کہ دس دن پہلے میرے دفتر میں افواہ اڑی کہ میرے ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہے۔ پچھلے جمعے کو اس کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے واقعی استعفا دے دیا ہے۔ اب صورت حال کچھ ایسی ہے کہ اگر میں ذرا سی بھی کوشش کروں تو یہ عہدہ مجھے مل سکتا ہے۔ حق بھی میرا ہی بنتا ہے۔ یہ عہدہ حاصل ہونے کا مطلب ہے کہ

میری تنخواہ اور مراعات میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ ہم میاں بیوی بھی اس سلسلے میں بات کرتے رہے ہیں۔“

وہ سب ہنسی مذاق کرنے لگے۔ آخر صوفیہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”آج فیصلے کا دن تھا..... فیصلہ کیا ہوا۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں مرد سر جھکائے بیٹھے اپنی اپنی انگلیوں میں سگریٹ گھماتے رہے۔ آخر رے نے سر اٹھایا اور بولا۔ ”ہم وہی کریں گے جو میرے والد نے کیا تھا۔“

باقی تینوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو رے بولا۔ ”میرے والد ڈاکٹر تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو انہیں پریکٹس کرتے ہوئے ایک سال گزرا تھا۔ انہیں ایک پیش کش ہوئی کہ اگر وہ چاہیں تو دریائے ایمیزون کے آس پاس کے علاقے میں سروے کرنے اور نقشے وغیرہ بنانے والی ایک ٹیم کے ساتھ ڈاکٹر کے طور پر ایک سال کے لیے چلے جائیں۔ اس وقت ان کی پریکٹس اچھی کا صی چل نکلی تھی لیکن اس مہم پر جانے کے لیے ان کا دل بھی مچل رہا تھا۔ مہم پر جانے کا مقصد اپنی پریکٹس کو خیر باد کہنا اور ایک سال بعد آ کر نئے سرے سے جدوجہد شروع کرنا تھا۔ کافی دنوں تک وہ کشمکش اور اذیت میں مبتلا رہے لیکن آخر کار فیصلے پر پہنچ گئے۔“

رے چند سیکنڈ خاموش رہا تو فل نے پوچھا۔ ”انہوں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔“

رے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو ہم کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بہت دن اس موضوع پر باتیں کیں..... بہت دماغ سوزی کی، بہت تجزیے کیے اور آخر کار بہت سے اہم پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔“

پھر رے آگے جھک کر باری باری سب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”اس کے بعد ان کی پریکٹس بہت بڑھی۔ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر شمار ہوئے لیکن ان کی ساری زندگی اپنے فیصلے پر پچھتاتے ہوئے گزری۔“

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ ”بالکل یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوگا۔ ہم نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ ہم شہری زندگی کے چکر میں گرفتار رہیں گے لیکن ہم زندگی بھر اپنے فیصلے پر پچھتاتے رہیں گے۔ اصل میں انسان کو پچھتانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ ہمیں بھی زندگی کا پچھتاوا مل گیا ہے۔“

مسکرایئے

چھوٹے قد کی عورت سے جس کا شوہر بہت لمبا تھا، اس کی سہیلی نے پوچھا: ”تم نے اتنے لمبے آدمی سے شادی کیوں کی۔“ اس کی سہیلی نے جواب دیا: ”اس لیے کہ وہ جب مجھ سے بات کرے گا تو گردن جھکا کر اور جب میں بات کروں گی تو گردن اٹھا کر کروں گی۔“

☆

میاں بیوی کو فلم کے ٹکٹ ڈاک کے ذریعے ملے۔ دونوں میں بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی کہ یہ ٹکٹ کس نے بھیجے ہیں۔ بیوی کو ضد تھی کہ اس کی سہیلی نے بھیجے ہیں اور شوہر کا اصرار تھا کہ اس کے دوست نے بھیجے ہیں۔ وہ دونوں جب فلم دیکھ کر واپس لوٹے تو ان کے مکان کا صفایا ہو چکا تھا۔ ان کو ڈرائنگ روم کی میز پر ایک کاغذ ملا، جس پر لکھا تھا۔ ”کیسے فلم کیسی تھی؟ آپ کے فلم دیکھنے کا شکریہ!“

☆

زندگی جینے کا نام ہی نہیں بلکہ زندگی ایک تلخ مرحلہ ہے، ایک دشوار راہ گزر ہے، جو کوئی اس راہ گزر کو عبور کر گیا۔ سمجھو اس نے بام عرش کو چھو لیا۔ اس لیے ہمیشہ زندگی کے سامنے ہار ماننے سے بہتر ہے کہ اسے اپناؤ، اس کا سامنا کرو۔ زندگی میں جو کانٹے ہیں جو دشواریاں ہیں انہیں خوش اسلوبی سے پورا کرو۔

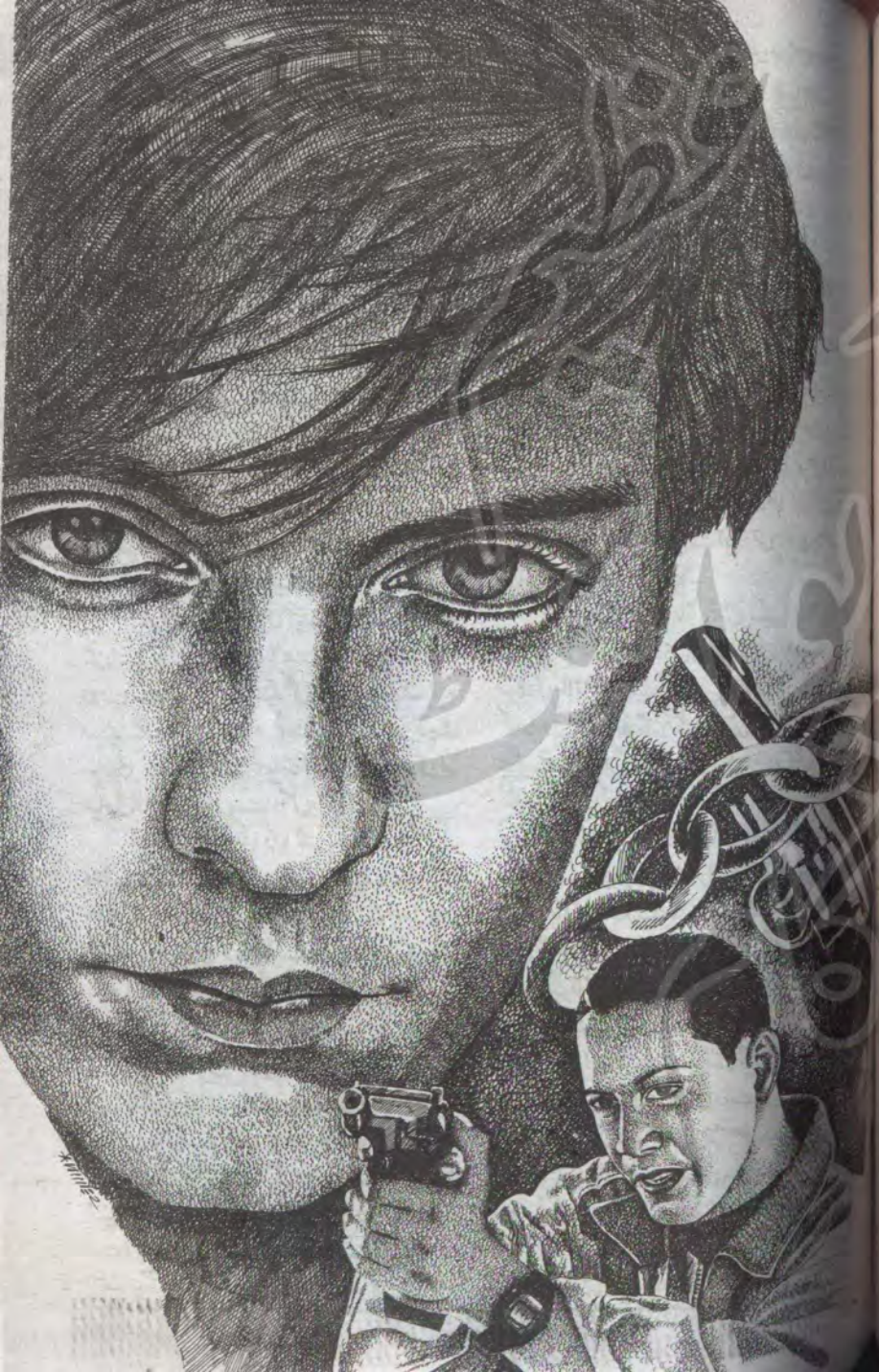

تم سے دور نہیں

آٹھویں قسط

غزالہ جلیل راؤ

اشرف المخلوقات ہی ہر کہانی کا مرکز ہوتا ہے باقی بہت سے ذی روح ہیں لیکن سب کے سب انسان کے تابع۔ ان کی ہر کہانی انسان سے منسوب ہوتی ہے۔ میں نے ہر دور کو دیکھا ہے۔ اس سے لطف اندوز ہوا ہوں۔ اسے لکھا ہے۔ میں نے انسان کو تاریخ سے روشناس کرایا ہے' مجھ میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ میں ماضی کا شناور ہوں۔ میں حال کا مسافر ہوں اور میں ہی سب سے پہلے مستقبل میں جھانکوں گا۔ ایسے تو میری شناوری میں بہت سے نت نئے تجربات ہیں' میں سائنس داں ہوں۔ میں ماہر نفسیات اور بہت کچھ ہوں۔ بڑے دلچسپ تجربات ہیں میری زندگی میں لیکن جس چیز کو میں نے سب سے زیادہ محسوس کیا ہے وہ ہے 'تضاد' ہاں انسانی فطرت کا تضاد حالات کی وجہ سے۔ ماحول کی وجہ سے۔ کہیں مشکلوں کے دریا سے گزر کر سکون کے مرغزار اور کہیں سکون کی وادیوں کے سفر کا اختتام خارزاروں پر۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک انوکھی داستان

جیلر بھی تمام رات بلی کی چیخیں سنتا رہا تھا۔ اس لیے فطرتاً اسے نادر سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ جیلر کو یقین ہوگیا تھا کہ نادر بالکل ہی بے گناہ ہے اور خبیث بلی واقعی اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس نے نادر سے پوچھا۔

"رات کو نیند آئی تھی۔" جیلر واقف تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے سے نادر کو خواب آور دوا پلا دی گئی تھی۔

"جی نہیں' نیند تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آئی۔ آپ خود سوچیے بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ تمام رات بلی میرے قریب پلنگ کے پاس موجود رہے اور میں سوتا رہوں۔"

نادر کے اس جواب نے جیلر کو حیران کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خواب آور دوا کی اتنی زیادہ خوراک بھی ناکام رہ سکتی ہے۔ اس نے آج کی رات کے لیے ایک بالکل نیا منصوبہ بنایا۔

جیلر جیل کے باہر ہی ایک چھوٹے سے بنگلے میں اپنے بیوی' بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور چونکہ گزشتہ دو دن سے خود اس کے بچے بھی تمام رات خوف زدہ رہے تھے۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر جیل کو اس خبیث سیاہ بلی سے نجات دلا دینا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ سیاہ بلی تو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔

تمام دن جیل کی دنیا میں ایک عجیب قسم کی دہشت پھیلی رہی۔ کوارٹروں میں رہنے والے بعض وارڈر شہر جا کر ملاؤں سے تعویذ لے آئے اور انہوں نے ان تعویذوں کو دروازے کی چوکھٹ میں دفن کر دیا۔ تاکہ تعویذ کی برکتوں سے کم از کم ان کے کوارٹر بلی کی نحوست سے محفوظ رہیں۔

ایک وارڈن غریب آبادی میں رہنے والے ایک عامل کو بلا لایا۔ کیونکہ سیاہ بلی کی کہانی سننے کے بعد اس عامل نے دعویٰ کیا تھا وہ اپنے عمل کے زور سے اس بلی کو اس کے اصلی روپ میں دست بستہ اپنے قدموں پر جھکا دے گا۔ عامل کی عمر اسی برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں دور' دور تک یہ مشہور تھا کہ وہ جنوں اور بھوت پریتوں کو فوراً اپنے عمل کی طاقت سے زیر کر لیتا ہے۔ ہر جمعرات کو اس کی جھونپڑی میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ اس ہجوم میں وہ لوگ بھی ہوتے جن کو کوئی بھوت پریشان کرتا تھا اور وہ لوگ بھی ہوتے جن کی بیوی یا لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہوتا۔ عامل کسی کو تعویذ دے دیتا۔ کسی کی آنکھ میں کاجل لگا دیتا۔ زیادہ طاقت ور جن یا بھوت پریت کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ معمول کے مطابق مکان پر باقاعدہ عمل پڑھنے کے لیے جایا کرتا تھا اور چونکہ وہ یہ کام محض خدمت خلق کے لیے کرتا تھا اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ اس لیے اس کی شہرت بھی ہوگئی تھی اور توہم پرستوں نے اس کو عزت کا درجہ بھی دیا۔ بوڑھا عامل یا تو عبادت کرتا رہتا یا کوئی عمل پڑھتا رہتا۔ مشہور تھا کہ اس نے اپنے ہم زاد کو اپنا غلام بنا لیا ہے اور وہی نادیدہ طور پر اس کی خدمت کرتا رہتا ہے۔

شام سے پہلے ہی عامل جیل کے باہر اس بستی میں پہنچ گیا جہاں کافی دور سے وارڈوں اور دوسرے سرکاری ملازموں کے کوارٹر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کوارٹروں کے وسط میں جیلر اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے تھے۔ جیلر کو بھی عامل کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی لیکن اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی اور وہ روک ٹوک کرتا بھی کیسے' جبکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ حالات کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو جانے پر وہ فوراً روحانی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب بڑے سے بڑے مادہ پرست روح کے قائل ہو جاتے ہیں۔ روح کے بھی اور ان دیکھی طاقت کی عظمت کے بھی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جیلر نے سیاہ بلی کے مقابلے پر اپنا آج کی رات کا منصوبہ منسوخ کر دیا تھا۔ اس نے بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ویسے جیلر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے روح سے زیادہ مادہ کا قائل تھا۔

ادھر جیل کے باہر پیپل کے پرانے درخت کے نیچے عامل اپنے چاروں طرف ایک حصار کھینچ کر

بیٹھ چکا تھا۔ یہ حصار اس نے انسانی ہاتھ کی ہڈی سے کھینچا تھا۔ عامل کا دعویٰ تھا کہ اس ہڈی سے بنائے ہوئے حصار کے اندر کوئی بھی خبیث روح داخل نہیں ہو سکتی اور اگر داخل ہونے کی کوشش کرے گی تو لکیر پر قدم رکھتے ہی وہ آگ میں بھسم ہو جائے گی۔

اپنے سامنے املی کے کوئلے دہکا کر اس نے ان پر پڑھا ہوا لوبان ڈالا۔ دھواں پھیلتے ہی اس نے اپنا عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ عمل کے دوران میں وقفے وقفے سے جلتے ہوئے کوئلوں پر لوبان ڈالتا جاتا۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی آس پاس کی فضا لوبان کے دھوئیں سے بوجھل ہوتی گئی۔ عامل کی آواز ماحول کی خاموشی میں بلند ہوتی گئی اور پھر جیسے ہی بلی کی پہلی چیخ فضا میں گونجی تو ایک طرف جہاں عامل کی آواز میں زیادہ زور پیدا ہو گیا' وہاں کوارٹروں میں دم سادھے بیٹھی ہوئی عورتوں کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے خوف زدہ ہو کر اپنے بچوں کو اپنی گود میں چھپا لیا۔

دوسری طرف جیل کے اندر جیلر کا تمام انتظام مکمل تھا۔ جیل کی بلند دیوار پر جگہ جگہ بجلی کے بڑے بڑے بلب جلا دیے گئے تھے۔ اسپتال کی چھت پر چاروں طرف گارڈ بندوقیں لیے تعینات کر دیے گئے تھے۔ نادر کے پلنگ کے نزدیک ساری رات کے لیے چار مسلح وارڈروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں بھی تیز روشنی کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ مختلف پارکوں کے احاطوں میں پہرے داروں کو تمام رات چوکس اور مستعد رہنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ تمام بندوقچیوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ سیاہ بلی کو دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

جیسے ہی بلی کی پہلی چیخ فضا میں گونجی' ہر بندوق فائر کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ تمام پہرے دار' چوکی دار اور وارڈر اپنی جگہ چوکنے ہو کر ہوشیار ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ بلی کی چیخ سنتے ہی دہشت کی وجہ سے ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ہونٹ خشک ہونے لگے۔

نادر کو آج بھی خواب آور دوا کی بڑی خوراک پلا دی گئی تھی اور ڈاکٹر نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر رات کے کسی حصے میں نادر کی نیند ٹوٹ جائے تو اس کو ایک اور خوراک پلا دی جائے۔

لیکن اس کے باوجود سیاہ بلی کی چیخ میں نامعلوم کون سا جادو تھا' کون سا طلسم تھا' کون سی دہشت تھی کہ بلی کی پہلی ہی چیخ پر نادر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اچھل کر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں اپنے پلنگ پر چاروں طرف تعینات مسلح وارڈوں پر بھی پڑیں اور اس کے کانوں میں عامل کی آواز بھی پہنچ گئی۔ جو بدستور انتہائی پاٹ دار آواز میں اپنا عمل پڑھے جا رہا تھا۔

اچانک فضا میں بلی کی دوسری چیخ پھیلی اور پھر اس چیخ کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز گونج گئی۔ کئی وارڈن دوڑ کر اس پہرے دار کے نزدیک پہنچے۔ جس کی بندوق نے آگ اگلی تھی۔ پہرے دار نے کہا۔ اس نے ایک بلی پر جو سامنے کی دیوار پر موجود تھی فائر کر دیا۔ دھڑکتے ہوئے دلوں اور متلاشی نگاہوں کے ساتھ بلی کی لاش تلاش کی گئی۔ دیوار کے سائے میں اس بلی کی لاش بھی مل گئی۔

لیکن اس بلی کا رنگ سیاہ نہیں تھا۔ مقتول بلی کا رنگ بھورا تھا اور وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ جیل میں دیکھی جا چکی تھی۔

عامل کا عمل بدستور جاری تھا۔ بوڑھے عامل کو پورا یقین تھا کہ آدھی رات ہوتے ہی بلی کی خبیث روح اپنے اصل قالب میں حصار کی لکیر تک پہنچنے کے بعد اس کے قدموں پر سر جھکا دے گی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور اب آدھی رات ہونے میں چند ہی لمحے باقی رہ گئے تھے۔ جیل کی فضا میں سکوت سا طاری تھا' ہر طرف ایک گہری' لیکن پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ خاموش اور دبکا ہوا سا بیٹھا تھا۔ بلی کی چیخیں بھی ختم ہو چلی تھیں اور بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عامل کا عمل کامیاب ہوتا جا رہا ہے۔ جیل کے اندر نادر پر دوبارہ نیند کا غلبہ ہو چکا تھا اور جیل کے باہر عامل اس طرح زور دار آواز میں اپنا عمل پڑھ رہا تھا کہ سناٹے کو چیرتی ہوئی

اس کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔

عامل کو اپنے عمل کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے انجام سے بالکل بے پروا اور ماحول کے ڈراؤنے پن سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنا عمل پڑھے جا رہا تھا۔ اسے اپنے علم پر پورا بھروسہ تھا اور اسے کامل یقین تھا کہ بارہ بجتے ہی بلی کی خبیث روح اپنے اصل روپ میں اس کے حصار پر سرپٹختی حاضر ہو جائے..... اور ہوا بھی یہی۔

"میں آ گئی ہوں۔" عامل کے کان میں ایک نسوانی سرگوشی پہنچی اور اس نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

حصار کے باہر ایک خوب صورت عورت موجود تھی سفید لباس' سفید رنگ' لیکن چمک دار' سیاہ آنکھیں۔

"تمہارا نام۔" عامل نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"عالیہ۔" آواز اتنی ہلکی تھی کہ عامل کے علاوہ کسی کے کان میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"تم بلی کیوں بن جاتی ہو۔"

"یہ میرا اپنا راز ہے۔ میں بلی بن نہیں جاتی' بلی تو میں ہوں ہی البتہ عالیہ ضرور بن جاتی ہوں۔"

"تو تم عالہ کیوں بن جاتی ہو۔"

"کہا نا یہ میرا اپنا راز ہے اور یہ ضروری نہیں کہ میں اپنا راز آپ کو بتا دوں' آپ اپنے عمل کے زور سے مجھے یہاں بلا سکتے ہیں' تو اپنے علم کے بل پر میرا یہ راز بھی معلوم کر سکتے ہیں۔"

جواب میں عامل خاموش رہا اور خاموش کیسے نا رہتا جب کہ عالیہ نے بالکل صحیح بات کہی تھی۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔" اب عالیہ نے سوال کیا۔

"یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تم بلی بن کر بے گناہ انسانوں کو اپنی خباثت کا نشانہ کیوں دکھا رہی ہو۔"

"انتقام لینے کے لیے....." عالیہ نے بدستور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"کس سے۔" عامل نے پوچھا۔

"نادر سے' جو جیل میں بند ہے اور ہر اس موجود سے جو میری راہ میں حائل ہوگا۔" عالیہ کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا۔

"لیکن وہ وقت آنے سے پہلے میں تجھے جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

"خبیث روح....." عامل نے بدستور بڑی سنجیدگی سے کہا اور اس نے اپنے قریب رکھے ہوئے ایک پیالے سے جو کسی عجیب و غریب انجانی دھات سے بنا ہوا تھا' چاول کے چند دانے اٹھا کر عالیہ کی طرف پھینک دیے۔

ان چاولوں کا جسم سے چھونا تھا کہ عالیہ کے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ ایک ایسی چیخ جو صرف عامل نے سنی تھی۔

"اپنی سفلی طاقتوں کا مظاہرہ ایک معمولی بلی پر نہ کر بوڑھے عامل اگر بہادر ہے اور اگر تجھے اپنے علم و عمل پر پورا یقین ہے تو حصار ختم کر دے۔"

لیکن عامل پر عالیہ کی للکار کا کوئی اثر نہ پڑا پورے سکون و اطمینان کے ساتھ وہ ان چاولوں کو عالیہ کی طرف پھینکتا رہا اور اس کے کانوں میں عالیہ کی نسوانی چیخوں کی آواز پہنچتی رہی۔

دھیرے دھیرے یہ آواز بلی کی آواز میں بدلی اور پھر یہ آواز بلی کی درد کرب میں ڈوبی ہوئی آواز بن کر حصار کے اندر کی فضا میں گونجنے لگی۔

عامل سمجھا کہ بلی اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ فنا ہو رہی ہے اس کا عمل کامیاب ہو رہا ہے۔ اس کا برسوں کا تجربہ کام آ رہا ہے' اس کی مہینوں کی ریاضت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس نے اور زور سے اپنا عمل پڑھنا شروع کیا اور پھر جب بلی کی یہ نہ سنائی دینے والی چیخیں بالکل ختم ہو گئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ حصار کے باہر بلی اوندھے منہ پڑی تھی۔

یہ سمجھ کر بلی مر چکی ہوگی اور اس کے ساتھ اس کی ساری خباثتیں بھی ختم ہو چکی ہوں گی' عامل نے حصار کے باہر قدم رکھا اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ مردہ بلی کس حالت میں ہے' جیسے ہی وہ جھکا اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ خونخوار سیاہ بلی اپنے تیز اور نوکیلے دانت عامل

کے نرخرے میں گاڑ چکی تھی..... یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا عامل دوسری سانس بھی نہ لے سکا' اس وقت رات کے ٹھیک دو بج رہے تھے۔

ادھر جیل کے باہر یہ حادثہ ہوا اور چند لمحہ بعد ادھر بالکل اچانک جیل اسپتال کے صحن میں انسانی قدموں کی ایک آواز ابھری..... ہلکی آواز..... صدھم آواز..... نازک آواز..... ایک ایسی آواز جو نغمہ بن کر فضا میں گونج رہی تھی۔

مسلح وارڈوں نے چونک کر صحن کی طرف دیکھا اور پھر انہیں یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ ایک باوردی نرس صحن کو عبور کر کے اسپتال کی عمارت میں داخل ہو رہی ہے۔ روشنی میں آنے کے بعد جب وارڈوں نے اس نرس کو دیکھا تو وہ اس کی خوب صورتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے آج تک اتنی خوب صورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ سفید وردی میں' اپنے جلد کی سفید رنگت اور سیاہ بالوں کے ساتھ وہ بالکل آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی' اس کے لب اتنے سرخ تھے کہ ان پر کٹے ہوئے تربوز کا شبہ ہوتا تھا۔ آنکھیں اتنی سیاہ تھیں اور پلکیں اتنی لمبی کی ان کی خوب صورتی پر تمام دنیا کا حسن نچھاور کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اسپتال میں استعمال ہونے والی چھوٹی سی سفید ٹرے تھی' اس ٹرے پر دوا کی ایک شیشی' روئی اور ایک سرنج رکھا ہوا تھا۔

ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ حسن و خوب صورتی کا یہ پیکر کچھ اس انداز سے اسپتال کے وارڈ میں داخل ہوا کہ پہرے دار اور وارڈر اس کے ملکوتی حسن سے مرعوب ہو کر رہ گئے۔

اسپتال میں کئی نرسیں تھیں..... اکثر یہ نرسیں انتہائی بیمار قیدیوں کی تیمارداری کے لیے اسپتال میں رات کو بھی موجود رہتی تھیں اس لیے اس نرس کی آمد بھی غیر متوقع نہیں سمجھی گئی۔ وارڈن بھی دیکھتے رہے اور سر ہلاتی بھی اور پھر یہ نرس نادر کے پلنگ کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

چند منٹ تک نادر کو نیند کی حالت میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ نادر کی جانب جھکی۔ ایک ہاتھ سے اس نے نادر کے بازو پر سے کپڑا ہٹایا اور دوسرے ہاتھ سے سرنج لے کر وہ نادر کو انجکشن لگانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اب وہ نادر کے اتنا قریب ہو چکی تھی کہ نادر کی سانس اس تک اور اس کی سانس نادر کی ناک تک پہنچ رہی تھی۔ انگوٹھے کی ایک ہلکی سی جنبش سے سرنج کی لمبی اور باریک سوئی اس نے نادر کے بازو میں پھونک دی اور اچانک نادر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چونک کر نرس کے جھکے ہوئے چہرے اور جسم کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایسا محسوس کیا جیسے ایک خاص قسم کی بو اس کے بالکل قریب موجود ہے۔ وہی بو جو اس نے عالیہ کے جسم سے خارج ہوتی محسوس کی تھی' وہی بو جو بلیوں کے جسم سے پھوٹتی رہتی ہے۔

اور پھر جیسے ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ بو انجکشن لگانے والی نرس کے جسم سے آ رہی ہے' اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی' نرس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس نے دیوانوں کی طرح دوا کی ٹرے ایک طرف اچھال دی اور بازو میں چبھا ہوا سرنج نکال کر دور پھینک دیا۔

"عالیہ....." اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

وہ عالیہ کا نام لے کر اتنی زور سے چیخا تھا کہ اس کی آواز اسپتال کی بارک سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ آواز میں اتنا کرب تھا کہ دور کھڑے ہوئے چوکی دار بھی اسپتال کی جانب دوڑنے لگے۔ مریض اپنے بستروں پر چونک کر بیٹھ گئے۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ نادر مسلسل چیخے لگا تھا۔

دوسرے ہی لمحے نرس اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔

صبح کو جب ڈاکٹر نے یہ قصہ سنا' تو اس نے کہا۔

"میں نے کسی نرس کو ڈیوٹی پر نہیں لگایا تھا' کسی نرس کو انجکشن لگانے کی ہدایت نہیں دی تھی بلکہ کل رات تو جیل کے اندرونی احاطہ میں کوئی نرس ہی موجود نہیں تھی۔"

ڈاکٹر نے اتنا کہنے کے بعد خود محسوس کیا جیسے

مارے خوف کے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

انجکشن میں بھری ہوئی دوائی کا تجزیہ کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں ایک خوفناک قسم کا زہر بھرا ہوا تھا..... اتنا خوفناک کہ اگر اس کی پانچ بوندیں بھی نادر کے جسم میں داخل ہو جاتیں تو اسی لمحہ نادر کی موت واقع ہو جاتی اور پھر دنیا کی کوئی دوا اس کو نہ بچا پاتی۔

اور اس طرح عامل کی موت کے ساتھ اس نئی دہشت نے جیل کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب سیاہ بلی صرف ایک نہ دکھائی دینے والی سیاہ بلی ہی نہیں رہی تھی' اب وہ اپنا قالب بھی بدل رہی تھی اور اب جیل کے حکام کا یہ اولین فرض ہو گیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر نادر کی حفاظت کریں۔

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ایک روح کے حملے سے کسی انسان کو بچایا جا سکتا ہے اور وہ بھی ایک خبیث روح سے' ایک بھیانک روح سے۔

ڈاکٹر نے نادر کے ذہن کو سکون پہنچانے کے لیے اس کو مارفیا کا انجکشن دے دیا' لیکن اس انجکشن نے بھی نادر کے اعصاب پر کوئی اثر نہیں کیا کیونکہ دس بجے دن کو جب گل زمان اس سے جیل میں ملنے کے لیے آیا اور نادر کو اس کی آمد کی اطلاع بھیجی گئی تو وہ جاگ رہا تھا۔

نادر یہ سن کر حیران رہ گیا کہ گل زمان اس سے ملاقات کے لیے آیا ہے اور اس کی یہ حیرت بالکل حق بجانب بھی تھی۔ کیوں کہ گل زمان نے عدالت میں نادر کے خلاف جو بیان دیا تھا' اس کے بعد اس کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا کہ گل زمان اور نادر کے تعلقات باقی رہ جائیں گے۔

ملاقاتی کمرے میں گل زمان کا اداس چہرہ دیکھ کر نفرت کے باوجود نادر کو گل زمان پر رحم سا آ گیا۔ گل زمان کا چہرہ صرف اداس ہی نہیں تھا' اس کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

دونوں دوست چند لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر اچانک گل زمان دوڑ کر نادر سے لپٹ گیا' لپٹ ہی نہیں گیا' دھاڑیں مار مار کر رونے بھی لگا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"کل رات کو عالیہ میرے پاس آئی تھی نادر وہ مر کر دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔" پھر اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں نادر' کل رات کو ٹھیک دو بجے جب میں کمرے میں سو رہا تھا' سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا' لیکن اندھیرے کے باوجود میں نے یہ محسوس کر لیا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی اس کمرے میں موجود ہے اور جب اپنا اطمینان کرنے کے لیے میں نے لیٹے ہی لیٹے قریب کی میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ جلایا تو جانتے ہو میں نے کیا دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میری مسہری کے دائیں جانب عالیہ کھڑی ہے۔ ہاں' ہاں' عالیہ' میری عالیہ' وہی عالیہ جس کو تم نے قتل کیا ہے اور جس کی لاش میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ عالیہ بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی' وہ محبت بھری آنکھیں' وہی محبت بھرا انداز' وہی محبت بھری مسکراہٹ' وہی لباس اور وہی زیور پہنے جو قتل کے وقت اس کے جسم پر موجود تھا' لیکن نادر' نہ تو اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور نہ اس کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا' اس نے مجھ سے باتیں بھی کی ہیں نادر اور تم خوب جانتے ہو کہ اس کی باتیں کتنی پیاری ہوا کرتی تھیں..... اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہیں قتل کر کے ہی دم لے گی۔"

گل زمان نے اپنے دوست نادر کو بے قصور ٹھہرایا اور جب عدالت کے سامنے بھی عالیہ کے مافوق الفطرت ہونے کے شواہد پیش کیے گئے تو رہائی پانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

رہائی پانے کے بعد دونوں دوستوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور سب سے پہلے عالیہ کی قبر پر گئے۔ دونوں کا اندازہ یہ تھا کہ اس دوران کوئی نئی بات ضرور ہوئی ہو گی۔ جب وہ عالیہ کی قبر پر پہنچے تو ان کا یہ اندازہ درست نکلا۔ عالیہ کی قبر خالی تھی۔ بلی

کے قدموں کے نشان باہر موجود تھے' لیکن یہ نشان زیادہ واضح نہیں تھے اور اسی لیے دھڑکتے دل اور کپکپاتے لبوں کے ساتھ نادر اور گل زمان ان نشانوں کے سہارے آگے گئے تو انہیں قبرستان کے اندر ہی تقریباً دس گز چلنے کے بعد رک جانا پڑا۔ بظاہر یہ نشان ایک پرانی قبر پر آ کر ختم ہو گئے تھے۔ یہ قبر پرانی تھی' لیکن شکستہ نہیں تھی۔ اسی لیے نادر اور گل زمان دونوں اس قبر کو غور سے دیکھنے لگے۔

قبر کی بناوٹ' اس کا طرز تعمیر اور اس کا اندازہ یہ بتا رہا تھا کہ قبر کم از کم دو سو سال پرانی ہے اور اگر ایک ویران قبرستان میں کوئی دو سو سالہ قبر صاف ستھری نظر آئے۔ اس پر خاک دھول' پرندوں کی بیٹ اور خشک جھاڑیوں کی ٹہنیاں نہ پڑی ہوں اور کسی جگہ سے ٹوٹی پھوٹی بھی نہ ہو تو بھلا کون ہے جسے یہ قبر دیکھ کر حیرت نہ ہوتی لیکن نادر اور گل زمان کی حیرت کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ قبر پرانی ہونے کے باوجود بالکل سالم تھی بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ بلی کے قدموں کے غیر واضح نشان عالیہ کی کھدی ہوئی قبر سے شروع ہو کر اسی قبر پر ختم ہوتے تھے۔

قبر کی تعمیر کا انداز مغلوں کے دور حکومت کے انداز تعمیر سے ملتا جلتا تھا۔ مغل دور میں قبروں کا چبوترہ محراب دار بنایا جاتا تھا اور اس پر نقش و نگار بھی بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک عام رواج قبر کے سرہانے کتبہ نصب کرنے کا بھی تھا۔ اس کتبہ پر صاحب قبر کی تاریخ وفات اور اس کا نام وغیرہ کندہ کرا دیا جاتا تھا۔ یہ قبر بھی محراب دار تھی' اس کے سرہانے بھی ایک سنگی کتبہ نصب تھا۔ نادر نے جھک کر اس کتبے کی عبارت پڑھنا چاہی۔ گل زمان نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔"

"میں کتبہ کی عبارت پڑھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ قبر کس کی ہے اور حقیقتاً کتنے سال پرانی ہے۔" نادر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ حالانکہ عالیہ کی قبر کو خالی پا کر اس کے اعصاب پر جو دہشت سوار ہوئی تھی۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"کیا کتبے پر کوئی عبارت موجود ہے۔" گل زمان نے سوال کیا۔

"ہاں۔" نادر نے جواب دیا۔

"لیکن یہ عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔"

"کیوں۔"

"اس لیے کہ اس کو کھرچ کر بگاڑ دیا گیا ہے۔ بگاڑنے والے نے کوشش کی ہے کہ کوئی شخص اس عبارت کو پڑھنے نہ پائے۔"

"لیکن کسی نے ایسا کیوں کیا۔" گل زمان نے پوچھا۔

"اس کا جواب یہ بھی ہے کہ بلی کے قدموں کے نشان عالیہ کی قبر سے شروع ہو کر اسی قبر پر ختم کیوں ہوئے۔"

گل زمان اس جواب کے بعد خاموش سا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عالیہ کا وجود ایک بلی بن کر اتنا پراسرار ہو جائے گا۔ واقعات اتنی ہولناک اور دہشت ناک کروٹیں لیں گے اور ناقابل یقین باتیں زندہ اور متحرک بن کر اسرار و ہیبت کی سب سے بڑی حقیقت بن جائیں گے جب سے نادر نے اس کو اپنی حویلی والی آپ بیتی سنائی تھی تو گل زمان نے موجودہ حالات کے بارے میں اپنی رائے اور اپنا فیصلہ ہی بدل دیا تھا اور ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جو اس نے ابھی تک نادر کو نہیں بتایا تھا۔

نادر دیر تک کتبے کی بگڑی ہوئی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا' لیکن لفظوں' دائروں اور لکیروں کے علاوہ اس کو کتبہ میں کسی بھی لفظ یا حرف کی ساخت نظر نہ آئی۔ مجبوراً اس نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ پھر اس نے گل زمان کو مخاطب کر کے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پرانی قبر اتنی صاف ستھری کیوں ہے۔"

"لیکن میں اس کے صاف ستھرے ہونے کا سبب جان چکا ہوں۔" گل زمان نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا جان چکے ہو۔" نادر نے پوچھا۔

"جان ہی نہیں چکا ہوں' دیکھ بھی چکا ہوں کہ بلی

کے قدموں کے نشان اسی قبر پر آ کر ختم ہوئے ہیں اور جہاں بلی ہوگی وہاں جو کچھ بھی ہو جائے وہ کم ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ عالیہ کی اس قبر سے بھی کچھ وابستگی ہوگی۔"

"ہاں ضرور ہوگی۔" گل زمان نے برے سرد لہجے میں جواب دیا لیکن عالیہ کی اس قبر سے کیا وابستگی ہوگی۔ اس کے بارے میں وہ کوئی رائے قائم نہ کر سکا' اس نے سوچا' بہت ممکن ہے یہ عالیہ کے موروث اعلیٰ کی قبر ہو' لیکن اگر یہ عالیہ کے جد امجد کی قبر تھی' تو وہ کون تھا جس نے اس کے کتبہ کی عبارت کو بگاڑ دیا۔ اگر وہ قبر کا دشمن تھا تو اس نے قبر کا نشان مٹانے کی بجائے صرف عبارت کو مٹانے پر ہی اکتفا کیوں کیا۔"

دونوں دوست دیر تک قبر کے نزدیک کھڑے رہے۔ اچانک نادر نے کہا۔

"میں قبرستان کے چوکیدار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس قبر کی صفائی کون کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح ہمیں کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔"

"لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا۔" گل زمان نے پوچھا۔

"بہت فائدہ ہوگا گل زمان۔" نادر نے جواب دیا۔ "اگر ہمیں عالیہ کے خبیث ارادوں کا خاتمہ کرنا ہے تو ہمیں اس کے ماضی کی طرف جانا ہوگا' ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ عالیہ ہے کون۔ تمہاری بیوی بننے سے پہلے وہ کہاں تھی۔ اس نے تمہیں اپنا شوہر کیوں منتخب کیا۔ وہ ایک انتہائی خوب صورت عورت تھی' لیکن اس نے تمہاری بدصورتی میں وہ کونسی خوب صورتی دیکھی جو وہ دل و جان سے تم پر فدا ہوگئی۔"

گل زمان نے نادر کی ان الجھی ہوئی باتوں کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح خاموش رہا جیسے اس نے نادر کے جملے سنے ہی نہیں تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے جیسے وہ ماضی کی دھند میں ڈوب کر رہ گیا۔

اسی اثناء میں نادر قبرستان کے چوکیدار کو آواز دینے کے لیے قبرستان کے دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا' جس کے باہر وہ ایک جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔

یہ چوکیدار صرف قبرستان کا چوکیدار ہی نہیں گورکن بھی تھا۔ گل زمان ماضی کی یادوں میں کچھ اس طرح کھو کر رہ گیا تھا کہ نادر کے جانے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

اس وقت اسے وہ عالیہ بری طرح یاد آ رہی تھی جو اسے ایک بوڑھے کے ساتھ' جسے وہ اپنا باپ کہتی تھی' خشک پہاڑی سڑک پر ہر روز ملا کرتی تھی' اسی پہاڑی کی ایک بلند پر گل زمان کو محکمے کی طرف سے ایک چھوٹا سا بنگلہ رہائش کے لیے مل گیا تھا۔ ہر روز سورج ڈوبنے سے پہلے وہ عالیہ کو اس سڑک سے گزرتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ یہ عورت' یہ خوب صورت عورت جو صنوبر کے درخت سے زیادہ باوقار اور گلاب کے پھول سے زیادہ شاداب اور نرم و نازک ہے' ہر روز مقررہ وقت پر کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔

گل زمان کو اس عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا' اگر معلوم تھا تو صرف یہ کہ اس کی چال میں ایک محسوس ہو جانے والا شاہانہ انداز ہے' اس کے جسم میں ایک ایسی نزاکت ہے جو پھول کی پنکھڑیوں میں تو ہوتی ہے' لیکن جسم انسانی میں نہیں ہوتی' اس کی آنکھوں میں جو گہرائی اور سکون ہے وہ سات سمندروں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہر روز وہ اسے گزرتے دیکھتا اور جب وہ گزر جاتی' جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر پہاڑی سڑک کے موڑ میں گم ہو جاتی تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے سورج ڈوبنے سے پہلے ہی اس کے چاروں طرف تاریکی پھیل گئی ہے۔

گل زمان کا یہ بنگلہ آبادی میں نہیں تھا اور بنگلے کے بعد بھی کوئی آبادی نہیں تھی۔ اسی لیے گل زمان اکثر سوچتا تھا کہ یہ عورت اس ویران سڑک سے گزرتی ہوئی آخر جاتی کہاں ہے لیکن دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے گئے اور گل زمان کو اس کے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ یقیناً وہ اس عورت کے دل آویز حسن اور پرکشش شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا' لیکن چونکہ اپنی بدصورتی کی وجہ سے وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھا' اس لیے اس میں اتنی

اخلاقی جرات ہی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس کا تعاقب کرتا یا کسی دوسرے ذریعے سے یہ معلوم کرتا کہ یہ عورت کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ ابھی تو اسے اس عورت کا نام بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔

قبرستان کے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے گل زمان نے سوچا۔ کتنے اچھے تھے وہ دن! جاڑے کی کہر آلود راتوں سے بھی زیادہ دل کش دن۔ وہ دن جو اچانک کھو گئے' جو اچانک اس سے چھن گئے اور وہ رف ان حسین دنوں کی یاد میں بھٹکتا رہ گیا..... اور یہ سب اتنا اچانک ہوا جیسے کوئی نغمہ اچانک ٹوٹ جائے یا جیسے کوئی بادل برابر سے گزر جائے۔ جیسے تاریک رات میں بجلی چمکے اور سیاہ بدلیاں اس کو دوبارہ دبوچ لیں۔

اور پھر ایک دن گل زمان نے عالیہ سے گفتگو بھی کر لی اور اس کا نام بھی معلوم کر لیا۔ وہ شام اسے آج تک یاد تھی۔ بھلا وہ اپنی زندگی کی اس شام کو کیسے بھول سکتا تھا۔ جب پہلی مرتبہ اس کی محبت نے زندگی کی انگڑائی لی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اس نے عالیہ کی گیتوں بھری آواز سنی تھی اور اس کے شبنم سے بھی زیادہ پاکیزہ وجود کو اپنے بالکل قریب دیکھا تھا۔

شام بادلوں کی گود میں جیسے سمٹ کر رہ گئی تھی۔ چاروں طرف سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ سہ سلا دھار بارش کے آثار تھے' سب معمول وہ بنگلے کی بلندیوں پر کھڑا عالیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت مقررہ وہ سڑک پر سے گزری' جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ لیکن درزیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی' منظر اتنا حسین تھا کہ گل زمان اس میں کھو کر رہ گیا' لیکن پھر اچانک تیز بارش آ گئی اور اسے مجبوراً وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔ اس نے چاہا کہ وہ نیچے سڑک پر جا کر اس عورت کو بھی بارش سے بچنے کے لیے اپنے بنگلے میں پناہ لینے کی دعوت دے دے' لیکن کوشش کے باوجود وہ خود میں اتنی ہمت نہ پیدا کر سکا۔

وہ ابھی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس عورت کے سحر خیز حسن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس موسلا دھار بارش میں اس سے ملنے آخر کون آ سکتا ہے' لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کی یہ حیرت مسرت میں تبدیل ہوگئی۔ سامنے وہی عورت کھڑی تھی جس کو وہ اپنے خوابوں کی ملکہ بنا چکا تھا' آج وہ پہلی مرتبہ اس عورت کو اپنے بالکل قریب دیکھ رہا تھا اس کی نیلی آنکھوں کی لانبی لانبی پلکیں بارش سے بھیگ کر کچھ اور زیادہ حسین ہوگئی تھیں۔ پتلے لب نہ مسکرانے کے باوجود مسکرا رہے تھے۔ برآمدے کے کھمبے کا سہارا لیے وہ کچھ اس انداز میں خم کھائے کھڑی تھی جیسے پہلی کا چاند زمین پر اتر آیا ہو۔

اس شام زندگی میں پہلی مرتبہ گل زمان کو یہ حقیقت زندہ روپ میں نظر آئی کہ عورت کا حسن میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ عورت حسین ہو تو اسے نہ غازہ کی ضرورت ہوتی ہے' نہ لپ اسٹک کی' عورت نے اس نقرئی آواز میں کہا۔

"کیا میں بارش رکنے تک آپ کے کمرے میں پناہ لے سکتی ہوں۔"

گل زمان نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے کمرے میں کوئی ملکوتی نغمہ بکھر گیا ہو' جیسے چوڑیاں کھنک گئی ہوں' پھر اس نے یہ سوچا کہ یہ عورت کب ہے' یہ تو چاند کی وہ پہلی کرن ہے جو دروازہ کھول کر دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوگئی ہے اور ہر طرف ایک روشنی سی پھیل گئی ہے۔

لیکن جب بھیگی ہوئی یہ عورت کرسی پر بیٹھنے کے لیے اس کے قریب سے گزری تو اچانک اس کی ناک میں ایک بو کی لہر سی آئی' ایک ایسی بساند جو عموماً بلی کے جسم سے آتی ہے۔

اس وقت اس نے اس 'بو' کو کوئی اہمیت نہ دی۔ عورت کے ساتھ اس کا بوڑھا باپ بھی تھا۔ اس نے دونوں کو آتش دان کے قریب بٹھا دیا۔ دونوں کو گرم گرم کافی پلائی اور ان سے ذرا دور بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں عورت نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتا دیں۔

"میرا نام عالیہ ہے۔ میں سوات کی رہنے والی

ہوں۔ میری ماں ایبٹ آباد کی رہنے والی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ میں جلد ہی سوات جانے والی ہوں۔ میرا مکان یہاں سے دو میل دور ایک جنگل کے کنارے ہے۔"

"لیکن جنگل کے کنارے تو ایک پرانا قبرستان ہے۔"

"جی ہاں' اسی قبرستان کے قریب ہی میں رہتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے باپ کو آبادی سے نفرت سی ہے۔" عالیہ نے جواب دیا۔

یہ بالکل اتفاق تھا کہ تمام رات بارش ہوتی رہی اور تمام رات عالیہ اس کے چھوٹے سے بنگلے کو جنت بناتی رہی۔ تمام رات دونوں جاگتے رہے' ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور پھر جب صبح کو عالیہ اس کے بنگلے سے باہر نکلی تو خود عالیہ بھی اس کو اپنا دل دے چکی تھی۔

گل زمان نے آج تک یہ نہیں سوچا تھا کہ عالیہ نے ایک ہی رات میں اپنا دل اس کی نذر کیوں کر دیا تھا۔ وہ شام کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ وہ تمام دن اس کا انتظار کرتا رہا۔

ابھی گل زمان نے گزری ہوئی باتوں کے بارے میں یہیں تک سوچا تھا کہ نادر گورکن کو لے کر آ گیا اور حال کی تلخیوں سے حسین ماضی کا ناطہ ٹوٹ گیا۔

"یہ ہے وہ قبر جس کا تذکرہ میں نے تم سے کیا تھا۔" نادر نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گورکن سے کہا۔

"میں اس قبر کو اپنے بچپن سے جانتا ہوں صاحب۔" گورکن نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اس قبر کو ہمیشہ صاف ستھرا ہی پایا ہے۔"

"آخر کون اس قبر کو صاف کر جاتا ہے۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" گورکن نے جواب دیا۔

"اور اسی لیے میں اس قبر کے قریب بھی نہیں آتا۔ ایک مرتبہ میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ بھوت اس قبر کی رکھوالی کرتے ہیں اور روحیں ہر رات کو اس قبر کی صفائی کر جاتی ہیں۔ میں نے خود اکثر تاریک راتوں میں قبرستان کے اندر رونے چلانے کی آوازیں سنی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یقیناً کوئی اس قبر کے پاس بیٹھ کر روتا ہے اور دیر تک اس کی ہچکیوں کی صدائے بازگشت فضا میں گونجتی رہتی ہے۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گورکن نے مزید کہا۔

"آپ یقین نہیں کریں گے جناب' لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے اکثر تاریکی میں اس قبر پر شمع جلتے دیکھی ہے' کبھی اس کے قریب سے گزرتے وقت لوبان کی ایک عجیب سی خوشبو محسوس کی ہے اور ہر سال رجب کی ۲۳ تاریخ کو اس پر تازہ پھولوں کی ایک چادر بھی بچھی ہوئی پائی ہے اور اسی لیے تنہا میں اس کے قریب نہیں جاتا۔ مجھے اس قبر سے ڈر لگتا ہے' اس کو دیکھ کر خدا معلوم کیوں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے اچانک وہ دردناک چیخیں یاد آ جاتی ہیں جو تاریک راتوں میں اس کے قریب سے بلند ہو کر فضا کو سوگوار بناتی رہتی ہیں۔"

"یہ چیخیں عورت کی ہوتی ہیں یا مرد کی۔" سوال گل زمان نے کیا تھا۔

"ایک عورت کی چیخیں' جوان عورت کی چیخیں' بالکل ایسی چیخیں جیسے کوئی بلی رو رہی ہو' کوئی بلی بین کر رہی ہو۔"

گورکن نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ نادر اور گل زمان دونوں کے کلیجے کانپ کر رہ گئے۔

"کیا کبھی کوئی آدمی یا عورت دن کی روشنی میں بھی اس قبر پر فاتحہ پڑھنے یا لوبان سلگانے کے لیے آئی ہے۔" نادر نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہر جمعرات کو ایک عورت یہاں آتی ہے۔"

"کیا اس عورت نے کبھی تم سے کوئی بات چیت کی۔"

"جی نہیں' میں اس عورت سے بھی خوف زدہ ہوں۔ جب وہ قبرستان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ہے تو میں اپنی کوٹھری میں گھس کر اس کا دروازہ

اندر سے بند کر لیتا ہوں۔"

"تم اس عورت سے خوف زدہ کیوں ہو۔" گل زمان نے پوچھا۔

"آپ ہی سوچیے جناب کہ ایک بے حد حسین عورت ایک پراسرار قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ہر جمعرات کو خواہ آندھی ہو یا پانی' خواہ برف باری ہی کیوں نہ ہو رہی ہو' پابندی کے ساتھ یہاں آتی ہو' اس سے کون ہے جو خوف زدہ نہ ہوگا..... اور پھر....." گورکن جیسے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور پھر کیا..... تم کہنا کیا چاہتے ہو....." نادر نے پوچھا۔

"اور پھر سرکار ایک دن میں نے چھپ کر اسے خوب غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نہیں جھپکتی ہیں۔ آپ یقین جانیے وہ کبھی اپنی آنکھیں نہیں جھپکاتی۔ وہ ہوا کے سرد جھونکے کی طرح آتی ہے اور پھول کی خوشبو کی طرح باہر نکل جاتی ہے۔ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔ میں سوات کے بچے بچے سے واقف ہوں' لیکن میں نے اس کو سوات میں کبھی نہیں دیکھا۔ اب بتائیے ایسی عورت سے مجھے ڈرنا چاہیے یا نہیں۔"

گورکن نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک گل زمان کی نگاہیں سامنے والے درخت کے تنے پر پڑیں اور پھر یہ دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ تنے کے سہارے عالیہ کھڑی تھی۔

وہی اس کا پسندیدہ سفید لباس' وہی گلے میں پڑا ہوا جھلملاتا نیکلس' وہی کاجل گگی جھیل سے زیادہ گہری نیلی آنکھیں' وہی رخساروں پر لہراتی ہوئی باریک سی زلف' وہی مسکراتے لب۔

وہ واقعی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گل زمان ایک بت کی طرح چند لمحوں تک عالیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ وہی عالیہ تھی جسے کبھی وہ اپنا مقصد حیات سمجھتا تھا۔ یہ وہی عالیہ تھی جس کو پانے کے بعد وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے ساری دنیا کے پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا ہے لیکن آج وہی عالیہ اس کی روح کی سب سے بڑی اذیت بن چکی تھی۔ گل زمان نے نظریں جھکائیں تو عالیہ غائب تھی۔

اور پھر جیسے گل زمان کو یاد آ گیا کہ اس کے پرس میں تو ہر وقت عالیہ کی ایک تصویر موجود رہتی ہے۔ اس نے پرس نکالنے کے لیے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گورکن سے پوچھا۔

"تم اس عورت کو کتنے دن سے آتے جاتے دیکھ رہے ہو۔"

"تقریباً چالیس سال سے۔" گورکن نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ کہ اب یہ عورت بوڑھی ہو چکی ہوگی۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں صاحب! کبھی بھوت بھی بوڑھے ہوتے ہیں۔"

"اگر تمہیں اس عورت کی تصویر دکھائی جائے تو کیا تم اس کو پہچان لو گے۔"

"ضرور۔" گورکن نے حیرت سے جواب دیا۔

"لیکن اس کی تصویر کہاں ملے گی۔"

"میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر گل زمان نے جیب سے پرس نکال کر اس کی زپ کھولی اور عالیہ کی تصویر گورکن کے سامنے کر دی۔

گورکن پھٹی پھٹی نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر اس کے منہ سے ایسی گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں جیسے ان دیکھے ہاتھ اس کا گلا گھونٹے دے رہے ہوں۔

گل زمان اور نادر نے گھبرا کر پہلے گورکن کی طرف دیکھا اور پھر پرس میں لگی ہوئی تصویر کی طرف..... لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب نہ دکھائی دینے والے ہاتھوں نے دھیرے دھیرے تصویر کو پرس سے نکال لیا تھا۔

تصویر پرس میں سے غائب ہو چکی تھی۔

گورکن اب بھی چیخے جا رہا تھا۔ چیخ ہی نہیں رہا تھا زمین پر گر کر تڑپ بھی رہا تھا۔

گل زمان اور نادر دونوں نے جھک کر گورکن کو

سنبھالنا چاہا' لیکن گورکن زمین پر گرنے کے بعد بالکل بے ہوش ہو چکا تھا' بے ہوشی ایسی تھی جیسے وہ مر گیا ہو' لیکن وہ مرا نہیں تھا' نادر نے اس کی نبضیں دیکھیں' نبض کی رفتار سست ضرور تھی' لیکن ڈوبی نہیں تھی۔

اور پھر دونوں چونک سے گئے۔ ان کے بالکل قریب سے آواز آئی۔

''میں چاہتی تو اسے بھی مار سکتی تھی' لیکن میں نے محض گلزمان کی وجہ سے اس کا قتل نہیں کیا کیونکہ گورکن کی لاش نادر کے ساتھ گل زمان کو بھی جیل بھجوا سکتی تھی۔''

''سامنے آؤ عالیہ۔'' گل زمان نے ڈرے بغیر کہا۔

''اب جب کہ تمہارا اصل وجود بالکل ننگا ہو چکا ہے اور تم اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ مکمل کر سامنے آ چکی ہو تو تمہیں مجھ سے چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے گل زمان۔'' عالیہ کی آواز ہوا میں سرسرائی۔

''میں خبیث نہیں ہوں' تم میرے بارے میں اگر تمام باتیں جان جاؤ تو تمہیں بھی مجھ سے ہمدردی ہو جائے۔''

''مجھے اب تم سے قیامت تک ہمدردی نہیں ہو سکتی' میں نہیں مان سکتا کہ تم خبیث نہیں ہو۔ تم عورت بھی ہو اور بلی بھی' تم سینکڑوں برس سے زندہ ہو اور لمبی عمر نے تمہارے جسم اور تمہارے رنگ و روپ پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب اس دنیا کے ہر جاندار کو فنا ہونا ہے تو تم اب تک باقی کیوں ہو۔ تم بھوت ہو' تم ڈائن ہو' تم ایک ایسی ناپاک اور خبیث روح ہو جو دنیا میں صرف خباثت پھیلایا کرتی ہے..... مجھے تم سے نفرت ہے عالیہ۔''

گل زمان نے یہ جملے اس انداز سے کہے کہ خود نادر بھی حیران ہو کر گل زمان کی طرف دیکھنے لگا' لیکن ابھی اس کی یہ حیرت ادھوری تھی' کیوں کہ دوسرے ہی لمحے اس نے جو منظر دیکھا اس نے اسے صرف حیرت زدہ ہی نہیں کیا' چند لمحات کے لیے غم زدہ بھی کر دیا۔

ابھی گل زمان کے جملوں کی صدائے بازگشت بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ عالیہ ان دونوں کے قریب کھڑی تھی' لیکن اس وقت اس کے چہرے پر نہ کوئی نفرت تھی' نہ غصہ' نہ بھیانک پن تھا اور نہ خوف زدہ کرنے والا اثر۔

عالیہ کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے' وہ پہلی مرتبہ عالیہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لرزتی بوندیں دیکھ رہا تھا' ایک خونخوار وجود پلک جھپکتے میں عورت بن چکا تھا' ایک مکمل عورت' جس کے آنسوؤں میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت مضمر ہوتی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ نادر کے دل میں عالیہ کو دیکھنے کے باوجود اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا' وہ عالیہ سے ڈرا بھی نہیں' بس وہ حیران اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے عالیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس عالیہ کی طرف جو اس کی سب سے بڑی دشمن تھی' لیکن جس کے آنسوؤں نے پورے ماحول کو سوگوار بنا دیا تھا۔

گل زمان اور نادر دونوں آنسو بہاتی عالیہ کی طرف دیکھتے رہے۔

عالیہ نے واقعی بڑے ڈرامائی انداز میں گل زمان اور نادر کی نفرت کو ہمدردی میں تبدیل کر لیا تھا' وہ روتی ہی رہی اور آنسو اس کے رخساروں کو تر کرتے رہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا عالیہ کہ تم چاہتی کیا ہو۔'' گل زمان نے پہلے کی بہ نسبت ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تمہاری محبت اور نادر کی نفرت نے دیوانہ کر دیا ہے۔''

''گل زمان۔'' عالیہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ نادر کو تڑپا تڑپا کر موت کے حوالے کر دوں۔''

''لیکن کیوں۔'' گل زمان کا لہجہ دوبارہ سخت ہو گیا۔

''تم نادر کی موت کیوں چاہتی ہو۔''

''اس لیے کہ اس نے میرے انسانی وجود کا جو میں نے برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا خاتمہ کر دیا ہے' یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بلی تھی' لیکن یہ

بھی ٹھیک ہے کہ میں ایک عورت بھی تھی اور گل زمان میرے عورت ہونے سے تمہیں بھی انکار نہ ہوگا۔''

''تم نادر کو قتل کرنا چاہتی ہو تو تم نے اسے اب تک قتل کیوں نہیں کیا۔'' گل زمان نے پوچھا۔

''تم میری مافوق الفطرت طاقتوں سے واقف ہو چکے ہو' میں چاہتی تو کبھی کا نادر کو قتل کر چکی ہوتی' لیکن میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی ہوں۔''

نادر خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔ منظر واقعی عجیب و غریب تھا' پرانے قبرستان کے ایک ویران گوشے میں ایک پراسرار قدیم قبر کے قریب دو انسان' دو جیتے جاگتے انسان ایک روح سے گفتگو کر رہے تھے' ایک ایسی روح سے ہم کلام تھے جو کبھی ایک جسم کی مالک تھی۔ جس کا خود ایک اپنا وجود تھا۔ جو پھول کی طرح مسکراتی تھی اور باد نسیم کی طرح اٹھلاتی تھی۔

نادر مسلسل عالیہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ وہ جس وجود کو دیکھ رہا ہے اس کی حیثیت ایک دھوئیں کے ہیولے سے زیادہ نہیں ہے' لیکن اس ہیولے میں کتنی طاقت تھی۔ بے ہوش گورکن کی نیم مردہ لاش اس کا تازہ ثبوت بنی اس کی نگاہوں کے سامنے پڑی تھی۔

لیکن عالیہ نے ایک لمحے کے لیے بھی نادر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف گل زمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور گل زمان سے ہی مخاطب تھی جیسے اس کے نزدیک نادر قبرستان میں موجود ہی نہیں تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ تم نادر کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دو۔'' اچانک گل زمان نے پوچھا۔

''ہاں ممکن ہے..... لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔'' عالیہ نے کہا۔

''اپنی شرط بتاؤ۔'' گل زمان نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اور نادر دونوں مل کر مجھے میرا انسانی وجود واپس لا دو اور یہ وعدہ کرو کہ جب میں دوبارہ عالیہ بن جاؤں گی تو تم دوبارہ مجھ سے شادی کر لو گے۔''

''کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دوبارہ ایک انسانی جسم اختیار کر لو۔''

''ہاں.....'' عالیہ نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیسے ممکن ہے۔'' یہ سوال گل زمان نے کیا تھا۔

''وہ میں تمہیں بتا دوں گی۔'' عالیہ نے بڑے ہلکے لہجے میں کہا۔

''لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ میری آبائی حویلی چلنا پڑے گا۔''

''لیکن کب.....؟''

''تم چاہو تو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چل سکتے ہو۔''

اس جملے کے ساتھ ہی عالیہ کا ہیولہ دیکھتے دیکھتے فضا میں تحلیل ہو گیا۔

''میں تیار ہوں.....'' گل زمان نے جلدی سے جواب دیا۔

''لیکن پرانی حویلی تک ہم دونوں کو رہبری کون کرے گا۔''

''نادر.....'' فضا میں آواز گونجی۔ ''وہ میرے یہاں آ چکا ہے۔''

دونوں دوست ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ فیصلہ کر لینا چاہتے ہوں کہ انہیں عالیہ کی شرط مان لینا چاہیے یا نہیں..... نادر نے کہا۔

''عالیہ نے ٹھیک ہی کہا ہے مجھے اس کی آبائی حویلی کا راستہ یاد ہے..... لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اس کی خطرناک شرط قبول کر لی ہے۔''

''فی الحال میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔'' گل زمان نے جواب دیا۔

''لیکن میں تمہارے واضح جواب کے بغیر حویلی کی جانب قدم نہیں اٹھاؤں گا۔'' نادر نے ایک فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم خوب جانتے ہو نادر کہ میں اگر اس کی شرط قبول کروں گا بھی تو محض تمہاری سلامتی کی خاطر۔''

''اور یہی میں نہیں چاہتا ہوں۔'' نادر نے دو ٹوک جواب دیا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے زندہ دیکھنے کے لیے خود کو ایک بھوت کے حوالے کر دو' ایک خونخوار بلی کے سپرد کر دو' ایک ایسی خبیث روح کے رحم و کرم پر ہو جاؤ جو بظاہر سینکڑوں برس سے زندہ ہے اور جس کے ارادوں کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم' میں اپنی زندگی کے لیے تمہاری زندگی کو جہنم نہیں بنانا چاہتا گل زمان۔"

"لیکن میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں نادر۔"

"زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ میری موت عالیہ کے ہاتھوں نہیں لکھی ہے بلکہ عالیہ کی طویل اور خبیث زندگی کا خاتمہ میرے ہاتھوں ہونا ایک مقدر بن چکا ہے۔"

لیکن گل زمان نے نادر کی اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ گورکن رفتہ رفتہ ہوش میں آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

گل زمان نے اس کو سہارا دے کر بٹھایا۔ گل زمان چاہتا تھا کہ گورکن سے کچھ اور باتیں کریں' اس سے جیسے یہ پوچھ لیں کہ وہ تصویر دیکھ کر ایک ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخا کیوں تھا لیکن گورکن کھڑا ہوتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"آؤ چلیں نادر۔" گل زمان نے کہا۔

"کہاں۔" نادر نے پوچھا۔

"عالیہ کی حویلی کی طرف۔" گل زمان نے جواب دیا۔

"جب تم یہ کہہ چکے ہو کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے اور جب تمہارا یہ یقین ہے کہ خدا کے بعد انسان دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے تو انجام سے ڈرتے کیوں ہو۔"

اب نادر لاجواب ہو چکا تھا اس لیے وہ گل زمان کے دوبارہ اشارہ کرنے پر اس سمت روانہ ہو گیا جدھر عالیہ کی حویلی تھی۔ آسیب زدہ حویلی۔ وہ حویلی جس کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی اور جس کو اس نے نیم بے داری کی حالت میں دیکھا تھا۔

نادر اور گل زمان ایک دوسرے سے گفتگو کیے بغیر چلتے رہے اور انہیں اس کا پتہ بھی نہ چلا کہ خود عالیہ کا نہ دکھائی دینے والا وجود ان کے آگے آگے چل رہا ہے' لیکن اگر وہ دونوں اس وقت عالیہ کو دیکھ لیتے تو یقیناً ان کو وہ زہریلی مسکراہٹ بھی نظر آ جاتی جو اس وقت عالیہ کے باریک لبوں پر کھیل رہی تھی اور پھر شاید وہ حویلی جانے کے سلسلے میں اپنا ارادہ بھی بدل دیتے۔

عالیہ ان دونوں کے آگے آگے چل رہی تھی' مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی' لبوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی' آنکھوں میں ناگنوں کی سی چمک لہراتی ہوئی' بالکل اس طرح جیسے ہوا مچل مچل کر چل رہی ہو' عالیہ اس وقت خلاف معمول بے حد خوش نظر آ رہی تھی' بے حد مسرور' ایسی شاداں جیسے اس کا مطلوب اسے مل گیا ہو' جیسے اس کی پیاس بجھ گئی ہو' جیسے اسے اس کی کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔

نادر اور گل زمان منزل کی طرف بڑھتے گئے اور منزل نزدیک آتی گئی۔

ادھر سوات میں نادر کی منگیتر پریشان تھی کہ نادر اور گل زمان اب تک کیوں نہیں آئے۔ آج کل وہ بھی سیر و تفریح کی غرض سے اور اپنے محبوب نادر کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس ہی چلی آئی تھی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو وہ تھک ہار کر کچھ دیر آرام کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی' ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انجانی قوت اس کو تھکائے دے رہی ہے' اس کے اعصاب کو مضمحل کیے رہی ہے' جیسے وہ تھکتی جا رہی ہے' جیسے اسے نیند آئے جا رہی ہے اور پھر نرگس واقعی تھک کر پلنگ پر لیٹ بھی گئی' لیٹنے سے قبل اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

بہر حال وہ بلی کے وجود سے خوف زدہ تھی۔

نادر نے اس کو زیادہ حالات نہیں بتائے تھے' وہ بلی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے واقف بھی نہ تھی' لیکن اس کے باوجود جب بھی وہ سیاہ بلی کے بارے میں سوچتی' جیسے اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون سرد ہونے لگتا۔

رفتہ رفتہ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے بند کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا موجود ہے۔ ابتداء میں اس نے اس کو اپنا وہم ہی سمجھا کیوں کہ وہ اچھی طرح دیکھ چکی تھی کہ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند ہیں۔

مزید اطمینان کے لیے اس نے الماریاں بھی کھول کر دیکھ لیں۔ پردوں کو ہٹا کر دیکھا' پلنگ کے نیچے دیکھا اور جب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی پرندہ تک موجود نہیں ہے تو وہ پلنگ پر لیٹ گئی' اس نے منہ پر چادر ڈال لی' لیکن ابھی اس کو آنکھیں بند کیے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی چیز دھم سے گری۔ نرگس چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ گئی اور اب اس کو واقعی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس پر گہری نیند کا غلبہ ہو رہا ہے' اسی عالم غنودگی میں اس نے مختلف قسم کی آوازیں سنیں' جیسے دور بہت دور کوئی چیخ رہا ہو یا جیسے کوئی درد سے کراہ رہا ہو یا جیسے کوئی اس کے کان میں کچھ کہہ رہا ہو۔

اچانک گھبرا کر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور پھر جیسے اس کی گھگھی سی بندھ گئی' اس نے چیخنا چاہا' لیکن وہ چیخ بھی نہ سکی۔ نرگس کے پلنگ کے بالکل نزدیک ایک عورت موجود تھی' انتہائی خوب صورت' لیکن بالکل ساکت' وہ اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھے جا رہی تھی اور اس کا سفید لباس اس طرح خوشبو بکھیر رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اپنی قبر سے اٹھ کر آئی ہو۔

ایک ہی نظر میں نرگس نے دیکھ لیا کہ یہ عورت لباس کے بجائے جیسے سفید کفن ہی پہنے ہو۔ عورت دھیرے دھیرے اس کے بالکل قریب آ گئی' اتنا قریب کہ وہ اب لباس کی بو بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

عورت کے قدموں کی کوئی آواز بھی کمرے میں بلند نہیں ہوئی تھی' نرگس دم سادھے پڑی رہی' اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے' حلق خشک ہو چکا تھا اور آواز جیسے اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا' لیکن وہ چیخ بھی نہ سکی۔

نزدیک آ کر وہ عورت اس کے چہرے کی طرف جھکی اور پھر کمرے کی نیم تاریکی میں نرگس نے جب غور سے دوبارہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو جیسے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیوں کہ اب اس عورت کا چہرہ بدل چکا تھا۔ محض چند لمحات تک اس کا چہرہ ایک خوب صورت عورت کا چہرہ تھا' لیکن اب یہ چہرہ ایک سیاہ بلی کا چہرہ تھا۔ چہرہ بلی کا اور جسم عورتوں کا' نرگس کو اس کے بعد کچھ بھی یاد نہ رہا۔

وہ پوری طرح بے ہوش ہو چکی تھی۔

ٹھیک اسی وقت گل زمان اور نادر چلتے چلتے عالیہ کی آسیب زدہ حویلی کے قریب پہنچ چکے تھے' یہ نیم مسمار شدہ حویلی اپنی تمام وحشت ناکیوں کے ساتھ بالکل اسی طرح موجود تھی جس طرح نادر نے ۲۴ گھنٹے قبل دیکھی تھی۔

"تم یہیں آئے تھے۔" گل زمان نے ایک کپکپاتی نظر حویلی کی شکستہ دیواروں اور جھکی ہوئی محرابوں پر ڈالتے ہوئے نادر سے پوچھا۔

"ہاں۔" نادر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور میرا خیال ہے کہ سیکڑوں برس بعد میں پہلا زندہ آدمی ہوں جو اس میں زندہ داخل ہوا تھا۔"

"آؤ....." گل زمان نے نادر کو چلنے کا اشارہ کیا' لیکن نادر جیسے پھر رک گیا۔ اس نے کہا۔

"گل زمان میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم اس حویلی میں داخل ہو کر کچھ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

"تم پھر بہکنے لگے۔" گل زمان نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کم از کم اتنا تو سوچو کہ میں یہ سارا خطرہ محض تمہارے اور صرف تمہارے مفاد کے پیش نظر مول لے رہا ہوں۔"

"مجھے اس کا اعتراف ہے دوست' لیکن اس

کے ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی کہہ لینے دو کہ عالیہ کے شوہر ہونے کے باوجود تم عالیہ سے اتنا واقف نہیں جتنا کہ میں ہوں' میں خوب جانتا ہوں کہ وہ خبیث ہے' بدنفس ہے' آوارہ ہے بھٹک گئی ہے اور تم خود سوچو کہ ایک بلی جو عورت بن گئی ہو' ایک عورت جو برس ہا برس سے زندہ ہو اور جس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہو اس پر اتنا شدید بھروسہ کرنا عقل مندی کب ہے۔"

"میں ان تمام امور پر غور کر چکا ہوں نادر....." گل زمان نے کہا۔

"تم نے سب کچھ ٹھیک کہا ہے' لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ یہی کالی بلی یہی خوفناک روح ایک عورت کے روپ میں ایک عرصہ تک میری بیوی رہ چکی ہے اور آج بھی میری محبت میں دیوانوں کی طرح پھرا کرتی ہے' مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

گل زمان نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک عالیہ اپنی حویلی کے مسمار شدہ والان میں نظر آ گئی۔ یہ والان اس جگہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں عالیہ کو دیکھ کر چونک سے گئے اور چونکتے کیسے نہ جب کہ اب عالیہ ان دونوں کی جانب ہی آ رہی تھی۔ اس کی چال میں اتنی نزاکت تھی کہ ایک لمحہ کے لیے گل زمان اسی طرح طویل سانس لے کر رہ گیا جیسے اس پہاڑی پر جب اس نے عالیہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔

"آؤ گل زمان۔" عالیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"یقین نہیں آتا عالیہ کہ تم مر چکی ہو۔" گل زمان نے جواب دیا۔

"اے کاش تم نہ مری ہوتیں۔"

"میں مری نہیں ہوں' صرف میرا ایک خیالی وجود ختم ہوا ہے' میری پوری داستان سننے کے بعد' میرے ماضی میں جھانکنے کے بعد خود تم یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ میں مری نہیں ہوں' میں زندہ ہوں' بالکل تمہاری طرح' بالکل نادر کی طرح۔" عالیہ نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ایک مرتبہ پھر دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اب گل زمان اور نادر انکار کرنے کی ہمت کھو چکے تھے۔ عالیہ کی چمکدار آنکھوں نے جیسے ان پر ایک سحر سا کر دیا تھا۔ دونوں جواب دیے بغیر حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ عالیہ ان کے آگے آگے چلتی رہی اور پھر اچانک حویلی کے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اب اس نے کہا۔

"یہ میرے جد امجد کی بنائی ہوئی حویلی ہے گل زمان' انہوں نے دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آ کر پہاڑ کے اس ٹھنڈے گوشے میں جب کہ یہاں سیکڑوں میل دور تک کوئی آبادی نہ تھی یہ حویلی بنوائی تھی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی کے آخری دن یہیں گزارے تھے۔"

گل زمان اور نادر حیرت سے عالیہ کی طرف دیکھتے رہے وہ کہتی رہی۔

"اسی حویلی میں آج سے تین سو سال قبل میری پیدائش ہوئی تھی' یہیں میرا لڑکپن بیتا تھا' یہیں میں جوان ہوئی تھی اور یہیں میں دلہن بنی تھی۔"

"دلہن!" بے ساختہ گل زمان کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں دلہن..... اور جانتے ہو میرا دولہا کون تھا' میرا دولہا..... میرا دولہا تم تھے گل زمان..... ہاں تم....." وہ بولی۔

"لیکن شادی سے چند روز قبل میرے ہونے والے دولہا..... میرے محبوب کو رقابت میں ہمارے ہی ایک عزیز نے قتل کر دیا۔ اس صدمے سے میں پلنگ پر پڑ گئی۔ روز بہ روز میری حالت گرتی چلی گئی۔ میرے دل میں غم والم اور دماغ میں انتشار کا ایک طوفان برپا تھا۔ دنیا میری نگاہ میں تاریک ہو چکی تھی۔

ایک روز حویلی میں میرے والد کے ایک دوست کا آنا ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک پراسرار ہستی کے مالک تھے اور اپنے حیرت انگیز کارناموں کی بدولت دور دور تک مشہور ہو چکے تھے۔

اپنے ابتدائی دور میں اس شہرہ آفاق ہستی نے

موت و حیات کے حقائق پر سے سربستہ رازوں کی تاریک چادر کو اٹھانے کا عزم کیا تھا۔ چنانچہ جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہمالیہ کے دامن میں ایک ایسی وادی بھی ہے جو قدیم تہذیب کا گہوارہ رہ چکی ہے اور وہاں اس دور میں بھی ایسے مذہبی پیشوا مل جاتے ہیں جو موت کے بھیانک فلسفے کو حل کر چکے ہیں' نیز وہاں کی سب سے بڑی خانقاہ میں رہنے والے لامہ موت کے رازوں پر فتح حاصل کر چکا ہے اور اس سلسلے میں اس نے تمام رازوں کو سمجھ لیا ہے جو موت و فنا سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ تب وہ اس پراسرار وادی میں پوشیدہ طور پر داخل ہو گیا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے وہاں کے باشندوں سے تعلقات قائم کیے۔ اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ان سے ممکنہ حیات کے راز حاصل کیے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے وادی نیل کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک ایسے پراسرار بوڑھے کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا جو صدیوں سے زندہ تھا اور پوشیدہ علوم کا ماہر تھا۔ چنانچہ میرے والد کے دوست برسوں اس کے ساتھ رہ کر اپنے مقصد میں بالآخر کامیاب ہو گیا اور دائمی حیات کا کھوج لگا ہی لیا۔

جب انہیں میرے بارے میں علم ہوا تو مزاج پرسی کے لیے میرے پاس آ گئے۔ ان کی شفقت و محبت سے چند ہی دنوں میں میری طبیعت قدرے بحال ہو گئی اور میں چلنے پھرنے لگی۔

اپنے والد سے چھپ چھپ کر در پردہ میں نے ان کی شاگردی اختیار کر لی اور ان سے دائمی حیات کے بارے میں علم حاصل کرتی رہی۔ بالآخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اب میں اپنی ہیت بدلنے پر بھی قادر تھی۔ اب میں اپنے آپ کو درندوں اور جانوروں کے روپ میں رات کے وقت چاند کے مختلف مراحل کے ساتھ تبدیل کرنے کی قوت اور صلاحیت بھی رکھتی تھی اور اس نئے روپ میں دوسرے انسانوں کے لیے تباہی اور مصیبت بن سکتی تھی لیکن میں آفت کا پرکالا ان لوگوں کے لیے ہوں جو میرے روپ بہروپ کو آشکارہ کریں۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو' اس کا خون پی جاؤں گی۔

ایک دن میں نے ان کے سامنے اپنے دل کی بات عیاں کر دی تو انہوں نے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں اپنے علم کے ذریعے حساب لگا کر کچھ دنوں کے بعد آگاہ کریں گے۔

پھر ایک روز مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگے۔

"بیٹی تمہیں اپنے محبوب کو اپنانے کا حق بخشا جاتا ہے۔ تم اسے ضرور اپناؤ گی' لیکن کب' کس حالت اور کس دنیا میں..... فی الحال یہ بتانا دیوتاؤں کے اسرار سے بھید ہے۔ البتہ اس وقت تک تم زندہ رہو گی اور اسی طرح حسین و جوان رہو گی۔ تین سو برس بعد تمہارا بچھڑا ہوا محبوب دوبارہ تم سے ملے گا۔"

کچھ عرصے بعد انکل چلے گئے..... میرے والد کا انتقال ہو گیا البتہ میں اپنے محبوب کو دوبارہ پانے کے لیے زندہ رہی۔ پلک جھپکتے تین سو سال گزر گئے۔ میرے عظیم ترین خواب کی تعبیر کے پورا ہونے کا وقت آ پہنچا اور میں تمہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر میں تمہاری دلہن بن گئی۔

مجھے پہچانو گل زمان..... میرے محبوب..... میں تمہاری وہی عالیہ ہوں جس سے تم بے پناہ پیار کرتے تھے۔ تین سو سال تک میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ایک دن ہم پھر ایک ہو جائیں گے' دیکھو آج ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو ہیں۔"

گل زمان بڑی حیرت سے عالیہ کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ کہتے کہتے عالیہ اس قدر جھکی کہ اس کے ہونٹ گل زمان کی پیشانی سے ذرا ہی دور تھے۔ دونوں کی نگاہیں ایک ساعت کے لیے آپس میں ٹکرا گئیں۔ گل زمان نے اپنی قلبی کیفیت عالیہ پر بالکل ظاہر نہ ہونے دی اور پیار محبت کا اظہار کرتا رہا۔ عالیہ بہت خوش تھی کہ اس نے کھو کر اپنا محبوب پھر پا لیا ہے۔

"میرے محبوب! ہمارے لیے یہ آزمائشی دور ہے۔ ہمیں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم

دونوں کل بھی ایک تھے۔ آج بھی ایک ہے اور آئندہ بھی ایک ہی رہیں گے۔ اپنے ماضی کو یاد کرو گل زمان...... ماضی' ہمارا شاندار ماضی۔ ہماری زندگی کا سنہری عہد...... یاد کرو وہ عہد و پیمان' وہ رومان کے دن' رومان کی راتیں یاد کرو۔"

عالیہ خاموش ہو کر جواب طلب نظروں سے گل زمان کی طرف دیکھنے لگی' لیکن گل زمان کوئی جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔

گل زمان دوبارہ اپنی خوب صورت بیوی عالیہ کے ساتھ رہنے لگا تھا' لیکن اب اس کا انداز کچھ اور تھا۔ اس کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی خلش کنڈلی مارے ناگ کی طرح جمی رہ گئی تھی۔ عالیہ جو سیکڑوں برس سے زندہ ہے' نہ جانے اس نے کتنے گھر اجاڑے ہوں گے' کتنے جوانوں کا خون پیا ہوگا' لہٰذا اب اسے مٹا کر آنے والی نسلوں کو اس کی شیطانی قوتوں سے بچانا چاہیے۔

اس سوچ بچار میں کئی دن گزر گئے' لیکن وہ موقع کی تاک میں تھا۔ بالآخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔

ایک روز عالیہ کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لیے سوات سے کسی دوسرے مقام پر تبدیلی آب و ہوا کے لیے چلا گیا اور جانے سے پہلے اس نے اپنے وفادار ملازم کو تاکید کر دی تھی کہ عالیہ کی خواب گاہ کا فرش کھدوا کر تقریباً دس فٹ کی گہرائی میں اس کی موت کا انتظام کرے۔ چنانچہ ان کی روانگی کے فوراً بعد ملازم نے اپنے آقا کی ہدایت کے مطابق کام شروع کروا دیا اور ان کے آنے سے پہلے کام مکمل ہو چکا تھا۔

جہاں عالیہ کا پلنگ پڑا رہتا تھا وہیں سے فرش کی گہری کھدائی شروع ہوئی تھی اور دس فٹ کی گہرائی میں ڈیڑھ فٹ لمبے آہنی تیروں کا بستر سا لگوایا۔ ہر دو تیروں کے درمیان چار انچ کا فاصلہ بھی رکھا تھا۔ سرہانے اور پائنتی کی جانب دو دو پلاسٹک کے بنے ہوئے پیٹرول بھرے گیلن بھی اس انداز میں رکھ دیے تھے کہ انگلی کے ہلکے سے اشارے سے دونوں گیلن کے کاک ہٹ جائیں اور سارا پیٹرول بکھر جائے۔

یہ سب کچھ گل زمان نے اس لیے کیا تھا کہ بدروحوں کو آگ ے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب گل زمان نے اپنا ذہن خالی رہنے دیا۔ ظاہری طور پر صرف عالیہ کی محبت کا سمندر ہی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس تبدیلی پر عالیہ کو بڑی خوشی ہوئی اور اس خوش فہمی میں اس نے اپنی ماورائی قوتوں سے قطع نظر سپردگی کی انتہائی حدوں کو چھو لیا۔ نیز سپردگی کی بے خودی میں وہ گل زمان کی طرف سے ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو گئی۔

ایک رات جب عالیہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تو وہ پلنگ سے اترا اور پائنتی کی جانب پہنچ کر قالین تلے محفوظ اس فولادی سلاخ پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا جو اس مقصد کے لیے بنوایا گیا تھا۔

جیسے ہی سلاخ دبی' پلنگ صندوق کے ڈھکن کی طرح گہرائی میں لٹک کر رہ گیا۔ عالیہ الٹ کر سینے کے بل کھڈے میں لگے ہوئے آہنی تیروں پر جا گری۔ ایک دردناک چیخ فضا میں گونج کر رہ گئی۔ غالباً سب ہی تیر اس کی پیٹھ اور گردن کی طرف ابھر آئے تھے۔ اس کے فوراً بعد گل زمان نے کھڈے کے سرے پر لٹکائی ہوئی ڈور کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ آن واحد میں پیٹرول بھرے گیلن الٹ گئے۔ یوں لگا جیسے عالیہ کا سارا وجود پیٹرول میں ڈوب گیا ہو۔ فی الفور ماچس نکال کر سلگائی اور کھڈے میں پھینک دی۔

خواب گاہ آگ کی روشنی میں نہا گئی۔ عالیہ کی غیر انسانی چیخیں گونجتی رہیں۔ کھڈے سے اس قدر ناقابل برداشت بدبو اٹھنے لگی کہ وہ گھبرا کر خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔ ڈرتے' لرزتے اور کانپتے ہوئے اس نے جونہی کھڈے میں جھانکا تو لبوں سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔

عالیہ کوئلے کا ڈھیر بن چکی تھی۔

یہ روح فرسا کہانی ختم ہوگئی۔ علی شاہ کا پورا بدن

مسکرائیے

لڑکی کے باپ نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نکل جاؤ یہاں سے' مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم گورکن ہو۔ حالانکہ تم کہتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔"

"جناب! میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں کہ میری روزی کا دارومدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔"

☆

ایک عورت اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ قانونی مشورے کے لیے ایک وکیل کے پاس پہنچی۔ اس نے وکیل کو اپنے خاوند کے ظلم و ستم کی ایک دردناک داستان سنائی۔ بیان میں اتنی شدت تھی کہ وکیل بھی جذباتی ہو گیا اور بولا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا شوہر انسان نہیں درندہ ہے۔" یہ سنتے ہی عورت آگ بگولا ہو کر بولی۔

"میں یہاں قانونی مشورے کے لیے آئی تھی۔ اپنے خاوند کے خلاف ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔"

☆

ایک صاحب نے اپنی سیکریٹری سے کہا: "مجھے باورچی نے بتایا ہے کہ کل رات تم بری طرح نشے میں چور تھیں اور ڈرم سے لپٹ کر عشقیہ گانے گا رہی تھیں۔"

"میں معافی چاہتی ہوں سر" سیکریٹری نے کہا۔

"میں تمہیں ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں کہ آئندہ تم ڈرم سے لپٹ کر نہیں گاؤ گی۔"

"تو پھر آپ کو بھی وعدہ کرنا ہوگا جناب کہ شراب پی کر آپ بھی ڈرم میں گھس کر نہیں سوئیں گے۔"

تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پولیس افسر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نادر آزاد ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے یہ بھرپور کہانی سنائی' آپ یقین کریں' آپ کی زبان سے بلی کی کہانی سن کر مجھے یہ داستان یاد آ گئی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔ میں چلتا ہوں...... ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

بارش رات بھر جاری رہی تھی' لیکن علی شاہ کو ایک لمحے کے لیے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کا دماغ شدید الجھنوں کا شکار تھا۔ تابو اور مینا کی شکل میں ایک نئی افتاد سر پر پڑی تھی۔ مینا اس سے پردہ کرتی تھی' لیکن اس دن اس نے اتفاقیہ طور پر اسے دیکھ لیا تھا اور اس وقت پہچان لیا تھا۔ نہ دیکھتا تو اسے پتا بھی نہ چلتا کہ یہ اجنبی عورت کون ہے' لیکن یہ مصیبت بے چارے عنایت صاحب کے ذریعے آئی تھی۔ انہوں نے تو اپنی دانست میں ایک نیک کام کیا تھا۔ اب کیا کروں' انہیں اس بارے میں تفصیل بتانا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھتے کہ بیوی کی گمشدگی نے مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے اور کہیں چھان بین ہو گئی تو راز کھل بھی سکتا ہے۔ خاموش صرف خاموشی مناسب ہے۔

اچانک اسے ایک اور خیال بھی آیا۔ مینا کے وجود میں آ کر شاداب کی روح حلول کر گئی ہے تو یہ تابو کون ہے۔ ایک دم اس کے ذہن سے تابڑ توڑ خیالات گزر گئے۔ شاداب کے ساتھ مستقل طور پر ایک مرد کا وجود ملتا رہا ہے۔ اس رات کھڑکی کے شیشوں پر دونوں کا عکس' وہ دونوں جن پر اس نے گولیاں چلائی تھیں۔ اس پر قاتلانہ حملے کرنے والا اور مینا کے ساتھ تابو...... آہ کہیں شروع ہی سے تو وہ شخص

بھی کوئی روح ہی تو نہیں ہے' لیکن اس وقت جب دونوں کا عکس شیشے پر نظر آیا تھا۔ اس وقت تو شاداب زندہ تھی اور یہ..... پھر یہ مرد اور عورت کی لاشیں۔

سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دن کا اجالا ہو گیا تھا' وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا کہ باہر آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑا۔

''کون..... کون.....'' اس نے قریب رکھا پستول اٹھالیا اور وحشت بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ تابو چائے کے برتن لے کر آیا تھا جب سے یہ دونوں آئے تھے صبح کی چائے باقاعدہ ملنے لگی تھی۔ تابو کو اس کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے ادب سے اسے چائے پیش کی اور بولا۔

''کوئی کام صاب۔''

''ایں نہیں۔ رات کو بارش زیادہ ہوئی۔'' اس نے بے تکا سا سوال کر دیا۔

''ہاں صاب۔ ہم لوگ کو پتا ہی نہیں چلا حالانکہ آندھی بھی چلا۔ آپ نے دیکھا نہیں صاب۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا..... مینا کرچیاں اٹھا رہی ہے۔''

''دوسرا لگوا دیں گے۔ تم جاؤ۔'' علی شاہ نے کسی قدر بے صبری سے کہا۔ یہ سن کر کہ مینا کرچیاں چن رہی ہے وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔ جیسے ہی تابو دروازے سے باہر نکلا وہ تیزی سے مسہری سے نیچے اترا اور دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا' اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا' مینا کسی کی موجودگی سے بے خبر کھڑکی کے دوسری طرف پڑے ہوئے شیشے کے ٹکڑے اٹھا رہی تھی اور انہیں ایک جگہ جمع کیے جا رہی تھی' اس کا چہرہ پوری طرح نمایاں تھا' علی شاہ اسے غور سے دیکھتا رہا' رات کو وہ جس حال میں مسہری پر لیٹی نظر آئی تھی اس وقت اس سے بالکل مختلف تھی۔

رات کو اس کے چہرے پر شدید پیلاہٹ تھی۔ جبکہ اس وقت اس کے رخسار کشمیری سیبوں کی مانند لال گلال تھے اور چہرے سے بے پناہ حسن ٹپک رہا تھا۔ وہ سحر زدہ نگاہوں سے میان کو دیکھتا رہا' پھر اس نے دانت کچکچا کر کہا۔

''سب کچھ ممکن ہے تیرے لیے' سب کچھ ممکن ہے لیکن صبر کر انتظار کر دیکھتا ہوں تو کتنے پانی میں ہے۔ دیکھتا ہوں کہ تو۔''

وہ مینا کو دیکھتا رہا۔ مینا ہر احساس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف رہی۔ پھر اس نے تابو کو مینا کے پاس دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں تابو گردن اٹھا کر دیکھ نہ لے لیکن اس کے دل میں مینا کے لیے یہی خیال تھا کہ وہ لازمی طور پر شاداب کی روح ہے۔ جو واقعات اس طرح پیش آئے تھے' اس میں شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

وقت گزرتا رہا..... کہیں نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کوئی ملنے' جلنے والا بھی نہیں تھا۔ دن میں ایک آدھ بار عنایت صاحب کا فون آجاتا تھا۔ وہ بے چارے اس سے اس کی خیریت پوچھ لیا کرتے تھے۔

کوئی بارہ بجے آج بھی ان کا فون آیا' لیکن اس نے عنایت صاحب سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ خیر و عافیت کی رسمی گفتگو کے بعد فون بند ہو گیا۔ پھر نجانے اسے کیا خیال آیا' اس نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد عنایت صاحب کو فون کیا۔

''جی سر جی سر فرمایئے۔''

''عنایت صاحب ایک فائل ہے آپ کے پاس' دوبئی سے ہمارے پاس کچھ آرڈر آئے تھے اور ہم نے مال سپلائی بھی کر دیا تھا۔''

''جی سر اس کے ڈرافٹ بھی موصول ہو گئے تھے ہمیں۔ میں نے آپ سے۔''

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے' میں تابو کو بھیج رہا ہوں' آپ مجھے وہ فائل بھجوا دیجیے گا۔''

آئندہ ماہ اس سنسنی خیز داستان کی آخری قسط پیش کی جائے گی۔

ایک ہی بھول

سلطان جمیل نسیم

دکان ایسی چلی کہ سال بھر کے اندر ہی مجھے برابر والی دکان بھی لینا پڑی۔ ابھی نئی دکان لیے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک صبح ہم بھائی ابا میاں کے ساتھ فجر پڑھ کر مسجد سے نکلے' ابا میاں تو حسب معمول اپنے کمرہ میں چلے گئے' ہم بھائی ناشتہ کے لیے آن بیٹھے' ہمیں ناشتہ کرا کے ابا میاں کے لیے ٹرے میں چائے کی ایک پیالی اور رات کی روٹی رکھ کر اماں چھوٹے کمرے میں گئیں۔

اردو کے ایک حساس ادیب کے قلم سے ایک فکر انگیز تحریر

پہلی بار تو اُلجھن ہوتی ہی ہے۔ شروع شروع میں اُلجھن کا میں بھی شکار ہوا..... لیکن دس پندرہ دن میں مجھے خود محسوس ہونے لگا جیسے میں عادی ہوتا جا رہا ہوں۔

ابا میاں نے ہم بھائی بہنوں کو کچھ ایسے رکھا تھا کہ اختلاف تو دور کی بات ہے' ہم ان کی بات کے خلاف سوچنے تک کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا سبب ہماری سعادت مندی یا ابا میاں کے رعب داب سے کہیں زیادہ ان کی بات چیت کا انداز، زبان کی حلاوت اور تاثیر تھی، اللہ نے ان کے لہجے میں کچھ ایسا جادو رکھ دیا تھا کہ وہ جو کہتے' وہ سننے والے کے دل میں اتر جاتا..... اور بقول اماں کے یہ سب اس لیے تھا کہ علم قرآن اور تفسیر کا علم انہوں نے بچپن ہی سے حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تو

میں نے بھی دیکھا ہے' گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ انہوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے رکھ لیا تھا جہاں دو چار الماریوں میں ساری کتابیں عربی کی رکھی تھیں۔ کلام پاک پڑھنے کے دوران میں اکثر ابا میاں ان میں سے کوئی کتاب نکال کر دیکھتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کبھی اپنے محلے کی مسجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز ادا کرنے گئے ہیں تو پیش امام صاحب نے ابا میاں سے امامت کے لیے کہا ہے لیکن وہ ہمیشہ انکسار کے ساتھ معذرت کر لیتے تھے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے تلاوت کرتے کرتے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے..... پہلی بار میں نے جب یہ دیکھا تو فوراً آ کے اماں کو بتایا..... بظاہر میری بات کا کوئی اثر لیے بغیر وہ پانی کا کٹورا بھر کے ابا میاں کے کمرے میں گئیں اور خاموشی سے ابا میاں کے سامنے رکھا اور اُلٹے قدموں لوٹ آئیں۔

میں نے اکثر یہ بھی دیکھا کہ جب کبھی دکان پر وہ جاتے تو گاہک کو پسند آنے والے کپڑے کی جو قیمت بتا دیتے' بھاؤ تاؤ کیے بغیر وہ اسی قیمت میں لے جاتا..... یہی حال خاندان بھر کا تھا' بڑے سے بڑے مسئلہ کو چٹکیوں میں حل کر دیتے۔ اگر کوئی جرح پر اتر آتا تو ابا میاں قرآن پاک اور سیرت نبویؐ کے ایسے حوالے دیتے کہ ان کی بات بغیر حیل حجت کے مان لی جاتی۔ گھر میں بھی یہی حال تھا' ہماری اماں خاصی تنک مزاج تھیں اور ابا میاں سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں' مگر ان کی ہر بات پر آمنا وصدقنا۔ میری دونوں بہنوں کی شادی ان کا سولہواں سال پورا ہوتے ہی ہوگئی۔ حالانکہ اماں کہا کرتی تھیں' کم عمری کی شادی ایک روگ ہوتی ہے' میں جیتے جی اپنی بیٹیوں کو یہ روگ نہیں لگنے دوں گی۔ مگر جیسے ہی مناسب رشتے آئے' ابا میاں نے فوراً حامی بھر لی اور کسی کی بھی طرف سے کوئی آواز نہیں اُٹھی..... ماشاء اللہ اب دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر میں چین کی بنسی بجا رہی ہیں..... بڑی باجی تو دادی نانی بن گئی ہیں جبکہ خود ابھی پچاس کی بھی نہیں ہوئی ہیں۔

میرے دونوں بڑے بھائی بقول شخصے ابا میاں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ دکان کا پھیرا تو ابا میاں کبھی کبھار ہی لگاتے تھے' سارا لین دین بھائیوں کے ہی ہاتھ میں رکھا' وہ ہر ہفتہ آمدنی اور اخراجات کا چٹھہ بنا کے ابا میاں کے سامنے رکھ دیتے تھے' اور ابا میاں 'اللہ برکت دے' کہہ کر بغیر دیکھے واپس کر دیتے..... لیکن جب بھی کسی ضرورت مند کو دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مانگنے والے کی حیثیت سے زیادہ ہی نکلا۔ یہی حال گھر کا تھا کبھی کسی چیز کی کمی نہیں دیکھی۔ سب کا کہنا اور ماننا یہی تھا' دکان کی آمدنی میں یہ ساری برکت ابا میاں کی نیک نیتی، خدا پرستی عبادت و ریاضت اور دریا دلی کی وجہ سے ہے کہ نہ کبھی جیب خالی دیکھی' نہ گھر میں تنگی ترشی کا منہ دیکھنے کی نوبت آئی۔

مجھے یاد ہے جب اماں نے میرے کلاوہ میں ساتویں گانٹھ باندھی اور بتاشوں پر نیاز دی..... ہم سب بہن بھائیوں کی عمر کا حساب اماں نے کلاوہ کی گانٹھوں میں باندھ رکھا تھا۔ سب کے کلاوے الگ اور سال کے سال سب کی پیدائش کے دن پر ایک گانٹھ کا اضافہ..... تو جب میں ساتویں برس میں آیا' اسی شام ابا میاں نے مغرب کی نماز سے واپس آنے کے بعد مجھے بلا کے اپنے پاس بٹھایا اور ملائم لیکن مستحکم لہجہ میں سمجھایا۔

''اللہ تعالیٰ نے نماز کے بڑے فائدے رکھے ہیں' پہلا فائدہ تو یہ کہ آدمی جاگنے سے سونے تک صاف ستھرا رہتا ہے اور یہ تم کو معلوم ہی ہے کہ اللہ ایک ہے اور اسی نے دُنیا بھی بنائی ہے اور ہم سب کو پیدا بھی کیا ہے اور ایک دن ہم سب کو اس کے پاس جانا ہے۔ کیونکہ وہ سارے جہاں کا مالک ہے' اس لیے ہم انسانوں کو اس نے حکم دیا ہے کہ جب سمجھدار ہو جاؤ تب سے ہمارے پاس آنے تک پانچ وقت کی نماز پڑھتے رہنا' جب ہم اس کے پاس جائیں گے تو وہ پوچھے گا' بتاؤ تم نے ہمارا کتنا حکم مانا'

جنہوں نے حکم مانا ہوگا ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور جنہوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہوگی' ان کو اللہ سے دور کر دیا جائے گا۔ اس بات کو یوں سمجھو۔ یہ تمہارا گھر ہے یہاں تمہارے ماں باپ' بہن بھائی موجود ہیں' اگر تم کو ان سب سے دور کر دیا جائے تو اکیلے ہو کر خوب روؤ گے' تو اللہ کے ہاں جا کر اللہ سے دور کر دیے جانے والے بھی خوب روئیں گے' خوب پچھتائیں گے۔ اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح نماز کے پابند ہو جاؤ' جیسے روز پابندی سے اسکول جاتے ہو، اسکول میں جو کام ملتا ہے وہ کرتے ہو' ایسے ہی وقت پر نماز ادا کرو اور پچھتانے والوں میں شامل نہ ہو.....'' وہ کہتے رہے میں سنتا رہا..... اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دل و دماغ کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں اور ان کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میرے وجود کا حصہ بنتا جا رہا ہے' میں نماز کے لیے ابا میاں کے ساتھ مسجد جانے لگا..... اسکول کے ٹائم ٹیبل سے لے کر آج تک کی مجھے ساری باتیں یاد ہیں' شاید اسی لیے اکثر اماں کہا کرتی تھیں اور اب بیوی بھی طنزاً کبھی کبھی کہہ دیتی ہیں کہ میرا حافظہ ہاتھی کا ہے کہ جو بات ایک مرتبہ توجہ سے سن لی یا دیکھ لی' وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

فجر کے وقت سب کے ساتھ اُٹھنا' مسجد سے آنے کے بعد ابا میاں کے ساتھ ہم سب بھائی تلاوت کرنے بیٹھ جاتے تھے' بڑے بھائیوں کو دکان پر بھی جانا ہوتا تھا اس لیے وہ ایک دو رکوع کی تلاوت کے بعد اُٹھ جاتے تھے' اس وقت تک کسی بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی' اس لیے اماں اپنی نگرانی میں بہنوں سے ناشتہ بھی تیار کرتی تھیں۔ (نصیب دشمناں دیکھا ہے' کام کاج آتا ہوگا تو کسی کی محتاج نہیں رہو گی) بہنوں کو روز کی یہ نصیحت اور ناشتہ۔ ان گھن توس، ہفتہ میں ایک دن، رات کا بچا ہوا سالن روٹی، ایک روز چائے پاپے، البتہ جمعہ کے دن ابا میاں بڑے بھائی کے اسکوٹر پر بیٹھ کے چورنگی تک جاتے تھے' وہیں مسجد میں نماز ادا کرتے' مسجد میں جانے سے پہلے نہاری والے کے پاس برتن اور دسترخوان رکھوا دیا کرتے اور واپسی میں نہاری اور گرم گرم نان لے کے آتے' اماں بگھار تیار رکھتی تھیں' میرے علاوہ سب کو جمعہ کا بے صبری سے انتظار ہوتا تھا۔ وہ نہاری کیا ہوتی تھی' مرچوں کا دھتورا ہوتا تھا' میں تو پہلے دن ہی دن چیں بول گیا۔ ہفتہ بھر پیٹ کی گڑگڑ نے وہ شور مچایا کہ اسکول جا سکا اور نہ ہی مسجد جانے کے قابل رہا۔ سب سے چھوٹا تھا اس لیے اماں کا لاڈلا بھی تھا۔ اس دن کے بعد سے نہاری والے دن اماں میری نان پر مکھن کی پوری ٹکیہ چھوڑ دیتی تھیں پھر اس پر گڑ کی ڈلی رکھ دیتی تھیں یا شکر بُرکتی دیتی تھیں، کیا مزہ ہوتا تھا، آج تک یاد ہے' غرض ہفتہ کے ساتوں دن مختلف ناشتہ۔ اسکول کا وقت آٹھ بجے سے ایک بجے تک کا تھا..... آتے آتے ڈیڑھ بج جاتا..... بستہ رکھا۔ وضو کیا اور ابا میاں کے ساتھ مسجد کی طرف چلا' واپس آ کے کھانا کھایا..... گھنٹہ بھر سویا..... پھر مولوی صاحب سپارہ پڑھانے آ جاتے..... مولوی صاحب کے جاتے ہی عصر کی نماز کے لیے ابا میاں آواز دے لیتے..... عصر کے بعد مجھے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت تھی' سردی کے موسم میں کوئی کھیل پورا ہی نہیں ہوتا کہ مغرب کا وقت ہو جاتا واپسی پر ماسٹر صاحب کو موجود پاتا' وہ اسکول کا ہوم ورک کراتے اور آنے والے دن کا سبق سمجھاتے۔ ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد یا تو میں اماں کی گود میں سر رکھ کہ سو جاتا یا پھر اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ کھیلتا رہتا یا ان کے بنے بنائے کام بگاڑتا..... عشاء کے وقت ابا کے ساتھ پھر مسجد کا رُخ کرتا۔ مجھے یاد ہے دسویں پاس کرنے سے پہلے تک میرے یہی مشاغل تھے لیکن میں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور بی اے پاس کرنے تک میری پنجگانہ کبھی قضا نہیں ہوئی۔ پنجگانہ

تو قضا نہیں ہوئی لیکن نماز میں یکسوئی بہت عرصہ کے بعد نصیب ہوئی، ورنہ ہوتا یہ تھا اِدھر نیت باندھی اُدھر دنیا بھر کے ایسے خیالات نے یلغار کی جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ ابا میاں سے ایک مرتبہ یہ کہا تو انہوں نے سمجھایا۔ شیطان ہر اس کام سے روکنے کی کوشش کرتا ہے جس سے بندے کو اللہ کی خوشنودی اور قربت حاصل ہو، تم ایسی باتوں پر دھیان ہی نہ دو، ساری توجہ نماز کی طرف رکھو ایک روز شیطان خود ہی چھوڑ بھاگے گا۔ میں نے اس بات کی بھی گانٹھ باندھ کر دل میں رکھ لی۔

گھر بھر کا بوجھ ہماری دکان اُٹھاتی تھی لیکن میرے بی اے پاس کرنے کے بعد دکان کی حالت اس گائے کی سی ہوگئی تھی جو کئی بار بیانے کے بعد سوکھ جاتی ہے، دوسرے یہ کہ بھائیوں سے مزاج نہیں ملتا تھا۔ میں نے ابا سے کہا کہ اب دکان کی حالت ایسی ہوگئی ہے جیسے برسوں ایک سیٹ پر اور ایک ہی تنخواہ پر کام کرنے والے سرکاری ملازم کی ہوتی ہے اس لیے اب ہمیں کاروبار تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پہلے تو میری بات پر مسکرائے پھر اپنے خاص انداز میں سمجھایا کہ کپڑے کا کام سنت نبوی ہے اور لوہے کا کام سنت پیغمبراں ان دونوں کاموں کی تجارت میں اللہ تبارک تعالیٰ نے برکت رکھی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ پورا ناپا جائے اور پورا تولا جائے، جو لوگ ناپ تول میں دھوکہ دھڑی کرتے ہیں وہ کبھی فائدے میں نہیں رہتے..... بھول چوک کی معافی ہے لیکن ڈنڈی مارنے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح تم بھائیوں کی صورت شکل میں فرق ہے، اتنا ہی فرق سب انسانوں کے مزاج میں ہوتا ہے لیکن مزاج کا یہ فرق کسی صورت میں بھی اختلاف میں نہیں بدلنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں تمہارا مزاج اپنے بھائیوں سے کم ملتا ہے۔ اس لیے میں نے ایک دوسری مارکیٹ میں دکان دیکھی ہے، تم بھی آج شام کو چل کے دیکھ لو پسند آجائے تو کل ہی رجسٹری کرا کے پرسوں اس میں لاکھ پچاس ہزار کا مال بھی ڈلوا دیا جائے گا۔ یہ تمہارا حصہ ہوگا۔

دکان ایسی چلی کہ سال بھر کے اندر ہی مجھے برابر والی دکان بھی لینا پڑی۔ ابھی نئی دکان لیے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک صبح ہم بھائی ابا میاں کے ساتھ فجر پڑھ کر مسجد سے نکلے، ابا میاں تو حسب معمول اپنے کمرہ میں چلے گئے، ہم بھائی ناشتہ کے لیے آن بیٹھے، ہمیں ناشتہ کرا کے ابا میاں کے لیے ٹرے میں چائے کی ایک پیالی اور رات کی روٹی رکھ کر اماں چھوٹے کمرے میں گئیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہم نے ان کے چیخنے کی آواز سنی تو سب دوڑے..... ابا میاں مسند سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، آنکھیں چھت کی طرف لگی ہیں اور سامنے رحل میں قرآن پاک کھلا رکھا ہے۔

اس روز ابا میاں کی تلاوت کے بجائے ان کی تدفین تک دوسرے لوگ قرآن پاک پڑھتے رہے۔

اب یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ والد کے اُٹھ جانے سے اولاد پر کیا گزرتی ہے۔

پہلی برسی تک گھر کا نظام پہلے کی طرح چلتا رہا..... پھر ایک دن میرے بڑے بھائیوں نے وراثت کا قصہ چھیڑ دیا۔ میں نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے یہ کہا کہ ابا میاں نے اپنی زندگی میں میرا حصہ مجھے دے دیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی دکان اور اس مکان میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے جس طرح بھی چاہیں آپ تقسیم کرلیں، البتہ مجھے اس مکان میں رہنے کی اس وقت تک اجازت دیں جب تک میں کوئی دوسرا انتظام نہ کرلوں۔

دو تین ماہ لگے، مجھے ایک ایسا گھر مل گیا جہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہوگیا..... میں سچ کہتا ہوں مجھے وہ گھر چھوڑنے کا اتنا ملال نہیں ہوا جتنا اس مسجد کے دور ہونے کا جہاں میں نے ابا میاں کے ساتھ پہلی اور آخری بار نماز ادا کی تھی۔ مگر آدمی کو قدرت نے یہ مقدرت بھی دے رکھی ہے کہ

وہ ہر جگہ اور ہر ماحول کو اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ چند روز کے بعد نئے گھر کی طرح نئی مسجد میں بھی وہی اپنائیت پیدا ہوگئی جو پرانے گھر اور مسجد سے وابستہ تھی۔ ہر نماز کے بعد مجھے یہ محسوس ہوتا جیسے ابا میاں میرے ساتھ ہیں۔

مجھے اپنے کاروبار کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ اللہ نے دو چار نیک اور ایماندار بندے مجھے ایسے دے دیے تھے، جن پر میں دکانیں چھوڑ کر "آگرائی" کے لیے شہر سے باہر بھی چلا جاتا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے نجانے کس وجہ سے عصر کی جماعت کا وقت نکل گیا۔ میں بھاگم بھاگ مسجد پہنچا۔ آخری دو رکعت ملیں، باقی دو رکعت انفرادی طور سے پڑھیں.....

نماز کے بعد جب مسجد سے باہر آرہا تھا تب اچانک یہ خیال آیا کہ میں نے آخری دو رکعت میں ایک سجدہ کم کیا ہے۔ جتنا ذہن پر زور ڈالتا یقین ڈانواڈول ہوتا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی وہم کی گنجائش ہی نہ رہی، دل مسلسل گواہی دیے جارہا تھا کہ اک سجدہ کم کیا ہے۔ میں نے اس خلجان سے نکلنے کے لیے پیش امام صاحب سے رجوع کیا۔ وہ میری بات سن کر مسکرائے اور فرمایا۔

"بھئی یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، آپ کو اگر شبہ ہے کہ ایک سجدہ رہ گیا تو نماز کو دہرا لیجیے۔ پہلی نماز کا شمار نفل میں ہوجائے گا۔"

اس جواب سے دل مطمئن نہیں ہوا۔ مجھ سے یہ بھول ہو کیسے گئی۔؟ ابا میاں ہوتے تو ان سے پوچھ لیتا، ہر مسئلہ کی طرح وہ اس کو بھی حل کر دیتے۔ بلکہ اگر وہ ہوتے تو شاید یہ بھول ہی نہ ہوتی۔ اب حال یہ ہوگیا کہ ہر نماز ادا کرتے وقت یہی خیال رہتا کہ مجھ سے ایک سجدہ کی بھول ہوگئی۔ ایسی غلطی دوبارہ نہ ہوجائے، اس احساس کی وجہ سے باقی نمازوں میں جو تھوڑا بہت انہماک تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ میں جماعت میں شریک ہونے کے باوجود اس بھولے ہوئے سجدے کو یاد کر کے کانٹے کی سی چبھن دل میں محسوس کرتا رہا۔ میری بے کلی کو بیوی بھی بھانپ گئی۔

"کیا بات ہے؟ چار پانچ دن سے تم جب بھی نماز ادا کر کے آتے ہو، تمہارے چہرے پہ کچھ الجھن کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تم کچھ چڑچڑے بھی ہوگئے ہو۔ کیا مسجد میں کسی سے بحث مباحثہ ہوگیا ہے۔؟"

میں نے اس کو بھی اپنی الجھن کا سبب بتا دیا ہے..... پہلے تو اس نے ذرا توجہ سے سنا پھر ساری بات سننے کے بعد نہایت لاپروائی سے کہہ دیا۔

"جو رہ گیا وہ رہ گیا..... تم نے دوبارہ تو نماز پڑھ لی تھی۔ بس کافی ہے۔"

میری شادی کے دوسرے مہینہ بیوی کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ اماں نے ہونے والے بچے کے لیے نجانے کتنے چھوٹے چھوٹے کپڑے سی ڈالے تھے۔ تیسرے مہینے حمل ضائع ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا، مجھ سے اور بیوی سے زیادہ دکھ اماں کو ہوا تھا۔ وہ نجانے کیا کیا خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرے بڑے بھائیوں کے یہاں نرینہ اولاد نہیں ہوئی تھی شاید اسی لیے اماں نے میری بیوی سے اُمید باندھی ہوگی اور یہی اُمید لیے وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ میں یہی سمجھتا رہا لیکن ایک روز بیوی نے بتایا کہ اماں نے خواب دیکھا تھا کہ ابا میاں آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں یہ بچہ ہمارا نام روشن کرے گا۔ یہ بات سن کر مجھے بھی افسوس ہوا۔

بخدا مجھے کبھی یہ گمان نہیں گزرا کہ میں کوئی عبادت گزار بندہ ہوں لیکن ایک سجدہ کے چھوٹ جانے سے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے جن نمازوں کی ابتدا، ابا میاں کی زندگی میں کی تھی ان کے درمیان ایک خلاء پیدا ہوگیا ہے، وہ ایک سجدہ جو رہ گیا ہے، وہ میری عبادت کے درمیان ایک فاصلہ قائم کر گیا ہے۔ میں وہ فاصلہ کیسے پاٹوں..... یہ احساس کم ہونے کے بجائے روز بہ روز بڑھنے ہی لگا جس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ میں ہر نماز کے بعد دو دو چار چار نفل اور ادا کرنے لگا۔

عمر جتنی بڑھتی گئی، دکانوں کی طرف سے توجہ کم ہوتی گئی۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ اس نے مجھے بھی ابا میاں کی طرح اولاد نرینہ سے نوازا تھا۔ لڑکوں نے دکانوں کو سنبھال لیا۔

پھر ان ہی بچوں نے مشورہ دیا کہ ابو آپ اس بار حج کر آئیں۔ بیوی نے بھی یہ کہہ کر تائید کی.....

"تم جو کہتے ہو کہ دس بیس سال پہلے ایک سجدہ کم کیا تھا' کعبہ شریف اور مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے بھولے ہوئے سجدے کو ادا کرو گے تو اللہ رحیم قبول کرے گا اور تمہارے دل کو اطمینان ہو جائے گا کہ اس سجدے کی تلافی ہو گئی۔" بے کہے سب نے میری خواہش کو زبان دے دی' میں انکار کیسے کرتا۔

میرے اور بیوی کے فارم بھرے گئے اور متعلقہ رقم کے ساتھ بینک میں جمع ہوئے۔ اب قرعہ اندازی کا انتظار شروع ہو گیا۔ پورے ایک مہینہ بعد قرعہ اندازی ہوئی..... ساری دُنیا کے نام نکل آئے' ہمارا ہی رہ گیا۔ میں نے بیوی سے کہا۔ "معلوم ہے ہمارا نام کیوں نہیں آیا۔ کیونکہ ایک سجدہ رہ گیا ہے۔" میں ساری رات روتا رہا۔ اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا رہا۔ مجھے یاد ہے' اتنا میں دو ہی مرتبہ رویا ہوں' ایک ابا میاں کی وفات پر اور دوسری دفعہ حج کی قرعہ اندازی میں فیل ہونے پر..... بیوی سمجھا سمجھا کے تھک گئی کہ وہی لوگ جاتے ہیں جن کا بلاوا آتا ہے۔ بیٹوں نے اپنے طور پر سمجھایا، سب اپنے اپنے طور پر تاویل کرتے رہے مگر جو اصل بات تھی' اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔

میرے بڑے بیٹے نے توجہ دی اور وہ اس طرح کہ مجھے ایک ماہر نفسیات کے پاس لے گیا۔ میں نا سمجھ تو نہیں تھا مگر بیٹے کا دل رکھنے کے خیال سے میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے میں ذرا بھی آنا کانی نہیں کی..... ڈاکٹر صاحب مجھ سے جو پوچھتے رہے' میں جواب دیتا رہا..... اب انہوں نے میرے بیٹے کو اپنی تشخیص سے آگاہ کرتے ہوئے کیا بتایا' یہ اللہ جانے..... میں نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں سال بھر تک فرض نمازوں کے ساتھ اُتنے ہی نفل پڑھتا رہا۔ کبھی کبھی تو سجدے میں ایسی رقت طاری ہو جاتی کہ کوئی نہ کوئی نمازی آ کے ہاتھ رکھ دیتا اور ایک گلاس پانی بھی پلاتا۔

اب مجھے یہ خیال آنے لگا کہ جیسے کوئی شخص بڑے شوق سے ایک مکان بنائے۔ اس مکان میں پلاسٹر بھی ہو جائے اور رنگ روغن بھی پھر اس کو معلوم ہو کہ ایک دیوار میں اینٹ برابر سوراخ رہ گیا ہے۔ اب دو ہی صورتوں میں وہ خالی جگہ بھری جا سکتی ہے کہ پلاستر اور رنگ و روغن کو گھس کر اینٹ کی برابر جگہ بنائے یا پھر اینٹ کو تراش کر موجودہ کے سائز کا کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں میرے بس سے باہر تھیں۔

زندگی گزر جاتی ہے' ایک برس کا کیا گزرنا..... حج کے فارم بھرنے کا زمانہ پھر آ گیا۔ بڑے بیٹے نے کہا اب میں بھی ساتھ چلوں گا..... اس سال وہاں سے بلاوا آ گیا تھا۔ تینوں کے فارم منظور ہو گئے۔ گھر میں عید کا سا سماں ہو گیا۔ بھئی جس کا اُدھار دینا ہے' وہ ادا کرو..... جس سے ذرا سی کڑوی کسیلی بات کہی تھی' اس سے معافی طلب کرو۔ دوست احباب عزیز رشتہ دار سب سے کہا سنا معاف کرایا۔

لبیک اللھم لبیک..... کہتے ہوئے جہاز میں سوار ہوئے۔

☆

والدین کے ساتھ حج کرنا بھی ایک سعادت ہوتی ہے' مجھے اس خوشی سے زیادہ ابو کی فکر تھی۔ وہ ایک سال میں کمزور بھی ہو گئے تھے اور دینی رجحان بھی ازحد بڑھ گیا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا جیسے خدانخواستہ ان کے ذہنی توازن میں کچھ فرق پیدا ہو چلا ہے۔ اسی لیے میں نے ایک سائکولوجسٹ سے معائنہ بھی کرایا تھا جس نے رپورٹ دی' لیکن ساتھ ساتھ مجھ سے کہا' آپ کے والد خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں' ان کو اپنے والد کے نہ ہونے کا شدید

احساس ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ ان سے رہنمائی کے خواہش مند ہوتے ہیں جبکہ وہ اپنے والد سے کسی خاص مسئلہ میں رہنمائی کے طلب گار ہیں۔ وہ ذہنی طور پر بالکل تندرست ہیں۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر نارمل آدمی کے ذہن میں ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کی رپورٹ ملنے کے بعد بھی مجھے ابو کے انداز میں ایک اضطراری کیفیت محسوس ہوتی رہی' اسی کیفیت کو دور کرنے کے لیے حج کا ارادہ کیا۔ اس جگہ سے متبرک جگہ تو روئے زمین پر کوئی ہو ہی نہیں سکتی' اللہ کے دربار اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیار میں پہنچ کر یقیناً ابو کے اضطرار میں کمی ہو گی۔ ایک فرض اور ایک علاج سمجھ کر اس سفر مقدس کو اختیار کیا۔

خلافِ توقع جہاز میں بیٹھتے ہی انہوں نے بآواز بلند تلاوت شروع کر دی' وہ حافظ بھی تھے اور خوش الحان بھی' اب جو تلاوت شروع کی تو اس طرح کہ قرآن کے ہر لفظ کے ساتھ آنسو رواں تھے' معلوم ہوتا تھا زبان کے ساتھ ان کی آنکھیں بھی آیاتِ ربانی کا ورد کر رہی ہیں۔ کلام الٰہی کی تاثیر اور آواز کے سوز نے ایسا سماں باندھا کہ جہاز میں موجود بیشتر احرام پوش زائرین کی حالت بھی عجیب ہو گئی' آیات کے معنی جس کی سمجھ میں آ رہے تھے وہ بھی اور جو صرف اللہ کا کلام سمجھ کر سن رہے تھے وہ بھی ابو کی پُرسوز آواز اور آنسوؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔

کراچی سے جدہ پہنچنے تک تلاوت کا سلسلہ ایک لمحہ کے لیے نہیں رکا۔

دوسرے مسافروں کا کہنا تھا کہ تلاوت کی روشنی میں فاصلہ ایسے طے ہو گیا کہ کراچی کی روشنی سے نکلے اور جدہ کی روشنی میں پہنچ گئے۔

جدہ پہنچ کر اب ایک ہی خواہش تھی کہ جلد سے جلد حرم شریف کا دیدار کریں۔ جب معلم کی گاڑی میں بیٹھے تو سب نے ہم آواز ہو کر تلبیہ کا ورد شروع کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ امی کی کوشش تھی' کسی بھی طرح ابو کو زیادہ پرجوش نہ ہونے دیں..... لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جوں جوں حرم شریف قریب آتا جا رہا تھا..... ابو کے چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی..... ان کی آنکھیں چاروں طرف ایسے گھوم رہی تھیں جیسے حرم شریف کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں..... اور ذہن..... بس ہم اسی کو قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔ معلم نے راستے میں ہم سے پاسپورٹ طلب کیے۔ ہمارے گلے میں اپنے پتے اور ہمارے نام اور رہائش گاہ کا نمبر لکھا ہوا فیتا اس تاکید کے ساتھ ڈالا کہ جب بھی آپ کہیں راستہ بھٹک جائیں تو یہ آپ کی مدد کرے گا۔ ابو نے وہ فیتہ گلے میں ڈالنے کے بجائے امی کو دے دیا۔ 'تم رکھو۔ میں یہاں کھونے نہیں پانے آیا ہوں۔'

رہائش گاہ پر اپنا سامان رکھ کر حرم شریف کی طرف چلے۔ ابو آگے آگے اس طرح چل رہے تھے جیسے یہ ساری جگہ ان کی دیکھی بھالی ہے۔

حرم شریف کے سامنے پہنچ کے بابِ فہد پر رک گئے۔ کہنے لگے: 'باب السلام سے داخل ہوں گے۔ زیادہ ثواب ملتا ہے۔' باب السلام کو تلاش کرنے میں کوئی دس منٹ لگے۔ مجھ سے اور امی سے کہا۔ 'خانۂ کعبہ پر نظر پڑتے ہی جو دعا مانگو گے پوری ہو گی۔'

ہم اندر کی طرف تھوڑا گئے تو سامنے خانۂ کعبہ..... میرے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھے ہوئے تھے لیکن نظر خانۂ کعبہ کے جلال و عظمت کے سبب جہاں پہنچی تھی' وہیں ٹھہر گئی اور دُعا کہیں دل کے نہاں خانے میں شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی رہ گئی۔ میرے وجود میں ایک لرزش سی طاری ہو گئی..... ہوش مجھے اس وقت آیا جب امی نے میرا بازو پکڑ کے ہلایا..... میری آنکھوں نے ان کی نظروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھا۔

ابو سجدے میں تھے..... اس بھولے ہوئے سجدے میں جو اسی دیار کا منتظر تھا۔

ایک چینی کہاوت

اشرف نوشاہی

دادی اماں کی بہت سی عادتوں میں یہ عادت بھی مجھے عجیب لگتی تھی کہ وہ کبھی کسی ضرورت مند کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ روپے پیسے سے کسی کی مدد تو ہمارے بس کی بات ہی نہ تھی لیکن اور جو کچھ کسی کے لیے ہوسکتا تھا ہمیں کرنا پڑتا تھا۔ دادا کو اور مجھے دادی اماں کی یہ باتیں ماننی ہی پڑتی تھیں۔

ایک حساس ادیب کے قلم سے ایک طربیہ تحریر

جب دادا، دادی گھر میں آتے ہیں تو سارا نظم وضبط کھڑکیوں سے نکل کر اُڑ جاتا ہے۔ ایک چینی کہاوت۔''

رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے دلدار کی نظریں اس چھوٹے سے جملے پر رک گئیں۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کی نظریں ان الفاظ پر اٹک گئی ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی پتنگ اُڑتے اُڑتے کسی' اداس اور خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں میں الجھ جاتی ہے۔

دلدار کے ذہن میں اس کہاوت کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ یہ اس کے دل کی بات تھی۔ سوچوں اور یادوں کا ایک بپھرا ہوا ریلا جونجانے کب سے رکا تھا اس کے ذہن پر چھا گیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔

''کتنی سچی بات کہی ہے کسی سچ کہنے والے نے۔ مجھے بھی تو میرے دادا اور دادی نے بگاڑ کر رکھ دیا۔ لیکن میں اس پر کتنا خوش ہوں۔ کوئی کیا جانے۔ شاید میں وہ بہترین بگڑا ہوا بچہ ہوں جو بھی اپنے دادا' دادی کے زیر تربیت رہا ہوگا۔

میرے بگڑنے کا آغاز اسی دن سے ہوگیا جب میں پیدا ہوا۔ میرے پیدا ہونے سے دو مہینے پہلے ہی میرے والد جو ایک کان کن تھے' کان کے ایک حادثہ میں اپنی جان سے محروم ہوگئے۔ میری ماں نے میرے پیدا ہونے کے بعد دوسری شادی کرلی اور مجھے ہمیشہ کے لیے دادا، دادی کے سپرد کردیا۔ میں نے تو انہیں ہی اپنے ماں باپ سمجھا اور بہت بعد میں جب مجھے یہ علم ہوا کہ وہ دراصل میرے دادا، دادی تھے تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماں باپ اور دادا، دادی میں کیا فرق ہوتا ہے۔؟ میں نے اس کے بعد بھی کبھی اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کیا۔ یقیناً وہ مجھے مل جاتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی' لیکن میں انہیں پا نہیں سکتا تھا اور پھر دادی، دادی کو چھوڑ کر کسی بھی اور کو پانا مشکل بھی تو تھا۔

میں جس گھر میں رہتا تھا وہ بھی ان سارے گھروں جیسا تھا جو اس پہاڑی وادی میں کچھ دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ پہاڑی پتھروں کی دیواریں اور لکڑی کی چھتیں۔ ہمارا یہ گھر جس میں صرف تین افراد رہتے تھے' دوسرے گھروں سے اس لحاظ سے منفرد بھی تھا کہ ہمارے گھر کی چھت پر خوبصورت پرندوں کے بہت سے آشیانے تھے۔ دادا کہا کرتے تھے کہ ''یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔''

اس وقت یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن اب آتی ہے کہ ایک پہاڑی وادی میں زندگی کی ہر علامت خوش نصیبی ہی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے ہمیں ہر وقت پرندوں کے گانے سنائی دیتے تھے۔ وہ چھت پر بنے آشیانوں میں بیٹھے گاتے تو کھلی کھڑکیوں سے ان کی آواز گھر میں گونجنے لگتی۔ ''سنو میرے بیٹے سنو!'' دادا مجھے کہتے ''یہ ہمارے دیس کی موسیقی ہے۔''

آج میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں کہ میرے دادا نے مجھے حقیقت پسند نہیں بنایا۔ انہوں نے مجھے کان کنوں کی اس وادی کے رہنے والوں کے حالات کبھی بھی حقیقت پسندی سے نہیں بتائے۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ جس وادی میں ہم رہتے تھے وہاں کی کانیں دن بہ دن بے مصرف ہوتی جارہی تھیں۔ ہر طرف غربت کے آثار تھے۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی مانند چھوٹے چھوٹے بچے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں اور تنکے چنتے نظر آتے تاکہ چولہے کو ایندھن میسر ہوسکے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے دادا یہ سب باتیں مجھے بتاتے رہتے تو آج میرے دل میں غم وغصے کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن وہ تو ہر بات میں رومان بھر دیتے تھے مجھے آج بھی وہ خوشی یاد ہے جب پہلی بار میں ایک ٹوکری تنکوں اور لکڑی کے ریزوں سے بھر کے گھر لایا۔ میں اتنا خوش ہوا کہ دادی اماں مجھے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

اس صبح میں جب دادا کے ساتھ گھر سے نکلا تو دادا نے کہا: ''گھبرانا مت میرے چھوٹے بیٹے۔ آج میں تمہیں سکھاؤں گا کہ چھوٹے چھوٹے تنکے بھی کتنے کام کے ہوتے ہیں اور انہیں چننے کے لیے بھی کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔''

مجھے بہت بڑے ہونے کے بعد محسوس ہوا کہ ہم غریب تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارے پاس بہت ہی کم رقم تھی۔ اس احساس سے پہلے میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ ہم بہت امیر تھے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس کھانے پہننے اور ہنسنے کے لیے کسی شے کی کمی نہ تھی۔ میں کبھی بھی بھوکا نہیں رہا۔ عید اور دوسرے تہوار آتے تو مجھے اور بھی زیادہ اور نئی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم خوش تھے۔ ہمارے لیے غربت یا امارت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ہم اپنے لیے آرام اور خوشیاں

ضرور چاہتے تھے لیکن میں نے یہ فکر کبھی دادا یا دادی کے چہرے پر نہیں دیکھی کہ ہم کسی طرح امیر ہو جائیں۔ اس لیے کہ ہمارے پاس بہت سے خواب تھے' ہم کبھی اداس نہیں ہوتے تھے۔ اچھے اچھے خواب۔ ایسے خواب جو واضح نہیں تھے۔ ذہن میں مدھم سے عکس ابھرتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم دور کہیں گنگنانے والی موسیقی سن رہے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ گانے والا کیا گا رہا ہے لیکن اس کے لہجے میں محبت اور اپنائیت کی خوشبو موجود ہے۔ ایسی خوشبو جو ایک بار ذہن کو مسحور کر لے تو کبھی محو نہیں ہوتی۔ خواب کی خوشبو!

نہیں معلوم یہ اچھی بات تھی یا بری لیکن حقیقت یہی تھی کہ دادا یا دادی نے مجھے کبھی سونے کا حکم نہیں دیا۔ انہوں نے کبھی مجھے دیر تک جاگنے پر نہیں ڈانٹا۔ انہوں نے کبھی مجھے صبح اُٹھنے کی ہدایت نہیں دی۔ انہوں نے کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ 'تم اتنی رات تک کیوں جاگ رہے ہو۔ جاؤ اپنے بستر پر لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ تمہیں صبح جلدی اُٹھنا ہے۔' انہیں ایسا کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں اسی وقت سوتا تھا جب وہ سوتے تھے اور اسی وقت جاگتا تھا جب وہ جاگتے تھے۔

اب سوچتا ہوں کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ سردیاں بہت سخت ہوتی تھیں اور ہیٹر نام کی کسی شے کا وجود تک نہ تھا۔ اس کے باوجود مجھے کبھی سردی نہیں لگی۔ سردیوں کی راتوں میں چولہے پہ گرم کی ہوئی سرخ اینٹ میرے بستر میں موجود رہتی تھی۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ میرے کمرے میں لالٹین جلتی رہتی تھی اس لیے کہ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ جب تک میں سو نہیں جاتا تھا۔ وہ دونوں میرے کمرے ہی میں رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی مجھے دعا مانگتے نہیں دیکھا تھا۔ دادی اماں کہتی تھی کہ دعا انسان اور خدا کے درمیان معاملہ ہے۔ اس لیے کسی دوسرے انسان کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

دادی اماں نے مجھے بہت سی باتیں سکھائی تھیں۔ شاید ان میں سب سے اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے خدا کا شکر ادا کرنا سکھایا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ تم پر خدا کے سوا کسی کا بھی احسان نہیں۔ ہمیشہ اسی کا شکر کرو اور اس کے بنائے ہوئے انسانوں سے مہربانی کا سلوک رکھو۔

دادا اور دادی کو میں نے اسی نظر سے دیکھنا سیکھا جس نظر سے کھلے میدان میں اُگنے والا کوئی پودا سورج ار چاند کو دیکھتا ہے۔ دادا ایک اونچے لمبے آدمی تھے اور دادی کا قد ان سے بہت چھوٹا تھا۔ بلکہ ویسے ہی جیسے سورج کا دائرہ بہت وسیع اور چاند کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے۔ سورج اور چاند کی طرح وہ بھی ہر لمحہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہی نظر آتے۔ دادی اماں کا شاید ہی کوئی دن گزرتا ہو جب وہ میرے اور دادا کے کپڑوں میں پیوند نہ لگاتیں یا ٹوٹے بٹن نہ جوڑتیں۔ وہ ایک موچی کا کام بھی خوب اچھی طرح کر سکتی تھیں۔ ہمارے جوتے کبھی بھی پھٹے یا گھسے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔

دادی اماں کی بہت سی عادتوں میں یہ عادت بھی مجھے عجیب لگتی تھی کہ وہ کبھی کسی ضرورت مند کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ روپے پیسے سے کسی کی مدد تو ہمارے بس کی بات ہی نہ تھی لیکن اور جو کچھ کسی کے لیے ہو سکتا تھا ہمیں کرنا پڑتا تھا۔ دادا کو اور مجھے دادی اماں کی یہ باتیں ماننی ہی پڑتی تھیں۔ جب کبھی کوئی پڑوسی عورت اپنی پریشانی ان سے کہہ جاتی وہ خود اس کے لیے اتنی پریشان ہو جاتیں کہ باوجود نہ چاہیے کہ دادا کو اپنا آرام چھوڑ کر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا۔

انسان تو انسان ہوتا ہے اور ہر انسان میں فطرتاً دوسرے انسانوں کی محبت اور ہمدردی موجود ہوتی ہے لیکن دادی اماں تو جانوروں کی بھی مدد کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں مجھے وہ بلی آج تک یاد ہے جو ہمارے گھر رہتی تو نہیں تھی لیکن ٹھیک آٹھ

بجے ہی ہمارے دروازے پر آجاتی تھی۔ اس لیے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ دادی اماں کئی سال تک اس کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ وہاں رکھتی رہیں۔ مجھے وہ شام بھی یاد ہے جب وہ برسوں بعد' نہیں آسکی۔ اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئی۔ وہ شام دادی اماں کے لیے ایک اداس شام تھی۔ ہم دیر تک انہیں تسلی دیتے رہے "شاید اب زندہ ہی نہ ہو" دادی اماں نے دکھ کے ساتھ کہا۔

"ہاں شاید یہی بات ہے لیکن یہ بات تو قانون فطرت ہے" دادا نے انہیں سمجھایا تھا۔

"میں جانتی ہوں" دادی اماں نے بڑے دکھ کے ساتھ تسلیم کیا۔

دادا کو اکثر دادی اماں کو تسلی دینا پڑتی تھی۔ وہ مہربان آنکھوں اور سخت ہاتھوں والے لمبے آدمی تھے۔ وہ میرے دوست تھے اور میں ہر بات بڑے اطمینان اور بھروسے کے ساتھ ان سے کہہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ان پریوں اور بونوں کی کہانیاں بھی سناتے تھے جو درختوں اور غاروں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب ہم گھر سے باہر ہوتے تو وہ زور زور سے گانے لگتے۔ ان کی آواز دادی میں دور تک گونجنے لگتی۔ کبھی کبھی وہ مجھے کہتے کہ فضول باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی گیت گاتا رہے۔

دادا یا دادی دونوں میں سے کسی نے بھی اسکول میں نہیں پڑھا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح انہوں نے اردو پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی اردو پڑھنا سکھائی۔ ہمارے گھر میں کہانیوں کی ایک بہت بڑی لیکن پرانی کتاب تھی۔ دادی اماں زیادہ اچھا پڑھ سکتی تھیں اس لیے وہ روز ہمیں ایک کہانی پڑھ کر سناتیں۔ کبھی کبھی دادا بھی کسی کہانی کی فرمائش کر دیتے۔ ہمارے لیے کوئی کہانی پرانی نہیں ہوتی تھی۔ ہم بار بار ایک ہی کتاب پڑھتے رہتے اس لیے کہ ہمارے پاس اور کوئی کتاب تھی ہی نہیں۔ کبھی دادا کہتے کہ آج تو وہ

مسکرایئے

بہانہ

شوہر نے بیوی سے کہا۔ "دیکھو ڈارلنگ' میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا اور اگر نہ آسکا تو شام تک ضرور آجاؤں گا اور اگر شام تک نہ آسکا تو تم سمجھ لینا کہ میں شہر سے باہر چلا گیا ہوں اور اگر میں باہر گیا تو چپڑاسی کے ہاتھ رقعہ لکھ کر بھجوا دوں گا۔"

بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چپڑاسی کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وہ رقعہ آپ جیب سے نکال لیا ہے۔"

خوشی

ایک صاحب صبح کو دفتر دیر سے پہنچے تو دفتر کے ساتھی نے پوچھا: "آج اتنی دیر کیسے ہو گئی۔"

"میں بیوی کو اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا۔ وہ ایک ماہ کے لیے میکے گئی ہے۔"

"لیکن تمہارے ہونٹوں پر یہ کالک کیوں لگی ہوئی ہے۔"

"اوہ کالک....." ان صاحب نے کالک پونچھتے ہوئے کہا۔ "انجن کی ہوگی۔ میں نے مارے خوشی کے اسے چوم لیا تھا۔"

اشارہ

ایک عورت نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا۔ ان کے پیچھے جو صاحب گاڑی چلا رہے تھے' انہوں نے سمجھا کہ یہ خاتون اس طرف مڑیں گی۔ لیکن وہ عورت بدستور گاڑی چلاتی رہی اور مڑی نہیں۔ آخر ایک سگنل پر جب گاڑیاں رکیں تو ان صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنی گاڑی سے نیچے اترے اور عورت کے پاس جا کر غصے سے پوچھا۔ "اگر آپ کو مڑنا نہیں تھا تو ہاتھ کیوں باہر نکال رکھا تھا؟"

"میں تو اپنی نیل پالش سکھا رہی تھی۔" عورت نے جواب دیا۔

کہانی سنیں گے جس میں ایک لڑکے کو جادو کی سیڑھی مل گئی تھی۔ وہ اس سیڑھی پر جتنا اوپر جاتا تھا سیڑھی اتنی ہی اونچی ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ چاند پہ پہنچ گیا۔ تبھی دادا کو وہ کہانی یاد آجاتی جس میں ایک بوڑھے بونے نے ایک جادو کا بیج بو دیا اور وہ بیج بو کر ایک ایسا درخت اگا لیا جس پر ہمیشہ پھل لگتا رہا۔ اس کے بعد بونے کو کبھی محنت نہیں کرنی پڑی۔

پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ رسالے ہیں اخبار ہیں۔ مجھے یہ بات ایک لڑکے نے بتائی جو شہر میں ملازمت کرتا تھا اور چند دن کے لیے اپنے گھر آیا ہوا تھا ایک روز راہ چلتے وہ مجھے مل گیا۔ باتوں باتوں میں، میں نے اپنی کتاب کی تعریف کی۔ میرا خیال تھا وہ میری کہانیوں کو سن کر حیران ہوگا۔ مجھ سے التجا کرے گا کہ اسے دادی اماں کے پاس لے چلوں۔ لیکن وہ تو ہنس پڑا۔ پھر اس نے مجھے کچھ رسالے دیے میں نے وہ رسالے گھر جا کر دادی اماں کو دکھائے تو وہ خوش نہیں ہوئیں۔ لیکن دادا نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اس کا مطلب ہے ہمارے بیٹے کے پاس اس کی اپنی نئی اور اچھی کتابیں ہونی چاہییں'' دادا نے مسکراتے ہوئے اپنی مقامی بولی میں کہا۔ جب بھی وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتے تو اپنی مقامی بولی بولنے لگتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مجھے ان کی بات کا علم نہیں ہوگا۔ یہ انہیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ میں اردو ہی نہیں بلکہ ان کی مقامی بولی بھی جانتا تھا۔

''لیکن ہمارے پاس اتنی اچھی کتاب پہلے ہی موجود ہے۔'' دادی اماں نے دادا کی بات کا جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک۔ لیکن اگر اور بھی اچھی کتابیں اسے مل جائیں تو کیا حرج ہے۔'' دادا نے سمجھایا۔

''لیکن کتابیں قیمتی ہوتی ہے۔ اتنے بہت سے روپے ہم کہاں سے لائیں گے۔'' دادی اماں نے فکر مندی سے کہا۔ نہیں معلوم دادا کے پاس وہ روپے کہاں سے آئے لیکن اگلی صبح' انہوں نے چھ روپے مجھے دکھائے اور کہا کہ ''آج تم میرے ساتھ شہر چلو گے اور ان روپوں سے نئی کتابیں خریدو گے۔ وہ رسالے اس لڑکے کو واپس کردو۔!''

''لیکن وہ بہت اچھے ہیں۔ ان میں رنگ برنگی تصویریں ہیں'' میں نے احتجاج کیا۔

''ہاں وہ بہت خوبصورت ہیں۔ ہر طرح کے رنگوں اور اچھی باتوں سے بھرے ہوئے لیکن وہ تمہارے نہیں ہیں۔'' دادا نے سمجھایا۔

''اس نے مجھے دے دیے ہیں'' میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''لیکن جب تم خود اپنی رقم سے خرید سکتے ہو تو تمہیں کسی سے کچھ لینے کی کیا ضرورت ہے'' دادی اماں نے کہا۔

اس دن میری سمجھ میں آگیا کہ جب میں خود ایک چیز خرید سکتا ہوں تو کسی سے کوئی چیز کیوں لوں۔ میں نے وہ رسالے بڑی خوشی سے فوراً واپس کر دیے اور دادا کے ساتھ شہر چلا گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ رسالے بہت خوبصورت تھے ان میں بہت سی تصویریں' رنگ اور کہانیاں تھیں لیکن مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ میرے نہیں تھے۔ میری تو وہ تین کہانیاں تھیں جو اس روز ہم نے شہر کی ایک چھوٹی دکان سے خریدی تھیں۔ پرستان کے بونے۔ تانبے کا باغ اور چھوٹا سا اک لڑکا۔ وہ کہانیاں آج بھی میرے پاس ہیں۔

میری تینوں کہانیاں ہمارے گھر کے سرمائے میں ایک بڑا اضافہ تھیں۔ پرستان کے بونے تو دادا کو اتنی پسند آئی کہ وہ بار بار اس کی فرمائش کرتے اور میں ان دونوں کو پڑھ کر سناتا۔ سردیوں کی شاموں میں ہمارے باورچی خانے میں تین آوازیں سب آوازوں پہ چھائی ہوتیں۔ چائے کی چسکیاں، دادی اماں کی ہنسی اور کہانیوں کی

بازگشت!

دادا کبھی کسی بات پر ناراض نہ ہوتے تھے لیکن ایک دن وہ مجھ سے تھوڑا سا ناراض ہو گئے۔ میں اس وقت پانچویں جماعت میں تھا اور وادی میں بنے ہوئے چھوٹے سے اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ پانچویں کا نتیجہ نکلا تو مجھے افسوس ہوا۔ میں نے بہت محنت کی تھی لیکن میرے بجائے ایک دوسرا لڑکا اول آگیا۔

اس دن میں روتے ہوئے گھر آیا۔ دن بھر میں اداس رہا۔ دادی اماں مجھے تسلی دیتی رہی۔ لیکن میرا دکھ کم نہ ہوا۔ دن بھر کان میں محنت کرنے کے بعد سورج ڈھلے دادا گھر آئے تو انہیں دیکھ کر میں دوبارہ رونے لگا۔ انہوں نے وجہ معلوم کی تو بجائے مجھے تسلی دینے کی غصے میں کہنے لگے: ''یہ رونا بند کرو۔ یہ بھی کوئی افسوس کی بات ہے۔ خدا کا شکر کرو تم پاس ہو گئے ہو۔ تم نے پانچ جماعتیں اسکول میں پڑھ لی ہیں۔ مجھے دیکھو میں ایک دن بھی اسکول نہیں جا سکا۔ لیکن میں نے کبھی اس کا دکھ نہیں کیا۔ اس لیے کہ میں خود کو اتنا ہی اہم سمجھتا ہوں جتنا اسکول سے پڑھے ہوئے لوگ خود کو سمجھتے ہیں'' اس روز مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھی اسکول نہیں گئے تھے۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا اپنی ذاتی محنت اور شوق سے پڑھا تھا۔ وہ خود ہی اپنا اسکول تھے۔

''دیکھو ہر چیز، ہر شخص اہم ہے' اگر تم دوم آئے ہو تو یہ بھی بری بات ہے۔ صرف پاس ہو جانے والے بھی اپنی جگہ اتنے ہی اہم ہوتے جتنے کے اول آنے والے!'' دادا نے مجھے سمجھایا اور میرا دکھ خوشی میں بدل گیا۔ مجھے ہر خوشی میں خوش ہونے کا سلیقہ آگیا۔

خوش ہونے کا سلیقہ آگیا تو خوشیاں بھی بہت ہو گئیں۔ نجانے کیا ہوا کہ اس علاقے کی قسمت بھی بدل گئی۔ اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب دادا کے گھر میں وہ چیز لے آئے جس نے مجھے بالکل ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔ کم از کم دادی اماں کو تو یہی خوف تھا اور وہ دادا سے بہت دیر تک تکرار کرتی رہیں۔ یہ چیز ایک ٹی وی سیٹ تھا! دادی اماں کے خیال میں ٹی وی اچھی چیز نہیں تھا لیکن دادا کا یہ خیال نہیں تھا' بعد میں دادی اماں کا خیال بھی کچھ کچھ بدل گیا۔ مثلاً پہلی ہی شام ایک انگریزی پروگرام دیکھتے ہوئے وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ رو پڑیں۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ باوجود اچھی خاصی انگریزی جاننے کے بہت سی باتیں میری سمجھ بھی نہیں آرہی تھیں۔ وہ لوگ اتنی جلدی جلدی انگریزی بولتے تھے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کیا کہہ گئے ہیں!

''دادی اماں ان کی زبان سمجھ آرہی ہے؟'' میں نے دادی اماں سے پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''تو پھر آپ کیوں رو رہی ہیں۔؟'' میں حیران ہو گیا۔

''دکھ اور درد کی کوئی زبان نہیں ہوتی میرے بیٹے!'' دادی اماں نے بڑی عجیب لہجے میں کہا۔ ''اس کو سمجھنے کے لیے صرف دل کی ضرورت ہوتی ہے۔''

اس دن کے بعد ہمیں جب بھی ٹی وی دیکھنے کی فرصت ہوتی ہم پہلے دادی اماں سے اجازت ضرور لیتے۔ ہم جانتے تھے کہ کسی پروگرام کو دیکھنے یا نہ دیکھنے کے لیے بہترین فیصلہ وہی کر سکتی تھیں۔

یوں ہر دن مجھے نئی سے نئی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ نئی نئی عادتیں اپناتا رہا اور بگڑتا رہا شاید ہی کوئی اور مجھ سے زیادہ.....

دلدار کی سوچوں کا طویل سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ یہ کہہ کر مسکرانے لگا ''بعض کہانیاں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ انسان کی سوچ کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے۔''

ہمارے معاشرے کی عکاس......ایک دلگداز...... سچی کہانی

کملا کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑچکی تھی لیکن راجن کمار اول تو نشے میں تھا پھر اسے باپ کی تھانے داری کا زعم تھا اس لیے کچھ سوچے سمجھے بغیر اٹھ کر رفیع سے دوبارہ الجھ گیا اور گالم گلوچ کرنے لگا۔ شوروغل بڑھا تو محلے کے ایک دو گھروں کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ دو ایک آدمی باہر نکل آئے' انھوں نے بھی راجن کمار کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ آپے سے باہر ہوچکا تھا۔

سرخ ہتھیلی

نازش شاہین

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

اس کا سیدھا سادھا نام زبیدہ تھا لیکن شہر کے بیشتر لوگ اسے 'رفیع کی دلہن' کے نام سے جانتے تھے۔ دوندی پور کے علاقے میں تین کمروں کے مکان میں وہ اپنے دو بیٹوں محمود اور مقصود کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ایک کمرا میاں بیوی کے استعمال میں تھا۔ دوسرے میں دونوں بیٹے رہتے تھے اور باہر کے بیٹھک نما کمرے میں حجام کی دکان تھی جہاں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ اکھٹی رہتی تھی اور ایک طرف دیوار کے ساتھ لمبی بنچ پڑی تھی جس پر انتظار کرنے والے یا تو خاموش بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے یا پھر اس اکھاڑے میں آئے دن ہونے والی کشتیوں کے بارے میں گفتگو کرتے جو دور دور تک مشہور تھا۔ زبیدہ کی طرح وہ اکھاڑا بھی 'رفیع کا اکھاڑا' کے نام سے مشہور تھا۔

جس طرح آج کل ہر علاقے میں ایک نہ ایک بدمعاش طاقت کے بل بوتے پر بے تاج بادشاہ بنا بیٹھا ہے' اسی طرح پچھلے وقتوں میں بھی ہر محلے کا کوئی نہ کوئی دادا یا رکھوالا ضرور ہوتا تھا' فرق صرف اتنا ہے کہ فی زمانہ خود کو علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھنے والا اچھی شہرت کا مالک ہوتا ہے نہ ہر دلعزیز کہلاتا ہے' شاید اس لیے کہ وہ اسی فیصد لوگوں کے لیے نہایت ناقابل برداشت اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ علاقے میں سکون ہو یا افراتفری' اس سے بے تاج بادشاہ کو کوئی سروکار نہیں ہوتا' وہ صرف اور صرف اپنے حلوے مانڈے کی فکر کرتا ہے۔ دوسروں پر کیا گزرتی ہے' یہ سوچنا خود ان کا کام ہے جو صاحب معاملہ ہوں لیکن اس کے برعکس پچھلے زمانے میں (بٹوارے سے قبل) جو شخص علاقہ کا دادا یا بدمعاش سمجھا جاتا تھا وہ نہ صرف یہ کہ پہلودار شخصیت کا مالک ہوتا تھا بلکہ بہت ساری ذمے داریوں کا بوجھ سنبھالنا بھی اس کی غنڈہ گردی یا بدمعاشی میں شامل ہوتا تھا۔ ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کی بنیادی پر ہی 'سردار کی پگڑی' اس کے سر پر قائم رہتی تھی۔

رفیع نائی کی زندگی میں آنے والا انقلاب بھی ان ہی زریں اصولوں پر کاربند ہونے کا نتیجہ تھا' یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ صرف نائی تھا، پہلوان نہیں بنا تھا۔ وہ اور اس کے دونوں بیٹے چونکہ صبح و شام پابندی سے ڈنٹر بیٹھک اور مگدر گھمانے کے عادی تھے اس لیے ان کے بدن بھی

سیسہ پلائی دیوار کے مانند تھے۔ دن بھر دکان پر محنت مشقت کرکے وہ اتنا کما لیتے تھے کہ سکون سے گزر بسر ہوتی تھی۔ زبیدہ (رفیع کی دلہن) پیشے کے اعتبار سے ایک کامیاب 'دائی' تھی اس لیے اس کی آمدنی علیحدہ تھی۔ قدرت نے اس کے ہاتھ میں کچھ ایسی مسیحائی دی تھی کہ خراب سے خراب زچگی کا کیس بھی اس کے ہاتھوں بغیر پیچیدگی اختیار کیے حل ہوجاتا تھا۔ چنانچہ جوں جوں اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اپنے علاقے کے علاوہ شہر کے دور دراز علاقوں میں اس کی مانگ بڑھتی گئی۔ اس طرح 'رفیع کی دلہن' الہ آباد کے وسیع تر علاقوں میں خاصی مشہور ہوگئی۔ اسی اعتبار سے اس کی آمدنی بھی بڑھتی گئی۔

دوندی پور کے علاقے میں ان دنوں 'تمن خان' کا ڈنکا بج رہا تھا۔ رفیع نائی تمن خان کے دوستوں میں سے تھا اس لیے اس کی حیثیت بھی تمن خان کے گرگروں میں شمار ہوتی تھی۔

رفیع نائی بے حد ملنسار اور شریف شخصیت کا مالک تھا۔ تمن خان کا یار غار ہونے کے باوجود وہ خود کو اس کے معاملات سے الگ تھلگ ہی رکھتا تھا۔ اس کے کاروبار کی نوعیت بھی اسی بات کی متقاضی تھی کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھے اور دوسرے کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے سے حتیٰ الامکان گریز کرے لیکن اس روز وہ زندگی کے ایسے موڑ پر آگیا جہاں درگزر سے کام لینا اس کے اختیار میں نہیں رہا۔

اگر میری یادداشت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تو وہ شاید دیوالی یا پھر ہولی کی رات تھی' دن بھر پورے شہر میں رونق رہی' رنگ و نسل اور ذات پات سے آزاد ہوکر سب نے مل جل کر جشن منایا لیکن اسی رات وہ حادثہ پیش آگیا جس نے رفیع نائی کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ چہل قدمی کا عادی تھا۔ اس روز وہ کھانا ہضم کرنے نکلا تو اتفاق سے تمن خان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ تمن خان ترنگ میں تھا اس کے ایک دو گرگے بھی ساتھ تھے۔ رفیع نے بڑی کوشش کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس وقت تمن خان کو ٹال جائے۔ (تمن خان نشہ کرنے کا عادی تھا اور رفیع کو اس کی اسی عادت سے ہمیشہ اختلاف رہا)

لیکن تتن خان اور اس کے گرگے اصرار کر کے رفیع کو اپنے اڈے پر لے گئے جہاں پوری محفل جمع تھی چنانچہ واپسی میں اسے دیر ہوگئی۔

دو بجے رات کا وقت تھا' سڑک پر اکا دکا ہی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ رفیع سڑک عبور کر کے گلی میں داخل ہوا۔ اس کا گھر اسی گلی میں کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ خاصی تیزی میں تھا لیکن اس کے باوجود گلی میں قدم رکھتے ہی غالباً اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ اس نے پلٹ کر سڑک پر فٹ پاتھ سیل گی کھڑی اس سیاہ رنگ کی کار کو غور سے دیکھا جسے وہ جلدی میں نظر انداز کر گیا تھا' کار کی اگلی نشست پر کوئی موجود تھا۔ کوئی بات تھی جو رفیع کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس سیاہ رنگ کی آسٹن کو پہلے بھی متعدد بار دیکھ چکا تھا۔ اسی خیال کی تصدیق کی خاطر وہ الٹے قدموں سڑک پر آیا پھر اسے یکلخت یاد آ گیا کہ وہ گاری تھانے دار رام پرکاش کی ہے جو ہمیشہ رفیع نائی ہی سے حجامت کراتا تھا۔ گاری کے قریب پہنچ کر اس کی یادداشت کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر رام پرکاش کا اکلوتا بیٹا راجن کمار بیٹھا تھا۔

''راجن بابو آپ۔'' رفیع نے اس کے قریب پہنچ کر ازراہ ہمدردی پوچھا۔ ''اتنی رات گئے ادھر کیسے کھڑے ہیں۔ کیا گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔''

''نہیں۔'' راجن کمار نے بڑی جلدی میں گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔''

راجن کمار کے منہ سے دیسی ٹھرے کی بو آ رہی تھی۔ جس انداز میں وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور دروازے سے ٹک کر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ مشکوک سا تھا۔ رفیع نے دروازہ کھلتے وقت پچھلے نشست پر کوئی گٹھری نما شے بھی دیکھ لی تھی۔ راجن نے شاید اسی لیے باہر نکل کر دروازے سے ٹیکل گالی تھی کہ رفیع کی نظریں گٹھری پر نہ ٹھہر سکیں۔

''آپ کے پتا جی تو ٹھیک ہیں۔'' رفیع نے بظاہر بڑے اخلاق کا مظاہرہ کیا لیکن جو تجسس اس کے ذہن میں پیدا ہو چکا تھا' وہ اسے کسی نہ کسی طرح گٹھری کی سن گن لینے پر اکسا رہا تھا۔

''سب بھگوان کی کرپا ہے۔'' راجن نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں سوال کیا۔ ''اس سے کہاں سے آ رہے ہو۔''

''ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں وقت کا دھیان ہی نہ رہا۔'' رفیع نے جواب دیا پھر اپنے تجسس کے پیش نظر اس نے اپنی پوزیشن میں تھوڑی سی تبدیلی کی۔ مقصد صرف اس گٹھری کو دیکھنا تھا جس نے اس کے ذہن میں نہ جانے کیوں ایک کھلبلی سی مچا رکھی تھی۔

''ٹھیک ہے' اب تم گھر جا کر آرام کرو۔'' راجن کمار نے قدرے کھردرے انداز میں رفیع کو ٹالنے کی کوشش کی' شاید اسے بھی رفیع کے اندر ہونے والی اتھل پتھل کا احساس ہو گیا تھا۔

رفیع نائی نے راجن کمار کے لہجے کی چبھن محسوس کی تو اس کا تجسس اور بڑھ گیا۔ اسی وقت اس کی نظر گٹھری پر پڑی تاریکی کے باوجود واضح طور پر ہلتی محسوس ہوئی پھر جس شبہے نے سر ابھارا وہ ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔

''راجن بابو!'' رفیع نائی نے کھردرے انداز میں مطلب کی بات کی۔ ''آپ کی گاڑی میں اور کون ہے۔''

''چلو..... اپنا کام کرو۔'' راجن کمار نے باپ کے بھروسے پر سینہ تان کر رفیع کو دھتکارا۔

''اپنی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔''

''بات تو اب بڑھے گی راجن بابو!'' رفیع کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ''سیدھی طرح بتا دو کہ گاڑی میں تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے ورنہ میں نے اگر آواز لگا کر تتن خان کے ساتھیوں کو بلایا تو پھر بات میرے ہاتھ سے بھی نکل جائے گی۔''

راجن کمار نے بہتری کوشش کی کہ رفیع کسی طرح ٹل جائے لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ آسانی سے نہیں ٹلے گا تو راجن کمار بدتمیزی پر اتر آیا' وہ پہلے ہی نشے کی حالت میں تھا' گرمی چڑھی تو نشے کی شدت بھی دو چند ہوگئی۔ رفیع کچھ دیر تک زبان سے کام چلاتا رہا لیکن جب راجن نے اس پر دوسری بار ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو رفیع نے اس کی کلائی تھام لی پھر ایک ہی داؤ میں راجن کمار کو سڑک پر چاروں خانے چت لٹا دیا۔ جتنی دیر میں وہ سڑک سے اٹھتا' رفیع لپک کر کار کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا' پچھلی نشست پر کوئی گٹھری نہیں بلکہ ماسٹر وشوناتھ کی نوجوان لڑکی کملا سہمی سمٹی بیٹھی تھی۔

''تو یہاں کیا کر رہی ہے۔'' رفیع نے ایک بزرگ کی حیثیت سے گھرک کر پوچھا۔ ''کیا بہت زیادہ پر نکل آئے ہیں۔''

''معاف کر دو کاکا۔'' کملا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''اور جو کچھ ہو چکا ہے اس کی ذمے داری کون لے گا۔'' رفیع نے کملا کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ''بلاؤں تیرے باپ کو۔''

''نہیں کاکا' نہیں۔'' کملا نے منت کی۔ ''پتا جی کو مت بلانا ورنہ۔''

کملا کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد پڑ چکی تھی لیکن راجن کمار اول تو نشے میں تھا پھر اسے باپ کی تھانے داری کا زعم تھا اس لیے کچھ سوچے سمجھے بغیر اٹھ کر رفیع سے دوبارہ الجھ گیا اور گالم گلوچ کرنے لگا۔ شور و غل بڑھا تو محلے کے ایک دو گھروں کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ دو ایک آدمی باہر نکل آئے' انہوں نے بھی راجن کمار کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ آپے سے باہر ہو چکا تھا۔

تتن خان کے ایک دو گرگے بھی موقع پر پہنچ گئے۔ کملا ابھی تک گاڑی کے اندر ہی کسمسا رہی تھی۔ رفیع نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ماسٹر وشوناتھ کو بلوا لیا جو اسی محلے میں رفیع کے مکان کے قریب ہی رہتا تھا۔ محمود اور مقصود کو خبر ہوئی تو وہ بھی لاٹھیاں لیے باپ کی مدد کو آ گئے۔ تتن خان کے ایک گرگے نے راجن کمار کو باقاعدہ گریبان سے پکڑ رکھا تھا۔

''میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔'' راجن کمار نے بلند آواز میں دھمکی دی۔

''ٹرٹر بند کرے گا یا ٹینٹوا دبا دوں تیرا۔'' تتن خان کے کارندے نے الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ رسید کیا تو پہلی بار راجن کمار کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بری طرح حالات کے بھنور میں پھنس چکا ہے۔

ماسٹر وشوناتھ کو صورت حال کا صحیح اندازہ ہوا تو اس کی گردن شرم سے جھکی کی جھکی رہ گئی۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو ماسٹر جی!'' رفیع نائی نے اسے دلاسا دیا۔ ''ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔''

''وہ تو ہے رفیع بھائی لیکن اب میں اپنی برادری میں کیا منہ دکھاؤں گا۔'' ماسٹر وشوناتھ کی آواز بھرانے لگی۔

''تم کملا کو لے کر گھر چلو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ماسٹر وشوناتھ اور کملا کو روانہ کرنے کے بعد سب ہی کی توجہ راجن کمار پر مبذول ہوگئی۔ لوگوں کی متفقہ رائے تھی کہ راجن کمار کو دنڈا ڈولی کر کے کوتوالی (بڑے تھانے) پہنچا دیا جائے لیکن رفیع نے مداخلت کی۔ کملا اس کے محلے کی عزت و آبرو تھی اس لیے رفیع کو بھی ملال تھا کہ وہ راجن کمار کے سلسلے میں دل کی بھڑاس نہیں نکال سکا' بات اگر طول پکڑ جاتی تو اس کا سب سے زیادہ خمیازہ کملا کو بھگتنا پڑتا چنانچہ رفیع نائی نے تتن خان کے دونوں گرگوں کو ساتھ لیا اور راجن کمار کے ساتھ اس کے گھر جا پہنچا۔ تھانے دار رام پرکاش نے پوری بات سن کر کہا۔ ''تمہارے ساتھ ان لوگوں نے

کوئی زیادتی تو نہیں کی۔"

"ان سب ہی نے مجھے ذلیل کیا اور گالیاں بکی ہیں۔"

وہ ان کو گھورتا ہوا بولا۔ "اس حجام نے تو میرے اوپر ہاتھ بھی اٹھایا۔"

"کیوں رفیع۔" تھانے دار نے رفیع کی جانب دیکھا۔ "کیا تم نے میری اولاد پر ہاتھ بھی چھوڑا تھا۔"

"میں انکار نہیں کروں گا صاحب۔"

"یہ تم نے کس حیثیت سے کیا۔" رفیع نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "اب تم لوگ کیا چاہتے ہو۔" رام پرکاش نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا۔

"فیصلہ تو اب آپ کریں گے صاحب جی!" رفیع کے بجائے تنن خان کے ایک گرگے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ہمیں فیصلہ کرنا ہوتا تو پھر آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"کیا ماسٹر وشوا ناتھ کو تمام باتوں کا علم ہو چکا ہے۔" رام پرکاش نے تھوڑے توقف سے معلوم کیا۔

"جی ہاں صاحب بہادر!" رفیع نائی نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ "وہ بے چارا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا' کملا اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ بات برادری میں پھیل گئی تو۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔" رام پرکاش نے پہلو بدل کر دبنگ آواز میں کہا۔ "اگر تم راجن کے سلسلے میں بڑے بن کر اس پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو تو کیا میں کملا کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تم لوگ آرام سے گھر جاؤ' میں کل ہی ماسٹر وشوا ناتھ سے ملاقات کر کے کوئی بہتر صورت نکالنے کی بات کرلوں گا۔"

رفیع نائی' تنن خان کے کارندوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا لیکن اس حادثے نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسے پہلی بار بڑی شدت سے احساس ہوا کہ تنن خان اور اس کی آدمی جس ٹائپ کی بدمعاشی اور خلیفہ گیری کر رہے ہیں' اس میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی رات رفیع نائی نے تنن خان کے گروہ میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا پھر تنن کان کے مشورے ہی پر اس نے اکھاڑے کی داغ بیل بھی ڈالی جہاں وہ محلے کے نوجوانوں کو اکھٹا کر کے پہلوانی کے گر بھی سکھاتا اور دوسروں کے کام آنے کی تلقین بھی کیا کرتا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ رام پرکاش چونکہ پولیس افسر ہے اس لیے وہ ماسٹر وشوا ناتھ کو الٹی سیدھی رگڑائی دے کر معاملے کو تھانے میں ہونے والے فیصلوں کی طرح نمٹا دے گا۔ رفیع کے کچھ قریبی ساتھیوں کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس نے بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا' پولیس سے بیر مول لے کر اس کے لیے سکون سے زندہ رہنا محال بھی ہو سکتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہفتہ دس دن تک محلے میں کملا اور راجن والی کہانی کے شوشے مختلف انداز میں سرگوشیاں بن کر ابھرتے رہے پھر اس دن وہ سب ہی ششدر رہ گئے جب انہیں اس بات کا باقاعدہ علم ہوا کہ رام پرکاش نے کملا کو اپنی بہو بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس اعلان نے خاص طور پر رفیع نائی کے جذبوں کو مہمیز کرنے کا کام سرانجام دیا اور محلے میں اس کے نام کے جے جے کر ہونے لگی۔

رفیع نائی' رفیع پہلوان بن جانے کے بعد اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں پوری طرح مگن تھا۔ ایک روز اچانک رفیع کے لڑکوں کی دکان کو آگ لگ گئی۔ سارا فرنیچر اور ساز و سامان جل بھن کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا لیکن قرب و جوار کے لوگوں کو کان و کان خبر تک نہ ہوئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آگ نے صرف دکان کی حد تک اپنی تباہ کاریوں کو محدود رکھا۔ دوسرے ملحقہ کمرے میں سوئے ہوئے

افراد کو اس کی آنچ تک نہ لگی۔ حتیٰ کہ وہ لکڑی کا دروازہ بھی پوری طرح محفوظ رہا جو دکان کے اندر کی طرف تھا اور گھر میں کھلتا تھا۔

دوسری صبح محلے والے جاگے تو پوری گلی میں کہرام مچ گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں پھیلنے لگیں۔ کسی کا خیال تھا کہ یہ آگ کسی دشمن نے لگائی ہے' ایک دو شر پسند اسے ہندوؤں کی شرارت قرار دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے دبی زبان میں اس آگ کو راجن کمار کی طرف سے انتقامی کارروائی قرار دیا لیکن رفیع پہلوان نے ان تمام افواہوں کو مسترد کر دیا پھر وہ دروازہ سب ہی کے لیے سوالیہ نشان بن گیا جو آگ کی زد سے پوری طرح محفوظ رہ گیا تھا۔

دن بھر محلے کے چھوٹے بڑوں میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں' سب سے زیادہ حیرت تنن خان اور اس کے گرگوں کو تھی۔ چھان بین کرنے پر جو باتیں سامنے آئیں وہ بھی حیران کن تھیں' رفیع کے بڑے بیٹے محمود کا بیان تھا کہ اس نے حسب معمول رات کو نو بجے دکان کو اندر سے تالا لگایا تھا' کھانا کھانے کے بعد وہ روزمرہ کے معمول کے مطابق باہر آ کر دکان کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر اپنے یاد دستوں کے ساتھ باتوں میں مشغول رہا' جس وقت ان کی محفل برخاست ہوئی اس وقت رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔ دوستوں کو خدا حافظ کہتے وقت اس نے خاص طور پر دستی گھڑی دیکھی تھی' اسے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی کہ آنکھ لگنے سے پہلے اس نے گھڑیال کو بارہ بجے کے گھنٹے بجاتے بھی سنا تھا۔

آگ لگنے کا علم انہیں اس وقت ہوا جب وہ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس لوٹ رہے تھے۔ محمود نے پورے یقین سے لوگوں کو بتایا کہ جب وہ نماز پڑھنے جا رہا تھا' اس وقت اس نے دکان کے بیرونی دروازے کو پوری طرح محفوظ دیکھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ آگ نے صرف ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ساری تباہی پھیلائی اور پھر حیرت انگیز طور پر ٹھنڈی بھی پڑ گئی۔

دکان میں لگنے والی آگ ایک ایسا معما بن گئی جس نے سب کو ششدر کر دیا تھا۔ یہاں ایک خاص بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رفیع کی دلہن کو اس کی اطلاع سب سے بعد میں اس وقت ملی جب وہ عصر کے بعد ایک زچگی کا کیس نمٹانے کی بعد گھر واپس لوٹی تھی۔ اس کیس پر وہ رات ساڑھے بارہ بجے کے بعد گئی تھی' خود رفیع پہلوان نے اسے حاجی علیم الدین کی گاڑی میں بٹھایا تھا جو گزشتہ رات اسے لینے آئی تھی۔

آگ لگنے سے جو نقصان ہوا تھا' رفیع پہلوان کو اس کی مطلق کوئی فکر نہیں تھی۔ پریشانی صرف اس بات کی تھی کہ آگ کب اور کس طرح لگی۔ دن بھر اس کا ذہن اسی ایک سوال کو حل کرنے اور ملنے جلنے والوں کی قیاس آرائیوں میں مصروف رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد اسے اچانک محلہ چک کی اس مسجد کے پیش امام کا خیال آیا جن کی بزرگی اور صاحب کرامت ہونے کے بارے میں وہ نہ صرف لوگوں کی زبانی سن چکا تھا بلکہ ایک دو بار خود بھی ان کی امامت میں جمعہ کی نماز پڑھ چکا تھا اور مصافحہ کرنے کا شرف بھی حاصل کر چکا تھا۔ مذکورہ مسجد کے برابر الہ آباد کے ایک معروف سرجن کی کوٹھی بھی تھی جن سے رفیع پہلوان کی خاصی یاد اللہ تھی چنانچہ دکان کو آگ لگنے کے حادثے کے دوسرے ہی دن وہ سرجن کی کوٹھی پر جا پہنچا اور پھر ان کی وساطت سے اسی روز وہ شاہ صاحب سے ملاقات کا وقت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

شاہ صاحب نے آگ لگنے کی روداد پوری توجہ سے سنی۔ رفیع پہلوان سے اس کے اہل خانہ اور ان کی مصروفیات و مشاغل کے بارے میں دریافت کرتے رہے پھر کچھ دیر خاموش بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق رہے۔ رفیع پہلوان کی

نظریں شاہ صاحب کے نورانی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ شاہ صاحب کی خاموشی اسے نہ جانے کیوں کچھ عجیب معنی خیز نظر آرہی تھی۔

''تم خوش قسمت ہو کہ صرف تمہاری دکان کے ساز و سامان کو نقصان ہوا۔'' شاہ صاحب نے مہر سکوت توڑی۔

''بات اگر خراب ہوجاتی تو پورا گھر بھی راکھ کا ڈھیر بن سکتا تھا۔''

''میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں پھر یہ آگ کس نے لگائی۔'' رفیع پہلوان نے بڑے ادب واحترام سے کہا۔

''فوری طور پر میرا مشورہ ہے کہ تم اپنا اور اپنے گھر والوں کا نام بنام صدقہ دو اور نماز شکرانہ ادا کرو کہ آئی مصیبت آسانی سے ٹل گئی۔''

''جو حکم بڑے صاحب۔''

''دکان کا جو ساز و سامان جل گیا تھا' اس کی جگہ نیا اور زیادہ بہتر سامان خرید کر کاروبار دوبارہ شروع کردو۔ خدا نے چاہا تو تمہارے تمام نقصان کی تلافی بھی ہوجائے گی۔''

''آپ جیسا کہیں گے' میں ویسا ہی کروں گا۔''

''دکان کی مرمت اور رنگ و روغن کرانے کے بعد مجھ سے ملنا' میں تمہیں چار کیلیں پڑھ کر دوں گا' اسے اپنے دکان کے چاروں کونوں میں ٹھونک دینا' اللہ بہتر کرے گا۔''

''میں آج ہی سے مرمت کا کام شروع کرادیتا ہوں۔'' رفیع پہلوان نے بڑی سعادت مندی سے حامی بھری پھر دبی زبان میں پوچھا۔ ''بزرگوار۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آگ لگنے کا سبب کیا تھا اور.....''

''زیادہ کریدنے سے کبھی کبھی بات اور کرکری ہوجاتی ہے۔'' شاہ صاحب نے مبہم انداز میں کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ کچھ لوگوں میں برداشت کرنے کی قوت کم ہوتی ہے۔ ایک ذرا سی بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔''

''کیا میرے بیٹوں نے یا ملازم نے کسی گاہک کی شان میں کوئی گستاخی کردی تھی۔'' رفیع پہلوان کا تجسس پھر بیدار ہونے لگا۔

''تفصیل میں جانے کے بجائے آئندہ کے لیے گھر والوں کو محتاط رہنے کی تاکید کردینا۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

''جو حکم آپ کا۔''

''تمہاری گھر والی کا کاروبار کیسا چل رہا ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا۔ ''میں نے بھی مریدوں کی زبانی اس کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔''

''سب اوپر والے کی مہربانی اور آپ جیسے کرامت والے بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' رفیع پہلوان نے انکساری سے جواب دیا۔

''بچے خدا کی نعمت ہوتے ہیں' پھول کے مانند۔'' شاہ صاحب نے پہلو بدل کر کہا۔ ''ہر والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کھیتی ہری بھری رہے۔ اگر ان کے دل کو کوئی ٹھیس بھی لگے تو تڑپ اٹھتے ہیں۔''

''آپ بجا فرمارہے ہیں بڑے صاحب۔''

''تم اب جاسکتے ہو۔'' شاہ صاحب نے اپنی مصروفیات کے پیش نظر کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا جو کرتا ہے اس میں بندے کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور ہوتی ہے۔ جس کا علم اسے قبل از وقت نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی سیلاب آنے سے بنجر زمین بھی اناج اگانے کے قابل ہوجاتی ہے۔ سب اس کی دین ہے' جو صبر و شکر اور درگزر سے کام لیتے ہیں' وہ کبھی خسارے میں نہیں رہتے۔''

رفیع پہلوان نے جھک کر شاہ صاحب کو سلام کیا اور الٹے قدموں حجرے سے نکل کر مسجد کا صحن عبور کرتا باہر آگیا۔ شاہ صاحب سے مل لینے کے بعد اسے قلبی سکون اور اطمینان ضرور حاصل ہوا تھا لیکن نہ تو اسے آگ لگنے کا اصلی سبب معلوم

ہوسکا' نہ شاہ صاحب کے اشارے اس کی سمجھ میں آئے' اس کے ذہن میں بس ایک ہی جملہ رہ رہ کر گونج رہا تھا۔ ''یوں سمجھ لو کہ کچھ لوگوں میں برداشت کرنے کی قوت کم ہوتی ہے۔ ایک ذرا سی بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔'' اس جملے سے کم از کم رفیع پہلوان نے یہی مطلب اخذ کیا تھا کہ کسی گاہک کو کام کرنے والوں کی کوئی بات گراں گزری ہوگی اور اس نے طیش میں آکر دکان کا سارا ساز و سامان پھونک ڈالا۔

بہرحال شاہ صاحب کے حسب حکم رفیع پہلوان نے دوسرے ہی دن سے راج مزدوروں کو لگا کر دکان کے رنگ و روغن وغیرہ کا کام شروع کروادیا۔ فرنیچر وغیرہ کی خریداری میں بھی اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ معیاری اور بہتر ہو' اس دوران میں اس نے دبی دبی زبان میں گھر کے ہر فرد کو اس بات کی سختی سے تاکید کردی تھی کہ وہ آئندہ سے گاہکوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک کریں۔ شاہ صاحب کے حکم کے مطابق اس نے سوا سیر نکتی دانوں پر نیاز دلا کر بچوں میں تقسیم کرادی تھی۔ دکان دوبارہ سج دھج کر تیار ہوئی تو رفیع پہلوان نے باقاعدہ میلاد کرایا اور دوبارہ شیرینی تقسیم کی۔ سب کام سے فارغ ہوکر دکان کا افتتاح کرنے سے پیشتر وہ ایک بار پھر شاہ صاحب سے ملنے گیا۔ شاہ صاحب نے دم کی ہوئی کچی کیلیں رفیع پہلوان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اس بات کا خیال رکھنا کہ کیلیں احتیاط سے ٹھونکی جائیں تاکہ ٹوٹنے سے محفوظ رہیں۔''

''میں اس کا خیال رکھوں گا بڑے صاحب۔''

''اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔'' شاہ صاحب نے رفیع پہلوان کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے دریافت کیا۔

''اگر گستاخی نہ ہو جناب تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آگ لگنے کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ میرا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ قصور کس کا تھا۔ ہمارے کسی کارندے کا یا اس کا جس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔''

''جو بات ہونی تھی وہ ہوچکی۔ اسے بھول جاؤ۔'' شاہ صاحب نے سنجیدگی سے تلقین کی۔ ''آئندہ کے لیے خیال رکھنا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ ضرورت مند اگر صاحب استطاعت بھی ہو تو ہمیشہ اسی دروازے پر دستک دیتا ہے جہاں سے اسے بہتر خدمت اور مکمل اطمینان کی امید ہو۔''

''میں اب بھی آپ کا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔'' رفیع پہلوان نے کسمسا کر اپنی کم علمی کا اظہار کیا۔

''میں نے ایک عام سی بات کہی تھی۔'' شاہ صاحب نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔ ''کسی وسوسے کو دل میں جگہ مت دو' خدا بہتر کرے گا۔''

رفیع پہلوان کچھ دیر شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس آگیا۔ شاہ صاحب سے دوبارہ ملنے کے بعد بھی اسے قلبی سکون کا احساس ہوا تھا لیکن یہ سوال گرہ بن کر اس کے ذہن میں چبھنے لگا تھا کہ آگ لگنے کی وجہ کیا تھی اور اس کا ذمے دار کون تھا۔

رفیع پہلوان اور تنن کے باہم مشورے کے بعد جمعہ کے مبارک دن سے دکان کا دوبارہ افتتاح ہوا اور گاہکوں کی ریل پیل پہلے سے زیادہ ہوگئی لیکن جو سوال رفیع پہلوان کے ذہن میں کلبلا رہا تھا' وہی محلے کے بزرگوں اور تنن خان میں بھی رہ رہ کر مچل اٹھتا تھا۔ تنن خان نے خاص طور پر اپنے کارندوں کو بڑی رازداری سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ دکان پر نئے اور پرانے سب آنے جانے والوں پر خاص نظر رکھیں۔ ان خصوصی ہدایات کے پس منظر میں تنن خان کی ان بڑی بڑی مونچھوں کو خاص دخل تھا جس پر وہ حسب معمول تھوڑے تھوڑے وقفے سے تاؤ دے کر علاقے میں اپنی داداگیری اور برتری کا اعلان کرتا

پھرتا تھا لیکن رفیع پہلوان کی دکان میں آگ لگ جانے کے حادثے نے محاورتاً اس کی مونچھ نیچی کردی تھی' جسے دوبارہ اونچا کرنے کی خاطر وہ ہر قیمت پر اس مجرم تک پہنچنا چاہتا تھا جس نے اس کے محفوظ ترین علاقے میں واردات کرکے اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا' تنن خان کے اندر کی بے چینی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن اس نے اکھاڑے پر رفیع پہلوان کو علیحدگی میں لے جاکر پھر اسی موضوع کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''یار! میری ایک بات مانے گا۔''

''کیسی بات۔''

''تو ایک بار پھر اپنے چک والے شاہ صاحب سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کر کہ آخر وہ بندہ کون تھا جس نے تیری دکان کو آگ لگانے کی جرات کی۔''

''میں دو بار کوشش کرچکا ہوں لیکن شاہ صاحب نے زیادہ کریدنے کو سختی سے منع کیا ہے۔'' رفیع پہلوان نے کہا۔

''تیرے اصرار پر میں چلا تو جاؤں لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ شاہ صاحب ہتھے سے اکھڑ جائیں۔ بڑے کرامت والے بزرگ ہیں۔ ان کی ناراضی مول لینا بھی ہمارے حق میں ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''تو پھر میں ایک اور طریقہ اختیار کرتا ہوں۔''

''وہ کیا۔''

''کھڑا کھیل فرخ بادی۔'' تنن خان نے ایک مروجہ محاورے کی ٹانگ توڑتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ''شیدا بنگالی بڑی حرامی شے ہے' ہر توڑ کا جوڑ نیفے میں اڑسے پھرتا ہے۔ میں ایک دوبار اسے آزما بھی چکا ہوں۔''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' رفیع پہلوان نے جلدی سے کہا۔ ''میں بھی جانتا ہوں اسے لیکن وہ زیادہ تر گندے اور ناپاک جنتر منتر سے کام لیتا ہے۔ مسلمان ہوکر ہمارا اس کے پاس کسی مطلب سے جانا ٹھیک نہیں لگے گا۔''

''اس کے بعد تو قرآن پر چھری رکھوانے کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔'' تنن خان نے جواب دیا۔ ''جس نے بھی آگ لگائی ہوگی اس کا کلیجہ کٹتا رہے گا۔ سالا اس وقت تک خون تھوکتا رہے گا جب تک سامنے آکر اپنی غلطی کا اقرار نہ کرلے ورنہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا۔''

''میں اس کا مشورہ بھی نہیں دوں گا۔'' رفیع پہلوان نے کہا۔ ''شاہ صاحب نے مجھے درگزر سے کام لینے کو کہا ہے۔ ویسے بھی ذرا سے نقصان کے بدلے میں کسی کی جان لینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ شاہ صاحب نے نقصان کی تلافی کے سلسلے میں بھی کچھ اشارہ دیا تھا لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی' ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ اس بندے سے واقف ہیں جس نے غصے میں گرمی کھا کر دکان کو آگ لگائی تھی' شاہ صاحب نے بھی کہا تھا کہ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آئی گئی دکان کے سامان پر ٹل گئی' بات خراب ہوجاتی تو پورے کا پورا گھر راکھ کا ڈھیر بن سکتا تھا۔'' رفیع پہلوان نے تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا' میرے یار! ہاں' اگر آگ لگانے والا بھی کھل کر میدان میں آگیا تو پھر وقت کے وقت دیکھی جائے گی۔''

بات تنن خان کی سمجھ میں آگئی لیکن اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ اگر کبھی مجرم اس کے ہتھے لگ گیا تو وہ اس کی 'رام رام ست' ہے کیے بغیر اپنے ہاتھ نہیں روکے گا۔

☆☆

رفیع پہلوان کی دکان نے ڈیڑھ سال کے اندر اندر اتنی ترقی کرلی کہ برابر کے مکان کا ایک کمرا لے کر اس کی توسیع کی گئی۔ تین کی جگہ چھ کرسیوں کی گنجائش پیدا ہوئی تو تین نئے کاریگر بھی برسرروزگار ہوگئے۔ دکان کے باہر سیمنٹ کی

چادروں کا بڑا سا سائبان ڈال کر اس پر آتشی رنگ کیا گیا تو دکانوں کا بیرونی حصہ بھی چمک اٹھا۔

غرضیکہ شاہ صاحب کے بقول دکان جلنے سے جو نقصان ہوا تھا' وہ ڈیڑھ سال کے اندر نہ صرف پورا ہوگیا بلکہ کاروبار میں وسعت بھی پیدا ہوئی لیکن دکان کی آگ کا معما جوں کا توں رہا۔ تنن خان کے کارندوں نے ہر ممکن کوشش کرڈالی لیکن شبہ کرنے کے لیے انہیں ایک نقطہ بھی میسر نہ آیا۔

رفیع کی دلہن کی مصروفیات میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ صبح سے شام تک کوئی نہ کوئی گاڑی اس کے دروازے پر ضرور کھڑی نظر آتی تھی۔ شہرت اور تجربے نے اس کی مانگ میں اتنا اضافہ کردیا کہ ایک انار اور سو بیمار والا محاورہ صادق آنے لگا۔ اپنا ہاتھ بٹانے کی خاطر رفیع کی دلہن نے دو تجربہ کار دائیاں اور بھی ساتھ لگالیں لیکن ہر شخص کا پہلا مطالبہ یہی ہوتا تھا کہ زچگی کے وقت رفیع کی دلہن زچہ کے قریب ضرور موجود رہے۔

غرضیکہ رفیع پہلوان کی زندگی نہایت سکون سے گزر رہی تھی۔ بڑے بیٹے محمود کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد اب اسے مقصود کے لیے کسی مناسب لڑکی کی تلاش تھی' محمود کی شادی کے بعد رفیع پہلوان نے پڑوس میں قریب ہی دو کمروں کا مکان خرید کر محمود کا علیحدہ بندوبست بھی کردیا تھا لیکن ہر وقت دونوں گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

دسمبر کے آخر میں پڑنے والے شدید جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے کہ رفیع پہلوان کے گھر کے سارے افراد ایک کمرے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس روز اتفاق سے رفیع کی دلہن کا کہیں سے کوئی بلاوا بھی نہیں آیا تھا' اسی لیے اس نے محمود اور اس کی دلہن کو بھی بلالیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی اس نے مقصود کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی' رفیع پہلوان نے لڑکی والوں کے سلسلے میں ضروری چھان بین کرلی تھی چنانچہ اس وقت سب کو جمع کرکے رسمی طور پر رشتے کی بات سے آگاہ کرنا تھا۔

باتوں کے ساتھ ساتھ گڑھ کی سوندھی سوندھی چائے کا دور بھی جاری تھا کہ دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔

''اس وقت کون آسکتا ہے۔'' محمود نے پوچھا۔

''اماں کا بلاوا آیا ہوگا کہیں سے۔'' مقصود نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''خدا جانے یہ زیادہ تر رات گئے ہی عورتوں کو پریشانی کیوں لاحق ہوتی ہے۔''

''چپکا بیٹھا رہ۔'' رفیع پہلوان نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ''سوچ سمجھ کر بولا کر۔ بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے۔ اتنا سیانا ہوگیا لیکن.....''

''بھئی آج میرے مقصود کو کوئی کچھ نہ کہے۔'' رفیع کی دلہن کی مامتا پھڑپھڑائی۔ ''آج اس کے رشتے کی بات ہورہی ہے' اسے جی بھر کے چہکنے دو۔''

رفیع پہلوان نے بڑی بہو کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر اٹھ کر باہر آگیا جہاں سیاہ رنگ کی ایک لمبی کار کھڑی تھی' دروازے پر نظر آنے والا شخص بھی انتہائی قیمتی پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ رکھ رکھاؤ سے ہی لگ رہا تھا وہ ڈرائیور نہیں ہوسکتا۔

''جی فرمایئے۔'' رفیع پہلوان نے اسے سر سے پاؤں تک ٹٹولتے ہوئے بڑے مہذب انداز میں مخاطب کیا۔

''رفیع کی دلہن اسی مکان میں رہتی ہے۔'' نووارد نے قدرے بے چینی سے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ میں اس کا مرد ہوں' رفیع۔''

''میں اسے ایک کیس پر لے جانے کی خاطر آیا ہوں۔'' نووارد نے دوبارہ بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ ''اگر وہ گھر پر ہے تو مہربانی کرکے اسے فوری طور پر میرے ساتھ کردیں۔ میری بیوی کافی

تکلیف میں مبتلا ہے اور.....'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''کیا میری گھر والی زچہ کو پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔'' رفیع پہلوان نے معلومات کی خاطر پوچھا۔

''جی نہیں۔''

''آپ کی تعریف۔''

''میرا نام سلیمان ہے۔ سول لائن کے علاقے میں بائیس نمبر کی کوٹھی میں رہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب لیکن.....''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے رفیع صاحب!'' نووارد جس نے اپنا نام سلیمان بتایا تھا رفیع پہلوان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''آپ فیس کی کوئی پروا نہ کریں۔ میری بیوی کی خوشی پوری ہوجائے تو میں اپ کو آپ کی توقع سے زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔''

''اللہ کا دیا ہمارے پاس بھی سب کچھ ہے۔'' رفیع پہلوان نے وضاحت کی۔ ''دراصل میرے چھوٹے بیٹے کے رشتے کی بات چل رہی ہے' اسی سلسلے میں سب لوگ آج اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ اگر کسی دوسری دائی کا بندوبست.....''

''کیسی بات کررہے ہیں آپ!'' سلیمان نے رفیع پہلوان کو پہلی بار تیز اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ''اگر مجھے کسی اور لیڈی ڈاکٹر یا دائی کی ضرورت ہوتی تو سول لائن سے اتنی دور آنے کی حماقت کیوں کرتا۔''

''اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔'' رفیع پہلوان نے بدستور ادب سے جواب دیا۔ ''لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں رات کے وقت اپنی گھر والی کو۔''

''گویا تم دوسرے لفظوں میں انکار کررہے ہو۔'' سلیمان کے لہجے میں درشتی آگئی۔ چہرے پر طیش کی سرخی پھیل کر گہری ہونے لگی۔

''اپنی اپنی مجبوری کی بات ہے۔'' رفیع پہلوان نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بچے خدا کی نعمت ہوتے ہیں رفیع میاں۔'' سلیمان نے انتہائی خشک اور کھردری آواز میں کہا۔ ''قدرت نے تمہیں جس نعمت سے نواز رکھا ہے۔ تم اس کی خوشی کو میری پریشانی پر ترجیح دے رہے ہو لیکن ایک بات یاد رکھنا میں اس وقت تمہارے دروازے سے مایوس ہوکر لوٹ رہا ہوں۔ اگر میرے گلشن میں کھلنے والے پھول پر کوئی آنچ آئی تو میں تمہاری بے رخی کو فراموش نہیں کروں گا۔''

سلیمان کا لب و لہجہ خاصا سخت اور ناقابل برداشت تھا۔ رفیع پہلوان کو بھی پھریری آرہی تھی' اس نے جواب میں زبان کو تو جنبش نہیں دی لیکن جن تیز نظروں سے اپنے مقابل کو دیکھا اس کا واضح مفہوم یہی تھا کہ تم اس وقت میرے دروازے پر کھڑے ہو اس لیے معاف کررہا ہوں۔ اگر گفتگو کا یہی انداز تم نے کہیں دوسری جگہ اختیار کیا ہوتا تو شاید میں تمہیں سارا حساب کتاب ایک ہی جھپٹ میں سمجھا دیتا۔

سلیمان بدستور رفیع پہلوان کو گھورتا رہا۔ وہ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد بھی واپسی کے لیے نہیں پلٹا تھا۔ رفیع پہلوان بات بڑھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر محمود اور مقصود میں سے کوئی باہر آگیا تو بات یقیناً بگڑ جائے گی۔ نوجوان کے گرم خون میں جلدی ابال آجاتا ہے۔ یہ بات وہ کئی موقعوں پر آزما چکا تھا۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب خیال کیا کہ خاموشی سے گھر میں جاکر اندر سے کنڈی لگالے' اس کے بعد بھی اگر سلیمان نے دوبارہ دستک دی اور زور زبردستی کا مظاہرہ کیا تو پھر دیکھا جائے گا۔

اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے ارادے سے رفیع پہلوان نے ابھی اپنی نظریں سلیمان کے چہرے سے ہٹا کر واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ

اچانک اس کے ذہن میں چک والے شاہ صاحب کا دھیان آگیا پھر ان کا ایک جملہ بھی صدائے بازگشت بن کر اس کے کانوں میں گونجنا شروع ہوگیا۔ ''بچے خدا کی نعمت ہوتے ہیں۔ پھول کے مانند۔ ہر والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے' اس کی کھیتی ہری بھری رہے۔ اگر ان کے دل میں کوئی ٹھیس بھی لگے تو تڑپ اٹھتے ہیں۔''

''میں ضرورت مند بھی ہوں اور صاحب استطاعت بھی' اسی لیے میں نے تمہارے دروازے پر دستک دی تھی۔ بہتر خدمت اور مکمل اطمینان کی خاطر لیکن کوئی بات نہیں۔'' سلیمان نے عجیب انداز میں کہا۔ ''فی الحال میں جارہا ہوں۔''

''نہیں بڑے صاحب! نہیں۔'' رفیع پہلوان کے لب و لہجے میں یکلخت تبدیلی آگئی۔ سلیمان کا کہا ہوا آخری جملہ بھی وہ محلہ چک والے شاہ صاحب کی زبانی سن چکا تھا۔ اشارے مل رہے تھے لیکن اس کا پس منظر رفیع پہلوان کی سمجھ سے باہر تھا۔ پھر بھی اس نے سلیمان کو روک لیا اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ ایک منٹ انتظار کریں۔ میں اپنی گھر والی کو آپ کے ساتھ کیے دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' سلیمان نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''مجھے تم سے اسی مہربانی کی توقع تھی۔ مطمئن رہو' میں تمہاری گھر والی کو اس کی خواہش سے کہیں زیادہ.....''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب!'' رفیع پہلوان نے سلیمان کا جملہ کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے روپے پیسے کا لالچ نہیں ہے۔ کوئی اور وجہ ہے جو میں اپنی گھر والی کو بھیجنے پر آمادہ ہوگیا ہوں۔''

رفیع پہلوان تیزی سے پلٹ کر گھر میں داخل ہوا پھر اسی کی ایما پر اس کی بیوی سلیمان کے ساتھ جانے کے لیے فوری طور پر تیار ہوگئی۔ اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئی وہ نہ صرف انتہائی دلچسپ بلکہ حیرت انگیز بھی ثابت ہوئی۔ میں اس کی تفصیل آپ کو رفیع کی دلہن کی زبانی سنانا پسند کروں گا تاکہ آپ کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو اور رونما ہونے والے واقعات کا اصل نقشہ بھی پوری طرح اجاگر ہوسکے۔

☆☆

خشخشی داڑھی والے شخص نے بڑی شرافت سے میرے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ رفیع کا شکریہ ادا کیا پھر گاڑی میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اسے سڑک پر لاکر برق رفتاری سے دوڑانے لگا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی حسب عادت اس کی حرکتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا شخص تھا' بظاہر کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد نظر آرہا تھا۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ بے حد سختی اور جفاکش لگ رہا تھا۔

عام طور پر جب میں کسی کے ساتھ گاڑی میں تنہا ہوتی ہوں تو وہ شخص ایک دوبار میری شخصیت کا دزدیدہ نظروں سے جائزہ ضرور لیتا ہے لیکن اس خشخشی داڑھی والے نے جس نے اپنا نام سلیمان بتایا تھا' ایک بار بھی میری سمت دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاصی جلدی میں تھا اور گاڑی کی رفتار تیز کرتا جارہا تھا۔ ہر چند کہ اس وقت سڑک پر سناٹا تھا پھر بھی میں نے اس کی تیز رفتاری پر اعتراض کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

''برائے مہربانی گاڑی کی رفتار تھوڑی کم کرلیجیے' تیز رفتاری سے مجھے ہول اٹھنے لگتا ہے۔''

سلیمان نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کردی۔ کوئی بیس پچیس منٹ بعد گاڑی سول لائن کے علاقے میں داخل ہوئی پھر مرکزی بازار سے گھوم کر اس چوڑی شاہراہ پر آگئی جہاں دونوں طرف خوبصورت کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں راستوں کو سمجھنے کی دھن میں لگی ہوئی تھی' یہ میری عادت تھی

تاکہ اگر کبھی اکیلے اسی جگہ دوبارہ جانے کی ضرورت پیش آجائے تو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بڑی شاہراہ سے سیاہ کار ایک سروس روڈ پر مڑی پھر کچھ دور آگے جاکر بائیس نمبر کی عالی شان کوٹھی میں داخل ہوئی' جس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مجھے گیٹ پر چوکیدار یا کوئی ڈراؤنا کتا بھی بھونکتا نظر نہیں آیا۔ باہر بہت بڑا لان تھا۔ گاڑی تیزی سے روش کے ساتھ بل کھاتی کوٹھی کے صدر دروازے پر جاکر رک گئی۔ سلیمان نے تیزی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا' میں نیچے اتری تو دیکھا کہ کوٹھی کا بیرونی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور سلیمان کے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتی رہی جس نے میرا چرمی بیگ اٹھا رکھا تھا اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتا آگے آگے چل رہا تھا۔

کوٹھی کے اندر کی سجاوٹ دیدنی تھی' وہاں جو قیمتی ساز و سامان موجود تھا' وہ میں نے پہلے کسی دوسری کوٹھی میں نہیں دیکھا تھا' فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور در و دیوار پر اعلیٰ قسم کی پینٹنگز موجود تھیں۔ بیشتر بتیاں روشن تھیں لیکن مجھے وہاں کوئی ملازم یا ملازمہ نظر نہیں آئی' ممکن ہے وہ اپنے اپنے کوارٹروں میں محوِ خواب ہوں اور سلیمان نے انہیں جگانے کی ضرورت نہ محسوس کی ہو۔

میں سلیمان کے ساتھ قدم ملاتی اس خوبصورت خوابگاہ میں داخل ہوئی جس کی تعریف لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی' صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی' خوابگاہ روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ سامنے ایک بہت ہی خوبصورت مسہری موجود تھی اور اس مسہری پر جو عورت ایک دوشالہ پیروں تک ڈالے لیٹی تھی' وہ بلاشبہ اس پوری کوٹھی اور وہاں کی تمام آرائشوں سے زیادہ حسین اور دلکش تھی۔

مسہری کے قریب ہی ایک صوفہ نما کرسی موجود تھی' سلیمان کے اشارے پر میں اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ عورت نے پہلے سلیمان کو اور پھر مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہی ہے آپ کی مریضہ' میری زوجہ' آفرین!'' سلیمان نے مجھ سے کہا۔

''آپ کمرے سے باہر تشریف لے جائیں تاکہ میں ضروری معائنہ کرسکوں۔'' میں نے سلیمان سے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی عورت یا ملازمہ ہو تو اسے اندر بھیج دیں' مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی۔''

سلیمان نے میری بات کے جواب میں عورت کی سمت دیکھا پھر اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دیتا باہر چلا گیا' میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا پھر عورت کا معائنہ کای تو میرے تجربے کے مطابق کیس پوری طرح تیار تھا۔

''آفرین بی بی!'' میں نے عورت کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی عورت کو بلوالیں تاکہ وہ مجھے گرم پانی' تسلا اور دوسری چیزیں فراہم کرسکے۔''

''گھر میں اس وقت سلیمان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ آپ سامان کی فہرست انہیں بتا دیں' وہ آپ کو مطلوبہ چیزیں فراہم کردیں گے۔'' آفرین نے میری پشت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی تو سلیمان میری پشت پر موجود تھا' غالباً وہ خواب گاہ میں موجود کسی اور دروازے سے اندر آگیا تھا' یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ کچھ مرد حضرات کی کوشش ہوتی ہے کہ پہلی زچگی کے وقت اپنی بیویوں سے قریب تر رہیں۔ آفرین مجھے اپنی مجبوری سے بھی آگاہ کرچکی تھی کہ اس وقت کوٹھی میں اس کے شوہر کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ میں نے ضروری سامان کی فہرست اسے بتانی شروع کی۔ وہ خاموش کھڑا پوری توجہ سے میری ایک ایک بات کو ذہن نشین کرتا رہا پھر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

میں آفرین سے دریافت کرکے غسل خانے

میں ہاتھ دھونے گئی' ہاتھ دھوکر دو چار منٹ بعد باہر آئی تو سلیمان دوبارہ مجھے آفرین کی مسہری کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ میری تمام مطلوبہ چیزیں بھی میری نظروں کے سامنے تھیں۔ میں نے آفرین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''ان تمام اشیا کا بندوبست ہم نے پہلے ہی کررکھا تھا۔''

''کیا مجھ سے پہلے کوئی دوسری دائی آپ کو دیکھتی رہی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہی سمجھ لیں۔'' آفرین نے گول مول سا جواب دیا۔

میں کیس کی نوعیت بھانپ چکی تھی' میں نے سلیمان کو دوبارہ باہر جانے کو کہا۔ اس نے آفرین کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دی پھر قدم بڑھاتا باہر چلا گیا اور میں اپنے پیشہ ورانہ کام میں مصروف ہوگئی' آفرین کے سلسلے میں مجھے ایک بات پر تعجب ضرور ہوا تھا' میرے پوچھنے پر اس نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ پہلی بار اس تجربے سے گزرے گی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تردد یا پریشانی برائے نام بھی نہیں تھی۔ میرے تجربے اور مشاہدے کے اعتبار سے یہ بات یقیناً حیرت انگیز تھی اس لیے کہ پہلوٹی (پہلے بچے) کی ولادت کے وقت زچہ قدرتی طور پر بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی ہوتی ہے لیکن آفرین کے چہرے پر کچھ ایسا سکون اور اطمینان تھا جو مجھے پہلے کہیں اور نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ پہلے بچے کی ولادت پر آفرین یا سلیمان کے گھر کا کوئی فرد بھی وہاں موجود نہیں تھا۔

میں اپنے کام میں پوری توجہ سے مصروف تھی' کچھ دیر بعد آفرین کے ہاں اولاد نرینہ کی ولادت ساتھ خیریت کے ہوئی تو مجھے بھی کاروباری اعتبار سے خوشی ہوئی۔ یہ بات میرے مشاہدے اور تجربے میں تھی کہ خاص طور پر جہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے' وہاں زیادہ خوشیاں منائی جاتی ہیں اور سب کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ دائیوں کو طے شدہ رقم کے علاوہ مٹھائی اور دیگر تحفے تحائف ملتے ہیں۔ گھر کے ملازموں کو بھی باقاعدہ جوڑے دیے جاتے ہیں' محلے بھر میں شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔

''مبارک ہو آفرین بی بی! خدا نے اپنی مہربانی سے آپ کو اولاد نرینہ عطا کی ہے۔'' میں نے آفرین کو خوشخبری سنائی تو اس کا چہرہ گلاب کے مانند کھل اٹھا۔ ''اس خوشی کے موقع پر میں آپ سے دگنا نیگ لوں گی۔'' میں نے کہا پھر بچے کو نہلا دھلا کر اور کپڑے پہنا کر آفرین کے برابر لٹایا تو آفرین نے فوری طور پر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پانچ گنیاں (انگریزی دور میں خالص سونے کا ایک سکہ جو اکتیس شلنگ کا ہوتا تھا) نکالیں' میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری طرف سے ہے' سلیمان تمہیں علیحدہ انعام دیں گے۔''

میں نے گنیاں بڑی احتیاط سے دوپٹے کے آنچل میں کس کر باندھیں' ایک کے بجائے دو گانٹھ لگائیں پھر غسل خانے میں جاکر منہ ہاتھ دھویا' تازہ دم ہوکر باہر آئی تو سلیمان مسہری پر بیوی کے پاس بیٹھا نومولود بچے کو جو بے حد خوبصورت' گول مٹول اور صحت مند تھا' محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''لڑکا مبارک ہو بھائی صاحب!'' میں نے حسب عادت سلیمان کو مبارک باد دی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' سلیمان نے بڑے مہذب انداز میں جواب دیا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آفرین نے آپ کو جو انعام دیا ہے وہ بہت کم ہے' میں آپ کو آپ کی توقع سے زیادہ انعام دوں گا۔''

''ہم انعام کے لالچی نہیں ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا' ''آپ کا کام خوش اسلوبی اور ساتھ خیریت کے ہوگیا' ہمارے لیے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔''

''اب آپ غالباً گھر جانا چاہیں گی۔''

سلیمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلیے‘ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

”کیا آپ کے پاس کوئی ڈرائیور نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”زچہ کی ضروری دیکھ بھال اور مالش وغیرہ کے لیے مجھے کم از کم ہفتہ دس دن تک ذاتی طور پر آنا جانا ہوگا۔ اس کے بعد میں کسی اور کا بندوبست کردوں گی۔“

”اب آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔“ سلیمان نے مسکرا کر عجیب انداز میں جواب دیا۔ ”آفرین کی دیکھ بھال کے لیے میں نے بندوبست کرلیا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا‘ سلیمان کی بات سن کر مجھے ملال ضرور ہوا تھا۔ بہرحال رخصت ہونے سے پیشتر میں نے آفرین کو بڑے پیار سے خدا حافظ کہا‘ نومولود کو پیار کیا پھر باہر آ کر سیاہ کار میں بیٹھ گئی۔ واپسی میں بھی مجھے کوٹھی کے دروازے اور پھاٹک کھلے ملے تو سخت حیرت ہوئی‘ اتنی بڑی کوٹھی میں سوائے سلیمان اور آفرین کے مجھے کوئی دوسرا بندہ بشر بھی نظر نہیں آیا تھا۔

”کیا آپ کے سوا کوٹھی میں اور کوئی نہیں رہتا۔“ میں نے نہ چاہنے کے باوجود پوچھ ہی لیا۔ ”مجھے کوئی ملازم یا چوکیدار بھی نظر نہیں آیا۔“

”میں تم سے ایک درخواست کروں گا۔“ سلیمان نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے آج جو خدمت انجام دی ہے‘ اسے بھول جانا۔ کسی اور سے اس کا تذکرہ بھی نہ کرنا‘ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔“

اپنا جملہ ختم کرکے اس نے برابر والی سیٹ سے ایک سرخ رنگ کی تھیلی اٹھا کر مجھے دی۔ ”یہ میری طرف سے تمہارا انعام ہے لیکن اسے سنبھال کر رکھنا‘ غلطی سے پھینک مت دینا۔“

سلیمان کا جملہ سن کر میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں نے کپڑے کی تھیلی کا منہ نہ کھول کر دیکھا تو اس میں بڑے بڑے دس بارہ کوئلوں کے ٹکڑے موجود تھے۔ سلیمان نے انہیں سنبھال کر رکھنے کی تاکید کی تھی۔ مجھے سخت غصہ آیا‘ دل میں آیا کہ انعام کے کوئلے کی تھیلی واپس اس کے منہ پر ماردوں لیکن پھر میں نے اس کی باتوں پر غور کیا تو یکلخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی‘ میرے ذہن میں ایک شبہ تیزی سے ابھرا۔ ”کہیں سلیمان کا تعلق کسی دوسری مخلوق سے تو نہیں ہے جو کسی بھیس میں بھی نظر آسکتے ہیں۔“ اس شبہے کے سر ابھارتے ہی خوف سے میرے اوپر لرزہ طاری ہوگیا۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ میں نے قرآن کی جتنی آیتیں بھی یاد تھیں‘ ان کا ورد شروع کردیا اور خدا سے اپنی خیریت کی دعائیں کرنے لگی۔ سلیمان خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ میرا گھر قریب آیا تو اس نے گاڑی دروازے تک لے جانے کے بجائے گلی کے نکڑ پر ہی روک کر کھردرے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم اب ہمارے بارے میں کچھ کچھ سمجھ چکی ہو‘ اس لیے میرا تمہارے گھر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ میری طرف سے رفیع پہلوان کا شکریہ ادا کرنا اور ہاں‘ ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“

میں نے جواب میں کیا کہا مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں‘ گاڑی سے اتر کر لمبے لمبے قدم اٹھاتی‘ گرتی پڑتی گھر پہنچی‘ سرخ رنگ کی تھیلی میں نے ایک طرف کونے میں ڈالی پھر کھٹیا پر ایسی گری کہ ایک ہفتے تک کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ شدید بخار نے مجھے اس طرح جکڑا کہ کسی سے کچھ کہنے سننے کا دھیان ہی نہیں آیا۔ ایک ہفتے بعد طبیعت ذرا سنبھلی تو رفیع نے موقع پاکر دبی زبان میں کہا۔

”کچھ خبر ہے تجھے اس قدر ہلہلا کر بخار کیوں چڑھا تھا اور وہ کون تھا جس کے ساتھ تو آخری بار گیس پر گئی تھی۔“

”کون تھا۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔“ رفیع نے چہرہ قریب کرکے سرگوشی کی۔ ”تو تو بخار میں ایسی بدحواس تھی کہ نہ جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ پھر جب ڈاکٹروں کی سمجھ میں تیری بیماری کی وجہ نہیں آئی تو میں سیدھا چک والے شاہ صاحب کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تجھے جنات لے گئے تھے لیکن یہ بھی منع کیا ہے کہ زیادہ لوگوں سے اس کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ تیرے بخار کے لیے تعویذ بھی دیا تھا شاہ صاحب نے۔“ رفیع نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو اسی وقت شک ہوا تھا جب تو نے بخار میں ہذیان بکنا شروع کیا تھا‘ شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد میں سلیمان کے بتائے ہوئے پتے پر بھی گیا تھا۔ وہاں کے چوکیدار نے بتایا کہ وہ کوٹھی تو تین مہینے سے خالی پڑی ہے۔ گھر والے سیر و تفریح کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

”میں نے جو دوپٹا اوڑھ رکھا تھا‘ وہ کہاں ہے۔“ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے مدھم آواز میں رفیع سے پوچھا۔

”اسی کے آنچل کو کھولنے کے بعد ہی تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔“ رفیع نے جواب دیا۔ ”تیری سونے کی پانچوں گنیاں میرے پاس حفاظت سے رکھی ہیں اور وہ سرخ کپڑے کی تھیلی بھی جو تو نے بدحواسی میں کونے میں پھینک دی تھی‘ اچھا ہوا جو کسی اور کی نظر نہیں پڑی اس پر۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔“ میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”کیا میں کوئلے کے ٹکڑوں کو چھاتی سے لگا کر رکھتی۔“

”یہ تو کیا بک رہی ہے۔“ رفیع نے حیرت سے کہا۔ ”اری بھاگوان! اس تھیلی میں کوئلہ نہیں خالص سونے کے پورے دس ڈلے موجود تھے‘ جبھی تو میں نے صورت حال کا اندازہ لگا کر شاہ صاحب سے ملاقات کی تھی۔“

رفیع کی زبانی دس ڈلے سونے کا سن کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے بعد میں نے رفیع کے مشورے پر کیس پر جانا بند کردیا‘ صرف دس پندرہ گھر ایسے رہ گئے تھے جو میرے خاص اور پرانے واقف کاروں کے تھے جہاں میں جانے سے انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔

☆☆

یہ واقعہ مجھے میری والدہ (مرحومہ) نے آج سے پچیس سال قبل سنایا تھا۔ رفیع کی دلہن کا الہ آباد میں ہمارے گھر اتنا زیادہ آنا جانا تھا کہ میرے دونوں بڑے بھائیوں اور ایک بہن کی ولادت بھی اسی کے ہاتھوں انجام پائی تھی‘ وہ اور رفیع اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے دونوں بیٹے محمود اور مقصود خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں اور آج کل لاہور میں ہیں‘ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے اپنا آبائی پیشہ ترک کردیا اور کاروباری دنیا میں مگن ہیں۔ سرخ تھیلی کے انعام کی بدولت ان کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔

میں اس واقعے کی توجیہ میں نہ صرف اپنی والدہ کے بیان کا گواہ ہوں بلکہ اس ایک گنی (سونے کا سکہ) کو بچشم خود دیکھ چکا ہوں جو مقصود نے ایک بار کراچی آنے پر مجھے دکھائی تھی۔ اس گنی کو (جس پر کنگ جارج کی تصویر کے علاوہ 1938ء بھی کندہ ہے) مقصود نے بڑی احتیاط سے بطور یادگار آج بھی اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ رہا اس کی صداقت کا معاملہ تو یہ پورا واقعہ خود رفیع کی دلہن نے میری والدہ کو سنایا تھا جو بہرحال اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن کیا آپ نے اس قسم کے ملتے جلتے حیرت انگیز واقعات کبھی اپنے بزرگوں کی زبانی نہیں سنے۔ ویسے کون ہے جو جنات کے وجود اور اس کی حقیقت سے انکار کرسکتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی عکاس.....ایک دلگداز..... سچی کہانی

محبت فاتح عالم

ہما صفدر

ان دنوں میں اور ارم اسکول کے آخری سال میں تھے' ہم پرچوں کی تیاری کررہے تھے۔ اس کے بعد ارم کے سسرال والوں کو پاکستان سے آنا تھا۔ میں اکثر پڑھنے کے لیے ارم کے پاس چلی جاتی تھی' عجیب بات تھی کہ وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آتی تھی' شاید اس وجہ سے کہ میری ماتا جی اس کا آنا پسند نہیں کرتی تھیں یا شاید میرے بڑے بھائی سریش کی وجہ سے وہ ہم سے الگ تو ہوگئے تھے لیکن اکثر شام کو ہمارے ہاں بیوی بچوں سمیت آجاتے تھے۔

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

کھتے ہیں سچی عمر کی محبت نشے کی طرح ہوتی ہے فوراً اثر کرتی ہے اور پھر بعد میں اتر جاتی ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا' محبت نے اس وقت مجھے اپنا اسیر کرلیا تھا جب میں صحیح معنوں میں اس کے مفہوم سے واقف بھی نہیں تھی۔ میں ہندوستان کے شہر کان پور میں ایک اسکول ٹیچر کے گھر پیدا ہوئی' میرے پتا سری نواس بھی اسی علاقے میں بچوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہم نواحی علاقے میں رہتے تھے جو کسی حد تک دیہاتی پس منظر رکھتا تھا۔ میں نے اپنے ماتا پتا کی ساتویں اولاد تھی۔ مجھ سے بڑی چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ کسی ہندو گھرانے میں' اگر وہ غریب بھی ہو' اتنی لڑکیوں کی موجودگی نحوست کی علامت سمجھی جاتی ہے گویا میں پانچویں منحوس تھی' کم سے کم ماتا جی یہی کہا کرتی تھیں۔

''ارے اتنی ساری منحوسوں کو ٹھکانے کیسے لگاؤں گی۔'' ماتا جی اٹھتے بیٹھتے کہا کرتی تھیں۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو ماتا جی میری تین بڑی بہنوں کو ٹھکانے لگا چکی تھیں۔ سب سے بڑی بہن پاربتی اناج کے ایک بیوپاری سے بیاہی گئی تھی جو نہ صرف پچاس برس کا تھا بلکہ دو بیویوں کو پہلے ہی بھگت چکا تھا' یہ پکی عمر والا بدصورت شخص میری خوب صورت سی بہن کو بیاہ کر لے گیا اور دو سال بعد ٹی بی نے اس کی جان لے لی۔ دوسری بہن سریتا کی شادی ایک سرکاری کلرک سے ہوئی تھی' آدمی نوجوان تھا پر بلا کا کنجوس اور شکی۔ وہ سریتا کو گھر نہیں آنے دیا تھا اور نہ ہی ہمارا اپنے ہاں آنا پسند کرتا تھا۔ اسے ہر وقت شک لگا رہتا تھا کہ سریتا اس سے چھپ کر ہمیں کچھ دے نہ دے مہینوں بعد ہمیں سریتا کی شکل دیکھنے کو ملا کرتی تھی پر ماتا جی اس پر بھی مطمئن تھیں کہ سریتا اپنے گھر کی تو ہے۔

تیسری بہن جو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی اس کی شادی محض پندرہ برس کی عمر میں پنجاب کے ایک زمین دار سے کردی گئی جو عمر میں اس سے بیس سال بڑا تھا۔ لیکن میری یہ بہن اپنے گھر میں سب سے زیادہ خوش تھی۔ اس کے دو بچے تھے اور وہ ہر دو مہینے میں ایک بار اپنے پتی کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ دونوں بڑے بھائی شادی کر کے الگ ہوگئے تھے۔ ماتا جی کی اپنی بہوؤں سے نہیں بنتی تھی۔ اب گھر میں صرف میں میری بڑی بہن سونیتا اور ماتا پتا تھے' ماتا جی سونیتا کی بھی جلد از جلد شادی کرنا چاہتی تھیں وہ مجھ سے تین سال بڑی تھی اور شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔

ہم جس محلے میں رہتے تھے' وہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی تھی۔ تقسیم کے بعد جب یہاں سے مسلمانوں کے بہت سارے خاندان چلے گئے تو ان کی جگہ پاکستان سے آنے والے ہندو شرنارتھیوں کو ملی تھی اور وہ امن وسکون سے رہنے لگے تھے۔ میرے پتا سری نواس بھی پاکستان کے شہر راولپنڈی سے آئے تھے' جہاں ان کے پرکھے صدیوں سے رہتے آرہے تھے۔

ہمارا گھر جس گلی میں تھا' اس میں زیادہ تر پرانی وضع کے بڑے مکانات تھے' مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان سے ہمارے گھرانے کے اچھے تعلقات تھے۔ ماتا جی کسی حد تک چھوت چھات کی قائل تھیں اور ہمیں مسلمان بچوں سے ملنے یا ان کے گھر جانے سے روکا کرتی تھیں مگر پتا جی روشن خیال آدمی تھے' ان کے دوستوں کی اکثریت بھی مسلمان ہی تھی' شام کو وہ گلی کے کونے والے مرزا امجد علی کے گھر جا کر بیٹھا کرتے تھے' ان کے گھر ہر شام بہت سارے لوگ جمع ہوتے تھے' وہ خود بھی شاعر تھے اور پتا جی بھی شاعری کرتے تھے' اس لیے ان کی آپس میں خوب بنا کرتی تھی۔ ان کی بیٹی ارم سے میری دوستی تھی۔

''تم اپنا دھرم تو خراب کررہے ہو میرے بچوں کا تو نہ کرو۔''

''کیا میرے بچے نہیں ہیں۔'' پتا جی مسکرا کر کہتے۔

''ہیں' پر تم دھرم سے ہٹ گئے ہو۔'' ماتا جی صاف کہتی تھیں۔

میری ماتا جی کے ہاتھوں خوب عزت ہوا کرتی تھی۔ میں جب بھی ارم کے ساتھ کھیل کر آتی تھی ماتا جی نہائے بغیر مجھے رسوئی میں قدم نہیں رکھنے دیتی تھیں وہ کہتیں۔

''ارے یہ مسلے ادھرمی (بنا مذہب کے) ہوتے ہیں۔''

''نہیں ماتا جی ان کے بھی بھگوان ہوتے ہیں جنہیں وہ اللہ میاں کہتے ہیں۔''

''کہتے ہوں گے۔'' ماتا جی جھنجلاتیں۔ ''پر

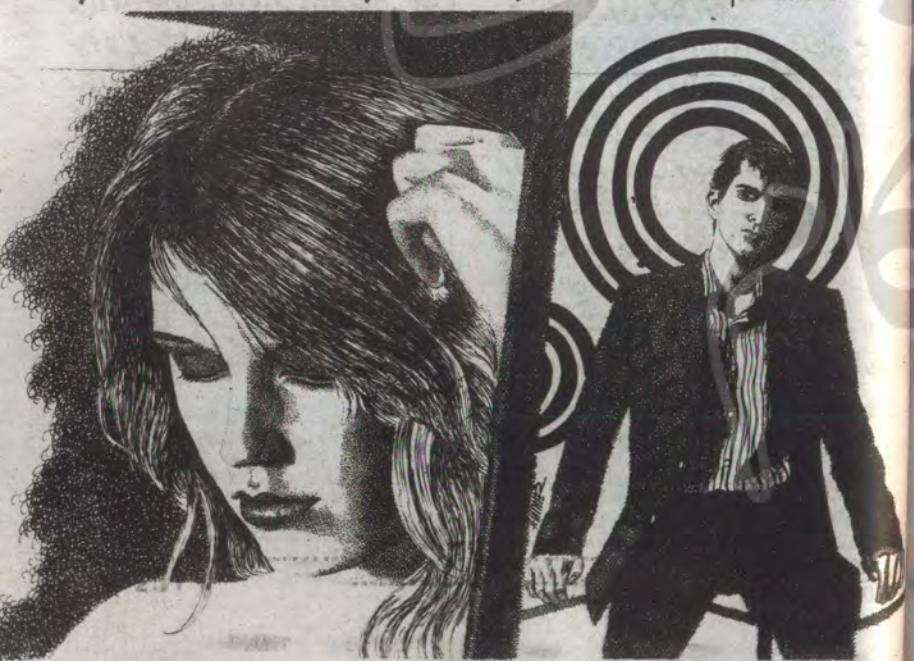

تو کسی مسلمان لڑکی کے ساتھ نہیں کھیلے گی۔''

اس وقت تو میں ماتا جی کی بات مان جاتی لیکن جب بھی باہر جاتی میرے قدم بے اختیار مرزا صاحب کی حویلی کی طرف اٹھ جاتے تھے' جن کے صحن میں نیم کا بڑا سا درخت لگا تھا' ہم اس پر لگے جھولے پر جھولا کرتے تھے۔ ارم میری ہم عمر تھی۔ وہ میری کلاس میں پڑھا کرتی تھی ہم ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔ ارم اپنے ساتھ مزے مزے کے کھانے لاتی تھی' کئی بار اس نے مجھے گوشت سے بنی چیزیں بھی کھلائیں' اس کے بعد مجھے ایسا چسکا لگا کہ میں اس کے گھر جا کر چوری چھپے کھا کے آجاتی تھی۔

جب میری عمر پندرہ سال ہوئی تو ماتا جی نے سریتا کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس کا شوہر میری سب سے بڑی خالہ کا بیٹا تھا اور دہلی میں ملازمت کرتا تھا' اسی لیے سریتا شادی کر کے دہلی چلی گئی۔ یہ شادی ذرا۔ اچھے طریقے سے ہوئی تھی اس لیے مجھے بہت مزہ آیا۔ اس شادی میں پہلی بار میں ذرا صحیح تیار ہوئی تھی' زرق برق کپڑے پہنے تھے اور میک اپ کیا تھا' لڑکوں کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ میں اچھی بھی لگ رہی تھی میری رنگت میں ہلکا سا سانولا پن شامل تھا ہلکی براؤن آنکھیں تھیں۔ براؤن رنگ کے لمبے اور گھنے بال تھے۔ ارم نے مجھے بتایا۔

''شیلا آج تو' تو غضب کی لگ رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''لڑکے تو دیکھ کر پاگل ہو جائیں گے۔''

''جھوٹ۔'' میں شرمائی۔ کیونکہ اب میں سمجھ دار ہو گئی تھی۔

''نہیں قسم سے سچ کہہ رہی ہوں' آئینہ دیکھو۔'' اس نے مجھے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

واقعی میں بہت اچھی لگ رہی تھی' ارم نے سرگوشی کی۔ ''آج تو دیکھنے والوں کی خیر نہیں ہے۔''

''تو بھی کم نہیں لگ رہی ہے۔'' میں نے اسے دیکھا' ارم بھی بہت پیاری سی تھی۔

''میرا تو پہلے ہی نمبر لگ چکا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''لیکن لگ رہا ہے آج تیرا بھی لگ جائے گا۔''

''بکواس نہ کر۔'' میں جھینپ گئی تھی۔

ارم کی منگنی اس کے بچپن میں ہو گئی تھی۔ پاکستان سے اس کی خالہ نے اسے مانگ لیا تھا۔ ان کا بیٹا اسی سال آنے والا تھا۔ وہ لوگ اب باقاعدہ منگنی کرنا چاہتے تھے' تین چار سال بعد وہ اسے بیاہ کر پاکستان کے شہر لاہور لے جاتے' میں نے ارم سے پوچھا۔ ''کیا وہاں جا کر مجھے یاد کرے گی۔''

''میں بھلا تجھے بھول سکتی ہوں۔'' اس نے مجھے گلے سے لگا لیا تھا۔

یہ عمر ایسی تھی جب نت نئے راز آشکار ہوتے ہیں' زندگی کے نئے مفہوم سامنے آتے ہیں ہم زیادہ تر اسی طرح کی باتیں کرتے تھے ارم نے بتایا کہ اس کا منگیتر اسے خط بھی لکھتا ہے۔

''ہائے اللہ کسی کو پتا نہیں چلتا۔''

''سب کو پتا ہے پر میری تو اس سے منگنی ہو گئی ہے نا اس لیے کوئی کچھ نہیں کہتا۔''

ارم کی بڑی بہن کی شادی بھی پاکستان میں اس کے ایک چچازاد بھائی سے ہوئی تھی' وہ لوگ بارات لے کر آئے تھے۔ پورے ایک ہفتے تک مرزا چچا کی حویلی میں خوب ہنگامہ رہا تھا۔ اگرچہ ماتا جی نے مجھے حویلی جانے سے منع کیا تھا لیکن میں موقع پاتے ہی وہاں پہنچ جایا کرتی تھی۔ ارم کی چچی اور ان کے گھر والے بہت اچھے تھے۔ سب کے لیے تحفے لائے تھے۔ مجھے بے حد تعجب ہوا تھا۔ کیوں کہ ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ پھر ارم کی چچی نے اس کی بہن کے لیے شاندار سی بری دی تھی اور اسے بغیر کسی جہیز کے پانچ جوڑوں اور زیورات میں بیاہ کر لے گئی تھیں۔ انہوں نے جانے سے پہلے بڑی سی دعوت

بھی کی تھی۔ اسے وہ 'ولیمہ' کہتے تھے۔

ارم کے لیے بھی ہر سال پاکستان سے اس کے ہونے والے سسرال سے تحفے اور چیزیں آتی تھیں۔ مجھے ان سب پر رشک آتا تھا۔ مرزا چچا کی بھی چار بیٹیاں تھیں لیکن وہ انہیں بوجھ یا نحوست نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتے تھے ان کے لیے اچھی سے اچھی چیز لاتے تھے' ان کے ناز نخرے بھی اٹھاتے تھے' محبت تو میرے پتا جی بھی کرتے تھے لیکن انہوں نے تو کبھی ہمارے ایسے ناز نخرے نہیں اٹھائے تھے۔ ارم نے مجھے بتایا کہ ان کے ہاں بیٹی رحمت ہوتی ہے جس گھر میں بیٹی پیدا ہو کہتے ہیں وہاں اللہ کی رحمت آتی ہے۔

''ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔'' میں نے حسرت سے کہا تھا۔ ''بچپن سے ماتا' پتا کے منہ سے منحوس منحوس سنتے آئے ہیں۔''

''ہمارے مذہب میں اللہ تعالیٰ نے عورت کا بہت بڑا مقام رکھا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا مرنے کے بعد اللہ میاں جس انسان سے راضی ہوں گے اسے جنت دیں گے اور یہ جنت ماں کے پیروں تلے ہوتی ہے۔''

میں یہ سب سن کر بے حد متاثر ہوتی تھی اور میرے اندر کبھی بے اختیار خواہش ابھرتی کہ کاش میں کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوئی ہوتی۔ میں نے کسی بھی اچھے سے اچھے اور دولت مند ہندو گھرانے میں لڑکیوں سے وہ سلوک نہیں دیکھا تھا جو مرزا چچا اپنی بیٹیوں سے کرتے تھے۔

ان دنوں میں اور ارم اسکول کے آخری سال میں تھے' ہم پرچوں کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد ارم کے سسرال والوں کو پاکستان سے آنا تھا۔ میں اکثر پڑھنے کے لیے ارم کے پاس چلی جاتی تھی' عجیب بات تھی کہ وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آتی تھی' شاید اس وجہ سے کہ میری ماتا جی اس کا آنا پسند نہیں کرتی تھیں یا شاید میرے بڑے بھائی سریش کی وجہ سے وہ ہم سے الگ تو ہو گئے تھے لیکن اکثر شام کو ہمارے ہاں بیوی بچوں سمیت آجاتے تھے اور خوب کھا پی کر جاتے تھے' ایک بار ارم میرے ساتھ ہی گھر آئی تو صحن میں چارپائی پر بیٹھے سریش بھائی نے اسے دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

''شیلا تیری سہیلی تو بڑی پیاری ہے بالکل مینا کماری لگتی ہے۔''

واقعی ارم کا چہرہ بڑی حد تک مینا کماری سے ملتا تھا۔ لیکن سریش بھائی نے یہ بات جس انداز میں کہی تھی خود مجھے بھی بری لگی تھی' ارم کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے تو بہت ہی ناگوار گزری ہے' اگلے روز جب میں اس سے ملنے گئی اور اس سے اپنے گھر چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

''شیلا اب میں تیرے گھر نہیں آؤں گی' میں بھی سریش بھائی کو اپنے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں لیکن کل انہوں نے.....''

میرا اثر مندگی سے برا حال ہو گیا' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تجھ سے شما چاہتی ہوں۔''

''ارے نہیں تو کیوں معافی مانگ رہی ہے' پراب میں تیرے گھر نہیں آؤں گی۔'' اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''مجھ سے ملے گی بھی نہیں۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ''تجھ سے ملنا کیسے چھوڑ سکتی ہوں' بس میں صرف تیرے گھر نہیں آؤں گی۔''

ارم کے بڑے بھائی بھی تھے وہ بس ایک ہی بیٹے تھے' مرزا چچا کے اور مجھے بالکل ارم کی طرح سمجھتے تھے۔ جب میں ان کے سامنے جاتی اور انہیں آداب کیا کرتی تھی تو وہ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ بھی رکھتے تھے مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ وہ غیر مرد ہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ انہوں نے مجھے کبھی مرد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں' اس کے مقابلے میں سریش بھائی نے جو حرکت کی تھی اس

نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا تھا۔ انہوں نے بعد میں بھی کئی بار ارم کے بارے میں پوچھا کہ اب وہ کیوں نہیں آتی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کہہ دوں آپ کی وجہ سے نہیں آتی ہے لیکن پھر میں خاموش ہوگئی۔

''بھیا مسلمانوں میں پردے کا رواج ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ نہیں آتی ہے۔''

''عجیب رواج ہے۔'' سریش بھائی نے منہ بنا کر کہا۔ ''ارے عورت بھی کوئی چھپا کر رکھنے کی چیز ہے۔''

''آپ بھی تو مجھے کہتے ہیں کہ.....'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''تو' تو بس.....'' سریش بھائی کھسیا گئے تھے۔

اس کے سسرال والے منگنی کرنے آرہے تھے۔ میں روز ہی ارم کے پاس جاتی' اس کی منگنی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ روزمرہ کاموں میں جوش وخروش بڑھتا جارہا تھا۔ ارم مجھ سے بار بار کہتی تھی کہ میں ہر کام میں آگے رہوں اور اس کی ساری رسموں میں شرکت کروں۔

''پاگل میں تیری خوشی میں شامل نہیں ہوں گی تو اور کس کی خوشی میں شامل ہوں گی۔'' میں اس سے کہتی۔

لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا جس روز ارم کی خالہ آرہی تھیں اس سے دو روز پہلے میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی تیز بخار چڑھا اور ایسا چڑھا کہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی' تقریباً ایک ہفتے میں اتنی بیمار رہی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکی تھی' اس دوران میں ارم کی خالہ آگئیں' اس کی منگنی بھی ہوگئی' اس کی امی مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ارم مجھے برابر یاد کررہی تھی' خاص طور سے جس روز منگنی تھی' اس روز ارم بہت روئی تھی مجھے نہ دیکھ کر۔ میں نے خالہ سے کہا کہ ''جیسے ہی میری طبیعت بہتر ہوگی میں ضرور آؤں گی۔'' ارم کا مجھے پتا ہی تھا کہ وہ کیوں نہیں آئی مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی کہ سریش بھائی کی حرکت غلط سہی لیکن کیا اس نے میرے ہاں نہ آنے کی اتنی سخت قسم کھا رکھی تھی۔

مجھے صحت یاب ہونے میں دس بارہ دن لگے تھے' اس بیماری نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمزور اتنی ہوگئی تھی کہ زیادہ بولنے سے سانس پھول جاتی تھی' بارھویں دن میں نے فیصلہ کیا کہ ہمت کرکے ارم کے پاس ہو آؤں۔ اسے منگنی کی مبارک باد دے آؤں۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی' میں نے ماتا جی سے کہا تو وہ بولیں۔

''نہ جاؤ تمہاری حالت اچھی نہیں ہے۔''

''اب ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں پڑے پڑے تنگ آگئی ہوں۔''

''اچھا جاؤ لیکن جلدی آجانا۔'' ماتا جی نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

میں جلدی سے باہر آگئی' مجھے سچ مچ ہلکے ہلکے سے چکر آرہے تھے لیکن ارم سے ملنے اور اسے منگنی کی مبارک باد دینے کی دھن میں چلی جارہی تھی' مرزا چچا کی حویلی میں بڑا پھاٹک تھا جس پر بڑا سا تالا پڑا تھا اور اس تالے کو میں نے کبھی کھلے نہیں دیکھا تھا اسی پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا جسے میں نے کبھی بند نہیں دیکھا تھا' صبح سے رات تک یہ کھلا ہی رہتا تھا' ممکن ہے رات کسی وقت بند کردیا جاتا ہو۔ میں اس دروازے سے گزر کر حویلی کے صحن میں آئی' نیم کے درخت تلے کوئی کھڑا تھا کوئی اجنبی تھا' کیوں کہ میں حویلی کے تمام لوگوں کو جانتی تھی۔ وہ دوسری طرف رخ کرکے کھڑا تھا اس کے کسی قدر دراز گھنگھریالے بال اس کے کاندھوں تک آرہے تھے' شلوار قمیص میں بھی اس کی شاندار جسامت واضح تھی' میں اس کی طرف بڑھی۔

''سنیے۔'' میں نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور میں جیسے پتھر کی ہوگئی۔

بے حد سفید رنگت' کشادہ پیشانی' ستواں ناک بھرے ہوئے رخسار اور ہلکی مونچھوں تلے مسکراتے لب میں ماتا جی کے ساتھ مندر جایا کرتی تھی جہاں دیواروں پر کرشن جی کی تصویریں بنی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے کرشن مجسم ہوکر میرے سامنے آگئے ہوں' میں ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ مجھے اردگرد کا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے میری اس محویت کو دیکھ رہا تھا۔

''جی آپ کو کس سے ملنا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''آپ سے.....'' میں نے عالم بے خودی میں کہا۔

''جی۔'' اس نے حیرانی سے کہا تو مجھے ہوش آگیا۔

''آپ آپ کون ہیں۔'' میں نے بدحواسی سے پوچھا۔

''میں راحیل احمد ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور آپ کون ہیں۔''

''میں میں شیلا ہوں' ارم کی سہیلی..... ارم کہاں ہے۔''

''اچھا تو آپ ہیں' ارم آپ کا بہت ذکر کرتی ہے۔ اس نے مجھ سے اب تک جتنی باتیں کی ہیں زیادہ تر آپ کے بارے میں ہی ہیں۔''

اب مجھے صحیح سے ہوش آیا' میں ارم کے منگیتر سے بات کررہی تھی اور اس کیفیت میں..... مجھے خود سے شرم آنے لگی تھی۔ میرا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا اب جب اس نے بتایا کہ ارم اندر ہے تو میں جلدی سی اندر بھاگ گئی نہ جانے کیوں مجھے اس کے سامنے کھڑے رہنا محال لگ رہا تھا۔

اندر ارم مجھے دیکھتے ہی آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''کیسی ہے تو ہائے کتنی کمزور ہوگئی ہے۔''

''اور تو کتنی خوب صورت ہوگئی ہے بالکل اپنے منگیتر کی طرح۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ''تو نے انہیں کہاں دیکھ لیا۔''

''ابھی اندر آتے ہوئے صحن میں کھڑے تھے۔''

''کیسے لگے میرے ہونے والے۔'' ارم شرارت سے بولی۔

''بہت ہی اچھے۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور بوکھلا گئی لیکن ارم نے توجہ نہیں دی' وہ مجھے راحیل کے بارے میں بتا رہی تھی' وہ کتنا اچھا تھا (واقعی اس جیسا کوئی نہیں تھا) کتنا خوب صورت تھا (بالکل کسی دیوتا کی طرح) اور ارم سے کتنی محبت کرتا تھا (میرے دل میں پھانس چبھ گئی) میں نے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجالی۔

''ارم تو واقعی خوش قسمت ہے تجھے ایسی حسین صورت والا شخص ملا ہے۔''

''تجھے بھی اچھا لگا۔'' ارم شرارت سے بولی۔ ''اپنے بارے میں کیا خیال ہے ہم مسلمانوں میں تو چار بھی ہوتی ہیں۔''

''بکواس نہ کر۔'' میں نے دل کی حسرت دباتے ہوئے کہا۔ ''تجھے تیرا منگیتر مبارک ہو' بھگوان نہ کرے جو تم دونوں کی خوشیوں کے بیچ کوئی اور آئے۔''

''تو واقعی میری سب سے اچھی سہیلی ہے میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی۔ خالہ کہہ رہی تھیں کہ وہ دو سال بعد آکر مجھے لے جائیں گی۔'' وہ بات کرتے کرتے گلوگیر ہوگئی' میں نے اسے گلے سے لگالیا۔

''پاگل روتی کیوں ہے' پھر تو آیا کرے گی نا میں بھی تجھ سے ملوں گی اور اگر ایسی ہی جدائی کی آگ لگ رہی ہے تو اپنے ساتھ مجھے بھی لے چل تم مسلمانوں کے ہاں تو چار چار بیویاں ہوتی ہیں۔'' میرا لہجہ شرارتی ہوگیا تھا۔

''بکواس نہ کر۔'' وہ روتے روتے ہنسی پھر سنجیدہ ہوکر بولی۔ ''سچ میں تجھ سے اتنی محبت کرتی

ہوں کہ تجھے سوکن بنا کر بھی اپنے ساتھ رکھنا پڑے تو رکھ لوں پر تو جانتی ہے یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ہاں میں ہندو ہوں اور تم مسلمان ہو۔"

"کاش کہ تو مسلم ہوتی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "راحیل کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے بالکل اس کی طرح۔"

"پر وہ راحیل تو نہیں ہے۔" میں نے ایک بے خودی کے عالم میں کہا پھر شرمندہ سی ہوگئی کیوں کہ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ "میرا مطلب ہے راحیل جیسا خوب صورت کوئی نہ ہوگا وہ تو تیرا منگیتر ہے نا۔"

میں اس پر رشک کرتی رہی اور اس کی خوشی پر خوش ہوتی رہی میرے اندر اس کے لیے ذرا سا بھی حسد نہیں آیا تھا۔

اگلے روز میں صبح سویرے ارم کے پاس جا پہنچی۔ اس امید پر کہ شاید راحیل مجھے پھر نظر آئے مگر اس روز اس سے میرا سامنا نہیں ہوا میں پاگل دیوانی ہو رہی تھی شام کو دوبارہ جانے پر بھی وہ مجھے نظر نہیں آیا تو میں نے ارم سے پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے تیرے منگیتر جی نظر نہیں آرہے ہیں۔"

"کیوں تجھے اس سے کیا کام ہے۔" ارم نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔

ارم نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ پندرہ دن کے لیے آئے تھے اس کے بعد انہیں دہلی جانا تھا جہاں ان لوگوں کے اور بھی رشتے دار رہتے تھے' میں نے اس سے پوچھا کہ کیا راحیل بھی چلا جائے گا۔ اس نے جواب دیا۔ ظاہر ہے وہ بھی اپنی امی اور ابو کے ساتھ جائے گا پھر اس نے ذرا رک کر کہا۔ "کیا بات ہے تو راحیل کے بارے میں زیادہ ہی فکر نہیں کرنے لگی ہے۔"

"ظاہر ہے میری پیاری سی سکھی کا منگیتر جو ہے۔" میں نے ہنس کر اپنے تاثرات چھپائے۔

"اچھا ورنہ میں سمجھی کہ شاید تیرا بھی دل آ گیا ہے۔"

اور یہ سچ ہی تو تھا' راحیل جیسے میرے لہو میں شامل ہوگیا تھا' اس پورے عرصے میں اس سے چند ہی بار ملی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں پتا نہیں اس نے میری دیوانگی کو جانا بھی تھا یا نہیں۔ جب وہ جا رہا تھا تو ارم روئے جا رہی تھی اور اسے تسلی دیتے ہوئے میں خود بھی اندر سے رو رہی تھی میرا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔

"تو کیوں روتی ہے آج نہ سہی کل تو اس کے پاس چلی جائے گی' وہ تیرا ہی تو ہے۔" اس سے زیادہ میں نے خود کو یاد دلایا کہ راحیل میرا نہیں صرف اس کا ہے۔

پر ابھی تو صرف میرا دل دکھ رہا تھا' ارم نے آنسو صاف کیے۔ "شیلا مجھے لگ رہا ہے میں اس کے بنا مر جاؤں گی جی نہیں پاؤں گی۔"

"بھگوان نہ کرے۔" میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تجھے کچھ نہیں ہوگا تو راحیل کے سنگ جائے گی' ہمیشہ اسی کے ساتھ خوش رہے گی۔"

"انشاء اللہ۔" اس نے کہا۔

راحیل جب جا رہا تھا تو میں جان بوجھ کر ارم کے پاس سے چلی گئی' ورنہ مجھے ڈر تھا کہ میں اس کے سامنے رو نہ پڑوں البتہ میں نے اپنے مکان کی چھت سے راحیل کو جاتے دیکھا تھا وہ بھی افسردہ تھا اور بار بار مرزا چچا کی حویلی کے اوپری جھروکے کو دیکھ رہا تھا مجھے معلوم تھا وہاں چنی کے پیچھے ارم کھڑی تھی۔ میں اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ ٹیکسی میں نہیں بیٹھ گیا پھر ٹیکسی چلی گئی میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے شکر ہے میں اپنی چھت پر تھی۔ اس رات میں روتی

رہی' میں حیران تھی' مجھے کیا ہو گیا۔ ایک اجنبی آیا اور میرے ہوش و حواس پر چھا گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے میں جلد راحیل کو بھول جاؤں گی' پھر میرے دل کو قرار آجائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ہر روز آنے والے دن وہ مجھے پہلے سے زیادہ یاد آنے لگا' میں جب ارم کے پاس جاتی تو بہانے بہانے سے راحیل کی باتیں کرتی تھی' ایک بار ارم نے مجھے پاکستان سے آنے والی تصویریں دکھائیں جو اس کی خالہ یعنی راحیل کی امی ساتھ لائیں تھیں' ان میں راحیل کی بے شمار تصویریں تھیں' میری پیاسی نگاہیں بے تابی سے اس کا دیدار کرنے لگیں' ارم نے بھی میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔

"کیا بات ہے تم اتنی غور سے تصویریں دیکھ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔" میں چونکی۔ "ارم ایک گلاس پانی دینا۔"

"ابھی لائی۔" وہ اٹھ کر گئی اس کے جاتے ہی میں نے پھرتی سے راحیل کی ایک تصویر نکال کر اپنے بلاؤز میں چھپالی' جب وہ پانی لے کر آئی تو میں پہلے کی طرح تصویریں دیکھ رہی تھی' بظاہر میں مطمئن تھی لیکن اندر سے میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اگر وہ تصویر کی غیر حاضری محسوس کر لیتی تو..... اس سے آگے مجھے نہیں معلوم تھا مگر خیریت رہی اس نے مجھے گلاس تھمایا اور میرے ہاتھ سے البم لے کر واپس الماری میں رکھ دی۔ شاید اسے میرا بار بار راحیل کی تصویریں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بہر حال لڑکی تھی اور اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ کوئی دوسری لڑکی اس کے منگیتر میں اتنی دلچسپی لے۔

"ارم..... ان لوگوں کا کوئی خط آیا وہاں سے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں خالہ کا خط آیا تھا خیریت سے پہنچنے کی اطلاع بھیجی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اور راحیل۔" میرا دل دھڑک گیا تھا۔

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" اس بار ارم کے انداز میں رکھائی تھی۔

"اچھا میں چلتی ہوں' ماتا جی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔" میں اٹھ گئی۔

گھر آ کر میں نے تصویر اپنے کپڑوں کے ٹرنک میں سب سے نیچے چھپا دی' میرے لیے یہ کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں تھی اگر کوئی یہ تصویر مجھ سے ساری دنیا کی دولت کے بدلے بھی مانگتا تو نہ دیتی۔ یہ میرے محبوب کی تصویر تھی۔ میں دن میں کئی بار اسے نکال کر دیکھا کرتی تھی اور ایسا کرنے سے پہلے میں اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کرتی تھی۔ ماتا جی نے کئی بار پوچھا بھی کہ میں اس طرح دروازہ کیوں بند کر لیتی ہوں کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اسی وقت آ گئیں جب میں دروازہ بند کر کے راحیل کی تصویر نکال کر دیکھ رہی ہوتی تھی۔ ماتا جی کو میں کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا کرتی تھی اسکول کے بعد پتا جی نے کالج میں داخلہ دلانے سے انکار کرتے ہوئے مجھے گھر بٹھالیا تھا۔

"لڑکیوں کی تعلیم پر پیسا صرف کرنا اسے کنویں میں پھینکنے کے برابر ہے۔" پتا جی نے کہا تھا۔

دوسری طرف ارم کالج جانے لگی تھی اور اس کے ماں باپ کا ارادہ تھا کہ اس کی شادی سے پہلے اسے کم سے کم انٹر ضرور کرا دیں۔ دونوں طرف کی سوچ میں کتنا فرق تھا' اپنے گھر اور ماحول سے میری بے زاری بڑھنے لگی' ماتا جی اب میری شادی کی فکر میں تھیں اور میں کسی صورت شادی نہیں کرنا چاہتی تھی' عورت اپنا سب کچھ کسی ایک ہی کو دیتی ہے اور میں وہ راحیل کے نام کر چکی تھی۔ میں مر جاتی پر ایسا نہ ہونے دیتی۔ میں نے ماتا جی سے کہہ دیا۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔"

"تیرا دماغ خراب ہے۔" ماتا جی بھڑک

گئیں۔ ”کیوں نہیں کرے گی شادی۔“

”بس میرا دل نہیں مانتا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”میری بہنوں کو شادی سے کون سا سکھ ملا ہے جو میں بھی شادی کرلوں۔“

”یہ ہماری ریت ہے۔ لڑکیاں گھر میں بٹھانے کی چیز نہیں ہوتی ہیں۔“

”تو لڑکیاں کنویں میں دھکا دینے کے لیے ہوتی ہیں۔“ میں نے اسی انداز میں کہا۔

”تیری زبان بہت چلنے لگی ہے۔“ ماتا جی نے مجھے گھورا۔ ”مجھے تیرا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“

میرا دل ایک خوف کا شکار ہوگیا تھا‘ اگر سچ مچ کوئی رشتہ آگیا اور ماتا پا نے اسے قبول کرلیا تو کیا ہوگا‘ میں صرف راحیل کی تھی کیا ہوا جو وہ ارم کا منگیتر تھا‘ مسلمان تھا میرے ملک کا رہنے والا بھی نہیں تھا‘ حتیٰ کے میری محبت سے بھی بے خبر تھا لیکن میرا محبوب تھا۔

اسی دوران میں ایک دو رشتے آئے بھی‘ لیکن کچھ سے ماتا پتا مطمئن نہیں تھے اور کچھ کے مطالبات اتنے زیادہ تھے کہ ان کو پورا کرنا تاجی کے بس سے باہر تھا اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی اور میں نے بھگوان کا شکر ادا کیا‘ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا‘ ارم سے میری دوستی رہی مگر اس کی شدت پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ پہلے ہم ایک دن نہیں ملتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے سالوں سے نہیں ملے اور اب کئی کئی دن گزر جاتے تھے۔ ماتا جی کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا‘ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت بستر پر گزرنے لگا تھا۔ گھر کا سارا کام میرے ذمے ہوگیا تھا ان میں الجھ کر کئی کئی دن ارم کے پاس جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شاید ارم بھی میری مجبوری سمجھنے لگی تھی اسی لیے اب اس کی طرف سے اتنا اصرار نہیں ہوتا تھا۔ ایک سال بعد اس کی خالہ نے پھر چکر لگایا لیکن راحیل نہیں آیا تھا‘ اس کے امتحانات ہو رہے تھے اور وہ انجینئرنگ کے آخری سال کے امتحانات دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ابو کی فیکٹری میں ان کے ساتھ کام کرنے لگتا اور پھر وہ لوگ ارم کو بیاہ کر لے جاتے۔ ارم کی خالہ اس بار بھی اس کے لیے ڈھیر سارے تحفے لائی تھیں لیکن مجھے سب سے زیادہ رشک اس انگوٹھی پر آیا جو ارم کو راحیل نے بھیجی تھی ارم نے مجھے دکھائی تھی۔

”ارم تو بے حد خوش قسمت ہے۔ اس لیے نہیں کہ تجھے راحیل نے اتنی قیمتی انگوٹھی بھیجی ہے بلکہ اس لیے کہ اس کی ساری محبت صرف تیرے لیے مخصوص ہے۔“

”ہاں میں خوش قسمت ہوں۔“ اس نے نازاں لہجے میں کہا تھا۔

ارم کی خالہ کو جلدی تھی‘ کیوں کہ انہیں اپنے شوہر کے ساتھ مسلمانوں کی مقدس زیارت ’حج‘ پر جانا تھا۔ اسی لیے انہوں نے چھ مہینے بعد کی تاریخ مقرر کردی‘ اگرچہ اس سے ارم کی تعلیم نامکمل رہ جاتی لیکن اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ارم پاکستان جاکر بھی پڑھ سکتی تھی‘ ارم بھی اس فیصلے سے خوش تھی اور شاید میں بھی کیوں کہ راحیل بھی آتا اور میں کم سے کم اسے دیکھ تو سکتی تھی‘ خالہ چلی گئیں اور پھر وقت آہستہ آہستہ گزر گیا‘ ارم کی بارات آئی اس کی شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ راحیل آیا میں نے اسے دیکھا اور ارم کی سب سے قریبی سہیلی ہونے کے بہانے جی بھر کر دیکھا‘ شادی والے دن وہ ایسا لگ رہا تھا کہ میں دل ہی دل میں اس کی نظر اتار رہی تھی۔ ساری رسومات میں پیش پیش رہی‘ اس کی انگلی پکڑی‘ دودھ پلائی میں حصہ لیا‘ اس کی قربت سے سرشار ہوتی رہی‘ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ہوا میں اڑ رہی ہوں اور اس وقت میں زمین پر آگری جب وہ ارم کو لے کر چلا گیا‘ کتنا جان لیوا احساس تھا۔ آج میرا محبوب جسے میں نے اپنا جانا تھا اور خود کو اس کی امانت سمجھا تھا کسی اور کے پہلو میں تھا۔ میں

گھر آکر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی‘ ماتا جی سمجھ رہی تھیں کہ مجھے اپنی سہیلی کے جانے کا غم ہے‘ حالانکہ مجھے اپنے محبوب کے پرائے ہوجانے کا دکھ تھا۔

پھر راحیل اور ارم پاکستان چلے گئے‘ مرزا چچا اور ان کے گھر والوں سے زیادہ میں افسردہ تھی‘ جب آخری بار ارم کے گلے لگی تھی اتنا روئی کہ بے ہوش ہی ہوگئی۔ اس کے جسم سے مجھے راحیل کی خوشبو آرہی تھی‘ ان لوگوں کے جانے کے بعد میرے اندر سناٹا چھا گیا تھا۔ کتنے ہی دن پاگل سی رہی راتوں کو بستر پر کروٹیں بدلتی رہی پھر پاکستان سے ارم کا خط آیا میرے لیے اس نے مجھے اپنے بارے میں لکھا تھا‘ راحیل کے سنگ وہ بے حد خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ راحیل کے ساتھ بھلا کوئی لڑکی ناخوش ہوسکتی تھی ارم نے اشاروں میں اپنی طبیعت میں گڑبڑ کا کہا تھا لیکن ابھی واضح نہیں تھا‘ راحیل کا خط میں جہاں جہاں نام آیا تھا میں وہاں اپنے ہونٹ رکھتی چلی گئی پھر میرے آنسوؤں نے الفاظ کو دھندلا دیا۔

ان ہی دنوں میرے چچا جی اور سریتا گھر آئے تھے مجھے اداس اور بے قرار دیکھا تو انہوں نے ماتا جی سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے‘ کچھ دن ان کے ساتھ رہوں گی تو میری طبیعت بحال ہوجائے گی‘ ماتا جی نے اجازت دے دی اور میں سریتا اور اس کے شوہر کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ وہ لوگ پنجاب میں امرتسر کے پاس کہیں رہا کرتے تھے‘ ٹرین کا لمبا سفر کرکے ہم امرتسر پہنچے پھر وہاں سے ایک ٹیکسی کے ذریعے سریتا کے گھر پہنچے‘ یہ دیہاتی طرز کی حویلی تھی بڑی سی اور سامان سے بھری۔

یہ چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں چند ہی مکان تھے‘ سریتا کا پتی سندر لال زمیندار تھا۔ دروپے پیسے کی فراوانی تھی‘ سریتا اس لحاظ سے خوش قسمت تھی‘ اچھے سے اچھا کھاتی تھی‘ بہترین کپڑے اور زیور پہنا کرتی تھی اس کے گھر میں صرف اس کی ساس تھی‘ ایک نند تھی جو بیاہ کر جا چکی تھی‘ ایک دیور تھا جو شہر میں پڑھ رہا تھا۔ سسر مر چکے تھے اس لیے سریتا صحیح معنوں میں اپنے گھر کی مالک تھی۔

”سریتا تیرا گھر تو بہت دور ہے۔“ میں نے شام کو بہن سے کہا‘ نہا دھو کر آرام کیا تو تھکن اتر گئی تھی۔

”ہاں کان پور سے بہت دور ہے لیکن وہ تیری عزیز سہیلی ہے نا‘ اس سے بہت پاس ہے۔“

”عزیز سہیلی۔ میں سمجھی نہیں۔“

”ارے وہی ارم لاہور میں ہے نا‘ ہم ادھر سرحد سے صرف چار میل دور ہیں اور لاہور سرحد سے تین میل دور ہیں اگر کوئی صبح پیدل چلنا شروع کرے تو شام کو لاہور پہنچ جائے گا۔“

”سچ۔“ میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ ”ہم لاہور سے اتنے نزدیک ہیں۔“

سریتا نے سر ہلایا۔ ”درمیان میں سرحد کی مجبوری ہے ورنہ سندر مجھے دو گھنٹے میں جیپ پر لے جاکر ارم سے ملوا دیتے۔“

میں سوچنے لگی میں راحیل سے اتنی نزدیک ہوں کان پور یہاں سے ہزاروں میل دور تھا اور یہ جگہ صرف چند میل‘ سریتا کہہ رہی تھی اگر میں پیدل چلنا شروع کرتی تو شام کو راحیل کے پاس جا پہنچتی۔ اگلے دو دن تک میں یہی بات سوچتی رہی تھی میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں سریتا اور سندر سے کرید کرید کر اس بارے میں سوال کرتی تھی لاہور کس طرف ہے۔ کتنی دور ہے۔ لاہور کس سمت میں پڑتا ہے۔ پاکستان میں کیا بھارتی روپے چلتے ہیں‘ وہاں سفر کیسے کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ سریتا کے گاؤں سے چند میل دور مغرب کی طرف پاکستان اور بھارت کی سرحد آجاتی ہے اس جگہ دونوں طرف کے سرحدی محافظ ہوتے ہیں لیکن ان کی نظر بچا کر سرحد عبور کی جاسکتی ہے۔ سندر کے پاس پاکستان کا ایک

نقشہ تھا جو کسی اسمگلر نے اسے دیا تھا۔ اس میں لاہور کے آس پاس کے سرحدی علاقوں کی نشاندہی کی گئی تھی اس میں ایک سڑک سرحد سے لاہور تک جاتی تھی۔ اس پر بسیں بھی چلتی تھیں جو لاہور جاتی تھیں۔

کانن پور سے آتے ہوئے میں کچھ روپے ساتھ لائی تھی۔ میں نے سندر سے کہا کہ وہ مجھے اس کے بدلے پاکستانی کرنسی لادے' کیوں کہ مجھے پاکستانی کرنسی کا شوق ہے مگر سندر کے پاس پہلے ہی کچھ پاکستانی روپے پڑے تھے' اس نے وہ مجھے دے دیے یہ سات سو روپے تھے جس وقت میں نے روپے تھامے تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں دراصل پاکستان جانا چاہتی ہوں' لاہور جانا چاہتی ہوں' راحیل کے پاس جانا چاہتی ہوں' جس کے گھر کا پتا بھی مجھے نہیں معلوم اس وقت مجھ پر ایسا جنون طاری تھا کہ مجھے راحیل تک جانا اور اسے تلاش کر لینا بے حد آسان لگ رہا تھا' پھر ایک تاریک اور سرد رات میں سرینا کے کپڑے کچھ اہم چیزیں اور پاکستانی روپے لے کر سندر کی حویلی سے نکل کھڑی ہوئی' میں رات میں سرحد عبور کر لیتی تو اگلی صبح میں لاہور جا سکتی تھی' یہ سوچے بغیر کہ محض اٹھارہ سال کی عمر میں ایک ناتجربے کار لڑکی یہ کام کیسے کرے گی' جسے مرد بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں رات دو بجے نکلی تھی۔ اس وقت حویلی کیا سارا گاؤں ہی سو رہا تھا' مجھے معلوم تھا کہ سرینا اور سندر کو میری گمشدگی کا صبح چھ بجے سے پہلے پتا نہیں چلے گا' کیوں کہ وہ لوگ اسی وقت ہی بیدار ہوتے تھے اور میں اس وقت تک سرحد عبور کر جاتی' میں حویلی سے نکل کر سرحد کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگی۔ چاند کی پہلی تاریخ تھی اسی لیے صرف تاروں کی روشنی تھی۔ میں اسی ہلکی سے روشنی میں ڈرے سہمے قدموں سے جا رہی تھی۔ کہیں کہیں کتوں یا گیدڑوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی' ان آوازوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا مجھے واپس جانے کا خیال آتا مگر پر راحیل کا خیال مجھے آگے کھینچنے لگتا' حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں راحیل کے پاس پہنچ بھی گئی تو وہ مجھے قبول کرے گا یا نہیں۔

میں چلتی رہی' کہیں کتے بھونکتے یا آہٹ ہوتی تو کسی جھاڑی یا درخت کے عقب میں دبک جایا کرتی تھی' اور جب مجھے اطمینان ہو جاتا کہ کوئی نہیں ہے تو میں آگے سفر شروع کر دیا کرتی تھی۔ خطرہ مول لیتے وقت مجھے اس بات کا احساس تھا کہ راستے میں مجھے سب سے زیادہ خطرہ انسانوں سے ہی ہو سکتا تھا۔ اگر میں ان دو پایہ درندوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو اپنی عزت آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھتی اور ممکن ہے جان سے بھی' مجھے نہیں پتا کہ مجھے چلتے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی کیونکہ پاس گھڑی نہیں تھی پھر کھیت اور جنگل ختم ہو گئے اور جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ راستہ ان کے بیچ چلا جا رہا اور پتا نہیں کہاں جا رہا تھا کیونکہ میں اندازے سے ہی سفر کر رہی تھی۔

ایک جگہ پہنچ کر جھاڑیاں چھدری ہونے لگیں اور آگے ریتیلا میدان آنے لگا شاید سرحد قریب تھی کیوں کہ سندر نے مجھے یہی بتایا تھا' سرحد کے پاس بارڈر سیکورٹی فورس نے خود جنگل اور جھاڑیاں صاف کر دی ہیں تا کہ کوئی ان میں چھپ کر سرحد عبور نہ کر سکے' مجھے نہیں معلوم تھا کہ سرحد کہاں ہے۔ میں اندازے سے ایک طرف بڑھتی رہی' یہاں دور تک کوئی نہیں تھا۔ اچانک ایک طرف سے روشنی آنے لگی میں جلدی سے ایک بڑے سے پتھر کی آر میں ہو گئی' میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا' تھوڑی دیر بعد کسی انجن کی آواز آئی اور چاروں طرف تیز روشنی لہرانے لگی۔ میں نے جھانک کر دیکھا ایک جیپ آ رہی تھی اس پر بڑی سی روشنی لگی تھی جسے وہ چاروں طرف گھما رہے تھے' جیپ میں پتا نہیں کتنے افراد تھے یہ بی ایس ایف والے تھے جیپ تھر سے کچھ دور آ کے

آ کر رک گئی۔ میں نے ایک آواز سنی۔

''اس طرف تو کوئی نہیں ہے۔''

''اس حرامی شنکر کو بھی نائٹ ویژن سے پتا نہیں کیا کیا نظر آتا ہے' کتے بلی بھی اسے آئی ایس آئی کے جاسوس لگتے ہیں۔''

''چلو۔'' کسی نے کہا اور جیپ آگے بڑھ گئی' میں اس وقت تک پتھر کی آڑ میں دبکی رہی' جب تک جیپ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ میں پڑھی لکھی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ نائٹ ویژن رات میں دیکھنے والی دوربین کو کہتے ہیں۔ بہر حال جیپ کی آمد سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ میں سرحد پر ہی تھی اور اس سے آگے پاکستان تھا۔ اس بار میں نے تیزی سے اور جھک کر چلنا شروع کر دیا اس سے پہلے کہ پھر کوئی آتا میں سرحد عبور کر لینا چاہتی تھی۔ ایک گھنٹے تک مسلسل چلنے کے بعد ایک بار پھر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے لگا کہ میں نے سرحد عبور کر لی ہے۔ اب میں پاکستان میں تھی اور یہاں سے لاہور کچھ ہی دور تھا جہاں راحیل رہتا تھا میرا محبوب۔ اس احساس نے ہی مجھے سرشار کر دیا تھا۔

میں کھیتوں سے بچ کر گزرنے لگی' مجھے معلوم تھا کھیتوں میں رکھوالی کے لیے کیتے ہوتے ہیں جو اجنبیوں پر بھونکتے ہیں اس سے لوگ آ جاتے' جب کہ میں کسی کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی کھیتوں سے ہٹ کر ایک کچا راستہ تھا جس پر گاڑیاں بھی چلتی تھیں جو آگے کی طرف جا رہا تھا۔ اس راستے پر مجھے سامنے سے کوئی آتا نظر آیا میں جلدی سے جھاڑیوں میں ہو گئی آنے والے اصل میں دو تھے ان میں سے ایک نے لالٹین اٹھا رکھی تھی اور وہ آپس میں باتیں کرتے آ رہے تھے۔

''یار آج چوہدری شہاب کے ہاں رات کا کھانا کھایا' سواد آ گیا یار شاہو..... بکرا مسلم تھا۔''

اور وہ باتیں کرتے میرے پاس سے گزر گئے' میرا ذہن لفظ چوہدری شہاب میں اٹکا تھا مجھے معلوم تھا کہ شہاب مسلمانوں کا نام ہے اور بھارت کے پنجاب میں اب مسلمان بالکل نہیں پائے جاتے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سرحد عبور کر کے پاکستان کے پنجاب میں آ گئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسی پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا' یہ سوچے بغیر کہ وہ سرحد جسے اسمگلرز کتنے جتن کر کے عبور کرتے تھے' اسے میں نے کتنی آسانی سے عبور کر لیا تھا۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی مسلسل چلنے سے میرا تھکن سے برا حال ہو گیا تھا اور اب بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں چلتے ہوئے رات کی بچی ہوئی روٹی' گڑ اور مکھن کے ٹکڑے تھے' ذرا روشنی ہوئی تو میں نے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا مگر مسئلہ پانی کا تھا میرا پیاس سے برا حال تھا اور راستے میں مجھے کہیں پانی بھی نہیں ملا تھا ایک دو جگہ کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالیاں نظر آئی تھیں لیکن وہ بھی اس وقت خشک پڑی تھیں۔ اب سورج نکلنے ہی والا تھا۔ مارے نیند کے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ ابھی مجھے بہت آگے کا سفر کرنا ہے۔ مجھے راحیل تک جانا ہے مارے تھکن کے اب میری نظریں دھندلانے لگی تھیں قدم گھسٹنے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے پھر مجھے ایک عمارت نظر آئی درختوں میں گھری ہوئی اس کی سرخ چھت نظر آ رہی تھی' میں آگے بڑھتی رہی درختوں کو پار کر کے میں ایک باڑھ کی طرف آئی اس کے دوسری طرف سے کسی عورت کی غصے سے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور کچھ بچے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ باڑھ کے ساتھ چلتی میں ایک لکڑی کے بنے پھاٹک تک آئی' پھاٹک کھلا تھا' میں اندر چلی آئی سامنے گھاس کے لان پر ایک عورت بچوں کو ڈانٹ کر ناشتے کی میز پر آنے کے لیے کہہ رہی تھی میری نظریں ایک دم تیزی سے دھندلانے لگی اور میں زمین پر گرنے لگی اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف

ستھرے سے بستر پر لیٹی تھی' میرا ڈہن اب بھی ہلکا سا چکرا رہا تھا اور گلا خشک ہو رہا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے پانی نکلا۔ کسی مہربان ہاتھ نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور میرے لبوں سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا پیالہ لگا دیا میں بے تابی سے پانی پینے لگی۔ پانی پیتے ہی میں جیسے پھر سے ہوش میں آ گئی تھی' میں نے دیکھا ایک خوب صورت سی عورت نے مجھے سہارا دے رکھا ہے میں نرم سے بستر پر لیٹی تھی اور میرے جسم پر سر بتا کا ہی ایک اور لباس تھا کمرا خوب صورت تھا لیکن کچھ عجیب سا بھی تھا۔

''کیا تم میری آواز سن رہی ہوں۔'' عورت نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''جی۔'' میں نے کسمسا کر کہا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔''

''جی شیلا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم یہاں تک کیسے آ گئیں۔''

''پتا نہیں بس چلتے چلتے آ گئی۔'' میں نے جواب دیا پھر اس سے پوچھا۔ ''لاہور یہاں سے کتنا دور ہے۔''

''تمہیں لاہور جانا ہے۔'' عورت نے مجھے غور سے دیکھا۔

''ہاں مجھے لاہور ہی تو جانا ہے۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے راحیل کا تصور کیا۔

''لاہور میں کہاں جانا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''راحیل کے پاس۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''یہ راحیل کون ہے۔''

عورت کا سوال سن کر میں جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا' اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا کہ راحیل کون تھا اور میرا کون تھا' میرے سر میں درد کی تیز لہر سی اٹھی تھی' میں نے سر تھام لیا۔

''کیا ہوا..... کیا درد ہو رہا ہے۔'' عورت نے تیزی سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے دودھ کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

''پہلے یہ دودھ پی لو پھر سو جانا۔''

میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا' میں چاہتی تھی کہ وہ عورت مجھے یہاں پر اکیلا چھوڑ دے میں اس کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی' گلاس لے کر وہ کمرے سے چلی گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں آنے آنکھ کھول کر دیکھا میں نہ جانے کہاں تھی اور یہ عورت کون تھی۔ اپنے رویے سے وہ اچھی اور مہربان ہی لگ رہی تھی لیکن مجھے اس عورت سے کیا میں تو راحیل کے پاس جانا چاہتی تھی' راحیل کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب رات کی تھکن مجھ پر غالب آ گئی۔ میری آنکھیں خود بہ خود بند ہوتی چلی گئیں۔

جب میری آنکھ کھلی تو روشنی ڈھل رہی تھی۔ پردے ہٹے ہوئے تھے اور ڈوبتے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں میں نے اٹھ کر دیکھا میرا سارا سامان بستر کے پاس میز پر رکھا تھا میں نے اسے کھول کر دیکھا اندر سب کچھ تھا میں نے اپنے پاس ایسی کوئی شے نہیں رکھی تھی جس سے معلوم ہو کہ میں بھارت سے تعلق رکھتی ہوں' مجھے معلوم تھا کہ اگر میں پاکستان میں پکڑی گئی اور میرے پاس سے بھارت کی کوئی شے نکل آئی تو مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مجھے جیل بھیج دیا جائے گا اور پھر میں راحیل سے نہیں مل سکوں گی اس لیے میں اس معاملے میں بے حد محتاط تھی۔

کچھ دیر بعد وہی عورت اندر آئی' مجھے جاگتے پا کر اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اتنا ٹوٹ کر سوئی ہو لگتا ہے بہت دن سے سونے کو نہیں ملا تھا۔ ارے میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میرا نام شگفتہ خیام ہے' میرے شوہر خیام ریاض فارسٹ آفیسر ہیں ہم یہاں پر ویک اینڈ گزارنے آتے ہیں۔''

''یہ کون سی جگہ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''لاہور یہاں سے کتنا دور ہے۔''

''یہ قصور کے پاس ایک جگہ ہے یہ محکمہ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس ہے۔''

''آپ کے بچے بھی ہیں۔'' میں نے باہر سے آتی بچوں کی آواز سن کر پوچھا۔

''ہاں..... اور بہت شرارتی ہیں تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔''

''آپ کے شوہر۔''

''وہ ذرا کام سے گئے ہیں' خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ بھوک لگ رہی ہے۔''

بھوک واقعی شدت سے لگ رہی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو تم بسکٹ لے لو' کھانا بننے میں ذرا دیر ہے۔''

اس نے مجھے بسکٹ کا ڈبا دیا' شروع میں ذرا جھجکی لیکن پھر میں نے ڈبا صاف کر دیا اس نے مجھ سے کہا۔

''اٹھو..... منہ ہاتھ دھو لو اور باہر آؤ۔''

''وہ جی کسی کو میرے بارے میں پتا نہیں ہے نا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں..... اس ریسٹ ہاؤس میں صرف دو ملازم ہیں چوکیدار اور اس کی بیوی جو باورچن ہے ان کو تمہارے بارے میں' میں نے یہی بتایا ہے کہ تم میری خادمہ ہو' برا نہیں منانا میں نے صرف چھپانے کے لیے کہا ہے۔''

''مجھے برا نہیں لگا۔'' میں نے آہستہ سے کہا تھا۔

اس نے مجھے غسل کا نہ دکھایا' میں نے منہ ہاتھ دھویا اور اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ لان پر اس کے تین بچے کھیل رہے تھے ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں تھیں ان کی عمریں دس سے بارہ سال کے درمیان تھیں۔ وہ شگفتہ کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آئے۔

''امی یہ کون ہے۔''

''یہ شیلا ہیں۔ یہ بھی لاہور جائیں گی۔'' اس نے بچوں کو بتایا بچوں نے مجھے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی' میں نے بے بسی سے ان کی اماں کی طرف دیکھا اس نے ڈانٹ کر بچوں سے کہا۔

''آپ لوگ جا کر کھیلیں۔''

بچے دوبارہ درختوں کی طرف جا کر کھیلنے لگے۔ ہم لان میں رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے' وہاں میز پر چائے رکھی تھی۔ شگفتہ خیام نے دو کپ چائے بنائی' ایک مجھے تھما دی۔

''شیلا کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے تمہارا دل اندر سے دکھا ہوا ہے۔'' اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر آنسوؤں اور سسکیوں ے درمیان میں نے اپنی ساری کہانی سچ سچ سنا دی۔ جب میں خاموش ہوئی تو وہ حیران سی مجھے دیکھے جا رہی تھی' خاصی دیر بعد اس نے کہا تھا۔

''کیا واقعی تم اتنی دور سے آئی ہو۔''

''ہاں کل رات تک میں اپنی بہن سریتا اور جیجا جی سندر لال کے گھر تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم نے سرحد عبور کر لی کسی نے تمہیں روکا نہیں!'' اس نے ناقابل یقین نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہاں مجھے کسی نے نہیں روکا۔''

اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا لیکن اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گی۔''

''نہیں..... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے میں کیا کروں۔ تم نے بہت احمقانہ کام کیا ہے' ایک محبت کے پیچھے اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔ اگر کہیں سرحد پر گرفتار کر لیا جاتا تو تمہیں جاسوس قرار دیا جاتا اور پھر تمہیں ہمیشہ کے لیے جیل بھیج دیا جاتا یا سزا

موت سنا دی جاتی۔"

"نہیں۔" میں لرز گئی تھی۔ "آپ مجھے پولیس کے حوالے مت کیجیے گا۔" میں رونے لگی تھی۔

"ارے چپ کر جاؤ میں اتنی ظالم نہیں ہوں کہ تمہیں پولیس کے حوالے کردوں۔" اس نے مجھے گلے لگا لیا اور تسلیاں دینے لگی۔

"وہ آپ کے پتی جو ہیں کہیں وہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کردیں۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"ان کی تم فکر نہ کرو میں ان سے جو کہوں گی وہ ویسے ہی کریں گے۔" اس نے مجھے تسلی دی۔

تاریکی ہونے کے بعد سردی بڑھنے پر ہم اور بچے اندر آ گئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے دو اچھے کمرے ان کے پاس تھے انہوں نے مجھے بچوں والے کمرے میں جگہ دے دی چوکیدار سے کہہ کر ایک بستر اور لگوا دیا تھا' رات کا کھانا میں نے اندر آتے ہی کھا لیا تھا۔ شگفتہ جنہیں میں اب دیدی کہہ رہی تھی ان کے پتی ابھی تک نہیں آئے تھے رات کے کھانے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا' دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میں انہیں اپنے بارے میں بتاتی رہی۔

"راحیل کیسا شخص ہے۔" انہوں نے درمیان میں پوچھا۔

"بہت اچھا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"لیکن تم نے تو بتایا کہ تم نے اس سے چند بار ہی بات کی' اتنی جلدی تمہیں اس کے اچھا ہونے کا کیسے پتا چلا۔"

"بس پتا چل گیا۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "ایسی باتیں انسان محسوس کر لیتا ہے۔"

دیدی نے گہری سانس لی۔ "تم پاگل لڑکی ہو نہ جانے کیا سوچ کر تم نے یہ محبت کی تھی۔"

"محبت تو ہو جاتی ہے۔"

"ہاں لیکن اس میں اتنا پاگل کوئی کوئی ہوتا ہے تم کیا سوچ کر پاکستان آئی ہو۔ راحیل ارم کا شوہر ہے کیا وہ تمہیں اور تمہاری محبت کو قبول کرے گا اور اگر وہ کرنا بھی چاہے گا تو اس کی بیوی اس کے گھر والے اسے کرنے دیں گے۔"

"یہ..... سب مجھے نہیں پتا۔" میں منہ ہاتھوں میں چھپا کر رو دی تھی۔

"اچھا دوست..... انہیں آنے دو' میں ان سے بات کروں گی کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا' اب چپ کرو پاگل لڑکی۔" انہوں نی مجھے بچوں والے کمرے میں بھیج دیا وہ اپنے بچوں کو ٹھیک نو بجے سلا دیا کرتی تھیں' رات کسی وقت دیدی کے شوہر آئے مجھے نہیں معلوم کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی لیکن صبح سب لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر میں نے پہلی بار خیام بھائی کو دیکھا وہ ذرا سفید بالوں والے لیکن بہت باوقار سے انسان تھے۔ انہوں نے سرسری سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ آداب کا جواب دیا اور ناشتا کرتے ہوئے دیدی سے باتوں میں لگ گئے' ناشتے کے بعد سامان ان کی سرکاری جیپ میں سوار کیا گیا اور ہم لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہم لاہور جا رہے تھے جہاں راحیل رہتا تھا۔ ہواؤں میں اس کی خوشبو تھی' میں بے چینی سے لاہور آنے کا انتظار کر رہی تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد دیدی کی بڑی بیٹی سارہ سے پوچھا کرتی۔

"لاہور کب آئے گا۔"

"بس ایک گھنٹے میں پھر آدھے گھنٹے میں۔"

اور پھر لاہور آ گیا۔ دیدی ایک خوب صورت سے علاقے میں خوب صورت سے مکان میں رہتی تھیں' ان کے گھر میں ان کی ساس بھی تھیں لیکن وہ سننے سے معذور تھیں' دیدی کا میکا کراچی میں تھا جب سامان اتار کر اندر لے جایا جا رہا تھا تو دیدی نے مجھے ایک کمرا دکھایا یہ بچوں کے کمرے کے برابر میں تھا۔ "تم یہاں رہو گی۔"

کمرا بہت خوب صورت تھا' صاف ستھرا۔

"اچھا ہے۔" میں بے خیالی میں بولی میں اس کمرے میں رہنے کے لیے نہیں آئی تھی مجھے تو راحیل کے پاس جانا تھا۔

"فکر نہ کرو۔" دیدی نے میرے تاثرات بھانپ لیے تھے۔ "راحیل بھی مل جائے گا۔"

"مگر کیسے۔ لاہور تو اتنا بڑا شہر ہے۔" میں نے راستے میں لاہور کی وسعتیں دیکھی تھیں۔

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" دیدی نے کہا تھا۔

پھر میں دیدی کے ساتھ رہنے لگی۔ انہوں نے راحیل کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ملا شاید وہ اب لاہور میں تھا ہی نہیں۔ خیام بھائی نے بھی کوشش کی' اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا' راحیل پتا نہیں کہاں تھا۔ مجھے یہی واحد ایک تکلیف تھی' ورنہ دیدی اور خیام بھائی میرا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ انہیں کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں ایک غیر قوم کی ہی نہیں بلکہ غیر مذہب لڑکی بھی ہوں جو سرحد پار کرنے کی مجرم بھی ہے اور جسے اپنے ساتھ رکھ کر وہ خطرہ مول لے رہے تھے' ویسے انہوں نے سب کو یہی بتایا تھا کہ میں خیام بھائی کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو باپ کی موت کے بعد بے سہارا ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔

دیدی کی یہ رہائش بڑی اچھی جگہ پر تھی' چاروں طرف خوب صورت بنگلے بنے تھے۔ علاقہ نیا آباد ہوا تھا مگر اس میں ہر سہولت تھی دیدی کو جب گھر کے سامان کی کوئی چیز لینا ہوتی تھی تو خود کار میں پاس ہی واقع مارکیٹ چلی جایا کرتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ میں بھی چلوں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا' دیدی نے لے جا کر مجھے ڈھیر ساری چیزیں دلائیں' کپڑے' جوتے چپلیں اور استعمال کی دوسری چیزیں۔ جب ہم سامان لے کر باہر آ رہے تھے تو میری نظر سڑک کے پار دوسری طرف والی سڑک پر کار میں بیٹھے راحیل پر پڑی۔

"راحیل۔" میں بے اختیار چیخی میرے ہاتھ سے ڈبے چھوٹ گئے' میں نے اندھا دھند سڑک پر جانے کی کوشش کی۔ اگر دیدی نہ پکڑ لیتیں تو شاید میں کسی گاڑی کے نیچے ہی آ جاتی۔ انہوں نے مجھے جھنجھوڑا۔

"پاگل ہوئی ہو۔ ابھی مر جاتیں۔"

"مجھے جانے دیں وہ دیکھیں راحیل۔" میں نے اشارہ کیا۔ لیکن راحیل کار میں بیٹھ چکا تھا اور کار حرکت میں آ گئی تھی۔

"کہاں۔" دیدی نے اس طرف دیکھا۔

"وہ دیکھیں..... سرمئی رنگ کی کار۔"

دیدی نے کار کی طرف دیکھا لیکن ٹریفک اتنی زیادہ تھی کہ وہ صحیح سے دیکھ ہی نہیں سکیں' میں نے ان سے کہا کہ اپنی کار سے اس طرف چلیں۔ دیدی نے ایسا ہی کیا لیکن جب ہم گھوم کر اس سڑک پر آئے' سرمئی کار نہ جانے کہاں چلی گئی تھی' دیدی اس روڈ پر خاصی دور تک کار بھگاتی رہیں لیکن راحیل اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گیا تھا۔ مجھے روتے دیکھ کر دیدی نے تسلی دی۔ "پاگل روتی کیوں ہو یہ تو اچھی بات ہے کم سے کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ راحیل لاہور میں ہی ہے۔"

"میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں نا۔"

"اب تم نے احمقانہ باتیں شروع کر دیں۔" انہوں نے ڈانٹا۔ "ویسے تمہیں یقین ہے وہ راحیل ہی تھا۔"

"اتنا یقین جتنا خدا کے ہونے کا' وہ راحیل تھا۔"

"افسوس کے میں کار نہیں دیکھ سکی ورنہ اس کی ساخت سے کچھ پتا چل جاتا یا نمبر نوٹ کر لیتی۔"

اس واقعہ کے بعد کئی دن تک میں افسردہ

رہی تھی مجھے راحیل مل کر کھو گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ دیدی اور بچوں نے مجھے بہلا لیا، خیام بھائی زیادہ تر دورے پر رہا کرتے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ یہ لوگ انسان نہیں فرشتے ہیں انہوں نے بنا کسی لالچ کے مجھے پنا دی' پیار دیا' توجہ دی چاہتے تو مجھے نوکرانی بنا کر رکھ لیتے لیکن میں کوئی کام کرنے کی کوشش بھی کرتی تو دیدی ڈانٹ دیا کرتی تھیں' ان لوگوں نے راحیل کے نہ ملنے کے دکھ کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ اس دوران میں' میں اپنی زبان صحیح کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ اردو کے الفاظ بولتی تھی میں کوشش کرتی کہ میرے منہ سے ہندی کے الفاظ کم سے کم نکلیں' اب میں بھگوان کے بجائے اللہ کہا کرتی تھی' باہر سے لوگ آتے تو میں ان کے سامنے کم جاتی اور اگر جانا پڑتا بھی تھا تو کم سے کم بولنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایک روز میں لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ مغرب کی اذان ہوئی میں نے بے اختیار سر پر دوپٹا لیتے ہوئے ٹی وی بند کر دیا، پھر مجھے تعجب ہوا میں بالکل مسلمان عورتوں کی طرح کرنے لگی تھی۔ یہ بات میرے ذہن سے جیسے محو ہوتی جا رہی تھی پھر میں نے سوچا میں راحیل کی محبت میں اپنا گھر' اپنا خاندان اور اپنا ملک چھوڑ آئی تھی تو کیا میں اس کے دین کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ جب کہ اس کا دین مجھے شروع سے اچھا لگتا تھا۔ اذان ختم ہونے تک میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں اسلام قبول کر لوں گی' اسی لمحے دیدی لاؤنج میں آئیں انہوں نے کہا۔

''آج تم نے بھی دوپٹا لیا ہے کتنی پیاری لگ رہی ہو اللہ نظر بد سے بچائے۔''

میں شرما گئی پھر میں نے دیدی سے کہا۔

''دیدی مجھے آپ کا مذہب اچھا لگتا ہے میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔''

''سچ۔'' دیدی خوش ہو گئی تھیں۔ ''تم اپنی خوشی سے مسلمان ہونا چاہتی ہو۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میں اپنی خوشی سے ہونا چاہتی ہوں ویسے بھی اس معاملے میں کسی نے مجھ سے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔''

''کیوں کہ اسلام میں زور زبردستی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہر مذہب قبول کرنے والا دل سے قبول کرتا ہے میں تمہارے بھائی کو بتاؤں گی تو وہ بھی خوش ہوں گے۔''

رات جب خیام بھائی آئے اور دیدی نے انہیں بتایا تو وہ خوش ہوئے تھے مگر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''بہتر ہو گا تم ایک دن اور سوچ لو۔''

''میں نے سوچ لیا ہے خیام بھائی۔'' میں نے اصرار کیا۔ ''بس اب میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔''

کیوں کہ معاملہ رازداری کا تھا اس لیے خیام بھائی اور دیدی مجھے کسی عالم دین کے پاس لے گئے اور انہیں مختصراً میرے حالات بتا کے انہوں نے مجھ سے چند سوال کیے اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد مجھے کلمہ پڑھایا پھر سکھایا اور میرا نام شیلا سے بدل کر فاطمہ رکھ دیا' انہوں نے مجھے بہت ساری دعائیں بھی دی تھیں' اسلام قبول کر کے میرے اندر ایک سکون سا اتر گیا تھا' اگلے روز سے دیدی نے میری اسلامی تعلیم کا بندوبست کیا بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک عالم خاتون آیا کرتی تھیں وہ انہیں قرآن پاک بھی پڑھاتی تھیں اور درس بھی دیا کرتی تھیں میں بھی ان سے پڑھنے لگی، ابتدائی قاعدہ ختم کر کے میں جلد قرآن کریم پڑھنے لگی تھی' ان خاتون نے مجھے سب سے پہلے نماز اور کچھ دعائیں سکھائیں۔ میں بچوں کو پڑھانے والے ٹیوٹر سے پہلے ہی اردو پڑھ رہی تھی اسی لیے مجھے پڑھنے میں خاص دشواری نہیں ہوئی تھی۔

میں خیام بھائی اور دیدی کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئی تھی مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے گھر کی اور ماتا پتا کی یاد آتی

تھی لیکن اتنی نہیں کہ میں اداس ہو جاتی۔ دیدی کی لاہور میں بہت جان پہچان تھی آئے دن انہیں کسی نہ کسی تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا اور وہ مجھے بھی لے جاتی تھیں پہلے میں نے انکار کیا لیکن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ممکن ہے اس طرح کسی تقریب میں میرا سامنا راحیل' ارم یا اس کی ساس سے ہو جائے' میں انہیں پہچانتی تھی۔ اس لیے میں ان کے ساتھ جانے لگی' لوگ مجھے دیکھتے میرے بارے میں سوال کرتے بعض عورتیں جنہیں رشتوں کی تلاش ہوتی تھی خاص طور پر میرا پوچھتیں کہ میرا کہیں رشتہ تو نہیں ہوا ہے اور دیدی انہیں ٹال دیا کرتی تھیں۔

دیدی کا بنگلہ ایک ہی منزل پر مشتمل تھا پھر خیام بھائی نے اوپر مہمانوں کے لیے کمرے بنانے کا فیصلہ کیا مزدور آئے اور دو مہینے میں بنگلے کے اوپری حصے میں دو خوبصورت کمروں کا اضافہ ہو گیا تھا' ان کے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور دیدی نے وہاں روز گارڈن بنوایا' ہمارے عقب میں جو بنگلہ تھا اس کی دیوار خاصی بلند تھی اس لیے چھت پر آنے کے باوجود ہم بنگلے میں نہیں دیکھ سکتے تھے' دیدی کہتی تھیں کہ یہ ایک لحاظ سے اچھا ہے کہ دونوں گھروں میں پردہ رہتا ہے' ہم شام کی چائے وہاں ہی پیا کرتے تھے۔

پھر ایک دن ہم حسب معمول شام کی چائے اوپر چھت پر پی رہے تھے کہ برابر والے گھر سے گیند آ کر گری' بچے چھت پر کرکٹ کھیل رہے تھے کیوں کہ ان کے شور کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں' دیدی نے مجھ سے کہا۔ ''ان کی گیند دے دو۔''

میں انہیں کھیلتا ہوا دیکھنے لگی' کچھ دیر بعد سیڑھیوں کی طرف سے کوئی بڑا آتا نظر آیا تو میں اٹھنے لگی اسی لمحے میں نے اس کے بولنے کی آواز سنی۔ ''ہم بھی کھیلیں گے۔''

میں ٹھٹکی' مجھے شبہ ہوا کہ میرے کانوں نے ایک مانوس آواز سنی ہے' بے اختیار میں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی۔ بچوں سے کھیلنے کی فرمائش کرنے والا راحیل تھا' بلاشبہ وہی تھا' میرے کانوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا مجھے شبہ نہیں ہوا تھا مجھے یقین تھا بچے اس سے جھگڑ رہے تھے اور وہ ان سے کھیلنے پر اصرار کر رہا تھا اس نے اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔

''فاطمہ کیا بات ہے وہیں رہ گئیں کیا۔'' عقب سے دیدی نے پکارا۔

''دیدی ادھر آئیں۔'' میں ذرا پیچھے ہو گئی میرا جسم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ ''جلدی آئیں دیدی۔''

میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

''کیا ہوا فاطمہ۔''

''دیدی..... راحیل ہے نیچے۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''راحیل۔'' وہ چونکیں اور انہوں نے نیچے جھانکا راحیل کو دیکھا پھر مجھے دیکھا۔ ''تمہیں یقین ہے۔''

''دیدی یہ راحیل ہے میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔''

وہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہیں پھر اچانک بولیں۔ ''راحیل صاحب پلیز بچوں سے کہیں اتنا شور نہ کریں۔''

''جی میں بھی انہیں یہی کہہ رہا تھا۔'' راحیل کی آواز آئی۔ ''پر یہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ بائی دی وے آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔''

''یہ میں آپ کے گھر آ کر بتاؤں گی' کتنی حیرت کی بات ہے ہمارے مکانوں کی پشت سے پشت ملی ہے اور ہم لوگ آج تک ملے ہی نہیں۔''

''دراصل یہ گلی اتنی لمبی ہے کہ دوسری طرف آنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔'' اس کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہی انداز تھا میں نے دیدی کے شانے پر سے جھانک کر دیکھا' اسے نگاہوں میں جذب کرنے لگی' اس نے دیدی کو دعوت دی تھی۔

''آپ آئیں ناں۔''

''میں ضرور آؤں گی اور میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز بھی ہے بہ شرطیکہ آپ راحیل احمد ہی ہوں۔''

''جی میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں راحیل احمد ہوں۔''

مجھے مایوسی ہوئی تھی' گفتگو کے دوران میں اس نے کئی بار اچٹتی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا مگر اس کی نگاہوں میں ہلکی سی شناسائی بھی نہیں آئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ حالانکہ سادہ سی بات تھی اس کی محبت میں صرف میں دیوانی ہو رہی تھی اسے تو پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر سے ہزاروں میل دور رہنے والی ایک لڑکی نے اسے اپنے من مندر کا دیوتا بنالیا تھا۔

جب میں نیچے آئی تو اداس تھی' دیدی نے گلے سے لگالیا۔ ''پاگل اب تو خوش ہو جاؤ۔''

''میں خوش ہوں' پر دیدی اب کیا ہوگا۔'' میرا خدشہ زبان پر آ گیا۔

''کچھ نہیں بس جو بھی ہوگا خدا کی مرضی سے ہوگا۔''

''ہاں میں نے گہری سانس لی اور دل میں دعا کی۔ ''اے خدا اگر مجھے راحیل سے ملوایا ہے تو اسے میرا بھی بنادے۔''

''میں اور تمہارے بھائی بعد میں ان کے ہاں جائیں گے۔''

میں سوچ رہی تھی کہ جب ارم کو یہ معلوم ہوگا کہ میں یہاں کیوں آئی تھی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ میں اس کا سامنا کیسے کروں گی' دیدی مجھے برابر تسلی دے رہی تھیں کہ بہتر ہی ہوگا' یہ تو قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ راحیل ان کے مکان کے عقب میں ہی رہتا تھا۔ مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا اس کے باوجود آنے والے کل کا ڈر تھا پھر خیام بھائی اور دیدی ایک شام راحیل کے گھر گئے' میں امید و یاس کے درمیان میں ان کا انتظار کرتی رہی پھر جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ارم اور راحیل بھی تھے' ارم مجھے دیکھتے ہی لپٹ کر رو دی تھی۔

''شیلا تو کہاں چلی گئی تھی' میں کان پور بھی گئی تھی سب تیرے بارے میں پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔''

''اب میں فاطمہ ہوں' ماضی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''ارم میرے کمرے میں آئی تھی' کیا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے تڑپ کر کہا' نہیں تجھ سے ہی تو تعلق ہے اور شاید اسی تعلق کی وجہ سے میں یہاں موجود ہوں۔''

ارم چپ ہو گئی تھی شاید دیدی نے اسے سب بتا دیا تھا کہ میں کیسے یہاں موجود ہوں اور راحیل کے لیے دیوانی ہوں' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''شیلا..... فاطمہ مجھے یقین نہیں آتا۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا لیکن میں تمہارے سامنے ہوں۔''

''تم کان پور سے یہاں آ گئیں کیسے مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔''

ارم نے بتایا کہ جب دیدی اور خیام بھائی نے اسے میرے بارے میں بتایا تو اسے اور راحیل کو بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ مگر مجھ سے مل کر یقین آ رہا تھا۔ ارم پرانے وقت کی باتیں کرتی رہی اور میں راحیل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس کا کیا ردعمل ہوگا' میں نے ارم سے پوچھا۔

''کیا تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آ رہا۔ مجھ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے نا۔''

اس نے مجھے گلے لگالیا۔ ''سچی بات ہے میں عجیب سا محسوس کر رہی ہوں لیکن تجھ پر غصہ بالکل نہیں آ رہا اور نفرت تو میں تجھ سے کر ہی نہیں

سکی۔''

''اور راحیل..... وہ ضرور مجھے ایک بے وقوف لڑکی سمجھ رہے ہوں گے۔''

''نہیں..... لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں ہے ابھی ہمارے گھر میں کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔''

میں ارم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اب میرا کیا ہوگا' کیا راحیل مجھے قبول کریں گے کیا ارم کو یہ بات قبول ہوگی۔ کیا اس کے سسرال والے راضی ہوں گے' سوچتے سوچتے میرے سر میں درد سا ہوا اور پھر آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا' مجھے ہوش نہیں رہا تھا' جب ہوش آیا تو دیدی میرے ہاتھ سہلا رہی تھیں اور ارم منہ میں پانی ٹپکا رہی تھی' میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہی تھی۔ سامنے راحیل بھی کھڑا تھا اور میں اسے ایک ٹک دیکھنے لگی' جب میں نے اسے دیکھا تو اس نے آنکھیں چرالی تھیں۔ پھر میں نے آنکھیں بند کرلیں پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

اس کے بعد جو ہوا وہ میرے لیے کسی خواب سے کم نہیں تھا۔ دیدی نے میرے لیے کوشش کی۔ ارم بھی راضی تھی اور اس نے راحیل کو بھی راضی کرلیا' میں نہیں جانتی کہ کیسے کیا۔ اصل مسئلہ اس کے گھر والوں کو راضی کرنے کا تھا' ارم کی خالہ نے یہ سنتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا وہ کسی صورت راحیل کی مجھ سے شادی پر رضامند نہیں تھیں جواب ایک بیٹے کا باپ بھی تھا۔ مگر دیدی نے ہمت نہیں ہاری وہ بار بار راحیل کے گھر جاتیں ان کے ماں باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرتی تھیں' ارم اور راحیل بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

کئی مہینوں بعد جا کر برف پگھلی اور راحیل کی امی پہلی بار مجھ سے ملنے آئیں' میں ان سے ملتے ہوئے گھبرا رہی تھی مگر وہ نارمل انداز میں ملیں۔ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر انہوں نے اچانک پوچھا۔

''اگر تمہاری شادی راحیل سے نہ ہوئی تو۔''

میں اس جملے پر دنگ رہ گئی تھی خاصی دیر بعد میں نے مشکل سے کہا۔ ''تو پھر کسی سے بھی نہیں ہوگی۔''

''لڑکی یہ پاگل پن ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''مجھے ہر الزام قبول ہے۔''

پھر مجھے نہیں پتا وہ کیسے راضی ہوئیں۔ میری اور راحیل کی شادی طے کر دی گئی' پہلے نکاح ہوا۔ اس کے بعد مجھے ایک عدالت میں پیش کیا گیا جہاں میرا بیان لیا گیا۔ میں نے اقرار کیا کہ میں غلطی سے سرحد عبور کر کے آ گئی تھی۔ میں بھارتی شہری ہوں' مگر اب ایک پاکستانی کی بیوی ہوں اس لیے مجھے پاکستانی شہریت دی جائے' عارضی طور پر مجھے گرفتار کرلیا گیا لیکن اگلے روز ہی ایک مشہور وکیل نے میری درخواست ضمانت منظور کرا کے مجھے رہا کرالیا' خیام بھائی اور راحیل کے ابو نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا' دو مہینے بعد مجھے پاکستان کی شہریت دے دی گئی اور اس کے فوراً بعد میں رخصت ہو کر راحیل کی زندگی میں آ گئی۔

اس وقت ارم دوسرے بچے کی ماں بننے جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تو پہلے کی دیکھ بھال میں کر رہی تھی۔ راحیل کو بیٹی کی خواہش تھی جو میں نے ایک سال بعد پوری کر دی۔

آج میں اور ارم دونوں ہی خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بعض اوقات اب بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ میں واقعی راحیل کو پا چکی ہوں' مجھے لگتا ہے کسی روز میری آنکھ کھلے گی اور میں خود کو اپنے ماں باپ کے کان پور والے گھر میں پاؤں گی۔

خدا کرے اگر یہ خواب ہے تو ہمیشہ جاری رہے۔ آمین۔

ہمارے معاشرے کی عکاس.....ایک دلگداز..... سچی کہانی

شاباش مصباح

عائشہ اختر بٹ

اس نے ایف اے کا داخلہ پرائیویٹ بھیجا تھا۔ پھر امتحان کا زمانہ آیا۔ اس نے آنا بند کر دیا۔ میں نے صدق دل سے دعا مانگی' اس کا امتحانی مرکز زیادہ دور نہ بنے۔ کاش اس کے تمام پرچے اچھے ہو جائیں۔ وہ لڑکی جو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے درود شریف اور رب زدنی علما کا ورد کرتی تو اس کی تکلیف میں کمی ہو جاتی۔ ایک پرعزم دوشیزہ کے جہد مسلسل کی سچی روداد جس نے انہونی کو ہونی کر دکھایا۔

اس شمارے کے لیے ایک حساس وجذباتی ودل گداز سچی کہانی

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ میں نے نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرا' دروازہ ابھی تک بج رہا تھا۔ میں نے غصے سے چھوٹی بہن کو پکارا۔ ''فریدہ بہری ہو' دروازے پر دیکھو کون ہے۔''

طوعاً و کرہاً وہ اٹھی اور کچھ دیر کے بعد واپس آئی۔ ''آپا! کوئی نیلی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔''

''تو آنے دو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر سترہ اٹھارہ سال کی نیلے چہرے والی لڑکی میرے سامنے تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ''بڑی مشکل سے میں نے سیڑھیاں چڑھی ہیں۔ آپ دوسری منزل پر رہتی ہیں ناں۔''

فریدہ نے جلدی سے اس کے لیے کرسی بڑھا دی۔ ''بیٹھو۔''

''شکریہ! میرے لیے سیڑھیاں چڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' وہ کرسی پر بڑی مشکل سے بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اکڑ گئی تھی اور دایاں بازو جھول رہا تھا۔

ایک نہ معلوم اندیشے سے میرا دل کانپ گیا۔ کہیں جسمانی طور پر یہ معذور تو نہیں۔

''میرا نام مصباح ہے' میں معذور ضرور ہوں مگر آپ سے تعلیم کے سلسلے میں کچھ مدد چاہیے۔ میں میٹرک پاس ہوں اور ایف اے کی تیاری کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے نفسیات کا مضمون رکھا ہے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ آپ بی اے میں پڑھتی ہیں۔ مجھے ایف اے نفسیات کے نوٹس اور پریکٹیکل کی کاپی چاہیے۔''

''میں یہ چیزیں تمہیں دے دوں گی مگر یہ جاننا چاہتی ہوں تم معذور کیسے ہوئیں۔''

''باجی دو سال پہلے میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ رزلٹ کا انتظار تھا۔ میں ایک دوپہر کپڑے استری کر رہی تھی۔ اس دوران پتا نہیں کیسے اچانک شاید استری کی تار کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میرا ہاتھ وہاں لگ گیا۔ لمحے بھر میں میرے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی..... اگر میں چیخی رہتی تو شاید بجلی میری جان لے کر ٹلتی۔''

''پھر چھ ماہ تک میں اسپتال میں رہی۔ ڈاکٹروں نے بے شمار ادویہ اور علاج آزمائے تاکہ میری ٹانگیں اور بازو دوبارہ کام کرنے لگیں۔ میرا منہ دیکھیں ابھی تک انجماد خون سے نیلا ہے۔ میں نے تو آئینہ بھی کئی ماہ بعد دیکھا تھا۔ لگتا تھا میں کوئی اور مخلوق ہوں۔ فزیوتھراپی اور دیگر علاج کے بعد مجھے اسپتال سے فارغ

کر دیا گیا۔ حالانکہ میں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ مجھے جب گھر لایا گیا تو امی نے دو دیگیں چاول پکا کر خیرات کیں۔ ابو کہہ رہے تھے اللہ تعالیٰ نے مجھے میری بیٹی کی زندگی دوبارہ دی ہے۔ میرے پانچوں بھائی میری گھر واپسی پر بہت خوش تھے۔ اس اثناء میں میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو میرے ساڑھے چھ سو نمبر تھے۔ ایک طرف میرے پڑھنے کا شوق' دوسری طرف میری معذوری' امی نے کہہ دیا کہ بس اتنی تعلیم کافی ہے۔ ایک سال سوچ بچار میں گزر گیا۔ ڈاکٹروں کے علاج معالجے سے زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ میرا زیادہ وقت دن کو وہیل چیئر اور رات بستر پر گزرتا۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کرتی مگر زیادہ فرق نہیں پڑا۔ کالج میں داخلے کا زمانہ گزر گیا۔ میری زندگی کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ میرے آنسو راتوں کو تکیہ بھگوتے۔ اپنی بے بسی اور مجبوری کا احساس مجھے اندر ہی اندر جلاتا جس کے نتیجے میں تیز بخار نے آلیا۔ ڈاکٹروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ میرے اندر پتا نہیں کیسی جنگ تھی۔ اچھی سے اچھی خوراک اور ادویات مجھے کمزور کر رہی تھیں۔ بخار اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ امی نے گھر کے کاموں کے لیے نوکرانی رکھ لی اور ہر وقت میری چارپائی سے لگی اللہ تعالیٰ سے میری صحت یابی کی دعائیں مانگتی۔ کئی ڈاکٹر آئے اور چلے گئے۔ مجھ پر بخار کی حالت میں ہذیانی کیفیت طاری رہتی اور میرے منہ سے یہی نکلتا ''میں کالج جاؤں گی میں پڑھوں گی۔ مجھے جانے دو میں نے جانا ہے۔'' ایک روز ڈاکٹر شفیع نے پوچھا۔ ''بیگم رحمان آپ بیٹی کو پڑھنے کیوں نہیں دیتیں۔'' تب امی نے بتایا۔ ''ہماری بیٹی نے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کی معذوری کی وجہ سے ہم اسے آگے نہیں پڑھا سکتے۔ بھلا یہ کالج کیسے جا سکتی ہے۔''

''بچی کو موقع دیں اور معاملہ اس پر چھوڑ دیں۔ یہ خود فیصلہ کر لے گی کہ کیسے پڑھنا ہے۔ اسے کچھ کرنے دیں۔ یہ کچھ نہ کرنے کی گھٹن کا شکار ہے۔ یہ کچھ کرے گی تو آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ میں اسے کچھ ورزشیں بتاتا ہوں۔ یہ اپنی کوشش سے جسمانی معذوری سے نجات حاصل کر لے گی۔''

دوسری طرف اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے میں خوش تھی۔ اگرچہ میں ابھی وہیل چیئر پر تھی مگر میں وہاں سے ایک نئے عزم سے نکلی تھی۔

گرمیوں کا موسم گزرا۔ کالجوں میں پھر داخلے

شروع ہوئے۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر میں دل تھام کر اداس ہو جاتی۔ سال ختم ہوا۔ میرا دل پودوں میں نکلتی ہوئی ننھی کونپلوں، شاخوں پر نکلے نئے پتوں کو دیکھتا۔ ابو نے میرے شوق کے لیے بے شمار پھولوں کے پودوں سے بھرے گملے منگوا دیے۔ میں پھولوں اور پودوں کو حسرت سے دیکھتی۔ میرا دل چاہتا اپنے ہاتھ سے ان کی آبیاری کروں۔ اب میں مشکل سے گھسٹ کر باتھ روم تک جاتی۔ امی میری مدد کرنے کی کوشش کرتی تو میں سختی سے کہتی نہیں میں خود جاؤں گی۔ یوں اپنی زبردست قوت ارادی سے میں نے گھر سے باہر نکلنے کا تہیہ کر لیا اور نعمان بھائی سے ایف اے کی کتابیں منگوائیں اور بستر پر یا وہیل چیئر پر بیٹھ کر مطالعے کے ساتھ الٹے ہاتھ سے لکھنے کی پریکٹس کرتی۔ پتا نہیں میرا دایاں ہاتھ کب ٹھیک ہوگا یا ہوگا بھی کہ نہیں۔

دیر تک بیٹھنے سے میرے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی۔ میں سوچتی پتا نہیں کون لوگ صحت مند ہوتے ہیں، چین کی نیند سوتے ہیں۔

بھائی اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ کوئی نوکری کرتا، کسی کو ابو نے کپڑے کی دکان بنا دی۔ بڑے بھائی امریکہ چلے گئے۔ امی گھر کے کاموں سے جتنا وقت ملتا میری ٹانگوں اور بازو پر مالش کرتی۔ کبھی حکیموں سے دوائی لاتی، کبھی کسی جراح سے لاتی۔ کوئی سانڈے کا تیل ہوتا اور کوئی سانپ کے زہر کا بنایا ہوا۔

امی مجھ سے بہت سی باتیں کرتیں، دین کی، مذہب کی، صبر و استقامت کی کہ دعاؤں میں بڑی تاخیر ہوتی ہے بشرطیکہ خلوص دل سے کی جائے۔

میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہتی، مگر کبھی کبھی چلا اٹھتی۔

"امی میری تکلیف کی دوا اس زمین پر کیوں نہیں۔ میں اپنے پاؤں پر نارمل لوگوں کی طرح کب چلوں گی۔"

"صبر کرو بیٹی ہم تمہارے لیے امکانی حد تک کوشش کرتے رہیں گے۔ تم دعاؤں کے ساتھ اپنی ہمتوں کو آزماؤ۔ رب کریم کا وعدہ ہے وہ کسی کی ہمت سے بڑھ کر امتحان نہیں لیتا اور کوشش کرنے والے کی کوشش رائیگاں نہیں کرتا۔"

"بس وہ دن اور آج کا دن میری زبان پر درود شریف اور رب زدنی علما کا ورد ہوتا ہے۔ یہ اسی درود اور ورد کا نتیجہ ہے کہ میں اپنے قدموں سے چل کر آپ تک پہنچی ہوں۔ میرا نام یاد رکھیں مصباح ہے۔ میں آپ سے دو گلیاں چھوڑ کر پچاس نمبر مکان میں رہتی ہوں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

"چلو میں تمہیں ہاتھ پکڑ کر نیچے چھوڑ آؤں۔"

"نہیں باجی مجھے لمبا سفر طے کرنا ہے۔ آپ کے گھر کی سیڑھیاں اللہ جانے مجھے کتنی بار چڑھنا اور اترنا ہے۔ آپ سے کچھ سیکھنا اور مدد لینا ہے۔ میں نے امی کو آپ کے حسن سلوک کے بارے میں بتایا تھا۔ کسی دن ہمارے گھر آئیں۔ امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"تمہارے جیسی باہمت لڑکی کی امی بھی یقیناً اچھی ہوں گی، مجھے جس دن فرصت ملی ضرور آؤں گی۔" اس طرح ہفتہ دس دن کے بعد شام کے وقت وہ آ جاتی۔ کورس سے متعلقہ سوالات اس نے ایک ڈائری میں لکھے ہوتے۔ آدھ گھنٹہ مجھ سے پوچھتی اور چلی جاتی۔ اس کے کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے ہوتے، بالوں میں کنگھی کی ہوتی حتیٰ کہ پاؤں میں پہنے جوتوں پر پالش کی ہوتی۔

اس نے ایف اے کا داخلہ پرائیویٹ بھیجا تھا۔ پھر امتحان کا زمانہ آیا۔ اس نے آنا بند کر دیا۔ میں نے صدق دل سے دعا مانگی، اس کا امتحانی مرکز زیادہ دور نہ بنے۔ کاش اس کے تمام پرچے اچھے ہو جائیں۔ وہ لڑکی جو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے درود شریف اور رب زدنی علما کا ورد کرتی تو اس کی تکلیف میں کمی ہو جاتی۔ اس کے چہرے پر نیلے دھبے رگوں میں خون منجمد ہو جانے کی وجہ سے تھے۔ بازو بھی ابھی تک نیلا تھا جب وہ ٹانگ گھسیٹ کر چلتی تو مجھے تکلیف ہوتی۔

"مصباح تم ایک بیساکھی، کیوں نہیں لے لیتیں۔"

"کبھی نہیں باجی۔" وہ عزم سے بولی۔

"میں پانچ بڑے بھائیوں کی بہن ہوں۔ میرے ابو معزز تاجر ہیں۔ میرا دل کٹ کر رہ جائے گا جب لوگوں کی رحم بھری نگاہیں مجھے دیکھیں گی۔ میں ٹھیک ہو جاؤں آپ میرے لیے دعا کریں۔"

کئی مہینوں تک مصباح نہیں آئی۔ ایک دن ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے ان کے گھر کا رخ کیا۔ اس کی امی اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح کھل اٹھی۔ "میرے پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ میری فرسٹ پوزیشن نہ آئی تو سیکنڈ ضرور آ جائے گی۔"

پھر میرے بی اے کے امتحان ہوئے اور رزلٹ آنے تک میں نے ایک رسالے میں کام شروع کر دیا۔ تقریباً دو ماہ بعد مصباح نے میرے گھر کی دہلیز پہ قدم رکھا۔

"باجی میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی ہوں۔ میرے اتنے نمبر ہیں کہ بی اے میں لاہور کالج میں داخلہ لیا ہے۔" وہ اپنی ٹانگ اور بازو کی تکلیف کے باوجود بڑی پرجوش تھی۔

"بہت خوب تمہارا وظیفہ رنگ لا رہا ہے۔"

"ہاں تعلیم کے علاوہ میں لائبریری سے تاریخی اور دینی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ جب ہم اچھی کتابیں پڑھتے ہیں تو ہم پر بہت سی مسرتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ کتاب سے دوستی رکھنے والے کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتے۔"

ستمبر کے مہینے میں، میں نے ایم اے میں داخلہ لیا۔ میں بہت مصروف ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی شام کو آ جاتی۔ اس کی ٹانگ اور بازو میں کچھ قوت آ گئی تھی۔ سلام کرتے ہوئے وہ اپنا دایاں ہاتھ آگے نہیں بڑھا سکتی تھی۔ اس کی ٹانگ بھی اس کا بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی، مگر اس کے چہرے پر اب اصلی رنگت آ گئی تھی۔ "باجی ابو نے مجھے رکشہ لگوا دیا ہے جو صبح چھوڑ آتا ہے اور ڈیڑھ بجے کالج سے لے آتا ہے۔ پرنسپل نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں رکشے میں کالج کے کمپاؤنڈ تک آ جاؤں۔"

"پوری قوم کا فرض بنتا ہے کہ آپ جیسی باہمت بچیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں۔ تاکہ کل کو تم ایک ماہر نفسیات بن سکو۔"

"آپ کی دعائیں چاہئیں۔" وہ انکسار سے بولی۔

ایم اے کرنے کے بعد میں نے ایک ریسرچ پراجیکٹ میں شمولیت اختیار کر لی اور شہر سے باہر مجھے جانا پڑا۔ کئی ماہ کے بعد میں گھر آئی تو فری نے بتایا۔

"میری غیر موجودگی میں مصباح دو مرتبہ آئی تھی۔"

"خدا اسے صحت و تندرستی کے ساتھ علم کی دولت سے مالا مال کرے۔" میں نے دل میں دعا مانگی۔

اس دن میں حیران رہ گئی۔ مصباح اپنے قدموں سے صحیح طرح چل کر میری گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر آئی۔ اپنے عزم اور حوصلے سے اس نے اپنی معذوری کو پرے دھکیل دیا تھا۔ اس نے مٹھائی کا ڈبہ پکڑ رکھا تھا۔

"باجی۔" وہ چھوٹتے ہی بولی۔ "میں بھی ایم اے سائیکالوجی کروں گی۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔"

"بہت مبارک ہو۔ اللہ تمہیں کامیاب و کامران کرے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"باجی میرے والدین اور بھائیوں نے میرا ساتھ دیا۔ یہ ان کی ذمے داری تھی، مگر آپ نے اگر پہلے دن مجھ معذور لڑکی کو ڈانٹ دیا ہوتا تو میں دوبارہ آپ کے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہ کرتی، لیکن آپ کی حوصلہ افزائی نے میرے دل میں زندگی سے محبت اور علم کی لگن پیدا کی اور آج میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔"

"شاباش مصباح تمہاری صحت یابی اور یونیورسٹی میں داخلہ ملنے پر ڈبل مبارک باد قبول کرو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ ویل ڈن مصباح۔" کہتے ہوئے پہلی بار میں نے اسے گلے لگایا۔

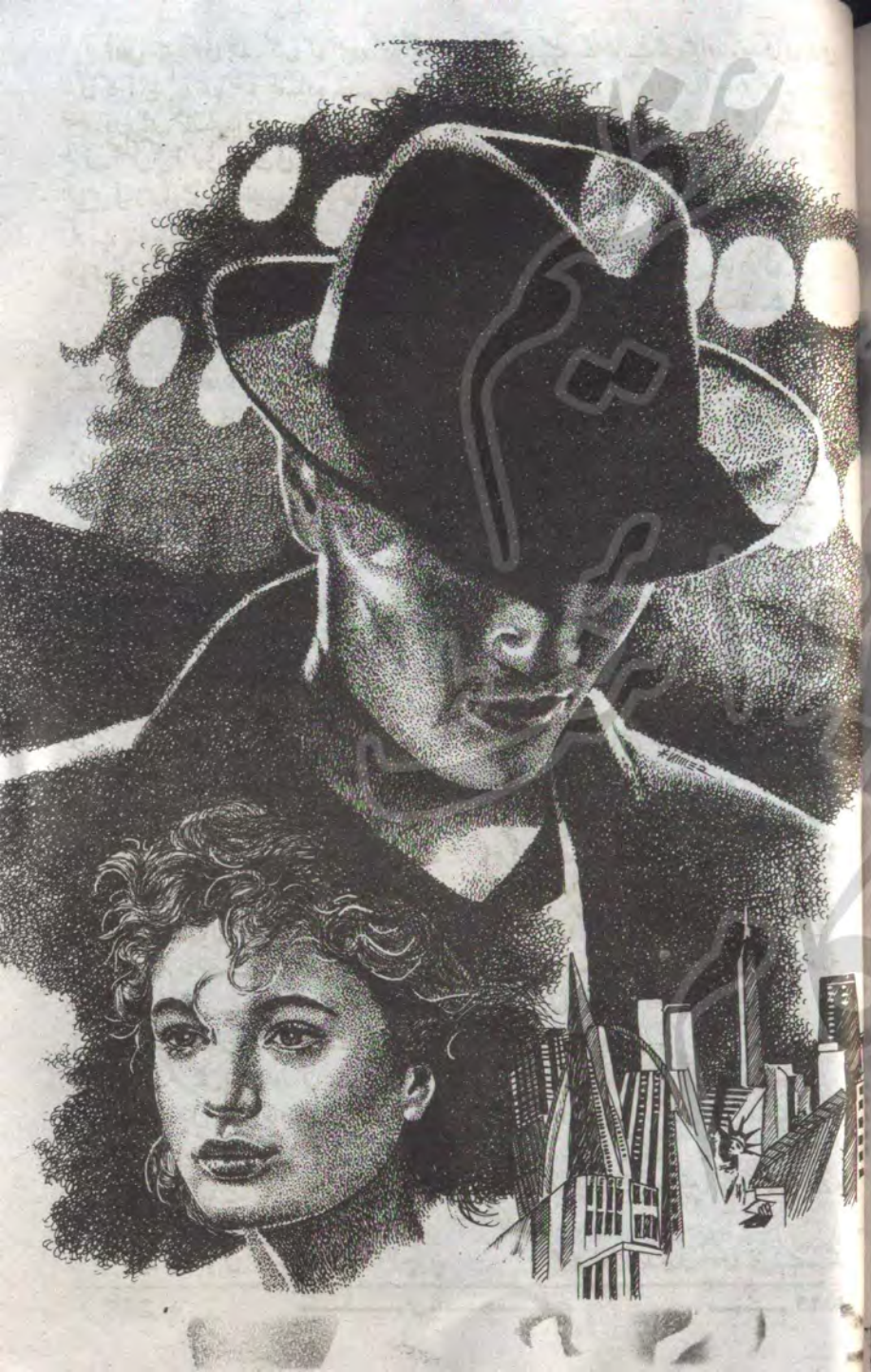

پسِ پردہ

عطیہ زاہرہ

دلاور نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی جو بالکل ساکت تھی۔ جسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اس کے داھنے ھاتھ میں ابھی تک برش دباھوا تھا۔ بائیں جانب وہ کینوس فریم رکھا تھا جس پر اس کی آخری کاوش آویزاں تھی۔ انسپکٹر دلاور نے دیکھا کہ وہ تصویر فیروزہ ھی کی ھے۔ ایك قابل غور بات یہ تھی کہ تصویر کا نچلا حصہ تھوڑا پھٹا ہوا تھا۔ دلاور نے پہلے لاش' ورك بینچ اور اس پر رکھی ہوئی چیزوں کے فوٹو لینے کی ھدایت کی۔ کینوس کے فریم کے پاس ھی اعشاریہ ۳۸ بور کا ایك ریوالور بھی پڑا ھوا تھا۔ دلاور نے بال پین کی نوك ریوالور کی نال میں ڈال کر اسے اٹھایا اور سونگھا' بارود کی بو آرھی تھی۔ قوی امکان تھا کہ یھی ریوالور آله قتل ثابت ھو۔ اس نے فنگرپرنٹ عملے کو تمام ضروری مقامات سے انگلیوں کے نشانات اور فوٹو اتارنے کی ھدایت کی اور انھیں اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر خود فیروزہ کو ساتھ لیے دوسرے بغلی کمرے میں آگیا۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

اس میں کوئی شک نہیں کہ منصور کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل بن سکتا تھا۔ وہ مانے ہوئے مصوروں میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ عالیہ اس کی طرف پھسل گئی تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی' لیکن الیاس کی زندگی میں گہرا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ عالیہ کو بے پناہ چاہتا تھا۔ عالیہ نے منصور کو اپنا لیا اور الیاس تڑپتا رہ گیا۔

آج عالیہ اس سے عالیہ منصور کی حیثیت سے ملنے آئی تھی' لیکن اس سے نہیں بلکہ بیرسٹر الیاس سے۔ بہت بڑے اور نامور بیرسٹر الیاس سے۔

عالیہ اس کی چچازاد بہن بھی تھی اور منگیتر بھی۔ مگر یہ منگنی اس وقت ہوئی تھی' جب الیاس کے والد ایک کامیاب اور دولت مند بزنس مین تھے۔ الیاس کے چچا ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھے۔ گورنمنٹ کی طرف سے انہیں بنگلہ' کار' ملازم سب کچھ ملا ہوا تھا۔ وہ دولت مند تو زیادہ نہیں تھے' مگر ان کی عزت' مرتبہ اور اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ ان کا رہن سہن اور حلقہ احباب بھی ماڈرن اور ہائی سوسائٹی جیسا تھا' لیکن قرابت داری اور دولت مندی نے طرز بود و باش کے فرق کے باوجود اس کے اور عالیہ کے درمیان منگنی کا رشتہ بھی قائم کر دیا۔ الیاس عالیہ سے محبت کرتا تھا اور بظاہر عالیہ بھی اسے پسند کرتی تھی۔ ان دونوں نے زندگی کی آخری سانس تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کیے تھے۔

مگر پھر حالات نے کروٹ لی۔ الیاس کے والد کو کاروبار میں پے در پے نقصان ہوتا چلا گیا۔ ایک سال کے اندر ہی وہ جو لکھ پتی تھے' دیوالیہ ہو کر کرائے کے گھر میں رہنے اور بس سے سفر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس معاشی تفاوت نے تعلقات میں ایک فاصلہ تو پیدا کر دیا مگر منگنی قائم رہی۔ اس توقع پر کہ الیاس جو ایل ایل بی کر رہا تھا' شاید کوئی اچھا وکیل یا کوئی اعلیٰ عہدیدار بن جائے۔

عالیہ اور الیاس بھی ملتے رہے۔ اگرچہ یہ ملاقاتیں پہلے کے مقابلے میں کم اور کچھ رسمی سی ہو گئی تھیں۔ ان ہی دنوں منصور نامی ایک نوجوان مصور بڑی تیزی سے شہرت کے آسمان پر ابھرا۔ ملک میں جگہ جگہ اس کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ اس کی دو چار تصویروں کو بین الاقوامی انعامات بھی مل گئے۔ وہ بہترین پورٹریٹ بناتا تھا۔ کچھ دولت مند گھرانوں میں اس سے تصویریں کیا بنوائی گئیں کہ ہائی سوسائٹی میں اس سے پورٹریٹ بنوانے کا فیشن سا چل پڑا۔ اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہونے لگی' تقاریب اور دعوتوں میں مدعو کیا جانے لگا۔

پھر کسی تقریب میں عالیہ اور منصور کی ملاقات ہو گئی جس کے بعد سے عالیہ مسلسل منصور کے ساتھ دیکھی جانے لگی۔ اس وقت الیاس بیرسٹر کی تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس عالیہ کے ارد گرد پھرنے اور اس کی ناز برداری کرنے کے لیے نہ وقت تھا نہ پیسہ۔ ان کی باہمی ملاقاتیں کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئیں۔ جب ہر جگہ عالیہ اور منصور کا نام ساتھ ساتھ سنا جانے لگا تو الیاس نے دوٹوک گفتگو کے لیے عالیہ سے ملاقات کرنا چاہی' مگر عالیہ ملنے سے گریز کرتی رہی۔ وہ اس کے گھر جاتا اور وہ گھر میں موجود ہوتی تب بھی وہ ملازم سے کہلوا دیتی کہ مس صاحبہ باہر گئی ہیں۔ وہ فون کرتا تو عالیہ ریسیو نہ کرتی۔ پھر ایک شام وہ خود ہی اس سے ملنے آ پہنچی۔

"میں تمہیں یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ اگلے فرائی ڈے کو میری اور منصور کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور ہماری منگنی۔"

"وہ تو کب کی ٹوٹ چکی ہے۔"

"وہ وعدے اور قسمیں جو تم نے میرا ساتھ دینے کے لیے کھائی تھیں۔"

"میری حماقت اور بچپنا تھا۔" عالیہ نے بلا جھجک جواب دیا۔

"محبت اور پسندیدگی اچھی چیز ہے۔ میں

تمہیں پسند کرتی تھی اب بھی کرتی ہوں' مگر زندگی گزارنے کے لیے اسٹیٹس کی ضرورت ہے' دولت کی ضرورت ہے جو تمہارے پاس نہیں۔"

"بلاشبہ یہ چیزیں آج میرے پاس نہیں ہیں' مگر میں ان کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہا ہوں۔ ایک ایجوکیشنل سوسائٹی میرے لیے اسکالرشپ منظور کر چکی ہے' میں عنقریب بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ جا رہا ہوں۔ تم تھوڑا سا انتظار کرو تو میں وہ سب کچھ تمہیں دے سکتا ہوں' جس کی تمہیں خواہش ہے۔"

"وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ جو چیز مجھے آج مل رہی ہے' اس کے لیے میں دس سال انتظار کیوں کروں۔"

"دس سال۔"

"ظاہر ہے' تین چار سال تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے میں لگیں گے پھر واپس آ کر تم کسی سینئر وکیل کے ساتھ دو چار برس چھوٹی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرو گے۔ اس کے بعد تم نے اپنی الگ پریکٹس شروع بھی کی تو کون جانتا ہے کہ کب تک اس قابل ہو سکو گے کہ خود اپنے آپ کو یا اپنے لواحقین کو ایک معیاری طرز زندگی فراہم کر سکو۔"

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں قطعی اور آخری فیصلہ' جسے میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" عالیہ نے جواب دیا پھر بولی۔

"تم حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھو گے تو اس بات کی تعریف کرو گے کہ میں نے تمہیں غلط فہمیوں اور موہوم امیدوں کی کوفت سے بچا لیا ہے۔"

"اس نوازش کا بہت بہت شکریہ۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی نہ رہ سکیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم جب چاہو' مجھ سے ملنے آ سکتے ہو' مجھے خط لکھ سکتے ہو' مجھے اپنے گھر بلا سکتے ہو۔"

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد۔"

"ابھی تو تم انگلینڈ جا رہے ہو نا۔"

"مگر تم ایک بات بھول رہی ہو۔"

"وہ کیا۔"

"ہائی سوسائٹی میں دوست بھی صرف ان ہی کو بنایا جاتا ہے جو ہائی اسٹیٹس کے مالک ہوں۔"

"ایک حد تک یہ درست ہے' مگر میں دوستی کے لیے دولت کو ضروری نہیں سمجھتی۔"

"اس وسعت قلبی کا شکریہ' لیکن میرا خیال ہے کہ دکھاوے کی دوستی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"دکھاوے کی دوستی کیوں۔"

"اس لیے کہ ہر تعلق کی بنیاد خلوص پر ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو صرف بناوٹ باقی رہ جاتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میری دوستی میں خلوص نہیں ہوگا۔"

"کہاں سے ہوگا۔ اسے تو تم دولت و شہرت کی چھری سے ذبح کر کے جا رہی ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں جو اتنی دیر سے بکواس کر رہی ہوں' وہ تم بالکل نہیں سمجھ سکے۔"

"نہیں' اس کا مطلب ہے کہ آج میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔"

"تمہاری مرضی۔" عالیہ نے شانے اچکائے' پھر بولی۔

"میری شادی میں تو آؤ گے نا۔"

"موجود ہوا تو ضرور آؤں گا۔ میں گرے ہوئے دودھ پر پچھتانے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"گڈ دیٹ از دی اسپرٹ....." عالیہ نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہماری دوستی تو پکی ہے نا۔"

"اس کا انحصار بھی تم پر ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھے کبھی اپنا دشمن نہیں پاؤ گی۔" الیاس نے جواب دیا۔

''اچھا تو خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

اور عالیہ چلی گئی۔ الیاس کے کمرے ہی سے نہیں' اس کی زندگی سے بھی۔ مگر پروگرام کے مطابق آئندہ جمعہ کو اس کی شادی منصور سے نہیں ہوسکی۔ اس نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے طور پر جو فیصلہ چاہے کرلے' اس کے والدین اپنی مغرب پرستی اور ترقی پسندی کی دھن میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ الیاس کے چچا اور چچی دونوں نے اس شادی کی مخالفت کی۔ منصور ایک نمایاں شخصیت تو تھا' تھوڑی بہت دولت بھی تھی' مگر اس کے خاندان کا کچھ پتا نہ تھا اور نہ ہی وہ اس بارے میں کچھ بتانے کے لیے آمادہ تھا' لیکن عالیہ اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔

یہ کشمکش کم و بیش ایک سال تک چلی پھر شاید منصور اور عالیہ کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے خوفزدہ ہوکر اس کے والدین کو جھکنا پڑا۔ الیاس لندن میں تھا جب اس نے عالیہ اور منصور کی شادی کی خبر سنی۔ بس اس کے بعد وہ جیسے اس کی زندگی سے بالکل ہی نکل گئی۔

الیاس اپنی تعلیم مکمل کرکے وطن واپس آیا۔ سال بھر تک ایک مشہور و معروف ایڈووکیٹ کے ساتھ کام کرنے کے بعد اس نے اپنا آفس کھول لیا اور ذاتی پریکٹس شروع کردی۔ اس میں خدا نے اسے اتنی کامیابی دی کہ دو تین سال ے اندر ہی اسے ایک نائب وکیل' دو کلرک' ایک اسٹینو ٹائپسٹ وغیرہ پر مشتمل عملہ رکھنا پڑا۔ اب ایک زیرک اور ہوشیار وکیل صفائی کی حیثیت سے اس کی شہرت دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے پاس اپنا بنگلہ تھا' کار تھی' زندگی کی تمام آسائشیں تھیں' مگر ان سب کے باوجود وہ ابھی تک تنہا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔

دفعتاً ٹیلیفون کی گھنٹی نے الیاس کو چونکا دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف بولنے والا اس کا ایک موکل تھا جو ملاقات کا وقت مانگ رہا تھا۔ الیاس نے اپنی ڈائری دیکھ کر اسے دوسرے دن کا ٹائم دیتے ہوئے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ عالیہ کو کمرہ ملاقات میں انتظار کرتے ہوئے پانچ منٹ سے کچھ زیادہ ہوگئے تھے۔ اس نے بات ختم کرکے ریسیور کریڈل پر رکھا' کرسی سے کھڑا ہوا' آفس کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بغلی دروازے سے نکل کر ایک چھوٹی راہداری میں چلتے ہوئے کمرہ ملاقات تک پہنچا۔ اندر قدم رکھا۔

عالیہ کچھ بے تابی کے عالم میں صوفے پر بیٹھی ایک انگلش میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر نظریں اٹھائیں۔ الیاس کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ میگزین سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہوگئی اور بولی۔

''ہیلو الیاس! کیسے ہو۔''

''شکریہ..... جی رہا ہوں۔'' الیاس نے خفیف تبسم سے جواب دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ اور عالیہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''مجھ سے بدلا لے رہے تھے۔'' عالیہ نے کہا۔

''بدلہ۔''

''ہاں مجھے اس طرح انتظار کرا کے۔''

''بدلہ لینا ہو تا تو ملنے سے انکار کردیتا یا ملاقات کے لیے کم سے کم ایک ہفتے بعد کا ٹائم دیتا۔ ویسے بھی میں بدلے یا انتقام کا قائل نہیں ہوں۔''

''تمہاری پریکٹس تو آج کل خوب چل رہی ہے۔ اخبارات میں پبلسٹی بھی خوب زور و شور سے جاری ہے۔''

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے میری توقع سے زیادہ دیا ہے۔'' الیاس نے جواب دیا۔ پھر بولا۔

''تم بتاؤ تمہاری زندگی تو اچھی گزر رہی ہے۔ آج کل منصور صاحب کا نام کچھ زیادہ سننے میں نہیں آرہا ہے۔ وہ خیریت سے تو ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' عالیہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''جس قسم کی خیریت اسے چاہیے' وہ اس کے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''وہ ایک آوارہ اور اوباش آدمی ہے۔ حسین لڑکیوں اور دولت مند خواتین کی ہم نشینی نے مگن رہنے والا۔ ہر خوب صورت عورت سے فلرٹ کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔''

''وہ تمہاری اپنی پسند بھی تو ہے۔''

''جب میں نے اسے پسند کیا تو وہ ایسا نہیں تھا۔''

''وہ تب بھی ایسا ہی تھا' مگر تم نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔''

''ممکن ہے' مگر اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔''

''اچھا خیر' یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ آج میری یاد کیسے آگئی۔''

''کچھ مشورہ کرنے آئی ہوں۔''

''کس سلسلے میں۔''

''مشورے کا لفظ شاید میں غلط کہہ گئی۔ یوں سمجھو کہ میں اپنی جنرل نالج میں کچھ اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور کرو۔''

''پوچھنا یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو قتل کردے تو کیا قانون ہمیشہ اسے موت کی سزا دیتا ہے۔''

''اس کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔''

''مثلاً.....''

''مثلاً یہ کہ قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا' مگر ہوگیا یا یہ کہ حالت اشتعال میں کوئی کسی کو جان سے مار دے یا خود اپنی زندگی کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھے' جس کو تم قتل بھی کہہ سکتی ہو..... تم اپنی بات کرو' تم کن مخصوص حالات کی بات کررہی ہو۔''

''مثلاً یوں سمجھو کہ کوئی کسی کے ہاتھوں تنگ آچکا ہے' زچ ہوگیا ہے' اس کی باتوں سے' اس کے طرز عمل سے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے' درخواست کرتا ہے' مگر دوسرے کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ نہ صرف اپنی تکلیف دہ روش برقرار رکھتا ہے بلکہ چڑانے اور ستانے کے لیے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا ہے جو کسی کو غصہ دلائیں' اشتعال میں لائیں اور جب برداشت کرنے والے کا صبر و ضبط جواب دے جاتا ہے تو وہ اسے قتل کر بیٹھتا ہے۔ ایسی صورت میں قانون اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔''

''اسے قتل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مناسب بات ہوگی کہ وہ ایسے شخص کا ساتھ چھوڑ دے۔''

''کچھ مجبوریاں ہوں جن کی وجہ سے نہ چھوڑ سکے تب۔''

''تب پھر جو اس کا جی چاہے کرے۔ میں ایک وکیل کی حیثیت سے جو رائے دے سکتا تھا دے دی۔''

''آپ بھول رہے ہیں۔ آپ سے مشورہ نہیں کیا جارہا ہے' صرف معلومات میں اضافے کے لیے سوال کیا جارہا ہے کہ قانون ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ کیا سزا دے سکتا ہے۔''

''اس کا صحیح جواب تو اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب وہ شخص یہ حرکت کرگزرے' مقدمہ فیصلے کے لیے عدالت میں پیش ہو اور اتفاق سے میں اس عدالت کے جج کی حیثیت سے کرسی پر بیٹھا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے' لیکن میں اندازاً آپ کا خیال پوچھ رہی تھی۔''

''دیکھو عالیہ۔'' الیاس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں نا' بیئنگ اے

راؤنڈ دی بش' تو یہ طریقہ چھوڑو اور صاف صاف بات کرو کہ تمہارے دل میں کیا ہے اور تم کیا کرنا چاہتی ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا' نا کہ صرف اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"میں نہیں مانتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خطرناک سوچ پوشیدہ ہے۔ مجھے اپنی الجھن بتاؤ' ممکن ہے میں تمہیں مفید اور قابل قبول مشورہ دے سکوں۔"

عالیہ چند لمحے خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ الیاس نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اسے کچھ گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح حسین تھی۔ ان چار پانچ برسوں نے اس کی کشش میں کچھ اضافہ ہی کر دیا تھا۔

"میں منصور سے بے زار ہو چکی ہوں الیاس۔" آخر میں اس نے کہا۔

"وہ حسن' جوانی' دولت اور شراب کے پیچھے بھاگ کر اپنا فن' اپنا مستقبل برباد کر رہا ہے۔ میں اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی۔ مگر وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ بلاشبہ میں اسے چھوڑ سکتی ہوں' مگر اب یہ میری انا کا سوال بن چکا ہے۔ میں نے اپنے والدین' عزیز و اقارب' سب کی مخالفت مول لے کر منصور سے شادی کی تھی۔ اس شادی کو یا تو کامیاب ہونا چاہیے یا مکمل طور پر تباہ۔ کوئی تیسرا درمیانی راستہ نہیں ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔"

☆☆

منصور اپنے اسٹوڈیو کی ورک بینچ کے سامنے بیٹھا ہوا کینوس فریم سے لٹکتی ہوئی اس تصویر کو دیکھ رہا تھا جو اس کا تازہ شاہکار تھی۔ تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ صرف ایک دو جگہ ہلکے ہلکے ٹچز کی ضرورت تھی۔ اس نے آج ہر طرح تصویر پوری کر کے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یوں وہ اپنے وعدوں کا کچھ ایسا پابند نہیں تھا۔ اس تصویر کے سلسلے میں اب تک بے شمار وعدے کر چکا تھا' مگر آج کی بات کچھ اور تھی۔ اسے تقریباً یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ اس لڑکی کو بھی کسی نہ کسی اعتبار سے شکار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ویسے اس نے احتیاطاً لڑکی کے باپ کو بھی ٹیلیفون کر دیا تھا۔ دونوں میں سے کسی نہ کسی کا دام میں آنا لازمی تھا اور یہ جو کچھ ادھر ادھر سے برش مارنا رہ گیا تھا' یہ بھی پورا ہو جاتا اگر وہ چڑیل نہ آ جاتی۔

اپنے غصے کو ٹھنڈا اور ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے منصور نے برش اٹھا کر مطلوبہ رنگ میں آمیز کیا اور کام شروع کرنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے آفس ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ منصور نے برش رکھ دیا' اٹھا اور میز کے قریب پہنچ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو..... منصور اسٹوڈیو۔" اس نے کہا۔

"ارے بھائی منصور میں غیاث بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے جواب آیا۔

"او ہیلو غیاث' کیا حال چال ہیں۔" منصور بولا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں' کچھ وقت دے سکو گے۔"

"کس سلسلے میں۔"

"دیکھو منصور' تم بھی میرے بہترین دوست ہو اور عالیہ کو میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں' میں تم دونوں کا بھی خواہ ہوں' میری خواہش ہے کہ اگر ہم تینوں بیٹھ کر سوچیں تو تمہارے اور عالیہ کے اختلافات....."

"اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" منصور نے بات کاٹی۔

"کیوں۔؟"

"وہ بیگم صاحبہ آئی تھیں اور بڑی زبردست جنگ کے بعد ابھی ابھی یہ دھمکی دے کر واپس گئی ہیں کہ اب کورٹ میں ملاقات ہوگی۔"

"اس نے غصے میں کہہ دیا ہوگا..... ورنہ میں جانتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں غیاث۔ میں اس عورت سے تنگ آ چکا ہوں۔" منصور نے پھر بات کاٹی۔

"معاف کرنا دوست' ایک ضروری تصویر مکمل کر رہا ہوں' زیادہ بات نہیں کر سکتا۔"

اور یہ کہہ کر منصور نے جواب کا انتظار کیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ واپس ورک بینچ پر آیا۔ دوبارہ برش اٹھا کر تصویر کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا۔ نہ جانے کس طرف سے ریوالور کی ایک گولی آئی اور اس کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ منصور منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر' برش ہاتھ میں لیے میز پر لڑھک گیا۔ گولی یقیناً کسی ایسی جگہ لگی تھی کہ اسے دوسری سانس لینے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔

☆☆

فون کی گھنٹی بجی تو انسپکٹر دلاور نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" ایک گھبرائی ہوئی زنانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"پولیس اسٹیشن۔"

"جی ہاں۔"

"ذرا کسی ذمے دار آفیسر کو بلائیں' میں ایک سنگین جرم کی رپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں انسپکٹر دلاور بات کر رہا ہوں۔" دلاور نے جلدی سے کہا۔

"آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں۔"

"میرا نام فیروزہ ہے۔" جواب ملا۔

"میں منصور اسٹوڈیو سے بات کر رہی ہوں۔ یہاں کسی نے منصور صاحب کو قتل کر دیا ہے۔"

"منصور!" دلاور چونکا۔

"آپ کا مطلب' وہ مشہور مصور جن کی تصویروں کو بین الاقوامی انعام مل چکا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کا تعلق اسٹوڈیو سے ہے یا منصور صاحب کی کوئی عزیزہ ہیں۔"

"جی نہیں' میں ان کی کلائنٹ ہوں۔ اپنی تصویر لینے آئی تھی' تو یہاں ان کی لاش دیکھی۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میری بات توجہ سے سنیے۔" دلاور نے واضح اور بلند آواز سے کہا۔

"آپ اسٹوڈیو کا دروازہ باہر سے بند کر دیں' کسی چیز کو بھی بالکل ہاتھ نہ لگائیں' نہ کسی اور کو کچھ بتائیں اور نہ اسٹوڈیو میں جانے دیں۔ میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

دلاور نے ریسیور کریڈل پر پٹخا' اچھل کر کرسی سے اٹھتے ہوئے میز سے اپنی چھڑی اٹھائی' کھونٹی سے کیپ اتار کر سر پر رکھی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

دلاور اپنی جیپ میں ضروری عملے کے ساتھ منصور اسٹوڈیو پہنچا تو فیروزہ بڑی گھبرائی ہوئی' پریشان سی اسٹوڈیو کے بیرونی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ انسپکٹر دلاور نے جیپ سے اترتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور بیرونی دروازے کو کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ فیروزہ ایسے اس پرائیویٹ کمرے تک لائی جہاں منصور اپنے خاص خاص گاہکوں کی تصویریں بناتا تھا۔ یہ ایک لمبا سا کمرہ تھا جس کے ایک گوشے میں وہ میز اور رنگ پڑے ہوئے تھے جہاں بیٹھ کر منصور اپنے برش کا جادو جگاتا تھا۔ میز پر اب اس کا بے جان جسم لڑھکا پڑا تھا۔

دلاور نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی جو بالکل ساکت تھی۔ جسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ابھی تک برش دبا ہوا تھا۔ بائیں جانب وہ کینوس فریم رکھا تھا جس پر اس کی آخری کاوش آویزاں تھی۔ انسپکٹر دلاور نے دیکھا کہ وہ تصویر فیروزہ ہی کی ہے۔ ایک قابل غور بات یہ تھی کہ تصویر کا نچلا حصہ تھوڑا پھٹا ہوا تھا۔ دلاور نے پہلے لاش' ورک بینچ اور اس پر رکھی ہوئی

چیزوں کے فوٹو لینے کی ہدایت کی۔ کینوس کے فریم کے پاس ہی اعشاریہ ۳۸ بور کا ایک ریوالور بھی پڑا ہوا تھا۔ دلاور نے بال پین کی نوک ریوالور کی نال میں ڈال کر اسے اٹھایا اور سونگھا' بارود کی بو آ رہی تھی۔ قوی امکان تھا کہ یہی ریوالور آلہ قتل ثابت ہو۔ اس نے فنگر پرنٹ عملے کو تمام ضروری مقامات سے انگلیوں کے نشانات اور فوٹو اتارنے کی ہدایت کی اور انہیں اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر خود فیروزہ کو ساتھ لیے دوسرے بغلی کمرے میں آ گیا جہاں کا فرنیچر اور دوسری اشیاء اس بات کا اشارہ کر رہی تھیں کہ منصور اپنے دفتری کام اور لوگوں سے ملاقاتیں اسی کمرے میں کیا کرتا تھا۔

''بیٹھ جایئے۔'' اس نے فیروزہ سے کہا۔

''اس واردات کے بارے میں آپ جو کچھ بھی جانتی ہیں' تفصیل سے بیان کر جائیں' مگر اس سے بھی پہلے اپنا نام پتا اور دوسری ضروری باتیں بتائیں۔''

وہ خود بھی فیروزہ کے سامنے ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا نام جیسا کہ میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا فیروزہ ہے۔'' فیروزہ نے جواب دیا۔

''میرے والد مرزا حیدر بیگ صاحب کو شاید آپ جانتے ہوں وہ حیدر آرکیڈ کے مالک ہیں۔''

''میں نے مرزا حیدر بیگ صاحب کا نام ضرور سنا ہے۔ وہ شہر کی معروف کاروباری شخصیت ہیں' مگر ان سے کوئی ذاتی واقفیت نہیں ہے۔'' انسپکٹر دلاور نے جواب دیا۔

''منصور صاحب پورٹریٹ بہت اچھا بناتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے اسٹوڈیو میں دیکھا ہوگا' کینوس فریم پر میری ایک نامکمل تصویر موجود ہے۔ اس کے لیے میں روزانہ پانچ بجے یہاں آ کر پوز کرتی تھی۔ گزشتہ دو ہفتوں سے وہ روزانہ تصویر مکمل کرنے کا وعدہ کر رہے تھے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے کر نہیں پاتے تھے۔ آج انہوں نے تصویر دینے کا پختہ وعدہ کیا تھا' میں حسب معمول پانچ بجے آئی۔ اسٹوڈیو میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک عجیب طرح کی خاموشی کا احساس ہوا۔ میں اندر داخل ہوئی تو انہیں بالکل اسی حالت میں میز پر گرے دیکھا' جس میں وہ اس وقت نظر آ رہے تھے۔ پہلے میں سمجھی کہ شاید وہ تھک کر سو گئے ہیں۔ ایک دو آوازیں دیں' جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے قریب آ کر دیکھا اور تب احساس ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہیں' پھر میں نے فوراً آپ کو فون کیا۔ بس یہ ہے پوری بات۔''

''جب آپ اسٹوڈیو میں آئیں تو آپ کے علاوہ یہاں کوئی اور بھی تھا۔'' انسپکٹر دلاور نے پوچھا۔

''جی نہیں۔''

''آپ کے آنے کے بعد کوئی آیا۔''

''جی نہیں۔''

''گویا آپ نے کسی کو بھی یہاں سے جاتے یا یہاں آتے نہیں دیکھا۔''

''جی ہاں۔''

''آپ نے اندر آنے کے بعد ٹیلیفون کے علاوہ کسی اور چیز کو بھی ہاتھ لگایا۔''

''جی نہیں۔''

''منصور صاحب کو بھی چھو کر نہیں دیکھا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔''

''جی نہیں۔ میں نے یہ بات جاننے کے لیے منصور صاحب کو چھونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''صنف نازک کے بارے میں منصور صاحب کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ آپ سے ان کے تعلقات کیسے تھے۔'' دلاور نے کہا۔

''مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ اگر وہ اتنی اچھی تصویر نہ بنا رہے ہوتے تو میں کبھی ان کے اسٹوڈیو میں قدم بھی نہ رکھتی۔ بلاشبہ ان کا کردار

کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ تالی بجانے کے لیے دوسرا ہاتھ بھی درکار ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھ پر بھی اپنی نوازش کرنا چاہی' لیکن میں نے اپنے کام سے کام رکھا اور انہیں کبھی حد سے باہر قدم نکالنے کا موقع نہیں دیا۔'' فیروزہ نے جواب دیا۔

''کبھی اس سلسلے میں آپ کی ان سے گرما گرمی بھی ہوئی۔''

''ایک دو مرتبہ' مگر جب میں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ شرافت سے پیش نہ آئے تو میں تصویر نہیں بنواؤں گی۔ تب وہ بالکل سیدھے ہو گئے۔ میں اپنی تصویر کے لیے انہیں ایک لاکھ روپے دے رہی تھی۔ یہ رقم کم نہیں ہوتی۔''

''دوست ہے۔''

دلاور کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ کمرے میں اپنے ایک ماتحت کو داخل ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''کیا بات ہے ظفر۔''

''وہ جی ریوالور پر انگلیوں کے کچھ نشانات غیر واضح اور کچھ میرا مطلب ہے' دوسرا سیٹ بہت نمایاں ملا ہے۔ یہی نشانات اسٹوڈیو میں دوسرے مقامات پر بھی ملے ہیں۔''

دلاور اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے فیروزہ کی طرف دیکھا۔

''فیروزہ صاحبہ' آپ کو اپنی انگلیوں کے نشانات دینے میں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''وہ کس لیے۔''

''دیکھئے نا' یہ تو ظاہر ہے کہ منصور صاحب کو قتل کیا گیا ہے' ممکن ہے' قاتل اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ گیا ہو' لہٰذا ان نشانات کو چیک کرنے کے لیے یہاں آنے والے افراد کی انگلیوں کے نشانات تو ہمارے پاس ہونے چاہئیں۔ تاکہ ہم پائے جانے والے نشانات کو الگ الگ پہچان سکیں۔''

فیروزہ کی انگلیوں کے نشانات لے کر چیک کیے گئے تو وہ ریوالور پر پائے جانے والے نشانات سے مل گئے۔

''مس فیروزہ آپ نے ہم سے سچ نہیں بولا۔'' دلاور نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ فون کے علاوہ آپ نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''جی ہاں۔''

''تو پھر ریوالور پر آپ کی انگلیوں کے نشانات کہاں سے آ گئے۔'' دلاور کے لہجے میں تیزی تھی۔

''میری انگلیوں کے نشانات!'' فیروزہ چونکی۔

''اوہ ہاں..... میں بالکل ہی بھول گئی تھی۔ دراصل جب میں اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو میں نے میز پر ریوالور دیکھ کر غیر ارادی طور پر اسے اٹھا لیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک مصور کی میز پر ریوالور کا کیا کام۔ اس وقت تک مجھے منصور صاحب کی موت کا علم نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے انہیں غور سے دیکھنے کے لیے ریوالور واپس میز پر رکھ دیا تھا۔''

''وہ ریوالور آپ کا تو نہیں ہے۔''

''جی نہیں۔''

''منصور صاحب کا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''آپ نے پہلے کبھی ان کے پاس وہ ریوالور دیکھا تھا۔''

''جی نہیں۔''

''اپنی تصویر آپ نے پھاڑی ہے۔''

''جی نہیں' میں اپنی تصویر کیوں پھاڑتی۔''

''آپ کو اندازہ ہے کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔''

''جی نہیں۔''

"ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کے اور منصور کے درمیان جھگڑا ہوا ہو اور آپ نے یا اس نے غصے میں آ کر تصویر پھاڑ دی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب میں آئی تو وہ مر چکا تھا۔"

"آپ نے اپنے خلاف شکوک و شبہات پیدا کر لیے ہیں۔ مجھے افسوس ہے مس فیروزہ، مگر ان حالات میں، میں آپ کو حراست میں لینے پر مجبور ہوں۔"

"کیا آپ کے خیال میں، میں نے منصور صاحب کو قتل کیا ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتا، لیکن جب تک مزید تحقیقات سے آپ کی پوزیشن واضح نہیں ہو جاتی، آپ حراست میں رہیں گی۔ آپ چاہیں تو اپنے والد یا کسی عزیز کو اطلاع کر سکتی ہیں۔"

انسپکٹر دلاور نے منصور اسٹوڈیو میں اپنی ابتدائی تحقیقاتی کارروائی مکمل کر کے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا اور فیروزہ کو اپنے ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ چلنے سے پہلے فیروزہ نے مرزا حیدر بیگ صاحب کو فون کر دیا تھا۔ اس لیے دلاور جب پولیس اسٹیشن پہنچا تو حیدر بیگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔

"انسپکٹر صاحب! آپ نے میری بیٹی کو بلاجواز حراست میں لیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر جرم اس نے کیا ہوتا تو چپ چاپ رخصت ہو جاتی، آپ کو فون نہ کرتی۔"

"دیکھیے میں نے فیروزہ صاحبہ کو قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کیا ہے۔ ان کے متضاد بیان اور کچھ دوسری وجوہات سے شبہ کی بنا پر مزید تحقیقات کے لیے حراست میں لیا ہے۔ میں اپنی رپورٹ اپنے افسران بالا کو پیش کروں گا۔ وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو انہیں آزاد کر دیں گے۔ یوں آپ چاہیں تو کسی وکیل کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔" دلاور نے جواب دیا۔

"بہتر ہے اب میں یہی کروں گا۔" حیدر بیگ صاحب نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چلے گئے تو دلاور نے اپنی رپورٹ تحریر کی اور ریوالور کو پولیس لیبارٹری بھجوا دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے منصور کی بیوی عالیہ منصور سے رابطہ قائم کرنے اور اسے اس المناک واردات کی اطلاع دینے کی کوشش کی۔ مگر گھر فون کرنے پر معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کہیں باہر گئی ہیں۔ اس نے پیغام چھوڑ دیا کہ جب واپس آئیں تو وہ فوراً اس سے رابطہ قائم کریں۔ ان کے شوہر کو قتل کر دیا گیا ہے۔

مرزا حیدر بیگ صاحب، پولیس اسٹیشن سے سیدھے الیاس کے دفتر پہنچے اور یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ انہیں رات کے آٹھ بجے بھی اپنے دفتر میں مل گیا۔ ورنہ عام طور پر پانچ بجے آفس بند ہوتے ہی وہ بھی گھر چلا جاتا تھا۔

"ارے حیدر صاحب! آپ اس وقت کیسے۔" الیاس نے کچھ حیرت سے کہا۔

"ڈاکٹر اور وکیل مصیبت کے وقت ہی یاد آتے ہیں۔" مرزا حیدر بیگ صاحب ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے بولے۔

"پولیس نے میری بیٹی فیروزہ کو حراست میں لے لیا ہے۔ اس پر مشہور مصور منصور کے قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔"

"کیا۔ منصور کو قتل کر دیا گیا۔" الیاس چونکا۔

"ہاں..... آج سہ پہر پانچ بجے فیروزہ اس کے اسٹوڈیو میں اپنی تصویر لینے گئی تو وہ بے جان پڑا ہوا تھا۔"

"مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔" الیاس بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے۔" حیدر صاحب پوری طرح سن نہیں سکے۔

"کچھ نہیں۔" الیاس نے جلدی سے کہا۔

"فیروزہ کے خلاف پولیس کا کیس کیا ہے۔"

"کوئی خاص نہیں، وہ ریوالور جس کے آلہ قتل ہونے کا گمان ہے اس پر فیروزہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کوئی بات اور بھی ہو، مگر مجھے انسپکٹر دلاور نے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔"

"انسپکٹر دلاور..... کیس کا چارج اس کے پاس ہے۔" الیاس نے جلدی سے کہا۔

"ہاں....." حیدر صاحب نے جواب دیا، پھر بولے۔

"میں چاہتا ہوں، آپ فیروز کی وکالت کریں۔"

"ایک منٹ، میں ذرا دلاور سے بات کر لوں۔ اس سے خاصی اچھی واقفیت ہے۔"

الیاس نے پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسرے لمحے وہ دلاور سے ہم کلام تھا۔

"تو حیدر صاحب تمہارے پاس پہنچے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ امید ہے ہمیشہ کی طرح تمہارا طرز عمل مثبت رہے گا۔" دلاور نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں مجرموں کی پشت پناہی تو نہیں کرتا۔" الیاس نے جواب دیا، پھر بولا۔

"کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ بتا دو کہ فیروزہ کے خلاف تمہارے شکوک کس بنیاد پر ہیں۔"

دلاور نے قدرے تفصیل سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ الیاس خاموشی سے سنتا رہا اور غور کرتا رہا۔

"ریوالور کے بارے میں معلوم ہوا کہ کس کا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، لیکن شاید مسز منصور سے رابطہ قائم ہونے پر معلوم ہو سکے کہ وہ ریوالور منصور کا تو نہیں تھا۔" دلاور نے جواب دیا۔

"تم مجھے جانتے ہو، میں صرف اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے کسی کو نہیں پکڑتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔ اتنی دیر میں ذرا تم پولیس لیبارٹری کو ہدایت کر دو کہ وہ صرف ریوالور کے اوپر ہی نہیں بلکہ اندر گولیوں وغیرہ پر بھی دیکھیں اور وہاں جو بھی نشانات ملیں، انہیں محفوظ کر لیں۔" الیاس نے کہا۔

الیاس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے حیدر صاحب کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر دلاور بڑا سمجھ دار اور غیر متعصب پولیس آفیسر ہے، وہ..... اختیارات کی اندھی لاٹھی نہیں چلاتا۔ آپ گھر جائیں۔ فیروزہ بے گناہ ہے تو انشاء اللہ میں اسے ضرور آزاد کرا لوں گا۔" اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے۔" حیدر صاحب نے جوش سے کہا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں۔" الیاس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے۔" حیدر صاحب جلدی سے بولے۔

"میرا مطلب ہے کہ مجھے یقین ہے۔ میری بیٹی بے گناہ ہے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مگر مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔"

"ضرور....." الیاس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

حیدر صاحب کے رخصت ہونے کے بعد وہ بھی دفتر بند کر کے پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

الیاس پولیس اسٹیشن پہنچا تو دلاور نے حسب عادت پرتپاک انداز سے اس کا استقبال کیا۔

"جب تم کوئی کیس اپنے ہاتھ میں لیتے ہو تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ پولیس سے کہیں نہ کہیں نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مکھن اچھا لگا لیتے ہو۔" الیاس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"مکھن لگانے کی بات نہیں۔ اب یہ ہی دیکھ لو کہ تم نے مجھ سے کہا کہ میں ریوالور کے اندر

گولیوں وغیرہ پر بھی نشانات دیکھنے کی ہدایت کردوں۔" دلاور بولا۔

"ہاں..... تو پھر کوئی خاص بات معلوم ہوئی۔" الیاس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی ابھی پولیس لیبارٹری سے فون آیا تھا۔ ریوالور پر دو افراد کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ جن میں سے زیادہ واضح نشانات فیروزہ کے تھے۔ مگر کچھ دبے دبے نشانات اور بھی تھے جو ظاہر ہے کسی دوسرے کے تھے۔ اب گولیوں کو چیک کیا گیا تو ان پر بہت واضح نشانات ملے۔ مگر فیروزہ کے نہیں' اس دوسرے فرد کے' کیا سمجھے۔" دلاور نے جواب دیا۔

"یہی کہ ریوالور' اس دوسرے فرد نے لوڈ کیا۔ اسے ہینڈل کیا' خدا جانے کہ استعمال بھی کیا ہو۔" الیاس نے جلدی سے کہا۔

"بالکل یہی بات ہے۔" دلاور نے تائید کی۔

"چنانچہ اگر اس ریوالور سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ریوالور اگر اس کے والد حیدر صاحب کا نہیں ہے اور انہوں نے اسے لوڈ نہیں کیا ہے تو فیروزہ کے خلاف کیس خاصا کمزور ہو جاتا ہے۔"

"مجھے ویسے بھی یقین تھا کہ وہ....." الیاس نے کہنا شروع کیا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا۔ دلاور کے آفس کا دروازہ کھلا اور عالیہ اندر داخل ہوئی۔ اس وقت وہ جس انداز سے بنی سنوری نظر آرہی تھی اس سے یوں لگتا تھا جیسے کسی بیوٹی پارلر سے اٹھ کر آرہی ہو۔

"میں ابھی گھر پہنچی تو ملازمہ نے بتایا کہ منصور کو قتل کر دیا گیا ہے۔" اس نے آتے ہی کہا۔ تخاطب انسپکٹر دلاور سے تھا۔

"آپ مسز....."

"ہاں میں عالیہ ہوں۔"

"مجھے اس المناک حادثے پر بہت....."

"اپنے الفاظ ضائع مت کیجئے۔" عالیہ نے پھر بات کاٹی۔

"جس کسی نے بھی منصور کو قتل کیا ہے۔ مجھ پر احسان کیا ہے۔ دنیا کو ایک بدکردار آدمی کے وجود سے پاک کیا ہے۔ آپ نہیں جانتے۔ وہ شخص اسی انجام کا مستحق تھا۔"

"آپ تشریف تو رکھیے۔" دلاور' عالیہ کی باتوں سے خاصا چونکا ہوا نظر آرہا تھا۔

عالیہ تو واقعی دلاور کی طرف پوری طرح توجہ تھی اور اس نے الیاس کو نہیں دیکھا یا یہ بھی اس کا ایک انداز تھا کہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے جب اس کی نظر الیاس پر پڑی تو وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"آپ یہاں کیسے۔ کچھ میرے بارے میں کہنے سننے تو نہیں آئے ہیں۔"

"جی نہیں' میں وکیل ہوں' پولیس نے میری موکلہ کو زیر حراست رکھا ہوا ہے اور اس سلسلے میں آیا ہوں۔" الیاس نے جواب دیا۔

"مسز منصور!" دلاور نے بات آگے نہیں بڑھنے دی۔

"آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اور منصور صاحب کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔"

"تعلقات ہوں تو اچھے یا برے ہوتے ہیں' انسپکٹر صاحب۔" عالیہ نے جواب دیا۔

"ہمارے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں تھا اور جو تھا۔ میں اسے بھی توڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔"

"اچھا یہ کب کی بات ہے۔"

"آج سہ پہر کی' میں تقریباً ساڑھے تین مجھے اس سے ملنے گئی تھی۔ وہاں ہمارے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ تم یوں نہیں دو گے تو میں عدالت سے لے

لوں گی۔" عالیہ نے کہا۔

دلاور نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ پھر میز کی دراز سے ریوالور نکالا جو الیاس کے آنے سے ایک دو منٹ قبل اسے پولیس لیبارٹری سے واپس بھیجا گیا تھا۔

"آپ اس ریوالور کو پہچانتی ہیں۔" اس نے پوچھا۔ عالیہ ریوالور دیکھ کر کچھ چونکی۔

"یہ آپ کو غالباً منصور کے اسٹوڈیو سے ملا ہوگا۔" اس نے جواب کے بجائے سوال کر دیا۔

"جی ہاں..... اس کا مطلب ہے کہ آپ اسے پہچانتی ہیں۔"

"پہچاننا کیا معنی' یہ میرا ریوالور ہے۔" عالیہ نے بلا تامل جواب دیا۔

"پھر یہ منصور صاحب کے اسٹوڈیو کیسے پہنچا۔"

"میں لے کر گئی تھی۔"

"کیوں۔" دلاور نے پوچھا۔

اس کی تیز نظریں عالیہ کے ہر تاثر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عالیہ پہلی مرتبہ کچھ ہچکچائی۔

"میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"میں آج منصور کے اسٹوڈیو اس ارادے سے گئی تھی کہ ہمیشہ کے لیے اس جھگڑے کو ختم کر دوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے مجھے طلاق نہیں دی تو میں اسے قتل کر دوں گی۔"

"اور چونکہ منصور نے آپ کو طلاق نہیں دی۔ اس لیے آپ نے اسے قتل کر دیا۔" دلاور نے کہا۔

"نہیں....." عالیہ نے تیزی سے جواب دیا۔

"میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ مگر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ غصے میں آکر کسی قتل کرنے کی دھمکی دینا یا ارادہ کر لینا اور بات ہے اور کسی جیتے جاگتے انسان پر اسے جان سے مارنے کے ارادے سے گولی چلانا بالکل دوسری بات ہے۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکی اور اپنی اس بزدلی پر اتنا غصہ آیا کہ میں ریوالور اس کی میز پر پھینک کر اسٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔"

"مگر پولیس لیبارٹری کی رپورٹ کے مطابق منصور کو اسی ریوالور سے قتل کیا گیا ہے۔" دلاور نے کہا۔

"کیا۔" عالیہ نے آنکھیں پھاڑ کر دلاور کی طرف دیکھا۔

"ناممکن ہے۔ میرا مطلب ہے کہ قتل اسی ریوالور سے ہوا ہے۔ تو وہ میں نے نہیں کیا' کسی اور نے کیا ہے۔"

"آپ اسٹوڈیو کس وقت گئی تھیں۔"

"میں نے بتایا نا کہ تقریباً ساڑھے تین بجے۔"

"اور کب تک وہاں رہیں۔"

"زیادہ سے زیادہ چار بجے تک۔ میں نے روانگی کے وقت گھڑی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہاں سے آپ کہاں گئی تھیں کہ فون کرنے پر گھر پہ موجود نہیں ملیں۔"

"میں زہرہ بیوٹی پارلر گئی تھی۔ سوا چار بجے میں نے ان سے وقت لے رکھا تھا۔" عالیہ نے جواب دیا۔

"بیوٹی پارلر سے گھر پہنچی تو آپ کے فون کا علم ہوا اور میں یہاں آگئی۔"

"مسز عالیہ۔"

"پلیز انسپکٹر۔" عالیہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اس نام سے مخاطب کرنا بند نہیں کر سکتے۔ میرا نام عالیہ ہے۔"

دلاور نے معنی خیز نظروں سے الیاس کی طرف دیکھا۔ تب ہی عالیہ پھر بولی۔

"آپ اس طرح ایک دوسرے کی طرف نہ

دیکھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ الیاس صاحب نے میرے خلاف آپ سے کیا کچھ کہا ہے۔ مگر حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب میں الیاس صاحب کے پاس قتل کے بارے میں دریافت کرنے گئی تھی تو میرا ارادہ واقعی منصور کو قتل کرنے کا تھا لیکن جیسا کہ میں نے ابھی بتایا' میں اسے مارنے کی ہمت نہیں کرسکی۔''

''تم انتہائی احمق اور نادان لڑکی ہو عالیہ۔ میں نے ہرگز انسپکٹر دلاور سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔'' الیاس نے غصے سے کہا۔

''ایک منٹ..... ایک منٹ.....'' دلاور جلدی سے بولا۔

''تو الیاس صاحب عالیہ آپ کے پاس قتل کے بارے میں مشورہ کرنے پہنچی تھیں۔''

''قتل کے بارے میں مشورہ نہیں۔ صرف عمومی معلومات قتل کی مختلف نوعیت کے سلسلے میں اور بالفرض مشورہ کرنے بھی آئی ہوں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وکیل اور اس کے موکل کی گفتگو کو ایک راز کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔'' الیاس نے جواب دیا۔

''تو گویا عالیہ صاحبہ آپ کی موکلہ ہیں۔''

''ہیں نہیں' ہوتیں' اگر یہ مشورہ کرنے آتیں۔ میں نے اسی لیے بالفرض کا لفظ استعمال کیا تھا۔''

''گویا یہ آپ کی موکلہ نہ تھیں' نہ ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''تو پھر کیا آپ یہ بتائیں گے کہ انہوں نے آپ کے سامنے منصور صاحب کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا یا نہیں۔''

الیاس نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

''اب سمجھ میں آیا کہ تم کتنی بڑی حماقت کر چکی ہو۔'' اس نے کہا اور دلاور کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''یہ درست ہے' مگر ادارہ جب تک عمل نہ بنے' اس پر کوئی گرفت نہیں جاسکتی۔''

''حماقت آپ اس وقت کہہ سکتے تھے۔ اگر میں نے واقعی کوئی جرم کیا ہوتا۔ بلاشبہ میں منصور سے نالاں تھی۔ اسے مارنا چاہتی تھی اور اسی ارادے سے گئی بھی تھی۔ مگر اس سنگین اقدام کی ہمت نہیں کرسکی۔ پولیس اگر میری دوسری باتوں کو سچ تسلیم کرتی ہے تو اسے میری یہ بات بھی درست ماننا چاہیے۔'' عالیہ نے کہا۔

''آپ کا بیان اور دوسرے تمام شواہد آپ کے خلاف ہیں عالیہ صاحبہ۔ آپ کے تعلقات اپنے شوہر سے خراب تھے۔ اتنے خراب کہ آپ نے منصور سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ آپ ریوالور لے کر اس کے اسٹوڈیو گئیں۔ وہاں آپ کا پھر مقتول منصور کے ساتھ شدید جھگڑا ہوا۔ آپ نے خود اپنے بیان کے مطابق اسے مارنے کے لیے ریوالور نکال لیا۔ اس کے بعد کون یہ مانے گا کہ آپ نے گولی نہیں چلائی اور ریوالور اس کی میز پر پھینک دیا اور واپس چلی گئیں۔ چنانچہ میں آپ کو قتل کے شبے میں زیر حراست لینے پر مجبور ہوں۔''

اس نے الیاس کی طرف دیکھا۔

''آپ کی موکلہ بے قصور معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ انہیں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔''

''شکریہ.....'' الیاس نے جواب دیا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ آپ عالیہ کو حراست میں لینے میں بھی جلدی نہ کریں۔ کم سے کم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے دیں۔ جس سے قتل کے وقت کا تعین کیا جاسکے گا۔ اگر یہ معلوم ہو کہ منصور کی موت اس وقت واقع ہوئی جب عالیہ وہاں موجود تھیں۔ تب آپ کا کیس زیادہ مضبوط ہوگا۔''

''اسی لیے میں انہیں باقاعدہ کسی دفعہ کے تحت گرفتار نہیں کررہا ہوں۔'' دلاور نے جواب

دیا۔

''لیکن میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ انہیں چھوڑ دوں اور یہ موقع ملنے پر قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے روپوش ہوجائیں۔''

اس نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو تاکید کی کہ وہ عالیہ کو حوالات لے جائے اور فیروزہ کو وہاں سے رہا کردے۔

''الیاس صاحب۔'' عالیہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ میری وکالت کرنا پسند کریں گے۔''

''ابھی میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ سردست میں فیروزہ کا وکیل ہوں۔ اس کے والد مرزا حیدر بیگ صاحب سے گفتگو کے بعد کوئی فیصلہ کرسکوں گا لیکن اس کے بغیر بھی میں تمہارے لیے جو کچھ بھی کرسکا ضرور کروں گا۔'' الیاس نے کہا۔

عالیہ کے حوالات جانے اور فیروزہ کے حوالات سے آنے کے بعد جب الیاس رخصت ہونے لگا تو انسپکٹر دلاور بھی اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

''یہ کیس کافی الجھا ہوا نظر آرہا ہے۔ آپ کوئی مشورہ نہیں دیں گے۔'' اس نے الیاس سے کہا۔

''تم نے ابتدائی تحقیقات صرف منصور کے اسٹوڈیو تک رکھی ہے یا اس کا دائرہ باہر بھی پھیلایا ہے۔'' الیاس نے پوچھا۔

''میں نے اپنے ایک ایس آئی کو اسٹوڈیو کے باہر لوگوں سے معلومات کرنے بھیجا ہے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے' کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہو یا کسی کو آتے جاتے دیکھا ہو۔'' دلاور نے جواب دیا۔

''یہ بہت اچھا کیا۔'' الیاس نے تائید کی۔

''اس کے علاوہ تمہیں زہرہ بیوٹی پارلر سے بھی معلوم کرنا چاہیے کہ عالیہ وہاں کس وقت پہنچی تھی۔''

''درست ہے' یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔''

''اس کے علاوہ فیروزہ کی تصویر کے پھٹے ہوئے حصے کو بھی نظر انداز مت کرنا' بلکہ اس تصویر کو اسٹوڈیو سے منگوالو' ممکن ہے بطور ثبوت اس کی ضرورت پڑے۔''

''میں اسے بھی اسٹوڈیو سے لیتا آیا ہوں۔''

''بہت خوب' اب تم خود خاصے ہوشیار ہوگئے ہو۔ میرے مشوروں کی تمہیں ضرورت نہیں رہی۔'' الیاس مسکرایا۔

دلاور کوئی جواب دینے لگا تھا کہ ایک کار اور ایک جیپ پولیس اسٹیشن کے سامنے آکر رکی۔ کار سے حیدر صاحب اترے اور جیپ سے ایس آئی بابر علی دو آدمیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ ابھی اتر ہی رہا تھا کہ حیدر صاحب تیزی سے چلتے ہوئے ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔

''کہیے الیاس صاحب' کیا رہا۔'' انہوں نے الیاس کو مخاطب کیا۔

''آپ سے انتظار نہیں ہوسکا۔ بہرحال مبارک ہو' فیروزہ کو رہا کردیا گیا ہے۔'' الیاس ہنستے ہوئے بولا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ الیاس صاحب۔'' حیدر صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں ایس آئی بابر علی بھی ان دو آدمیوں کے ساتھ قریب آگیا تھا۔

''کہو بابر علی' کوئی کامیابی ہوئی۔'' دلاور نے پوچھا۔

بابر علی کے ساتھ آنے والے آدمیوں میں سے ایک حیدر صاحب کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''جی ہاں' کچھ نہ کچھ تو ہوئی ہے۔'' بابر علی نے جواب دیا۔

''یہ دو گواہ ساتھ لایا ہوں۔ ان میں سے

KitabPK.Com

ایک آدمی منصور صاحب کے اسٹوڈیو کے پاس ریسٹورنٹ میں کام کرتا ہے اور دوسرے کی اسی ریسٹورنٹ کے باہر پان کی دکان ہے۔ ان دونوں نے ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ ایک کار کو اسٹوڈیو کے قریب رکتے اور پھر ایک آدمی کو کار سے اتر کر اندر جاتے دیکھا تھا اور ان کا کہنا ہے کہ یہ اسے دوبارہ دیکھیں گے تو پہچان لیں گے۔''

''کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔'' دلاور نے پوچھا۔

''نہیں۔'' بابر علی نے جواب دیا۔

''دراصل ریسٹورنٹ کے قریب ایک عمارت زیر تعمیر ہے۔ آج اس کی چھت پڑ رہی تھی۔ اس لیے بہت سے راج مزدوروں کے علاوہ کنکریٹ مکسر بھی کام کر رہا تھا اور آپ نے کبھی سنا ہو تو ان تمام چیزوں کا اچھا خاصہ شور ہوتا ہے۔ اس شور کی وجہ سے کسی نے بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔ اگر آواز آئی بھی ہوگی تو لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم ان لوگوں کا بیان لکھ لو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔'' دلاور بولا۔

''انسپکٹر دلاور! اب اجازت دیں۔ آپ کے تعاون کا بہت شکریہ۔'' مرزا حیدر بیگ صاحب نے کہا۔

''شکریے کی اس میں کوئی بات نہیں۔ میں اپنا فرض منصبی کسی جانبداری کے بغیر انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔'' دلاور نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر الیاس سے بولا۔

''اور الیاس صاحب! میں آپ سے بعد میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔ ابھی آپ دفتر جا رہے ہیں یا گھر۔''

''گھر ہی جاؤں گا۔'' الیاس نے کہا۔

''میرے خیال سے اگر زحمت نہ ہو تو کچھ دیر کے لیے دفتر چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔'' حیدر صاحب بولے۔

''جیسے آپ کی خوشی۔'' الیاس نے کہا۔

''بیٹی تم میری کار گھر لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔'' حیدر صاحب نے فیروزہ سے کہا۔

''اچھا ابو.....'' فیروزہ نے جواب دیا اور کار کی طرف بڑھ گئی۔

الیاس حیدر صاحب کو ساتھ لے کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ وہ آدمی بدستور حیدر بیگ کو گھور رہا تھا۔

اپنے پرائیویٹ آفس کا دروازہ کھولنے کے بعد الیاس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیے۔'' اس نے حیدر صاحب سے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ پولیس اسٹیشن سے روانگی کے قریب ہی سے وہ کچھ فکرمند نظر آرہے تھے۔ دفتر آتے ہوئے راستے میں بھی انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ الیاس نے ان کی پریشانی کو محسوس تو کر لیا تھا۔ مگر اس نے راستے میں دانستہ کوئی سوال نہیں کیا۔

''کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....'' حیدر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ پہلے ہی بتا دیتا تو زیادہ اچھا تھا۔ اسی سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے ساتھ چلا آرہا ہوں لیکن پہلے فیروزہ کے معاملے میں آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ طے ہو جانا چاہیے۔ کتنے کا چیک لکھوں۔''

''ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' الیاس نے جواب دیا۔

''پہلے آپ اپنی پریشانی کی وجہ بتائیں۔''

''یہ آدمی منصور شاید آپ کو معلوم نہیں انتہائی بدقماش اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا شخص تھا۔ وہ

مجھے فیروزہ کے سلسلے میں بلیک میل کر رہا تھا۔'' حیدر صاحب نے کہا۔

''کیا مطلب۔'' الیاس نے چونک کر پوچھا۔

''اس کے پاس فیروزہ کے کچھ خطوط تھے جو اس کے کہنے کے مطابق فیروزہ نے اسے لکھے تھے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ میں اسے پچاس ہزار روپے ماہانہ یا دس لاکھ روپے یکمشت ادا کروں۔ ورنہ وہ ان خطوط کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوا کر پوری سوسائٹی میں تقسیم کرا دے گا۔ میں اسی سلسلے میں اس سے معاملات طے کرنے آج ساڑھے چار بجے اس کے اسٹوڈیو گیا تھا لیکن جب وہاں پہنچا تو وہ قتل کیا پڑا تھا۔ میں گھبرا گیا اور فوراً واپس چلا آیا۔''

''میرا خیال ہے آپ نے اب بھی مجھے پوری بات نہیں بتائی۔''

''یہ آپ نے کیسے جانا۔'' حیدر صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''آپ منصور سے کوئی سودا کرنا چاہتے تھے تو اس میں ان خطوط کی واپسی شرط اول ہوتی۔'' الیاس نے جواب دیا۔

''دوسرے الفاظ میں آپ دونوں کی گفتگو کے وقت خطوط کی موجودگی ضروری تھی۔ مگر پولیس کو اسٹوڈیو کی تلاشی میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ وہاں گئے اور منصور کو مقتول دیکھا تو موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خط جو شاید آس پاس ہی رکھے ہوں گے، اٹھا کر لے آئے۔''

''ہاں..... وہ خطوط جو تعداد میں چار، پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس کی میز کی دراز میں رکھے تھے۔ ایک منٹ کی تلاشی میں مل گئے اور میں انہیں لے آیا۔'' حیدر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''اور اس طرح اپنے خلاف منصور کے قتل کا ایک بہترین مقصد فراہم کر دیا۔''

''مگر میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں اسٹوڈیو پہنچا تو اسے پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا۔'' حیدر صاحب نے جلدی سے کہا۔

''اور غالباً وہ دو گواہ جو سب انسپکٹر بابر علی کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے کسی نے آپ کو اسٹوڈیو میں جاتے یا وہاں سے واپس آتے دیکھ لیا تھا۔''

''شاید۔''

''انہیں دیکھ کر اور بابر علی کی بات سن کر ہی آپ کو احساس ہوا کہ اب پانی سر سے گزرنے والا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ دلاور آپ تک۔''

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ دفتر کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر دلاور اندر داخل ہوا۔

''میرا خیال تھا..... کہ آپ ابھی الیاس صاحب کے دفتر میں ہی ہوں گے۔'' وہ حیدر صاحب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''لیکن میرا یہ خیال نہیں تھا۔ تم نے آنے کے لیے کہا ضرور تھا۔ مگر اتنی جلدی کی توقع مجھے نہیں تھی۔'' الیاس نے بات کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی۔

''مجھے بھی نہیں تھی۔'' دلاور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''وہ تو جب بھولے پان والے نے بتایا کہ اس نے حیدر صاحب کو تقریباً ساڑھے چار بجے منصور کے اسٹوڈیو میں جاتے اور چار، پانچ منٹ بعد باہر نکلتے دیکھا تھا تب مجھے آنا پڑا۔''

اس نے حیدر صاحب کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ منصور کے اسٹوڈیو گئے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں گیا تھا۔'' حیدر صاحب کو مجبوراً کہنا پڑا۔

''اور آپ نے یہ بات مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔''

''جب یہ وہاں پہنچے تو منصور کو قتل کیا جا چکا

KitabPK.Com

تھا۔" الیاس نے جواب دیا۔

"اور یہ وہاں گئے کیوں تھے۔" دلاور نے پوچھا۔

"منصور انہیں فیروزہ کے کچھ خطوط کے سلسلے میں بلیک میل کر رہا تھا۔ اس نے رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ حیدر صاحب وہ رقم دینے گئے تھے۔" الیاس نے بتایا۔

"اور جب حیدر صاحب وہاں پہنچے تو منصور نے رقم میں اضافہ کر دیا یا اس نے پہلے ہی زیادہ رقم مانگی تھی اور یہ کم لے کر گئے تھے۔ اس بات پر دونوں کا جھگڑا ہوا۔ عالیہ کا ریوالور میز پر رکھا ہوا تھا۔ حیدر صاحب نے غصے اور اشتعال کی کیفیت میں وہ ریوالور اٹھایا اور منصور کو شوٹ کر دیا اور خطوط لے کر چلے گئے۔ کیونکہ ہمیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی۔"

"ہرگز نہیں۔" حیدر صاحب جلدی سے بول اٹھے۔

"جب منصور کو پہلے ہی کسی نے قتل کر دیا تھا تو اس کا مجھ سے جھگڑا کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں نے میز پر ریوالور دیکھا ضرور تھا' مگر اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔ مگر اسے ثابت کیسے کریں گے۔" دلاور نے کہا۔

"اگر حیدر صاحب نے منصور کو قتل کیا ہوتا تو ریوالور پر ان کی انگلیوں کے نشانات بھی ہوتے۔ جبکہ اس پر صرف فیروزہ اور عالیہ کی انگلیوں کے نشانات ہیں اور غالباً تم یہ نہیں کہو گے کہ غصے اور جوش میں آ کر جب انہوں نے ریوالور اٹھایا تو انہیں اتنا ہوش تھا کہ یہ پہلے دستانے خرید نے بازار گئے' انہیں پہن کر ریوالور اٹھایا اور پھر منصور کو شوٹ کیا۔" الیاس نے دلیل دی۔

دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

"نہیں میں یہ تو نہیں کہوں گا..... لیکن حیدر صاحب دستانے پہن کر تو جا سکتے تھے۔" وہ بولا۔

"ہاں..... ضرور..... چونکہ انہیں معلوم تھا کہ اسٹوڈیو میں ان کا منصور کے ساتھ جھگڑا ہوگا اور وہاں میز پر ریوالور بھی رکھا ہوگا' اس لیے انہوں نے سوچا کہ دستانے پہن کر چلنا چاہیے۔ تاکہ جب یہ ریوالور اٹھا کر اسے شوٹ کریں تو ریوالور پر ان کی انگلیوں کے نشانات نہ رہ جائیں۔" الیاس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' دلاور چڑ گیا۔

"یہ عدالت نہیں ہے۔ اس لیے مجھ سے وکیلوں کی طرح جرح مت کرو۔ تمہیں مان لینا چاہیے کہ حیدر صاحب کے دل میں کوئی چور نہیں تھا تو یہ اسٹوڈیو جانے اور منصور کو مقتول دیکھنے کی بات مجھ سے نہ چھپاتے۔ خاص طور سے ایسی صورت میں جب خود ان کی بیٹی پر قتل کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ یہ فوراً کہتے کہ فیروزہ تو منصور کو قتل کر ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اسے پہلے ہی قتل کیا جا چکا تھا۔ مگر یہ خاموش رہے۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ منصور کو انہوں نے قتل کیا ہے۔ فیروزہ نے نہیں۔ اس لیے فیروزہ تو بے گناہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ ہی جائے گی۔ مگر یہ اسٹوڈیو جانے کا اعتراف کر کے پکڑے جائیں گے۔"

"تم رائے قائم کرنے میں بہت جلدی کر رہے ہو۔ پہلے تم نے فیروزہ پر شبہ کیا۔ پھر ابھی عالیہ کو حوالات میں بند کر کے آ رہے ہو اور اب حیدر صاحب پر شک کرنے لگے۔ میرا مشورہ ہے کہ ابھی مزید تحقیقات کرو' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے دو۔ قتل کے وقت کا تعین ہو جائے تو یہ طے کرنا زیادہ آسان ہوگا کہ تمام مشتبہ افراد میں اس وقت کون موقع واردات پر موجود تھا اور کسے قتل کرنے کا بہترین موقع حاصل تھا۔"

انسپکٹر دلاور نے الیاس کی بات پر سنجیدگی سے غور کیا اور آخر اس نے جواب دیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اور پھر حیدر

صاحب کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا رہا ہوں۔ مگر براہ کرم آپ شہر میں موجود رہیں اور کہیں جائیں تو اطلاع دے کر جائیں۔"

وہ کھڑا ہوا' اپنی ریسٹ واچ پر نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کافی وقت ہو گیا ہے۔ اس لیے اب اجازت چاہوں گا۔ امید ہے جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

دلاور چلا گیا تو حیدر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

"میرا خیال ہے اس وقت آپ نہ ہوتے تو انسپکٹر دلاور مجھے بھی حراست میں لے لیتا۔" انہوں نے کہا۔

"اس میں دلاور کا قصور نہ ہوتا' کیونکہ حالات آپ کے معاملے میں بھی بہتر نہیں ہیں۔"

"اچھا..... اب فیروزہ کے لیے تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا فیصلہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی کر سکے گی۔"

"بہرحال کچھ بھی ہو آپ کو پہلے فیروزہ اور پھر بعد میں میرے وکیل کا فرض انجام دینا ہے۔" حیدر صاحب بھی چلنے کے لیے کھڑے ہوئے۔

"وقت آنے دیجیے..... میں سچائی کا ساتھ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔" الیاس نے جواب دیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ مشہور و معروف مصور منصور کے قتل کی خبریں شائع ہوئیں۔ پولیس کے پریس ریلیز کے حوالے سے منصور کی بیوی عالیہ کی گرفتاری کی خبر بھی چھاپی گئی تھی۔ پوری تفصیل درج تھی کہ ان دونوں کی ازدواجی زندگی منصور کی رنگین مزاجی نے تلخ بنا دی تھی۔ چنانچہ عالیہ نے عاجز آ کر منصور سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ساڑھے تین بجے منصور کے اسٹوڈیو پہنچی۔ وہاں دونوں کا زبردست جھگڑا ہوا اور عالیہ نے جو اپنے ساتھ ریوالور بھی لے گئی تھی۔ پرس سے ریوالور نکال کر اسے شوٹ کر دیا۔

الیاس ابھی دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اسے انسپکٹر دلاور کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے فوراً بلا لیا۔ دلاور بڑے جوش میں معلوم ہو رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے' کیس حل کر لیا ہے۔" الیاس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے کیسے جانا۔ ابھی تو ایس پی صاحب تک سے اس مسئلے پر بات نہیں کی۔" دلاور نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے چہرے کے تاثرات سے..... ہاں تو پھر کون قاتل ثابت ہوا۔" الیاس نے کہا۔

"تمہارے موکل مرزا حیدر بیگ صاحب۔ وہ اور فیروزہ دونوں اپنے بنگلے سے غائب ہیں۔" دلاور نے جواب دیا۔

"یہ کہو کہ اپنے بنگلے میں موجود نہیں ہیں۔" الیاس نے کہا۔

"وہ اپنے دفتر میں بھی نہیں ہیں۔"

"اس وقت تم بھی نہ اپنے گھر پر ہو نا اپنے آفس میں' تو کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انسپکٹر دلاور غائب ہیں۔" الیاس ہنستے ہوئے بولا۔

"مگر یہ باتیں چھوڑو' تم اپنی بات کرو' حیدر صاحب قاتل کیسے ثابت ہوئے اور عالیہ کا کیا بنا۔"

"میں نے انہیں رہا کر دیا ہے۔"

"اچھا..... تو گویا تمہیں حیدر صاحب کے قاتل ہونے کا یقین ہو گیا ہے۔" الیاس نے حیرت سے کہا۔

"سو فیصد۔"

"وہ کس طرح۔"

"سنو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق منصور کی موت دل میں گولی لگنے سے واقع ہوئی

KitabPK.Com

ہے اور حیدر صاحب رائفل کلب کے ممبر ہیں اور ان کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ پولیس سرجن کا خیال ہے کہ منصور کی موت سہ پہر چار بجے سے پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ میں خود پانچ بج کر پندرہ منٹ پر اسٹوڈیو پہنچ گیا تھا اور لاش کا جسم جس قدر ٹھنڈا تھا' اس کے اعتبار سے فیروزہ اسے قتل نہیں کر سکتی تھی۔'' دلاور نے بتایا۔

''مگر عالیہ۔''

''ابھی اسی کی طرف آ رہا ہوں۔''

''آج اخبارات میں منصور کے قتل اور عالیہ کی گرفتاری کی خبریں پڑھ کر غیاث صاحب نے مجھے فون کیا۔ غیاث صاحب ایک آرٹ گیلری کے مالک ہیں اور عالیہ اور منصور دونوں کے بہترین دوست بھی۔ انہوں نے بتایا کہ کل سوا چار بجے کے قریب انہوں نے منصور کو فون کیا تھا۔ عالیہ اور اس کے اختلافات ختم کرنے کے خیال سے یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ فون سوا چار بجے کیا گیا تھا اور اس کا جواب خود منصور نے دیا اور اس نے غیاث صاحب کو بتایا کہ عالیہ ایک بڑے جھگڑے کے بعد واپس جا چکی ہے اور اس نے دھمکی دی ہے کہ اب ان کی اگلی ملاقات کورٹ میں ہوگی۔ اس بیان سے ثابت ہو گیا کہ عالیہ کے جانے کے بعد بھی منصور زندہ تھا۔ گویا سوا چار بجے تک۔ اب مشتبہ افراد میں کون باقی رہ گیا۔ صرف حیدر صاحب۔ وہ خود اپنے بقول ساڑھے چار بجے اسٹوڈیو پہنچے تھے اور پھر وہاں وہی ہوا جو میں نے کل رات کہا تھا۔ یعنی رقم کے معاملے یا خطوط کی واپسی پر ان کا منصور سے جھگڑا ہوا۔ حیدر صاحب نے یا تو دستانے پہن رکھے تھے یا پھر انہوں نے غصے کے باوجود اتنی ذہانت کا ثبوت دیا کہ رومال ہاتھ میں لپیٹ کر ریوالور اٹھایا۔ منصور کو شوٹ کیا۔ ریوالور وہیں رکھا اور میز کی دراز سے خطوط نکال کر چپ چاپ رخصت ہو گئے۔ سب کڑیاں اپنی اپنی جگہ فٹ بیٹھ گئیں۔ مقصد قتل' موقع قتل' آلہ قتل اور قتل کا وقت' تم تسلیم کرو گے کہ حیدر صاحب کے معاملے میں جس طرح تمام شواہد متفقہ طور پر یہ ان کے خلاف نظر آ رہے ہیں۔ عالیہ یا فیروزہ کے معاملے میں اس طرح نہیں ہیں..... بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''غلط اور صحیح کا جواب تو میں ابھی نہیں دے سکتا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ حیدر صاحب کے خلاف تمہارا کیس بہت مضبوط ہے۔ پھر بھی ایک' دو باتیں ہیں جو اس فریم میں فٹ نہیں بیٹھتیں۔'' الیاس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مثلاً۔''

''مثلاً یہی ہاتھ میں رومال لپیٹ کر ریوالور اٹھانے والی بات۔'' الیاس نے ٹالتے ہوئے جواب دیا' پھر بولا۔

''اس عمل سے پیشگی منصوبہ بندی کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے کوئی باقاعدہ پلان بنا کر کسی کو قتل کرنے جائے' اسے معلوم ہو کہ وہاں میز پر ریوالور رکھا ہوگا اور وہ یہ بھی سوچ سکے کہ یوں ریوالور اٹھانے سے اس کی انگلیوں کے نشان ریوالور پر رہ جائیں گے۔ اس لیے اسے ہاتھ میں رومال لپیٹ لینا چاہیے۔''

''میں مانتا ہوں کہ اس عمل سے پیشگی منصوبہ بندی کا تاثر ملتا ہے۔ مگر یہ منصوبہ بندی فوراً کی فوراً بھی تو ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے حیدر صاحب کے ذہن میں پہلے سے منصور کو قتل کرنے کا خیال نہ ہو لیکن جب وہ اس کے اسٹوڈیو پہنچے' وہاں جھگڑا ہوا' جھگڑے کے دوران ان کی نظر ریوالور پر پڑی اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ منصور سے چھٹکارا پانے کا بہترین موقع ہے اور اسی سوچ کے تحت انہوں نے خود کو محفوظ رکھنے کے خیال سے جھگڑے کے دوران ہی ہاتھ پر رومال لپیٹنا شروع کر دیا ہو۔ پھر موقع پاتے ہی ریوالور اٹھایا اور شوٹ کر دیا۔'' دلاور نے کہا۔

''یہ ممکن تھا۔'' الیاس نے تسلیم کیا' پھر بولا۔

''مگر خود تمہارے گواہ کے بقول حیدر صاحب بمشکل پانچ منٹ اندر رہے۔ اتنے کم وقت میں باتیں' جھگڑا' پیشگی منصوبہ بندی' یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ہو سکتا ہے' وہ زیادہ دیر اندر رہے ہوں۔ بہرحال میں اتنی پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ غالباً حیدر صاحب کے وکیل تم ہی ہو۔ پولیس کیس کمزور ہو تو انہیں عدالت سے چھڑا لینا۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ وہ ہیں کہاں۔ ان کا پتا نہیں چلا تو تجھے گرفتاری کا وارنٹ نکلوانا پڑے گا۔'' دلاور بولا۔

''تو نکلوا لو۔''

''میں ابھی ایک دن کے لیے تمہارے ہی خیال سے ذرا احتیاط برتنا چاہتا ہوں لیکن وہ نہ ملے تو پھر یہی کرنا پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ شاید وہ صبح کے اخبارات پڑھ کر اپنی والدہ کے پاس گئے ہوں۔ تاکہ اس قسم کی خبروں سے اگر انہیں کوئی پریشانی ہو تو انہیں تسلی دے سکیں۔ آخر پولیس کے پریس ریلیز میں اشارتاً ہی سہی' مگر حیدر صاحب کا ذکر تو کیا گیا ہے نا۔''

''ان کی والدہ کے گھر کا پتا ہے تمہارے پاس۔''

''اس کی ضرورت نہیں' ممکن ہے وہ اب تک اپنے گھر یا دفتر واپس پہنچ چکے ہوں۔''

''ہاں ہو سکتا ہے۔ تو پھر میں اب چلتا ہوں۔'' دلاور نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دلاور کے جاتے ہی الیاس بھی پھرتی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور باہر اپنے نائب کو یہ بتاتے ہوئے کہ وہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد واپس آئے گا یا فون کرے گا۔ دفتر سے نکل گیا۔ وہ آرٹ گیلری کے مالک غیاث صاحب کو جانتا تھا اور اب ان ہی سے ملنے جا رہا تھا۔

انسپکٹر دلاور نے چونک کر الیاس کی طرف دیکھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''جو کچھ کہہ رہا ہوں' ٹھیک کہہ رہا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس ثبوت بھی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔''

''جس طرح پلاننگ کی گئی تھی' اس کے پیش نظر ممکن ہو سکتا تھا اور وہ ہوا بھی۔''

''لیکن میں تو ایس پی صاحب کو اپنی رپورٹ دینے جا رہا تھا۔''

''رپورٹ دوسری بھی لکھی جا سکتی ہے۔''

''اور تم نے ان سب کو فون کر دیا ہے۔''

''ہاں۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔'' الیاس نے اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور عالیہ اندر داخل ہو گئی۔ الیاس کھڑا ہو گیا۔

''آیئے..... آیئے مسز منصور۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ لوگوں سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے اس نام سے نہ پکارا جائے۔ میرا نام عالیہ ہے۔''

''بہت بہتر' مگر آپ تشریف تو رکھیں۔''

''شکریہ لیکن اس طلبی کا مقصد کیا ہے۔'' عالیہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے آپ کے شوہر کے قتل کا معمہ حل کر لیا ہے۔''

''گویا آپ نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔ یہ آپ نے برا کیا۔ اب آپ اسے عدالت سے سزا دلانے کے لیے کارروائی کریں گے جبکہ میرے نزدیک وہ شخص انعام کا مستحق ہے۔'' عالیہ نے تلخی سے کہا۔

''دنیا کا کوئی قانون کسی کو بھی' کسی کی جان لینے کا اختیار نہیں دیتا۔''

''خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔'' عالیہ نے

KitabPK.Com

بے پروائی سے کہا۔

''مگر وہ ہے کون۔''

اس سے پہلے کہ الیاس کوئی جواب دیتا' دروازہ دوسری مرتبہ کھلا اور اس بار حیدر بیگ صاحب اور فیروزہ نے آفس میں قدم رکھا۔ عالیہ نے فیروزہ کو دیکھ کر ناگواری سے اپنا منہ پھیر لیا۔

''آئیے آپ دونوں کا ہی انتظار تھا۔'' الیاس بولا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ پولیس میری گرفتاری کے درپے ہے لیکن مجھے فیروزہ کے طلب کیسے جانے پر اعتراض ہے۔ کیا باپ کو بیٹی کے سامنے گرفتار کرنا ضروری تھا۔'' حیدر صاحب نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''سب سے پہلے میں آپ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور کردوں کہ آپ کو میں نے طلب کیا ہے۔ یہ شرارت' مذاق یا کوئی سنجیدہ اقدام جو کچھ بھی ہے' سب کچھ بیرسٹر الیاس کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس لیے اس بارے میں جواب دہی کا فرض بھی ان ہی پر عائد ہوتا ہے۔'' دلاور نے کہا۔

''اور میں جواب ضرور دوں گا۔'' الیاس ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

''بنیادی طور پر اس دعوت کا مقصد آپ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ ہم نے منصور کے قاتل کو جان لیا ہے اور اب اس کی گرفتاری کچھ دیر کی بات ہے۔''

''اور وہ میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ کم سے کم انسپکٹر دلاور کا خیال یہی ہے۔'' حیدر بیگ صاحب نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''اس کیس میں تین افراد شبے کے زد میں آتے ہیں۔'' الیاس دلاور کے کچھ کہنے سے پہلے بول اٹھا۔

''فیروزہ' عالیہ صاحبہ اور حیدر بیگ صاحب۔ باری باری انسپکٹر دلاور نے آپ سب پر شبہ کیا' لیکن ایک ضروری بات یہ شروع سے ہی نظر انداز کرتے رہے۔''

''وہ کیا......'' دلاور نے چونک کر پوچھا۔

''فیروزہ صاحبہ کی تصویر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور وہ ظاہر ہے کہ آپ سے آپ نہیں پھٹی' کسی نے اسے دانستہ پھاڑا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس نے ایسا کیا۔''

''تو پھر کیا فیروزہ نے۔ منصور کی نازیبا حرکتوں کے باوجود فیروزہ اس لیے تصویر مکمل ہونے تک پوز کرتی رہیں کہ انہیں اپنی تصویر چاہیے تھی۔ اس لیے وہ بھی اپنی تصویر نہیں پھاڑ سکتی تھیں۔''

''آپ بے کار اتنے الفاظ کہہ رہے ہیں اور اس طرح کی تصویریں ہی میری بربادی کا باعث تھیں۔ میرا بس چلتا تو ساری تصویریں پھاڑ ڈالتی۔'' عالیہ بول اٹھی۔

''شکریہ عالیہ۔'' الیاس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

''جس جرات کے ساتھ تم اب تک تمام اعترافات کرتی رہی ہو' اسی حوصلے سے کام لے کر یہ بھی اعتراف کرلو کہ تم نے منصور کو قتل کیا ہے۔''

''میں نے۔'' عالیہ مسکرائی۔ پھر بولی۔

''بلاشبہ میری خواہش یہی تھی' مگر افسوس' یہ نیک کام میں نہیں کرسکی۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں ریوالور میز پر پھینک کر' منصور کو زندہ سلامت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

''کہاں۔''

''زہرہ بیوٹی پارلر۔''

''کیوں۔''

''وہاں میرا اپائنٹمنٹ تھا۔''

''کس ٹائم کے لیے۔''

''سوا چار بجے کے لیے۔''

''اور تم وہاں پہنچیں کس وقت۔''

''شاید چار بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔''

''جی نہیں' تمہارا اپائنٹمنٹ ساڑھے چار بجے کا تھا اور تم چار چالیس پر وہاں پہنچی تھیں۔''

''کون کہتا ہے۔''

''میں کہتا ہوں۔ مسز زہرہ خالد کی اپائنٹمنٹ بک کہتی ہے اور وہ لڑکی کرن کہتی ہے جس نے تمہیں اٹینڈ کیا تھا۔''

''خوب' تو تم وہاں تک ہو آئے۔''

''جی ہاں! کیونکہ میں انسپکٹر دلاور کی طرح خوش فہم نہیں تھا۔''

''ممکن ہے' یہی ٹائم ہوا ہو۔ ٹریفک کے ہجوم میں اکثر اندازے سے زیادہ دیر لگ جاتی ہے۔ تو پھر اس سے کیا ہوا یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ منصور میرے جانے کے بعد بھی زندہ تھا۔''

''یہ کیسے ثابت ہوا۔''

''غیاث بھائی کے بیان سے۔ انہوں نے سوا چار بجے یا اس کے ایک دو منٹ بعد منصور سے فون پر بات کی تھی اور منصور نے خود اعتراف کیا تھا کہ میں جا چکی ہوں۔'' عالیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''غیاث صاحب کو ٹھیک اسی وقت فون کرنے کا خیال کیوں آیا۔'' الیاس نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم۔ یہ آپ ان سے پوچھیں۔'' عالیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''میں نے پوچھا تھا۔''

''کیا۔'' عالیہ چونک پڑی۔ پھر بولی۔

''آپ غیاث بھائی کے پاس بھی گئے تھے۔''

''یقیناً۔''

''پھر انہوں نے کیا کہا۔''

''وہی جو انہیں کہنا چاہیے تھا۔'' الیاس نے جواب دیا۔

''کہ ٹھیک سوا چار بجے منصور کو فون کرنے کے لیے تم نے انہیں تاکید کی تھی۔''

کو پکڑ لیا ہوا۔ میں نے ان سے اس لیے کہا تھا کہ اگر میں منصور کو سمجھانے میں ناکام رہوں تو وہ اسے قائل کرسکیں۔''

''یہ بات تھی تو تم ان کے فون کرنے سے پہلے ہی کیوں چلی گئیں۔ ان کے فون کا انتظار کیوں نہیں کیا۔''

''میں اس قدر غصے میں تھی کہ فون کی بات بالکل یاد ہی نہیں رہی۔''

''تمہارا یہ بھی جواب نہیں عالیہ۔ تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے بیان کے مطابق چار بجے اسٹوڈیو سے نہیں گئی تھیں بلکہ دروازے کے باہر کھڑی انتظار کررہی تھیں اور فون کی بات بھی تمہیں اچھی طرح یاد تھی۔ جیسے ہی سوا چار بجے غیاث صاحب کا فون آیا اور منصور نے ان سے فون پر بات کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ تم عدالت میں ملاقات کرنے کی دھمکی دے کر جا چکی ہو تو تم نے کھلے دروازے سے گولی چلائی۔ تمہارا نشانہ بھی بہترین تھا کہ گولی ٹھیک اپنے ہدف پر لگی اور منصور ختم ہوگیا۔ انسپکٹر دلاور کو معلوم نہیں تھا' مگر میں جانتا ہوں کہ تم بھی رائفل کلب کی ممبر رہ چکی ہو اور نشانہ بازی میں کئی مقابلے بھی جیتے ہیں۔ منصور کو قتل کرکے تم نے ریوالور اس کی میز پر رکھا اور دروازہ بند کرکے زہرہ بیوٹی پارلر چلی گئیں۔ تم نے بڑی ذہانت سے قتل کا منصوبہ بنایا تھا' پورا ٹائم ٹیبل ترتیب دیا تھا' مگر اتفاقاً ہونے والی باتوں کا تدارک ہر مجرم کی طرح تمہارے پاس بھی نہیں تھا اور اسی طرح کی ایک اتفاقی بات نے تمہیں قانون کی گرفت میں دے دیا۔''

''کون سی بات۔'' عالیہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔

''یہ کہ جب منصور نے اپنی بات ختم کرکے ریسیور کریڈل پر رکھا تو وہ ٹھیک طرح سے نہیں رکھا گیا' کنکشن آف نہ ہوسکا اور اس کے فوراً بعد

KitabPK.Com

تمہاری چلائی جانے والی گولی کا دھماکا غیاث نے بھی سن لیا۔ اگرچہ وہ اس وقت اس کا مطلب نہیں سمجھے تھے' مگر اب جان چکے ہیں اور واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت نہ فیروزہ فائر کرسکتی تھیں نہ حیدر صاحب' صرف تم ہی یہ کام کرسکتی تھیں کیونکہ تم وہاں موجود تھیں۔''

عالیہ ایک دم کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔

''یہ غالباً تم نے اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام لیا ہے بیرسٹر الیاس۔'' وہ بولی۔

''مگر اس وقت میں نے اچھا نہیں کیا تھا تو اب تم نے بھی کوئی ثواب نہیں کمایا ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ لہرائی اور بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑی۔

''جواب نہیں تمہارا بیرسٹر الیاس۔'' انسپکٹر دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو شاید غیاث صاحب کے بیان کے بعد قیامت تک عالیہ پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ مگر ایک بات پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا۔'' الیاس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''غیاث صاحب نے گولی چلنے کی آواز کیسے سن لی۔ میں نے خود فون دیکھا تھا' اس کا ریسیور بالکل ٹھیک کریڈل پر رکھا تھا۔''

''تم بھول رہے ہو۔ اس سے قبل فیروزہ تمہیں کال کرنے کے لیے فون استعمال کرچکی تھی۔ مگر انہوں نے فون نہ بھی کیا ہوتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ منصور نے ریسیور ٹھیک ہی رکھا تھا اور کنکشن آف ہوچکا تھا۔'' الیاس نے جواب دیا۔

''تب پھر وہ ریوالور کا دھماکا۔''

''وہ میرے ذہن کی اختراع تھی۔ عالیہ نے بڑی مکمل پلاننگ کی تھی۔ ہر سوال کا جواب اس کے پاس تھا۔ اس سے اقبال جرم کرانے کے لیے یہ دھماکا ہونا ضروری تھا۔ مجرم اپنا جرم چھپانے کے لیے جھوٹ بول سکتا ہے تو اس سے سچ اگلوانے کے لیے ایک آدھ جھوٹ کی اجازت تو قانون کے رکھوالوں کو بھی ہونا چاہیے یا نہیں۔''

''مگر سچ اور جھوٹ کی اس جنگ نے میری بیٹی کو تو بدنام کردیا نا۔'' حیدر صاحب نے افسردگی سے کہا۔

''فیروزہ کے منگیتر نے منگنی توڑ دی ہے۔ حالانکہ ان خطوط میں کچھ بھی نہ تھا اور نہ ہی وہ منصور کو لکھے گئے تھے۔ ان پر کسی کا نام نہیں تھا۔''

''میں جانتا ہوں کیونکہ وہ خط مجھے ہی لکھے گئے تھے۔'' الیاس نے سر ہلایا۔

''آپ کو۔''

''جی ہاں۔ میرا ارادہ جلد ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا' مگر جب آپ نے..... فیروزہ کی منگنی کردی تو ہر چند ان خطوط میں کوئی عامیانہ بات نہیں تھی پھر بھی ان کا میرے پاس رہنا مناسب نہ تھا۔ وہ میں نے فیروزہ کو واپس کردیئے۔ ویسے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ منصور سے اپنا پورٹریٹ بنوا رہی ہیں۔''

''تو پھر اب..... اب۔''

''اب اگر اجازت دیں تو میں وہ خط فیروزہ سے واپس لے لوں۔''

''کمال کے لوگ ہوتے ہیں یہ آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں بھی۔'' حیدر صاحب نے پہلی بار مسکراتے ہوئے دلاور کی طرف دیکھا۔

''یعنی یہ دیکھیے' اگر یہ بات ان دونوں میں سے کوئی پہلے مجھے بتا دیتا تو مجھے محمود احمد صاحب کے یہاں جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی۔''

دلاور نے کن انکھیوں سے فیروزہ کی طرف دیکھا جو حجاب سے شفق رنگ ہوئی جارہی تھی۔

KitabPK.Com